انڈیا
یعنی
مادر ہند
مس کیتھرائن میو کی مشہور و معروف کتاب
مدر انڈیا
کا مکمل سلیس اُردو ترجمہ

جو اُسے دراصل ذبح کرتا ہے۔ نہ کہ مجھ کو جو اسے صرف فروخت کرتا ہوں
اب یہ دودھ نہیں دیتی اور اس کے رکھنے میں صاف خسارہ ہے۔ اور جو
کہ وہ قصاب سے لیتا ہے جب اس میں سے کچھ بچا کر ایک نہایت لا
مریض گائے خرید کر وہ پنجر خانوں یا گوشالہ میں بھیج دیتا ہے تو وہ دل
لگتا ہے کہ اُسے اس نیک کام سے بے انتہا ثواب ملے گا۔ حالانکہ گائے
قیمت وہ اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ اب یہ بات ہندوستان کے ا
میں بار بار آ چکی ہے۔ کہ جو گائیں ہندوؤں کے گھروں سے قصائیو
ہاتھ آئی ہیں۔ وہ اسی ذریعہ سے آتی ہوں گی۔

اس کتاب میں بیسیوں مضامین ہندوؤں کی سوشل اصلاح
درج ہیں۔ مگر زیادہ تر کم عمری کی شادی اور گایوں سے بدسلوکی کر
سخت حملہ کیا گیا ہے اور ان دونوں مضامین پر اجنبی مصنفہ نے اسقدر مو
سرکاری رپورٹوں اور مسٹر گاندھی کے اخبار ینگ انڈیا اور دیگر سوشل ر
کی تحریروں۔ گفتگوؤں اور لیکچروں کے اقتباسات سے جمع کی ہیں۔ ک
مصنفہ کے پیشہ ور اخبار نویس ہونے کے پھر بھی اُسے جو کامیابی ا
کی بہم رسانی اور جمع کرنے میں ہوئی ہے۔ اس سے لوگ نتیجہ نکالتے ہیں
حکام نے مدد دی ہے۔ ورنہ وہ اتنے مسالہ کے فراہم کرنے میں کامیاب
لیکن اگر اس بات کی طرف خیال کیا جائے کہ وہ ملک کے ایک حصہ
دوسرے تک چھچھوندر کی طرح پھرتی رہی ہے۔ اور ہر جگہ سے ملاقات
خطوط لے کر ہر قسم اور ہر درجہ کے لوگوں سے ملتی رہی ہے۔ پھر ا
میں بہت سے یورپین بلکہ امریکن مشنری اور سوداگر و ملازم لوگ
ہیں جنہیں مس میو کو ہر قسم کی واقفیت بہم پہنچانے میں کسی قسم کا عذر

سکتا تھا۔ تو کیا ضروری ہے کہ حکام نے ہی مدد دی ہو؟

اخبارات نے یہ بھی لکھا ہے کہ مس میو نے پہلے اس سے جزائر فلپائن
باشندوں کے خلاف ایک ایسی ہی کتاب لکھی ہے۔ جو امریکہ کے
تی ہیں۔ اور اس کتاب کے لکھنے سے اُن کی آزادی حاصل ہونے
دیر ہو گئی ہے۔ اور اب ایک یہ خبر اُڑ رہی ہے کہ آیندہ سال
مس میو مصر پر ایک ایسی ہی کتاب لکھنا چاہتی ہیں۔ تاکہ اہل مصر کو انگریزوں
پنجہ سے آزادی نہ ملے۔ حالانکہ مصریوں کو اس سے زیادہ آزادی
نا ہے جو ایسی کتاب کے لکھنے سے رُک سکتی ہے۔ میرے خیال میں
مس میو خاص قسم کی اخبار نویس عورت ہے۔ وہ جانتی ہے کہ ایسی کتابیں
ں کسی قوم کی کمزوریاں صفائی سے بیان کی جائیں تو وہ خوب بکتی ہے
یا کہ مدر انڈیا کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتک اس کتاب
پندرہ، ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ تو اگر اسے راستہ نظر آئے
یک درجن اور ملکوں کے ایسے عیب بیان کر دے گی۔ لیکن ہمیں
وب کو دیکھ کر غور کرنا چاہئیے کہ آیا یہ بالکل بے بنیاد الزام ہیں۔ یا
ں کچھ صداقت بھی ہے اگر یہ سچ ہیں تو ہمیں ان کی اصلاح کی کوشش
ہائیے اور جو ہمارا عیب چیں ہمیں ہماری سچی کمزوریاں بتلائے انپر
ہونے کی بجائے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئیے۔ نہ کہ ہم اسپر
ہا ہوں۔ شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے۔ ؎

کو دشمن شوخ چشم بیباک؟   تا عیب مرا بمن نماید

ور فارسی کا مشہور قطعہ قابل توجہ ہے۔ ؎

دوست آنست کہ عیب دوست   ہمچو آئینہ رو برو گوید

نہ کہ چوں شانہ ہزار زباں   در پس پشت مو بمو گوید

پبلک کی ناراضگی کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ مصنفہ نے یہ تاثر دیا ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں یعنی ہندو اور مسلمان آباد ہیں اور ان دونوں میں ہندو علوم و فنون اور سیاسیات و معاملات تجارت وغیرہ میں ہر طرح پیش پیش ہیں۔ اور مسلمان کسی دیوان یا میدان میں کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں۔ اس لئے تعلیم یافتہ اور واقف کار ہندوؤں کی نکتہ چینی میں ہی کچھ لطف آسکتا ہے۔ اور شہرت بھی حاصل ہو سکتی ہے مسلمانوں کو چھیڑنا عبث ہے ؂

بہر حال مس میو نے ہندوؤں کی حالت اور ذہنیت کی صحت سے تاڑنے میں جو کام کیا ہے وہ ایک غیر ملک کی عورت کے لئے بڑا عجیب کام ہے اس نے ہندو سوسائٹی کی برائیوں کو جو اس کے خیال میں آئی ہیں مسلمانوں سے جدا کر کے بیان کیا ہے۔ اور عجیب تر یہ ہے کہ اس نے زیادہ تر گورنمنٹ کی رپورٹوں مطبوعہ کتابوں اور اخباروں سے بعینہ اقتباسات نقل کئے ہیں یہانتک کہ گائے کے باب میں زیادہ تر ینگ انڈیا سے حوالے دئے ہیں جو مہاتما گاندھی کا اخبار ہے۔ اسے تعجب ہوا ہے۔ کہ باوجودیکہ گائے کی عزت بلکہ پرستش کا خیال ہندوؤں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ مگر وہ اس کی خدمت اور نگہداشت کرتے ہیں۔ اس حد تک غافل پائے جاتے ہیں۔ کہ بھوکا مار مار کے گائے کی نسل کو مسخ کر دیا ہے۔ اور جیسی خدمت گایوں کی یورپ کے بعض ملکوں میں کی جاتی ہے۔ کہ ان سے منوں دودھ لیا جاتا ہے۔ اسکی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ بلکہ جیسی گائیں بھی یہ لوگ دودھ کے لئے پالتے ہیں۔ خشک ہونے پر انہیں بوچڑوں کے

خوں میں پڑنے دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ لارڈ ارون بہادر وائسرائے
د کے ایما سے گورنمنٹ ہند نے ایک سہ ماہی رسالہ مویشی کی پرورش
یرہ مضامین کا جاری کیا ہے۔ جس کے پہلے ہی نمبر میں بتلایا گیا ہے کہ ہندوستان
ں مویشی خصوصاً گائیں بے توجہی کی وجہ سے کسقدر ذلیل و خوار ہیں اسی
سالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ فروری ۲۷ء کو وائسرائے ہند نے
نسٹن سنمائی دہلی میں مسٹر سمتھ کے لکچر کی صدارت کے دوران میں فرمایا
ہندوستان میں غیر ضروری مویشی پر اہل ملک میں ساٹھ کروڑ روپیہ
سالانہ ضائع کیا جاتا ہے۔ جو اسقدر رقم ہے کہ جو یہ ملک اپنی تمام فوج پر ہر
سال خرچ کرتا ہے۔ غیر ضروری مویشی کا یہ مطلب ہے کہ چند چیدہ اور اچھے مویشی
ی اچھی پرورش نہیں کی جاتی اور بہت سے ادنے مویشی پر جسقدر رقم خرچ
ی جاتی ہے وہ گویا روپیہ کا ضائع کرنا ہے اور اہل ہنود کا فرض ہے کہ وہ گاؤں
ی پرورش اور نگہداشت ایسے عمدہ پیرایہ میں کریں۔ جیسی کہ گورنمنٹ اپنے
بعض مویشی کی پرورش کے تجربہ گاہوں میں خرچ کر رہی ہے۔ راقم حروف نے
جو ہندوستان کی دو دیسی ریاستوں میں کہ جن کے راجے مہاراجے ہندو ہیں
اور وہاں گاؤکشی کی سزا عمر قید ہے بچشم خود دیکھا ہے کہ گائیں عموماً ایسی بھوکی ماری
جاتی ہیں۔ وہ بازاروں میں غلاظت کھاتی پھرتی ہیں۔ یا گھروں میں گھس کر واقعی
لوگوں کے پاخانے صاف کردیتی ہیں۔ مس میو کی یہ اغراض بعد اتنی بری نہیں مگر اسنے
اسے کسیقدر چبھتے ہوئے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح اُس نے ہندوؤں پر
الزام لگایا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی عورتوں کی وہ عزت نہیں کرتے کہ جسکی وہ مستحق
ہیں۔ بلکہ ان سے بدسلوکی اور ریاکاری برتاؤ کرتے ہیں۔ مس میو کی جو ستم
ظریفی رنجیدہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ جا بجا مزے کی چٹکیاں بھی لیتی جاتی ہے۔

مثلاً انسداد ظلم حیوانات کا جو قانون گورنمنٹ ہند نے سنہ ۱۸۹۰ء میں پاس کیا تھا
اسے اعتراض ہے کہ لوگ کئی طرح سے اسکی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہندو
گوالے گایوں سے زیادہ دودھ لینے کے لئے انہیں پیشاب کی جگہ میں پھو کا
(پھونک) دے کر اذیت پہنچاتے ہیں۔ یا گاڑیبان بیلوں کی دمیں بے رحمی
سے توڑ کر یا انہیں سوئے چبھو کر تیز چلاتے ہیں۔ یا زندہ بکری کی کھال اتارتے
ہیں۔ حالانکہ گورنمنٹ بذریعہ قانون انسداد ظلم حیوانات کرنا چاہتی ہے۔ مگر
مس میو طنزاً کہتی ہے کہ گورنمنٹ کیا کر سکتی ہے۔ یہ زراعت یا تجارت کا
مضمون منتقلہ صیغوں میں شامل ہونے کی وجہ سے ہندوستانی وزیروں کے
ہاتھ میں ہوتا ہے؛

جن لوگوں کو مس میو کی اس کتاب میں گورنمنٹ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ انہیں
یہ بھی سوجھا ہے کہ مسلمانوں کو اس لئے مس میو نے نظر انداز نہیں کیا کہ ان میں
کم عمری کی شادی کا رواج نہیں یا سوائے رسم پردہ کے ان کی کوئی اور کمزوری
اسے نظر نہیں آئی۔ بلکہ گورنمنٹ دونوں قوموں کو علیحدہ علیحدہ کرنے اور آپ پر
قابو پانے کے اصول کی گرویدہ ہے۔ اس لئے انہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر میرے
خیال میں مس میو کو مسلمانوں میں وہ سوشل کمزوریاں کہ جن کا اس نے اپنی
کتاب میں ذکر کیا ہے۔ ایسی نظر ہی نہیں آئی ہیں جیسی کہ ہندوؤں میں آئی ہیں
اور جن سے کہ سنسنی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی مسلمان طلبا یا پروفیسر ہندوؤں
کی طرح امریکہ کو جاتے ہیں۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا؛

بہر حال دو صورتوں سے خالی نہیں ہے۔ یا تو یہ کتاب ہی ایسی خراب ہے
کہ جیسا اسے اکثر انگریزی و اردو ہندو اخبارات اور لیڈروں نے قرار دیا ہے
اور یا ایسی خراب نہیں ہے جیسا کہ بہت سے دوسرے لوگوں اور انگریزی اخبارات نے سمجھے

رائے دی ہے۔ بلکہ مہاتما گاندھی جیسی نہایت ممتاز اور بے تعصب شخصیت نے بھی اسے تمام ملزم نہیں ٹھہرایا۔ آپ نے جو رائے اس کتاب کی نسبت دی ہے اس کا خلاصہ اُن کے اس فقرہ میں موجود ہے: کہ جس میں چند لفظوں میں بہت سا مطلب ادا کر دیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ مصنفہ نے ایک ڈرینیج انسپکٹر کی طرح شہر کی گندی نالیوں کی رپورٹ لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ حالانکہ شہر میں اور بہت سی خوبصورت عمارتیں اور بازار اور چوک بھی موجود ہیں۔ اور مہاتما جی نے یہ نہایت موزوں ریویو اس کتاب کا کیا ہے جسمیں چند لفظوں میں کتاب کے اکثر حصہ کا مطلب ظاہر کر دیا ہے۔ مثلاً ناظرین کتاب کے اندر دیکھیں گے کہ جب مس مئیو بنارس میں جاتی ہے۔ تو سب سے پہلے میونسپلٹی کے ڈاکٹر کے ہمراہ شہر کی گندی نالیوں اور گھاٹوں اور مرگھٹوں کے دیکھنے میں ہی منہمک ہو جاتی ہے:

لیکن کون سا شہر ہے جس میں گندی نالیاں یا پاخانے نہیں ہوتے۔ خود انسان کے ساتھ ہی اس کا گند ہر لگا رہتا ہے۔ اس میں کئی ایسے الزام لگائے گئے ہیں۔ جو ہر ملک یا قوم پر عائد کئے جا سکتے ہیں۔ مس صاحبہ کو صرف گندی نالیوں پر ہی رپورٹ نہیں لکھنی چاہئے تھی۔ بلکہ ہندو قوم کے بہت سی خوبیوں مثلاً رحمدلی۔ اہنسا۔ فیاضی۔ سادھارن دھرم وغیرہ کا بھی ذکر کرنا چاہئے تھا۔ کہ بھونرا یا شہد کی مکھی صرف اچھے اور خوشبودار پھولوں پر ہی بیٹھتے ہیں۔ اور ان سے رس جمع کر کے شہد بناتی ہیں۔ اگر وہ چاہتی تو زہریلے اور بدبودار پودوں کا بھی رس جمع کر دیتی۔ مگر اُس کی کون قدر کرتا؟

بہرحال کئی عیسائی مشنریوں اور بعض چوٹی کے ہندو لیڈروں نے مس مئیو کی کتاب پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور اسکی کئی باتوں کو ناپسند کیا ہے۔ اور بہت سی

نامہ نگاروں نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے۔ کہ مس میو کی سخت نکتہ چینی کی
وجہ سے ہندوستان میں عورتوں کی اصلاح اور کم عمری کی شادی کی جانب
لوگ اور زیادہ متوجہ ہو گئے۔ آل انڈیا زنانہ کانفرنس میں کم عمری کی شادی
کے خلاف کھلم کھلا قرار دادیں پاس ہونے لگی ہیں۔ اور کونسلوں میں عمر
رضامندی یا شادی کی عمر بڑھا دینے پر زور دیا جا رہا ہے۔ صرف چند
سال پہلے جب عمر رضامندی بڑھا دینے کی تحریک ہوئی تھی تو ہندو شاستروں
کے سلوک اس بات کے خلاف پیش کئے جاتے تھے کہ بڑی عمر کی لڑکیوں کی
شادیاں کرنا دھرم ورودھ ہے۔ اور والدین کو بڑا پاپ ہوتا ہے۔ مگر اب
مسٹر شاردا جیسے ہندو پنڈت جو قدیم
کے فدائی ہیں۔ ایسے مسودہ قانون کے ذمہ دار ہیں کہ عمر رضامندی جبراً
بڑھا دی جائے۔

ڈاکٹر پرنجپے جو آجکل کونسل وزیر ہند کے ممبر ہیں۔ ایک مضمون
میں اس کتاب کے خلاف لکھا ہے۔

کہ اب بحیثیت نظریہ یہ بات دور ہو رہی ہے کہ سن بلوغ کو پہنچنے کے
بعد لڑکیاں کنواری نہ رہیں۔ اور دولہا دولہن کی عمروں میں تفاوت کا
معاملہ بھی تیزی کے ساتھ اصلاح پذیر ہو رہا ہے۔ کیونکہ ایک تو اب شادی
کی عمر بڑھتی جاتی ہے۔ اور دوسرے لوگ شادی بیوگان کی بھی کم مخالفت
کرنے لگے ہیں۔

تو ایسے تغیر پذیر زمانہ میں یہ کتاب بجائے نقصان کے فائدہ ہی کریگی
کیونکہ سب لوگ اس بدنامی کو دور کرنے پر آمادہ پائے جانے لگے ہیں
امریکہ میں جو ہندوستانی رہتے ہیں ان میں سے بعض کی یہ رائے ہے

لہ اہل آمریکہ کو ہندوستانیوں کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے یہ کتاب مس مئیو سے لکھوائی گئی ہے اور آمریکہ میں یہ کتاب بے انتہا فروخت ہوئی ہے۔ اور اسی سے بہت سے امریکن ہندوستانیوں کی طرف سے بدظن ہو گئے ہیں۔ اور یہ بات بالکل ممکن اور قرین قیاس ہے کہ گوش زدہ اثر سے دارد۔ مگر ان سطور کے لکھنے کے وقت ۷- اپریل ۱۹۲۸ء کا لنڈن کا اخبار ڈیلی میل راقم سطور کے سامنے ہے۔ جس میں اس اخبار کے برلن کے نامہ نگار نے مس مئیو سے انٹرویو کر کے سوال کیا ہے کہ تم نے کیوں ایسی جھگڑے والی کتاب لکھی۔ مس مئیو نے اس کے جواب میں بتلایا ہے کہ

"جب میں ہندوستان گئی۔ تو میرا ایسی باتوں سے مقابلہ ہوا۔ جو نہایت ہی دہشتناک تھیں۔ یعنی حیوانات کی مصائب اور کم عمر بیواؤں کی مصیبت اور ذلت میں دیکھ نہ سکتی تھی۔ مینے اپنے دل سے پوچھا کہ کیا یہ میرا فرض نہیں ہے کہ میں صاف صاف کہدوں۔ مینے سوچا کہ اگر مجھے بولنا پڑا تو میں صاف صاف بولوں گی۔ اور مجھے ایسی باتوں کا ذکر کرنا پڑے گا کہ جن سے لوگ قدرتاً گریز کرتے ہیں۔ لیکن مینے دیکھا کہ یہ ہندوستان کا اور نیز اضلاع متحدہ آمریکہ کا فرض میرے ذمہ ہے"۔

نامہ نگار نے پوچھا کہ امریکہ کا فرض کس طرح؟ جس کے جواب میں مس مئیو نے بتلایا۔

"نوجوان ہندوستانی اضلاع متحدہ آمریکہ کو جاتے ہیں اور اس بات کو فائدہ مند کاروبار پاتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے پُراسرار روح پر خواب آلود کچھ دیں۔ اور یہ لوگوں کے حساس دلوں کو صدمہ پہنچاتیں۔ جو قدرتاً انگریزوں سے دلی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ضروری تھا

کریں اپنے ان ہموطنوں کے ہاتھ میں جو ایسے ہندوستانیوں کی باتوں سے متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک ناپنے والی لاٹھی دیدوں۔ کہ جس کے ذریعہ سے ایسے بیانات کی قدر و قیمت اُن کی سمجھ میں آجائے۔ اہل امریکہ آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور انہوں نے ہندوستانیوں کو بولتے ہوئے سُنکر مجھے کہا ہے کہ میں تو محکوم کا طرفدار ہوں"۔

مس مئو کے اس تازہ ترین بیان سے اس کی ایسی شرارت آمیز کتاب لکھنے کی وجہ معلوم ہو گئی ہے۔ ہندوستانی جو انگریزوں کے سلوک یا ہندوستان کی آزادی کے متعلق امریکہ میں لکچر دیا کرتے ہیں ان کا اثر دور کرنے کے لئے مس مئو نے یہ کتاب لکھی ہے۔ کہ جس کا اُسنے آخر کار خود اقرار کر لیا ہے۔ تو پھر ہندوستانی عورتوں اور گایوں کی دردناک حالت تو بہانہ ہی معلوم ہوتی ہے۔

اب صرف ایک اور شہادت درج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مس مئو کو اہل امریکہ کی رائے بدلنے کی کیوں ایسی ضرورت لاحق ہوئی - اخبارات میں مسٹر وی آر رایناڈے سکریٹری یونائیٹڈ انڈیا لیگ (مقام ڈیٹرائٹ مچی گن) کی ایک چٹھی چھپ رہی ہے۔ جو اس نے مدراس کانگریس کے پریزیڈنٹ کے نام اس درخواست کے ساتھ بھیجی تھی۔ کہ "امریکہ میں مس مئو کی کتاب کو بے انتہا شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اور چونکہ اقوام یورپ اور خصوصاً انگلستان اضلاع متحدہ امریکہ کو دنیا کی رائے عامہ کا مرکز سمجھتے ہیں۔ کیونکہ امریکن دراصل اینگلوسیکسن قوم سے ہیں۔ اور اہل انگلستان امریکہ کی دوستی اور دوستانہ رویہ کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ برطانیہ کو امریکہ کی اخلاقی مدد ضرور حاصل ہونی

چاہئے۔ اس غرض سے انگلستان نے انتظام کیا ہے کہ اس ملک میں ایسی رائے عامہ پیدا کی جائے۔ اس لئے یہاں کے تمام ضروری اخبارات رسائل اور تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں اور پبلک لٹریچر وغیرہ کو قابو میں رکھنے کا اپنی منشا کے مطابق انتظام کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں برطانیہ نے اپنے ممتاز مدبر اور سیاست دان امریکہ کو بھیجکر ہندوؤں کو اہل امریکہ کی آنکھوں میں اس لئے گھٹایا گیا ہے۔ کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کو حق بجانب ٹھیرایا جائے؛

بہرحال یہ ایک جانب کا بیان ہے۔ مگر دوسری جانب یعنی سرکار کا بیان ہمیں معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ حاصل نہیں ہے۔ البتہ بعض کونسلوں میں مس میو کی کتاب کو مسترد کرنے کی جب سرکار سے درخواست کی گئی تھی۔ تو سرکار نے اسے رد کے جانے کے لائق نہ سمجھا؛

اس کتاب میں سب سے بڑا الزام ہندو بیواؤں پر بدچلنی کا لگایا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مصنفہ نے عورت ہوکر تمام عورتوں کو ایک لاٹھی سے ہانک دیا۔ ہندو بیوائیں اگر بدچلن بھی ہیں تو کسی ملک میں عورتیں بدچلن نہیں ہوتیں۔ خصوصاً یورپ اور امریکہ میں تو بوجہ بے پردگی عورتیں کبھی ہندوستان کی عورتوں سے زیادہ نیک چلن اور عصمت مآب نہیں ہوسکتیں۔ ہندو عورتیں تو ابتک اپنے شوہروں کی چتا پر جل کر مرجانا کار ثواب سمجھتی ہیں۔ کیونکہ باوجود خلاف قانون ہونے ابتک ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشہ سے ستی کی خبر کبھی کبھی نکلتی رہتی ہے؛

بعض اخبارات اور کتابوں نے ممالک مغرب کی عورتوں کی بدچلنی کی خبریں مس میو کی کتاب کے جواب میں چھاپی ہیں۔ اور بعض نے امریکہ کی

عورتوں کی عیاشی اور بناؤ سنگار کا ثبوت دینے کے لئے بتایا ہے۔ کہ امریکہ میں عورتوں کے چہروں پر ملنے کے غازے اور پوڈر اس وقت (۲۵۵۰) سے بھی زیادہ شمار ہو چکے ہیں۔ حالانکہ یہ غیر ضروری باتیں ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ مشرق کی عورتیں بلحاظ حیا و شرم و پردہ داری کے مغرب کی عورتوں سے بہت بہت فایق ہیں۔ مگر نہ تمام مغرب کی عورتیں ہی اور نہ تمام خراب ہیں ایسی ہی مشرق کی عورتوں میں بھی کالی بھیڑیں موجود ہیں۔ مگر مس میونے نے بہت زیادتی کی ہے کہ ہندو عورتوں کو یورپ اور امریکہ کے مقابلہ میں بد چلن کیا ہے ٭

نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد　　خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

معلوم ہوتا ہے ایسے مبالغہ آمیز یا جھوٹی باتیں مس میو کو اپنے بیان کو رنگدینے اور اہل امریکہ کی نظر میں ہندوستانیوں کو گرانے کے لئے لکھی ہوئی ہیں۔ ایک اور واقعہ اس کتاب سے اس خیال کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتی ہے کہ ایک گوشالہ کی ایک گائے کی ایک ٹانگ اس لئے کاٹ ڈالی گئی کہ وہ دودھ دیتے وقت لات مارتی تھی۔ گو مس میو یقین دلاتی ہے اس نے بچشم خود دیکھی تھی۔ مگر اس کا کیا اعتبار ہے کہ ٹانگ کاٹنے کی یہی وجہ ہے۔ کیونکہ ٹانگ دودھ دینے کے وقت باندھی بھی جا سکتی تھی۔ اور لوگ باندھ لیتے ہیں ٭

اب میں صرف ایک اور بات کا جواب دے کر ختم کرتا ہوں۔ ہندو لڑکیوں کی کم عمری کی شادی کے جواب میں اردو ترجمہ کے حاشیہ میں بھی انگلستان کی ایک زنانہ سوسائٹی کے سکرٹیری کی شہادت انگلستان میں بھی بعض کم عمر کی لڑکیوں کی شادیاں ہو جانے کے متعلق درج کی گئی ہے

مگر یہاں ایک اور شہادت کا درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

لنڈن کے اخبار ڈیلی میل جس پرچہ سے مس میو کے انٹرویو کا اقتباس کیا گیا ہے۔ اسی (۷ر اپریل ۱۹۲۸ء) میں ایک خاص مضمون:

(ہماری افسوسناک بچوں کی شادیاں) کے عنوان سے چھاپا گیا ہے کہ جس کے بعض فقرے قابل توجہ ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بیشک ہم اپنی لڑکیوں کی اس عمر میں شادیاں نہیں کرتے۔ جبکہ وہ بالکل ہی بچیاں ہوں۔ لیکن سوشیالوجیسٹ (ماہران علم معاشرت) ہمیں بتلاتے ہیں کہ ایک بارہ سالہ مشرق کی پرورش یافتہ لڑکی کا جو ایک گرم ملک میں سکونت رکھتی ہو۔ اسقدر نشوونما ہو جاتا ہے جو ممالک مغرب کی سولہ یا سترہ سالہ لڑکی کے برابر ہوتا ہے۔ اور اٹھارہ یا انیس سال کی بہت سی انگریز لڑکیاں اپنے والدین کی رضامندی سے اپنی تمام زندگی کے لئے رائے عامہ سے تائید پاکر (شادی کا) فیصلہ کر لیتی ہیں"۔

اس مضمون کا راقم لکھتا ہے کہ قانوناً بھی یہ عمر شادی کے لئے درست نہیں۔ کیونکہ ہم ایسی لڑکی کو پچاس پونڈ تجارت میں اپنی رائے کے مطابق لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر اسے اپنے لئے شوہر پسند کر لینے دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جتنی لڑکیوں کو ہر سال طلاقیں ملتی ہیں۔ انپر ہم حیران ہو کر ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ وہ آگے لکھتا ہے:۔

کہ جن دنوں میں سولہ سال کی انگریز لڑکیاں شادیاں کر لیتی تھیں تو وہ ہمیشہ کے لئے بیاہی جاتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت طلاق اور علیحدگی کا کوئی قانون یا

دستور نہیں تھا۔

غرض اس اقتباس سے یہ دکھلانا مقصود ہے کہ انگریزوں کے یہاں جو سولہ سترہ سال کی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ وہ گرم ملکوں کے دس بارہ سال کی لڑکیوں کی شادیوں سے ذرہ بھی بہتر نہیں ہوتیں۔

اب میں صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں۔ کہ ایسی معرکتہ الآرا کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں ہونا اس لئے ضروری تھا۔ کہ لاکھوں کروڑوں ہندوستانی اس کتاب کے مضامین سے کماحقہ واقفیت حاصل نہیں ہوسکتی (جو اُن کا حق ہے) جب تک کہ یہ اردو میں ترجمہ نہ ہو۔

اس ترجمہ کے لکھے اور چھاپے جانے کے دوران میں اور اس سے پہلے معلوم ہوا ہے کہ اسی کتاب کے ترجمے بعض دیگر صاحبان نے بھی اردو اور ہندی میں اور بصورت کتاب یا قسط وار اخبار میں شائع کئے ہیں۔ تاہم ہم نے اس سے پہلے کسی ترجمہ کو دیکھا نہیں۔ انگریزی میں بھی اس کے ایک دو جواب چھپے ہیں۔ اور یہ ترجمہ بھی ایک طرح جواب ہی ہے۔ کیونکہ قابل اعتراض باتوں کا جستہ جستہ مسکت جواب ساتھ ساتھ دیدیا گیا ہے۔

امید ہے کہ ناظرین اسے دیکھ کر پسند کریں گے۔ اور ہماری اس خدمت کی داد دیں گے۔

(راقم۔ غ۔ م)

مس کیتھرین میو مصنف کتاب

تمام برٹش سلطنت میں کلکتہ بلحاظ آبادی دوسرے درجہ کا
عظیم الشان شہر ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے برابر برابر جس کو یہاں دریائے
ہوگلی کہتے ہیں۔ اور خلیج بنگالہ کی چوٹی پر واقع ہے۔ دور تک بستا ہوا

چلا گیا ہے۔ کلکتہ بہت بڑا اور مغربی ممالک کے مانند زمانۂ حال کا بہترین شہر ہے جس میں سرکاری عمارات۔ یادگاریں۔ تعمیرات۔ پارک۔ باغات۔ ہسپتال عجائب خانے۔ یونیورسٹی۔ عدالت ہائے انصاف۔ ہوٹل۔ دفاتر۔ دکانات اور تجارتی کوٹھیات کی اس قدر فراوانی ہے۔ کہ جن کی موجودگی میں اس کو امریکہ کے پر رونق اور فراغبال شہر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ ان کے ساتھ ہی کلکتہ میں منادر۔ مساجد۔ بازاروں اور مکانات کے احاطوں اور ٹیڑھے اور پیچیدہ اور تیرہ و تاریک گلی کوچوں کی بڑی کثرت ہے۔ باوجودیکہ نقشہ پر اس شہر کو قایم الزاویہ دکھلایا گیا ہے۔ احاطوں۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں کتب فروشوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کی افراط ہے۔ جہاں تنگ سینہ والے موٹی نظر والے کمزور نوجوان ہندوستانی طلبا اپنے دیسی لباس میں روسی (بولشویکوں) رسالوں کے مطالعہ میں مشغول نظر آتے ہیں۔

متمول کلکتہ۔ جو دنیا اور ہندوستان کی تجارت کے لئے کھلا ہوا عریض دروازہ ہے جس میں سیم و زر۔ سن۔ جوٹ اور روئی کی تجارت کروڑوں روپے کی ہوتی ہے۔ اس تمام تجارت درآمد اور برآمد کا لین دین کر رہا ہے۔ جو تمام ممالک دنیا و ہندوستان ایک دوسرے کے ہاتھ میں دینا اور لینا چاہتے ہیں۔ مہذب۔ تعلیم یافتہ۔ جاہل اور پر از عیوب کلکتہ جہاں تمام مذاہب۔ تمام رنگتوں اور طرح طرح کے لباس اور پوشاک پہننے والے لوگوں کے مہذب اور پر از عیوب لوگ گورنمنٹ ہاؤس کی گارڈن پارٹیوں میں اس لئے شریک ہوتے ہیں۔ کہ خوشی کے ساتھ ہز اکسیلنسی گورنر بنگال اور گورنر کی لیڈی صاحبہ کو جھک کر

آداب و تسلیمات بجا لائیں۔ اور وہاں چاء۔ اور کیک اور پھل اور فواکہات اور آئس کریم کھاتے اور برف کا ٹھنڈا پانی پیتے اور کسی رجمنٹ کے فوجی بینڈ باجہ کے ترانے سننے کے دوران میں خوشی کے ساتھ اعلےٰ محاورہ انگریزی میں گفتگو کریں۔

گورنمنٹ ہوس کی دیواریں اونچی ہیں۔ اس لئے تم گورنمنٹ ہاؤس کے باغات میں سے کلکتہ کے بازار اور کوچہ و برزن کو نہیں دیکھ سکتے لیکن اگر تم وہاں سے کچھ دیکھ سکو۔ تو تم بازاروں کو آمد و رفت والے لوگوں سے بھرا ہوا پاؤ گے۔ جہاں موٹر کاروں کا آنا جانا بالخصوص ٹریم کار۔ ٹورنگ کار ٹیکسی اور پرائیویٹ موٹر کاروں کی بیحد کثرت ہے۔ ان میں تم کو آتی جاتی چند آمنی بس گاڑیاں بھی کچھ کچھ وقفہ کے بعد ملینگی جن پر بڑے بڑے جلی حروف میں کالی گھاٹ کا نام لکھا ہوگا۔
اگر تم اس آمنی بس پر نگاہ رکھو گے۔ تو یہ بس پارک کے برابر برابر امپائر تھئیٹر۔ اور بہت سے کلب گھروں سینٹ پالز کیتھڈرل لاٹ پادری صاحب کے مکان جنرل ہسپتال۔ لندن مشنری سوسائٹی ایسوسی ایشن کے سامنے سے گذر کر تھوڑی دیر میں ایک بہت گنجان آباد محلہ کے سامنے جاکر ٹھہر جاتی ہے یہی اس کی مشتہرہ منزل مقصود یعنی کالی گھاٹ ہے۔

کالی گھاٹ یعنی کالی دیوی کی جگہ۔ اسی جگہ سے کلکتہ کا لفظ مشتق ہے۔ کالی ہندوؤں کی ایک دیوی کا نام ہے۔ جو ان کے ایک بڑے دیوتا شیوجی کی اہلیہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تباہی اور بربادی کی دیوی ہے۔ جس کی پیاس خون سے بجھتی ہے۔ اور جب

کے قدموں پر سینکڑوں جانور ہر روز قربانی کے نام سے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ پانچہزار برس سے دنیا ئے ہندوستان پر کالی کا مذہبی غلبہ ہے۔ اور اس کا یہ غلبہ چار لاکھ ۲۳ ہزار برس تک ابھی اور قائم رہیگا۔

ہندوستان میں کالی کے چھوٹے اور بڑے ہزارہا مندر موجود ہیں۔ کلکتہ کا کالی دیوی کا مندر ایک برہمن خاندان کی پرائیویٹ جائداد ہے۔ برہمنوں کا یہ خاندان تین سو سال سے اس مندر پر مالکانہ حیثیت سے قابض ہے۔ آجکل پورا ایک سو برہمن جو ایک ہی مورث کی نسل سے ہیں۔ اس پر قابض ہیں۔ ان سو برہمن میں سے ایک برہمن بڑی خوشی سے مجھکو میری ایک برہمنی دوست کے ساتھ اس مندر میں لے گیا اسنے راہ نما بنکر مجھکو اس مندر کی عمارت کی خوب سیر کرائی۔ چونکہ اس مندر کے قابض خاندان کا نام ہالدر ہے۔ اس لئے میں اپنے راہ نما کا نام ہالدر کے نام سے لکھوں گی۔

مسٹر ہالدر چھوٹا سا کوٹ۔ سفید دھوتی اور سفید چوغا۔ بنگالیوں کی معمولی پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ اگر وہ بنگالی لباس میں نہ ہوتا۔ تو میں اس کو شمالی اٹلی کا خوش لباس جنٹل مین سمجھتی۔ وہ انگریزی نہایت فراحت سے بولتا تھا۔ اور اس کے طرز و اطوار بالکل موزون تھے۔

اس نے کہا کہ اس مندر کے لئے پانسو نوے ایکڑ لاخراجی زمین وقف ہے۔ اس کے علاوہ دور نزدیک سے جاتری یہاں ہمیشہ بڑی کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ وہ زر نقد اور سیم و زر کا چڑھاوا یہاں آکر چڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جاتری لوگ برہمنوں کو دکھشنا بھی دیتے ہیں۔ اس کے ماسوا راستہ میں آتے جاتے جس قدر بے شمار دکانیں واقع ہیں۔ ان پر ہر قسم کی شیرینی کالی کے مقدس بُت۔ گیندہ اور ہزارہ کے پھول۔ تعویذ وغیرہ

اور جاتریوں کے لئے چڑھاوے کی تمام اشیا فروخت ہوتی ہیں اور ان کے کرایہ سے ہی بہت معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔

جاتریوں کے جم غفیر کی آمد و رفت میں سے راستہ جلد جلد بنا کر مسٹر ہالدر ہم کو اصل مندر میں لے گیا۔ مندر کا چبوترہ اونچا چھت دار ہے۔ یہ چھت بیسیوں ستونوں پر قائم ہے۔ اس چبوترہ کے عرض و طول میں تین طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جن پر چڑھکر چبوترہ پر جاتے ہیں۔
اس کے ایک کنارہ پر گہری نیم تیرہ جگہ میں کالی کی مورت بہت دھندلی نصف کے قریب دکھلائی دیتی ہے۔ اس دیوی کا چہرہ سیاہ ہے۔ منہ میں سے ہیتناک طور سے زبان باہر نکلی ہوئی ہے جس میں سے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس دیوی کے چار ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ میں انسان کے سر کو پکڑے ہوئے ہے کہ جس میں سے خون ٹپکتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں خنجر ہے۔ تیسرا ہاتھ پھیلا ہوا ہے جس میں سے خون ٹپکتا ہے۔ چوتھا ہاتھ خالی ہے۔ مگر اس کو اس طرح اوپر اٹھا رکھا ہے کہ جیسے کسی کو دھمکایا جا رہا ہے۔ سایہ میں دیوی کے پاؤں کے قریب پوجاری کھڑے رہتے ہیں۔ جو جاتریوں سے اس کی پوجا کرواتے ہیں۔

کالی کے سامنے اس لمبے چبوترے پر مرد اور عورت زمین پر سجدہ کر کے ڈنڈوت کرتے ہیں۔ اور اس سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ ان کے درمیان بیکار اور وقت ضائع کرنے والے لڑکے چلتے پھرتے رہتے ہیں جو لکڑی پر چڑھی ہوئی ایک قسم کی شیرینی کو جو منہ میں گھل جاتی ہے کھاتے رہتے ہیں چبوترہ پر گائے کا ایک سفید بچھڑا بھی ادھر ادھر پھر رہا ہے۔ ان کے درمیان میں ایک معمر سفید ریش پجاری بیچ چبوترہ پر

پالتی مارے ہوئے ایک بڑی کتاب کو سامنے لئے بیٹھا ہے۔ اور ایک بھن بھناتی ہوئی آواز میں کچھ پڑھتا سناتا جاتا ہے۔

مسٹر ڈالدر نے کہا کہ یہ پجاری ہندوؤں کی دیومالا پوتھی میں سے جاتریوں کو کالی کا حال پڑھکر سنا رہا ہے۔

یکایک ہم نے دل سے پار ہوجانے والی آواز بھیڑ کے چلانے کی سنی۔ ہم مڑکر کالی کے بت کے محاذ والے کنارہ پر کھلے میدان میں آگئے یہاں دو پجاری کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ دوسرا ایک حلوان کو تھامے ہوئے تھا۔ بکری کا بچہ چلا رہا تھا۔ اس لئے کہ ہوا میں وہ بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کہ جس سے تمام جانور خوف کھاتے ہیں۔ بکری کے بچے کی دلخراش آواز دوبارہ پھر آئی۔ اس کے ساتھ ہی کالی دیوی کے نقارے بجنے لگے۔ جس نے حلوان کو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اس کو اوپر اٹھایا اور پھر زمین پر لٹاکر اس کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ چلاتے ہوئے حلوان کا سر ایک ستون کے شگاف کے اندر کرکے اس کو بہت کس کر پکڑ لیا۔ دوسرے پجاری نے تلوار کی ایک ہی ضرب سے اس چھوٹے سے جانور کا سر اس کے دھڑ سے الگ کر دیا۔ حلوان کا خون بڑی تیزی سے چبوترے پر گرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کالی کے سامنے نقارے اور تال مجیرے زور زور سے بجنے لگے۔ تمام جاتریوں اور پجاریوں نے کالی! کالی! کالی! کا شور مچا دیا۔ اور بعض جاتری تو مندر کی خوشنما زمین پر ڈنڈوت کرنے کے لئے اوندھے منہ کے بل گر پڑے۔

بکری کے مار ڈالنے والے دونوں پجاریوں کے پیچھے اس اثنا میں ایک عورت منتظر کھڑی رہی۔ اور بکری کے بچہ کا سر کٹنے کے بعد

فوراً دوڑ کر آگے آئی۔ اور جانور کی طرح اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑی ہو
اس امید میں کہ اس خون کی برکت سے اس کے کوئی بچہ پیدا ہو جائے۔ اپنی
زبان سے زمین پر سے بکری کے بچہ کا خون چپڑ چپڑ پینے لگی پھر ایک اور دو
عورت نے جھک کر اس خون میں ایک کپڑے کو تربتر کر کے اور اس کو اپنے
سینہ سے لگا کر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی چھ یا سات زخمی اور خارشی
کتوں نے جن کی شکل بے نام بیماریوں کے سبب سے ہولناک طور سے بدشکل
ہو چکی تھی۔ اپنی گرسنہ تھوتھنی کو خون کے پھیلے ہوئے گنڈ میں چپکا دیا۔

مسٹر ہالدر نے بڑے فخر سے کہا کہ اسی طرح سے یہاں ہر روز ڈیڑھ
سو سے لیکر دو سو تک بکری کے بچوں کو ہم بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ یہ تمام
حلوان جاتری لوگ اپنے خرچ سے لاتے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر ہالدر ہمیں بعض دیگر چھوٹے چھوٹے دیوتا اور دیویوں
کے مندر میں لے گئے جہاں ہم نے ایک چھوٹی سی سرخ دیوی چیچک کی دیکھی
اس کے برابر پہلو میں اس سے چھوٹی ایک اور سرخ دیوی تھی۔ جو اپنی بڑی
بہن کے ساتھ توام پیدا ہوئی تھی۔ یہ چھوٹی دیوی اپنی مرضی اور خوشی
کے مطابق خسرا یا موتی جھرا وغیرہ بیماریوں کو پیدا یا ناپید کر دیتی ہے
پھر ہم نے پانچ سر والے سیاہ ناگ کا مندر دیکھا۔ اس ناگ (سانپ)
کی ٹھوڑی کے نیچے ایک پجاری کی چھوٹی سی تصویر بنی ہوئی ہے۔ جو لوگ
ناگ کے ڈسنے سے مخوف رہتے ہیں۔ وہ یہاں آکر اس سانپ کے منہ
میں چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ پھر ہم سرخ ہندو دیوتا کے مندر میں گئے پہلوان
لوگ کشتی لڑنے سے پہلے اس مندر میں آکر ڈنڈوت کرتے اور چڑھاوا
چڑھاتے ہیں۔ بعد ازاں اس مندر کو جا کر دیکھا۔ کہ جس کے دیوتا کی پرستش

دولتمند تاجر اور یونیورسٹی کے طلبا ، بالترتیب لعلےٰ پیمانہ پر کسی نئے کار وبار کے کرنے یا طالب علم امتحان دینے سے پہلے یہاں آکر کرتے ہیں۔ بعدازاں ہم کو برہما کا مندر دکھلایا گیا جس کو تمام دنیا کا عام دیوتا کہتے ہیں۔ یہاں ہم کو صرف ایک پردہ دکھلائی دیا جس پر برہما کی تصویر جو بالکل امریکہ کے جزیرہ نما ئے الاسکا سے توتم کی طرح منقش تھی ۔ اور پھر شوجی کا جو کالی دیوی کا خاوند ہے لنگ دیکھا۔ جو ہر جگہ موجود ہوتا ہے ان تمام دیوتا اور دیویوں کے آگے گیندے اور ہزارہ کے پھول اور ٹوکریوں میں جن کو کوڑیوں سے آراستہ کر رکھا تھا کسی چیز کی سرخ ٹکیاں تھیں۔ جو چڑھاوے کے طور پر چڑھی ہوئی تھیں ۔ یہ سب چیزیں اور مندر کے بیلوں کے گوبر کے بنے ہوئے پوتر اُپلے ، مندر کی دکانوں میں با ادا رعیت جاتری لوگ مول لے لیتے ہیں ۔

پھر ہم کو مسٹر بالدر ایک گلی میں لے گیا۔ جہاں قطار در قطار بڑی ترتیب سے بیسوں کم وبیش ننگے سادھو اور فقیر بیٹھے ہوئے تھے ۔ یہ سب کے سب موٹے تازہ ۔ فربہ اندام اور مالدار تھے ۔ سروں پر لمبی لمبی جٹیں تھیں ۔ اور تمام جسم پر بھبوت مل رکھی تھی ۔ اور جاتریوں سے بھیک مانگ رہے تھے ۔ یہ سب اس بات کے شائق تھے ۔ کہ ان کا فوٹو اتارا جائے ۔ سادھو یعنی مقدس ریاضت کرنے والے فقیر جھٹ فوٹو کے لئے تیار ہو جاتے تھے ۔ ان میں سے ایک سادھو جو بظاہر دیوانہ تھا ہمارے اوپر آگرا اس سے ایک چھوٹی لڑکی کو سخت ڈر آیا جس کو ایک نوجوان آدمی اپنے ہمراہ لے جا رہا تھا ۔ اوجس نے اپنے رومال کے دونوں کناروں سے اپنی کلائی کو اس بچی کی کلائی سے باندھ رکھا تھا ۔ مسٹر

ہالدر نے کہا۔ کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ ان کی ابھی شادی ہوئی ہے۔
یہ دونوں یہاں بیٹا پیدا ہونے کی دعا مانگنے آئے ہیں۔

بعد ازاں ہم اس مندر کے مرگھٹ میں گئے۔ وہاں اس وقت ایک نعش آگ میں جلائی جا رہی تھی۔ کھلے میدان میں ایک مستطیل گڑھا زمین میں کھدا ہوا تھا۔ اس آدھے گڑھے میں اس وقت خشک لکڑیاں بھر رکھی تھیں۔ اس کے پاس ہی زمین پر ایک نوجوان خوبصورت ہندوستانی عورت اس طرح ارتھی پر پڑی ہوئی تھی۔ کہ جیسے کوئی غش میں بیہوش ہوتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے چند پھول اس کی ارتھی پر پڑے تھے۔ جو اس بات کی علامت تھے۔ کہ یہ عورت بڑی خوش قسمت نکلی۔ کہ بیوہ بننے کی مصیبت سے بچ گئی۔ اور اس کے مرنے کے بعد تک اس کا خاوند زندہ ہے۔ دو یا تین آدمی اور ایک دس برس کا لڑکا اس کے رشتہ دار وہاں کھڑے تھے۔ مگر اس کو کچھ دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ فاصلہ پر ایک بڑھیا عورت بیٹھی ہوئی ماتم کر رہی تھی۔ پاس ہی پانچ یا چھ فقیر آپس میں ڈانس کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔

اب ان لوگوں نے اس نوجوان عورت کی نعش کو اٹھایا۔ اور گڑھے میں لکڑیوں کی چتا پر رکھدیا۔ یکایک عورت کا سر ایک طرف مڑا۔ اور بازو نیچے گر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا اس نے سوتے سوتے کروٹ بدلی ہے۔ اس عورت کو مرے ہوئے صرف چند گھنٹے گذرے تھے۔ لوگوں نے لکڑیوں کا انبار اس عورت کی نعش پر چن دیا۔ اور اس پر برابر لکڑیاں پھینکتے رہے۔ یہانتک کہ چتا بہت اونچی ہو گئی۔ پھر اس عورت کا چھوٹا

لڑکا ہاتھ میں روشن مشعل لئے ہوئے چتا کے گرد سات بار پھرا۔ سات پھیرے کر کے اس لڑکے نے وہ مشعل چتا کی لکڑیوں پر پھینک دی جس سے فوراً شعلے نکلے۔ اور دھواں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ اور یہ رسم ختم ہو گئی

مسٹر ہالدر نے ہم کو بتلایا کہ اچھی آگ میں ہر ایک چیز جل جاتی ہے مگر ناف نہیں جلتی۔ اس ناف یا آنول نال کو مندر کے خادم چتا کی راکھ میں سے ڈھونڈھ کر نکال لیتے ہیں۔ متوفی کے خاندان کے لوگ ان لوگوں کو ایک اشرفی دیتے ہیں۔ تو اس ناف کو خادمان مندر مٹی کے گولے میں لپیٹ کر دریائے گنگا میں پھینک دیتے ہیں۔ اب ہم گنگا کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

پھر مسٹر ہالدر ہمیں لوگوں کے ہجوم کے اندر سے راستہ بنا کر مندر کے ایک طرف ایک جگہ لے گیا۔ جہاں ایک گدلا اور پایاب نالا جاری تھا جس میں لوگ نہا رہے تھے۔ مسٹر ہالدر نے کہا کہ یہ گنگا کے بہنے کی سب سے قدیمی بقیہ ندی ہے۔ اس لئے اس میں نہانے والوں کو بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔ جیسے کہ اب آپ لوگوں کو یہاں نہاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح سے ہر سال لاکھوں بیمار ہندو یہاں آکر نہاتے ہیں۔ اور بھلے چنگے ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ نیز جو لوگ یہاں طرح طرح کی مرادیں کالی دیوی سے مانگنے آتے ہیں۔ وہ دعا مانگنے سے پہلے یہاں اشنان کرتے ہیں۔ تاکہ گناہوں سے پاک صاف ہو جائیں

اشنان کرنے والے جب نہا چکے۔ تو پھر انہوں نے اس نالہ کا پانی پیا۔ جو ان کے گھٹنے تک بہ رہا تھا۔ پھر ان میں سے بہتوں نے چند منٹ تک اس نالا کی تہ کو خوب ٹٹولا۔ اور مٹھیاں بھر بھر کر کیچڑ اوپر اٹھا کر

اپنی ہتھیلیوں میں جمع کیا۔ اور بہت احتیاط سے اس کو دیکھا بھالا۔ مسٹر ہالڈر نے کہا۔ کہ گھاٹ سے جو اشرفیاں دریا میں گر پڑتی ہیں۔ یہ لوگ ان کو تلاش کرتے ہیں۔ ان کو امید ہے۔ کہ شائد وہ پالیں۔

اس اثنا میں گھاٹ کی سیڑھیوں پر پجاری اترتے اور چڑھتے رہے ہر ایک پجاری تین یا چار بکری کے بچوں کو نیچے لیجا کر نہانے والے آدمیوں کے بیچ میں ندی میں نہلاتا تھا اور پھر ان کو کھینچکر سیڑھیوں پر چڑھکر ان کو مندر کے باہر میدان میں لیجاتا تھا۔ اسی طرح سے مرد اور عورتیں سیڑھیوں سے اُترکر مٹکوں میں ندی کا پانی بھرتیں اور سیڑھیوں پر چڑھکر اسی راستہ سے پھر غائب ہو جاتیں۔

مسٹر ہالڈر نے کہا کہ ہر ایک حلوان کو قربان کرنے سے پہلے اس پاک ندی میں نہلا کر پاک وصاف کر لیا جاتا ہے۔ پانی لے جانے والیاں پانی کو مندر میں چڑھاوے کے طور پر چڑھاتی ہیں۔ وہ پانی کو کالی کے پاؤں میں اور کالی کے سامنے جو پجاری کھڑے ہوتے ہیں ان کے پاؤں پر بھی ڈال دیتی ہیں۔

جونہی کہ مسٹر ہالڈر ہم سے رخصت ہو گئے۔ میں نے مندر کی باہر والی دیوار کے بالکل پیچھے ایک بدررَو کا سوراخ دیکھا۔ جو آدمی کے ہاتھ کے برابر تھا۔ یہ سوراخ دیوار میں زمین کے بالکل برابر بنا ہوا تھا۔ اس سوراخ کے پاس ایک چھوٹے سے چپٹے پتھر پر گیندے کے چند پھول اور گلاب کے پھولوں کی چند پنکھڑیاں اور کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے جونہی کہ میں نے اس سوراخ کو دیکھا۔ اس میں میلے پانی کا ایک فوارہ سا نکلا۔ ایک عورت دوڑکر سوراخ کے پاس گئی۔ اور اس کے نیچے ایک پیالہ

رکھ دیا۔ اور اس کو اٹھا کر غٹاغٹ پانی کی طرح پی گئی۔ اور کہا یہ ہماری گنگا کا پاتال ہے۔ چونکہ یہ پانی کالی اور اس کے پجاریوں کے پاؤں میں سے بہہ کر آیا ہے۔ اس لئے اور بھی زیادہ پاک ہو گیا ہے۔ کالی کے مندر کی فرش پر سے یہ اس قدیم بدررو کے ذریعہ سے یہاں تک پہنچا ہے۔ یہ پانی تپ محرقہ اور ہیضہ کے بے نظیر اور حکمی علاج ہے جن بیماروں میں چلنے پھرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ پہلے دریا گنگا میں نہا کر پھر یہاں آکر اس پانی کو پیتے ہیں۔ جو لوگ اس قدر بیمار ہوتے ہیں کہ وہ یہاں آ نہیں سکتے۔ ان کے دوست یہاں سے یہ پانی ان کے لئے لے جاتے ہیں۔

مندر سے روانہ ہو کر ہم باہر موٹر کار میں آ بیٹھے۔ جو ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ اور پھر وہاں سے روانہ ہو کر جنرل ہسپتال لاٹ پادری صاحب کے گھر۔ متفرق کلبوں۔ اور امپائر تھیٹروں کے سامنے سے گذر کر چند منٹ کے عرصہ میں کلکتہ کے عین وسط میں جا پہنچے۔

دوسرے روز ایک انگریز تھیوصوفسٹ نے بڑی افسردگی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ تم کالی گھاٹ ناحق گئیں۔؟ کالی گھاٹ ہندوستان نہیں ہے۔ کالی کے پرستش کرنے والے اور پوجنے والے تو صرف نہایت ہی ادنے درجہ کے آدمی اور نہایت جاہل اور نہایت ناخواندہ ہندوستانی لوگ ہیں۔

میں نے ایک بنگالی برہمن کے سامنے جو نہایت فاضل اور ممتاز شخص تھا۔ انگریز تھیوصوفسٹ کے مذکورہ بالا الفاظ دہرائے۔ اس نے میری گفتگو سنکر یوں رائے زنی کی۔

"آپ کا انگریز دوست غلط کہتا ہے۔ یہ بات تو سچ ہے۔ کہ

کہ وشنو کی پرستش کرنے والوں کی فیصدی کی نسبت کالی کی پرستش کرنے والوں میں نیچ ذات والوں کی فیصدی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے۔ کہ وشنو کی پرستش کرنے والے ضبطِ نفس جیسے شراب یا دیگر مسکرات سے بالکل محترز اور مجتنب رہنے کے پابند بتائے جاتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ لاکھوں برہمن کالی کی پوجا اور عبادت کرتے ہیں۔ کالی گھاٹ کے جاتریوں اور پوجاریوں میں تمام طبقوں اور تمام ذاتوں کے ہندو شامل ہیں جن میں شہر کلکتہ اور ہندوستان کے بعض نہایت اعلےٰ تعلیم یافتہ اور مقتدر اشخاص بھی پائے جاتے ہیں۔

سفرِ ہند کرنے کے وجوہات

جس قطعۂ ملک کو ہم ہندوستان کے نام سے جانتے ہیں اس
کا رقبہ امریکہ کی سلطنت یونائیٹڈ سٹیٹ امریکہ سے قریبًا نصف ہے۔
البتہ ہندوستان کی آبادی امریکن سلطنت کی آبادی کی نسبت تگنی
زیادہ ہے۔ ہندوستان کی تجارت درآمد و برآمد کی مقدار ۲۵-۱۹۲۴ء
میں قریبًا پچاس کروڑ پونڈ یا ڈھائی بلین[1] ڈالر ہے۔ اور امریکہ کے
شہر نیویارک سے بمبئی صرف تین ہفتہ کی راہ ہے۔

انسانی تحریکات کی موجودہ حالتوں کے مطابق۔ خواہ ہماری
خواہش ہو یا نہ ہو۔ جو سڑکیں امریکہ کو دنیا کے ہر ایک حصہ سے
پیوستہ کر رہی ہیں۔ ان کی طنابیں مسلسل کم اور راستے لگاتار زیادہ
ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات ظاہر ہے۔ کہ ایسے عظیم الشان
ملک (ہندوستان) کے اہم معاملات کی نسبت جو آجکل امریکہ کا
بہت قریبی پڑوسی بن گیا ہے۔ کچھ واقفیت امریکن سررشتہ خبر رسانی
کا ایک جزو اور امریکہ کی حفاظت خود اختیاری کے لئے ضروری سمجھنا

---

[1] یہ شمار و اعداد کتاب ریویو آف ٹریڈ آف انڈیا بابت ۲۵-۱۹۲۴ء ڈیپارٹمنٹ آف کمرشل انٹیلی جنس اینڈ سٹیٹسٹکس کلکتہ ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۵۱ سے لئے گئے ہیں

چاہیئے ۔ حالانکہ ہندوستان کی بابت معمولی امریکن کو کس قدر واقفیت حاصل ہے ؟ امریکہ کا معمولی باشندہ ہندوستان کی بابت صرف اتنا جانتا ہے ۔ کہ مسٹر گاندھی ہندوستان میں رہتے ہیں ۔ اور شیر بھی وہاں ہوتے ہیں ۔ ان دو باتوں کے علاوہ امریکہ کا باشندہ ہندوستان کی بابت اور کچھ نہیں جانتا ۔ اگر کچھ اور زیادہ جانتا بھی ہو گا ۔ تو اس کا ماخذ یا تو کسی نہ کسی پیشہ ور پروپیگنڈا پھیلانے والے لوگوں کے دھندلے اور تاریک خیالات کا عکس ہو گا ۔ یا مذہبی یا خفیہ ذرائع یا قصے کہانیوں اور سفرناموں کی کتابوں یا ایسی ناولوں اور نظموں سے جن کا سین (منظر) ہندوستان میں رکھا ہو گا ۔ اس کی واقفیت کے دائرہ میں کچھ وسعت ہوئی ہو گی ۔

امریکن لوگوں کی اس درجہ ناواقفیت سے غیر مطمئن ہو کر میں ہندوستان آئی ۔ تا کہ معلوم کروں ۔ کہ ایک رضا کار عورت جس کو گورنمنٹ یا کسی کی طرف سے کچھ بھی مالی امداد سفر کے لئے نہ دی گئی ہو ۔ اور جس کے سفر کرنے کی کوئی خصوصی غرض بھی نہ ہو ۔ اور جس کا کسی سے تعلق و رشتہ نہ ہو ۔ روزانہ انسانی زندگی کی معمولی باتوں میں کیا کیا باتیں دیکھ سکتی ہے ۔

میں نے اس سفر ہندوستان میں مذہبی یا سیاسی یا فنون لطیفہ کے معاملات میں دخل دہی سے بالکل محترز رہنے کا عزم مصمم کر لیا ۔ اور یہ ارادہ کر لیا کہ ہندوستان میں صرف صحت عامہ اور اس کے متعلقہ امور کی تحقیقات پر میں خاص زور دوں گی ۔ مثلاً میں اس بات کے معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ اگر سر رشتہ صحت عامہ کے کسی افسر کو

رھند
بصنہ یا طاعون کی وبا کو روکنے کا چارج دیا جائے۔ تو اس کو کن
ن باتوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ یا اگر ہک ورم کے مرض کو دور کرنے
ی کوشش کی جائے۔ تو اس کوشش کی تائید یا مخالفت میں کون کون
ے عناصر کام کرتے ہیں۔ یا اگر گورنمنٹ اس بات کی کوشش کرے کہ
وں کی اموات کی تعداد کم ہو جائے۔ یا زندگی بسر کرنے کی حالت
تر بنا دی جائے یا فرض کرو کہ اس بات کی احتیاج پڑ جائے۔ کہ
شندوں کی تعلیمی سطح کو بلند کیا جائے۔ تو کون کون سی قوتیں ایسی
ں۔ جو گورنمنٹ کی کوشش کی تائید کریں گی۔ اور کون کون سی طاقتیں
ی ہیں۔ جو گورنمنٹ کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالیں گی۔

ان میں سے کوئی بات بھی مشرقی طلسم یا راز میں لپٹی ہوئی
یں ہے۔ یہ تمام باتیں کل اقوام عالم کے تمام خاندان سے اسی
ح علاقہ رکھتی ہیں۔ کہ جس طرح نیویارک کے ۲۳ بڑے بازار کے
ان سمتھ کا طریقۂ حفظان صحت اور صفائی۔ بازار مذکور کے دوسرے
نارہ پر پیٹر جونسن سے تعلق رکھتا ہے۔

چنانچہ اوائل ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں میں امریکہ سے لندن گئی
در وہاں وزیر ہند کے دفتر انڈیا آفس میں ایک بالکل اجنبی کے طور
ر جاکر میں نے اپنے تجویز اور ارادہ کو بیان کیا۔

چنانچہ ایک جنٹل مین نے جس سے میں ملی۔ مجھ سے کیفیت ورد
ریافت کی۔ میں نے اپنا عندیہ بیان کر دیا۔ اس کو سنکر اس نے کہا
جو آپ فرمائیں۔ ہم آپ کے لئے وہ انتظام کر دیں۔ میں نے جواب دیا
میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتی کہ جو میں کہتی ہوں آپ اس پر یقین کر لیں

ایک اجنبی مسافر جو ہندوستان میں بنظر تجسس ہر جگہ سیر و سیاحت کرے۔ جو قدیمی تعمیرات کا مطالعہ نہ کرتا ہو۔ اور جس کو فلسفیوں یا شعراء کی بھی تلاش نہ ہو اور جو ہاتھی۔ شیر اور گینڈے کے شکار کا متمنی بھی نہ ہو۔ اور جس کو کسی نے بھی کسی خاص کام کے لئے مامور نہ کیا ہو۔ اس کو ہر جگہ لوگ ایک نادر اور طرفہ شکل خیال کریں گے بالخصوص جبکہ اس اجنبی میں سوالات دریافت کرنے کا نہایت تیز میلان ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مان لیں۔ کہ میں نہ تو بیکار دخل در معقولات دینے والی ہوں۔ اور نہ سیاسی ایجنٹ ہوں بلکہ ایک محض معمولی امریکن شہری ہوں۔ اور ایسے واقعات تجربتہً تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ کہ جن کو میں اپنے وطن کے روبرو پیش کرسکوں

اس وقت یا اس کے بعد جس اہل ہند سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کو اپنے اسی عندیہ سے آگاہ کر دیا اور دونوں نے جو خطوطِ معرفت مجھے دیئے۔ ان کی مدد سے اس کے بعد تمام ہندوستان میں ہندوستانیوں۔ اور انگریزوں۔ حکام اور پرائیویٹ لوگوں نے بڑی خوش اخلاقی اور امداد کی نیت سے مجھ سے ملاقات کی۔ اور بہت تواضع اور اخلاق سے میرے ساتھ پیش آئے۔ اس طور سے ہندوستان میں جن جن امور کی تحقیقات میں نے کی۔ وہ آسانی سے درجہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اگر ہندوستانی لوگ اور انگریز مجھ کو مدد نہ دیتے۔ تو جتنے کم عرصہ میں میں نے کام کیا ہے۔ اس سے پانچ گنا زیادہ مدت میں بھی ایسی مکمل تحقیقات نہیں ہوسکتی تھی۔

مجھے برٹش لوگوں نے یہی ترغیب دی تھی کہ اس بات کی احتیاط کرنا
کہ جس بات کو تم معلوم کرو۔ اس کا سب پر یکساں اطلاق نہ کرنا۔ اس
عظیم ملک میں ہر جگہ تمام چیزوں کی یکساں حالت کہیں بھی نہیں ہے
مدراس اور پشاور بمبئی اور کلکتہ ان مقامات میں سے ہر ایک جگہ کی
چیز کو دوسری جگہ سے نسبت دیدی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل
غلط ہوتی ہے۔ مگر اجنبی مسافر کو یہ بات بہت کم معلوم ہوتی ہے۔

الغرض میں نے ہندوستان کے تمام طول و عرض میں سفر کیا۔
ہر جگہ میں نے تمام درجوں کے ہندوستانی اور برٹش ہیلتھ افسروں
سے گفتگو کی۔ اور ان کے ہمراہ ان کے حلقہ شہر یا دیہات میں جاکر
دیکھا۔ میں نے ان کا کام اور کام کرنے کا طریقہ بھی زیر نظر رکھا۔ میں
نے بہت سے مقامات میں طرح طرح کے ہسپتال جاکر دیکھے۔ ڈاکٹروں
سے گفتگو کی۔ میں نے مرضوں اور مریضوں کی حالت کا مطالعہ کیا۔ میں
نے شمال مغربی صوبہ سے مدراس تک کھلے ملک میں یلغار کیا۔ کبھی
میں ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے ہمراہ دورہ میں رہتی۔ جبکہ وہ اپنی گوناگوں
فرائض کے انجام دہی کے لئے اپنے ضلع کا دورہ کرتا۔ بعض اوقات
میں دیہات میں کسانوں کی پنچایت اور چوپال میں یا ہندوستانی
میونسپل بورڈ کے جلسہ میں جا بیٹھتی۔ کبھی عدالت سشن جج میں جاکر زندگی
کے روشن نظاروں کا معائنہ کرتی۔ میں انگلش نرسوں کے ساتھ بازاروں
اور غربا کے مکانات میں گئی۔ زنانہ مکانوں میں مستورات سے ملاقاتیں
کیں۔ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر شہر کو دیکھا۔ غرضکہ جہاں کہیں
ضرورت جانے کی سمجھتی۔ میں وہاں گئی۔ میں نے امراء کے محلات

بھی جا کر دیکھے۔ میں نے زچہ خانوں میں جا کر دائیوں کا کام۔ بچوں کا رکھ رکھاؤ۔ مریضوں کی خبرگیری اور تیمارداری۔ اشیاء خوردنی کی احتیاط اور حفاظت کرنے کا کام دیکھا۔ اور صفائی کی جو قیمت یہاں لگائی جاتی ہے۔ اس کو بھی غور سے دیکھا۔ میں نے متفرق ذاتوں اور طبقات کے لوگوں کی ذاتی عادتوں اور روزانہ زندگی کا سفر اور حضر میں مطالعہ کیا۔ میں نے زراعتی اسٹیشن۔ مویشیوں کے فارم ملاحظہ کئے۔ اور مویشی اور زراعت کے انتظام کو با معان نظر دیکھا کیا۔ میں نے لنگڑے۔ لولے۔ ناتواں اور ضعیف العمر مویشیوں کے گئوشالے جا کر دیکھے جن کو ہندوستان کے رحمدل اور فیاض لوگوں نے قائم کر رکھا ہے۔ میں نے سکولوں کو جا کر دیکھا۔ اور ٹیچروں۔ اور طالبعلموں سے اُن کے مدّنظر مدّعا اور تجربہ کی نسبت بحث و مباحثہ کیا۔ میں نے امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی۔ کونسل آف سٹیٹ اور تمام صوبجات کی لیجسلیٹو کونسلوں کے اجلاس کو جا کر دیکھا اور ممبروں کی تقریروں کو سُنا کہ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے موکلوں کے خیالات کونسل میں ظاہر کرتے تھے۔ میں نے ممتاز ہندوستانیوں۔ دیسی فرمانرواؤں۔ سیاست دانوں۔ منتظموں۔ مذہبی پیشواؤں کی تلاش کی۔ اور ان سے سوالات کرنے کے لئے پرائیویٹ موقعے نکالے۔ انہوں نے ہندوستانی لوگوں کی ذہنیت اور جسمانی درجہ اور عام حالات کی نسبت ایسی صاف دلی کے ساتھ گفتگو کی کہ مجھے میرے ذاتی مشاہدہ کے بعد ان کے قول کی تائید ہوتی نظر آئی۔ اور میں نے اس بارہ میں ان کی رائے کو معتبر پایا۔

ہندوستانیوں کی اسی صاف بیانی اور دل کی صفائی نے مجھ کو اس خیال پر قائم کردیا۔ کہ آخرکار چند امور ایسے ہیں۔ کہ جن پر جنوب شمال۔ مشرق۔ مغرب ہیں ہندوستان کی بابت عمومیت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ تم صرف انہی معاملات پر عمومیت کا اطلاق کرسکتے ہو۔ کہ جن سے ہم جیسے مصروف کاروباری مغربی لوگوں کو خاصکر تعلق ہے۔

نیو یارک کے ۳۰ بڑے بازار کا جان سمتھ ممکن ہے۔ کہ کہ پیٹر جان کے خاندان اور نسب کی نسبت کچھ بھی پرواہ نہ کرے۔ یا اس کے مذہب۔ اس کے فلسفہ یا فنون کے متعلق اس کے خیالات کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ تو کچھ ہرج نہیں ہے لیکن اگر پیٹر زندگی بسر کرنے کی ایسی عادتیں کر لے اور خیالات دوڑانے کا طریقہ ایسا اختیار کرلے کہ جو نہ صرف اس کے اور اس کے خاندان کے لئے ہی صریح جسمانی دھمکی ہو۔ بلکہ تمام محلّہ کے لئے بھی خطرہ کا باعث بن جائے۔ تو جان سمتھ موثر طریقہ سے اس پر معترض ہوگا۔ اور اس کی تفصیل پر اصرار کریگا۔

زمانہ حال کے ہندوستانی اہل نظر یہ سوال دریافت کرتے ہیں۔ کہ یہ کیا بات ہے۔ کہ ہندوستان میں برٹش حکومت کو قائم ہوئے ایک مدت دراز گذر گئی۔ مگر ہم اہل ہندوستان ابھی تک تمام دنیا کے لوگوں میں اپنی جہالت اپنے افلاس اور موت کی عظیم الشان شرح کے لئے مشہور اور ممتاز ہیں؟ کس حق سے ہم کو روشنی (علم) اور روٹی اور

زندگی نہیں دی جاتی؟

سرچمن لال سیتلواد[1] کو اس بات کا سخت افسوس ہے۔ کہ ہندوستان جن وجوہات سے پست حالت میں مبتلا ہے۔ وہ اہل ہندوستان میں ابتدائے اختراع کی عدم موجودگی۔ حوصلہ اور ہمت کی کمی۔ اور مشقت طلب اور مسلسل کام کرنے کا فقدان ہے۔

مسٹر گاندھی[2] کہتے ہیں۔ کہ ہم اپنی بے بسی۔ اور کام کے از خود شروع و اختراع کرنے کے فقدان اور ایجاد و اختراع کی کمی کا الزام بیجا طور سے انگریز حکام پر لگاتے ہیں۔

دوسرے پبلک آدمیوں کا یہ مطالبہ ہے۔ کہ ہمارے جوش اور سرگرمیاں اس قدر بے اثر کیوں ہیں؟ ہمارے باہمی معاہدے اور اقرارات۔ عام اخوت و آزادی کے پیمان سوڈا واٹر کے جوش کی طرح اس قدر جلد کیوں خرچ ہو کر فراموش ہو جاتے ہیں؟ خود ہماری جوانی اس قدر مختصر کیوں ہے؟ ہم اتنے جلدی کیوں تھک جاتے ہیں۔ اور کم عمری میں کیوں مرجاتے ہیں؟ پھر وہ اپنے آپ کو چلا کر صرف یہی جواب دیتے ہیں:۔

"ہمارا روحانی حصہ زخمی اور خونچکاں ہے۔ مغرور

---

[1] لیجس لیٹو اسمبلی کے مباحثات بابت ۱۹۲۵ء جلد ششم نمبر ۱ صفحہ ۲۹۶۔

[2] ینگ انڈیا بابت ۲۵ مارچ ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۱۲۔ یہ مہاتما گاندھی کا ہفتہ وار اخبار ہے۔ اس اخبار میں سے اس کتاب میں آگے چلکر بھی بہت سا مضمون مقتبس کیا گیا ہے۔

اجنبی نے ہماری روحوں کو زہر آلود کر دیا ہے۔ ہمارے سوچ کو معدوم کر دیا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی جگہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ سیاسی چبوترہ پر چڑھکر ظالم اور جابر کو تب تک ایمانداری کے ساتھ بُرا بھلا کہتے رہیں۔ جب تک کہ وہ اس ملک سے بھاگ نہ جائے۔ جب گورنمنٹ برطانیہ اس ملک کی حکومت چھوڑ کر یہاں سے چلی جائے گی۔ تب تک اور اس سے پہلے نہیں۔ ہم آزاد ہوکر آزاد ہوا میں سانس نہیں لے سکتے۔ اور تب ہی ہم اپنی پیاری مادر ہند کی کم درجہ کی ضرورتوں کی طرف اپنی توجہ منعطف کر سکتے ہیں۔

اب ٹھیک اس موقعہ پر اور مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ دلی ہمدردی کی روح میں متفق ہو کر میں نے بڑی بڑی باتوں کو عمومیت کی ذیل میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

ہندوستان میں برٹش نظم ونسق خواہ وہ اچھا ہے یا بُرا یا بے پرواہی کیساتھ چل رہا ہے اسے مذکورہ بالا حالتوں کے پیدا ہونے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ ایک ہی مجہول حالت میں پڑا رہنا بے بسی اور سستی۔ کام کے آغاز اور اختراع اور ایجاد کا فقدان۔ قوت برداشت اور مستقل وفاداری کی کمی کی عدم موجودگی۔ حوصلہ اور زندگی کی قوت کی کمزوری۔ یہ تمام خصلتیں ہیں۔ جو نہ صرف آجکل کے زمانہ کے ہندوستانی کی ہیں۔ بلکہ طویل زمانۂ گذشتہ کے تواریخی ہندوستانی کی خاص خصوصیات ہیں۔ اس کے علاوہ تمام دنیا ہندوستانیوں کو اس سے بھی بہت زیادہ

بلکہ کبھی گنا زیادہ اپنی خصوصیات سے اس وقت تک منسوب کرتی رہے گی جب تک کہ ہندوستانی ان کے اسباب کا اقبال نہ کریں۔ اور ان اسباب کو اپنے دونوں ہاتھوں سے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہ کریں۔ بیشک ہندوستانی لوگوں کی روح اور جسم دونوں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر ہندوستانی اپنی زنجیروں سے خود ہی بڑی محبت رکھتا ہے۔ اور تمام زور کے ساتھ انہیں اپنے سینہ سے چپٹائے رکھتا ہے۔ اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ہندوستانیوں کے سینہ میں ایک نئی روح پیدا ہو۔ دنیا کی اور کوئی ایجنسی ہندوستانیوں کو ان کی ان زنجیروں سے چھٹکارا نہیں دلا سکتی اور گذشتہ یا موجودہ یا آئندہ زمانہ کے بیرونی عناصر پر الزام رکھنے سے ہندوستانی لوگ خود اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے ہیں۔ اور اپنی آزادی کے دن کو برابر معرض تعویق میں ڈال رہے ہیں۔

ایک بارہ برس کی بچی کو لے لو۔ یہ ہڈیوں اور لہو کا ایک قابل رحم جسمانی نمونہ ہے۔ جو بالکل ناخواندہ اور جاہل ہے۔ اور اسے کسی قسم کی بھی صحت کی عادتوں کی تعلیم نہیں ہوئی۔ اب اس کو مجبور کر کے کم سنی میں ہی ماں بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے کمزور بیٹے کی نہایت ہی خراب طریقوں میں پرورش کی جاتی ہے۔ کہ جس سے اس کی چند روزہ زندگی دن بدن ابتر ہونی

لے سخت مبالغہ آمیز مغالطہ کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کسی قدر سچائی ضرور ہے۔ اگر واقعی یہی حالت ہو۔ تو قوم کا قطع نسل کیوں نہیں ہو جاتا۔ مترجم

جاتی ہے۔ اس لڑکے کو کھیل کود کے لئے کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا اس کو ایسی عادتیں بنائی جاتی ہیں کہ جس سے وہ تیس برس کا ہونے پر بجائے نوجوان ہونیکے ایک بوڑھا معلوم ہوتا ہے تو کیا اس وقت تم دریافت کرو گے۔ کہ اس لڑکے کی قوت مردمی اور جوانی کو کونسی چیز اندر ہی اندر گھن کی طرح تباہ کر گئی ہے۔

اب فرض کرو۔ ایک عظیم الشان آبادی خاصکر اہل دیہات کی ہے۔ جو بالکل ناخواندہ اور جاہل بلکہ جہالت پسند ہیں۔ اب اس آبادی کی عورتوں کو ٹیچر رکھے بغیر اسے ابتدائی تعلیم دینے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اگر تم ان عورتوں سے تعلیم کا کام لوگے تو ہر ایسی عورت کی کہ جس کو تم اس کام پر لگاؤ گے۔ گویا اس کی زندگی برباد کرو گے[1]۔ کیا اب بھی تم یہ سوال کروگے کہ ان لوگوں کی تعلیم اس قدر سست رفتاری سے کیوں ہو رہی ہے۔

اب ان جسموں اور دلوں کو لو۔ کہ جن کی پرورش اور نشو و نما مذکورہ بالا طریقہ پر ہوئی ہے۔ پھر بھی کیا تم یہ سوال کرو گے۔ کہ ان لوگوں میں شرح اموات اس قدر کیوں زیادہ ہے۔ اور لوگ کیوں اتنے نکبت زدہ ہیں؟

خواہ انگریز یا روسی یا جاپانی سب سے بلند مسند پر بیٹھ جائیں۔ خواہ دیسی والیان ریاست تمام ملک کو اپنے درمیان

---

[1] اس فقرہ کا مطلب اگر یہی ہے۔ کہ سب ایسی استانیاں بدچلن ہو جائیں گی۔ تو یقیناً شرمناک حملہ ہے۔ (مترجم)

تقسیم کرلیں۔ اور قدیم زمانہ کے شاہی شوکت کی یادداشت کو پھر تازہ کردیں۔ یا ہندوستان کو جس قدر خودمختاری اب اس وقت حاصل ہے۔ اس سے بھی زیادہ اختیار حکومت مل جائے۔ مگر ہندوستان کی نشو ونما کے قدم کو اس سے زیادہ تیزگامی اور عجلت سے آزادی کی طرف رہنمائی کے لئے کو جس پر وہ آج کل رواں ہے۔ جو قوت اور طاقت بچا سکتی ہے۔ وہ صرف ہندوستان کے مردوں کی طاقت ہے۔ کہ یہ باتیں بنانے یاہی تو تو میں میں کرنے اور دوسروں کے سر پر الزام منڈھنے میں اپنا اور زیادہ وقت ضائع نہ کریں۔ بلکہ حتی الامکان بہترین عزم و استقلال کے ساتھ اپنی جسمانی اور روحانی کمزوریوں کا دفعیہ کر کے اپنی مردانہ طاقت کی تکمیل کریں۔

میرا یقین ہے۔ کہ یہ مضمون عام طور پر ابھی تک چھاپا نہیں گیا۔ ہندوستانی ابھی اس کام سے بتمامہ دو بدو نہیں ہوئے۔ وہ اس کام کے اجزائے ترکیبی کو جانتے ہیں۔ مگر ان اجزا کو ایک جگہ مجتمع کرنے کی پریشانی سے یا ان سے ضروری نتائج نکالنے سے بچتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو غیر ملکی مسافر آتا ہے۔ وہ بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اس کو خوشنما سطح کے نیچے کرید کر کے زندہ چیزوں کے اندر جیسی کہ وہ فی الواقعہ ہیں جانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ برٹش حاکم اس سے بالخصوص بچتے ہیں۔ اور یہ بھی پسند نہیں کرتے۔ کہ دوسرے لوگ بھی اس کام میں ہاتھ ڈالیں۔ ۱۹۱۹ء کی انتظامی اصلاحات بجائے

دکھی ا ہونے کے زیادہ تر ترغیبی ہیں۔ اس لئے حکام کو اپنی کامیابی کی امید و حکام بالا کے احکام کے مانند طائم الفاظ کی پالیسی پر عملدرآمد کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کی اخلاقی بہبودی کے لئے جو غیر ملکی ایجنسیاں کام کر رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی اکثر اپنے زیر اثر لوگوں کو ترغیب دینے کا طریقہ ہی اختیار کرتی ہیں۔ تاکہ صرف وہی انکی خوبیوں اور عمدگیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور دوسرے کے عیوب کا گیت گاتے رہیں۔ حالانکہ ان کو چاہیئے تھا۔ کہ وہ ان کو اپنی غلطیوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کا سبق دیتے۔ غرضیکہ خاموشی یا خوشامد کے معاہدہ کے درمیان تم ایک بیمار آدمی کو ہر روز زیادہ سے زیادہ کمزور ہوتے ہوئے اور اس کے جسم اور دماغ کو ایک ایسی بیماری سے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھتے ہو۔ کہ جس کا علاج مریض خود کرسکتا ہے۔ اور جس کا کہیں بھی کوئی ایسا دوست نہیں ہے۔ کہ جو آئینہ اوپر اٹھا کر صاف طور سے اس کو یہ دکھلا دے۔ کہ کیا چیز اس کو ہلاک کر رہی ہے

اس کام کا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھتے ہوئے میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہ میرے اوپر چاروں طرف سے گندگی پھینکی جائے گی۔ لوگ مجھکو بہت برا بھلا کہیں گے۔ مجھ پر بے انصافی۔ مادہ پرست ضمیر والی اور غیر ہمدرد بلکہ جھوٹے اور شائد خود غرض ہونے کا الزام بھی عائد کردیں۔ مگر امر واقعی یہ ہے۔ کہ میں نے ایسی حالتیں اور ان کے نتائج دیکھے ہیں۔

اور میں ان حالات کو پیش کرنے کے قابل ہوں کہ میں کسی کی ذاتی ناراضی کے سبب سے اپنے حق سے اپنے آپ کو محروم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں۔

اس لئے اس کتاب کے آغاز میں بھی وہ لب لباب اور مغز موجود ہے۔ کہ جو مجھکو بنی نوع انسان کے اس آٹھویں حصّہ کی زندگی اور مستقبل کے لئے نہایت اہم جزو قرار دیتا ہے۔ اس کتاب کے آیندہ صفحات میں میں نے اس تصویر کو توسیع دیئے۔ اور اس کو اور دیگر میدانوں میں پھیلانے اور ہندوستانی زندگی کے اور دیگر شاخسانوں پر قلم فرسائی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مگر کسی میدان یا کسی ہئیت اور منظر میں وہ زندگی اپنے آغاز کے اثرات سے بچ نہیں سکتی۔

دوسری فصل

غلامانہ ذہنیت

مسٹر گاندھی کا قول ہے "کہ سوراج[1] یا حکومت خود اختیاری کے حصول تک ہم کو ہر چیز ملتوی نہیں کر دینی چاہئے" "سوراج صرف بہادر اور اچھے لوگ ہی لے سکتے ہیں[1]"

لیکن آجکل کے زمانہ میں جبکہ اس سابق لیڈر کا اقتدار گھٹ چکا ہے۔ لوگ اس کی ایسی تعلیم پر اب کان نہیں دھرتے مادر ہند کی وفات پر ہر ایک سیاسی پلیٹ فارم سے اس کی محبت کی ادعا میں مشتعل اقرارات تقریروں کی شکل میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ہندوستان کے بچے اپنے کسی فعل کو اپنے قول کے مطابق نہیں کرتے۔ ہندوستان بیشک غریب۔ مریض جاہل اور بے بس ہے۔ مگر ہندوستان کے قابل ترین سپوت بجائے اس کے کہ مادر ہند کے بچاؤ میں اپنی قوت صرف کریں۔ اپنے ہی نوحہ کے مطابق اپنا تمام وقت آپس میں جھگڑے اور تنازعہ کرنے یا اپنی ہی بے قدری اور کس مپرسی کی حالت پر کاہلانہ طور سے رونے دھونے میں صرف کر دیتے ہیں۔

اس اثناء میں معلوم ہوتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ معاملات

[1] سلف گورنمنٹ ینگ انڈیا ۹ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۹۹ - (مترجم)

ہند کے انتظام کرنے میں ترقی کی مقررہ رفتار پر پہنچ گئی ہے جس میں اگر کسی قسم کا ہرجہ نہ پڑے۔ تو ہر دس برس کے بعد اس کی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اتنے سکول تعمیر ہوئے۔ اتنی ہسپتالیں قائم کی گئیں۔ اتنے میل سڑکیں بنائی گئیں۔ اس قدر پل تعمیر ہوئے۔ آبپاشی کے لئے اتنے سو میل نہر کھودی گئی۔ اتنے ہزار بیگھہ بنجر زمین زیر کاشت لائی گئی۔ اتنے چھاپہ خانے کھولے گئے۔ ملک کی اشیائے خوردنی کی مقدار اور تجارتی وسائل میں اس قدر چاول۔ گیہوں۔ جوار۔ باجرہ۔ اور کپاس کا اضافہ ہوا۔

ترقی کی اس رفتار کا ملک کی عظیم ضرورتوں کے ساتھ جب مقابلہ کیا جاتا ہے یا سلطنت متحدہ امریکہ یا کینیڈا کی ایسی ہی تحریکات سے جب ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو یہ رفتار بہت سست معلوم ہوتی ہے۔ اس رفتار کو نمایاں طور پر تیز بنانے کے لئے صرف ایک عنصر کافی ہے۔ یعنی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا دلی توجہ ہوشیاری اور سخت محنت کے ساتھ یہ عملی کام پورا کرنا۔ مگر آجکل ہندوستانی لیڈروں میں عوام الناس کے درجہ کو ترقی دینے کے فکر کے بہت کم آثار پائے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ اس طاقت پر بھی تین[1] حرف بھیجتے ہیں۔ جو ہر چند کہ ان کو پسند خاطر نہیں ہے۔ تاہم عملاً وہ تمام کام انجام دے رہے ہیں۔ کہ جو غمگین اور بوڑھی مادر ہند

---

[1] بہتان اور الزام (مترجم)

کے آرام کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

"کتاب "انڈین ایئر بک ٹائمز پریس بمبئی ۱۹۲۶ء" کے صفحہ ۱۳ کے مطابق تمام ہندوستان کی آبادی اکتیس کروڑ نوے لاکھ شمار کی گئی ہے۔ دیسی ریاستوں کی آبادی سے کہ جن پر دیسی فرمانروا حکمران ہیں قطع نظر برٹش ہندوستان کی آبادی صرف چوبیس کروڑ ستر لاکھ باقی رہ جاتی ہے۔ اور اگر والسرائے سے لے کر ادنیٰ انگریز تاجر دودھ پیتے بچے کو بھی گن لیا جائے۔ تو ہندوستان کی اس عظیم آبادی میں یورپین مردوں۔ عورتوں۔ اور بچوں کی کل آبادی دو لاکھ نفوس سے بھی کم ہے۔ برٹش دگورہ، فوج کی کل تعداد ساٹھ ہزار سے بھی کم ہے۔ کہ جس میں ہر قسم کی فوج شامل ہے۔ برٹش سویلین لوگوں کی تعداد جس میں سول سروس کے حکام۔ ڈاکٹر۔ انجنیئر۔ افسران جنگلات۔ ریلوے افسر ٹکسال۔ سررشتہ زروسیم۔ تعلیم۔ زراعت اور علاج المویشی کے ماہر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ صرف ۲۳۴۳ ہے۔ انڈین پولیس سروس میں انگریز افسروں کی تعداد تخمیناً چار ہزار ہے۔ ان چار ہزار میں پولیس کے ماتحت ملازم اور صوبہ جات کی پولیس کے آدمی شامل نہیں ہیں۔ مگر اس میں یورپین لوگوں کی تعداد اس قدر کم ہے۔ کہ وہ ناقابل التفات ہے۔

غرضکہ آجکل ہندوستان میں کل انگریزوں کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

فوج ساٹھ ہزار۔ سول سروس ۲۳۴۳۔ پولیس ۴۰۰۰۔ میزان ۶۶۳۴۳

یہ اس جماعت کی تمام مقامی قوت ہے۔ کہ جس کی ظالمانہ موجودگی سے بقول خود ہندوستانی ۳۲ کروڑ ۷۰ لاکھ انسانی ہستیوں کے غلامانہ ذہنیت کو منسوب کرتے ہیں۔ تاہم کسی شخص کو یہ امر واقعہ نظر انداز نہ کرنا نہیں چاہیے کہ انگلستان کی حکومت سے پہلے ہندوستان میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے جنگوں یا لوٹ مار کے سبب سے طوائف الملوکی رہتی تھی۔ ایک سردار دوسرے سردار پر اس کو ہڑپ کر جانے کے لئے حملہ کرتا تھا۔ اور تمام حاکم لوگوں کو لوٹتے تھے۔ یا ہندوستان پر کوئی نہ کوئی بیرونی غنیم حملہ آور ہوتا رہتا تھا۔ اگر گاہ بگاہ کوئی دیسی بادشاہ تمام دوسرے چھوٹے راجاؤں پر غلبہ حاصل کر کے تمام ملک میں کوس لمن الملکی بجانے لگتا تھا۔ تو اس کے خاندان کی حکومت بہت کم عرصہ تک قائم رہتی تھی۔ اور اس کو بھی سارے کے سارے ہندوستان پر کبھی تسلط کامل حاصل نہیں ہوتا تھا بار بار سنٹرل ایشیا سے فاتح اقوام کوہستانی درّوں کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔ اور قدیم ہندوؤں کی تمام آبادی کمزوری اور نرمی سے ہر ایک حملہ کا صدمہ برداشت کر کے کانپ کر وہیں خاموش رہ جاتی تھی۔

ان باتوں کی بہت وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک سبب تو ہندو مذہب کا بے جان کرنے والا اثر بیان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی تعلیم ہے۔ کہ تمام چیزیں در اصل بالکل نیست اور معدوم ہیں۔ مگر وہ بیشمار زندگیوں کا قائل ہے۔

حالانکہ یہ سب خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ مگر ہندوؤں کا انہی باتوں پر اعتقاد ہے۔ حالانکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عنصر اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ مگر ہم سخت دماغ والے امریکن لوگ کام کے آغاز کرنے کے لئے ایسے معاملات پر غور وخوض کرتے ہیں۔ کہ جن میں بحث ومباحثہ کی گنجایش بالکل نہیں ہوتی۔ اور جس میں ہم کو نہ کسی مترجم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور نہ کس لغت کی کتاب کی احتیاج پیش آتی ہے

اہل ہندوستان کی تمام مصیبتیں خواہ مادی ہیں یا روحانی یعنی کہ افلاس۔ بیماری۔ جہالت۔ سیاسی اقلیت۔ رنج اور اداسی عدم قابلیت ان سب کی بنیاد جسمانی چٹان پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتا کہ اس کو کم درجہ کا سمجھا جاتا ہے۔ جس کو وہ ہمیشہ اپنی ذلت کا باعث سمجھتا ہے اور اس معاشری تذلیل پر وہ فراموشی نہیں کرتا۔ اور اس پر غصہ سے اپنے دانت پیس کر اسے شہرت دیتا رہتا ہے۔ اور یہ بنیاد صاف لفظوں میں اس کا اس دنیا میں آنے اور اس کی جنسی زندگی سے مراد ہے۔

عام رواج یہ ہے۔ کہ ہندوستانی لڑکی بالغ[1] ہو جانے کے نو مہینے بعد مادرانہ حالت کی توقع رکھتی ہے یا دوسرے الفاظ

---

[1] رپورٹ صفحہ (۱۴۴) مگر اب تو ہندو لیڈر قانونی کونسلوں میں شادی کی عمر بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور یوں بھی شادی کی عمر نسبتاً بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ابھی تک کم عمری کی شادی کا دستور ہے لیکن ۱۴-۱۵ سال کی لڑکیوں کی شادیاں تو ابتک انگلستان

میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ آٹھ سال سے لیکر چودہ سال کی
عمر کے درمیان کسی وقت بھی یہ ماں بن جاتی ہے۔ آٹھ سال
کی عمر اگرچہ انتہائی ہے۔ لیکن بعض جماعتوں میں یہ معمولی ہے۔
اور چودہ سال کی عمر تو اوسط سے زیادہ عمر ہے۔ بوجہ اس کی خورد
سالی اور اٹھان کے اور بوجہ اس کی بیشمار سابقہ نسلوں کے
اسی طرح پرورش پانے کے وہ لڑکی بہت نحیف اور کمزور
ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بالکل بے لکھی پڑھی ہوتی ہے۔ اس کا
مبلغ علم یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے خاندان کے بتوں کی پرستش
کی صرف رسوم اور دیوتاؤں اور بھوت پریت کے غصہ کو
فرو کرنے کی رسوم سے واقف ہو۔ اور نیز اپنے خاوند کی
بالتفصیل خدمات ادا کرنے کی رسوم سے واقف ہو۔ کہ جو
مذہبی احکام کے مطابق اس کا ذاتی دیوتا ہوتا ہے۔

؎ اگر یہی تو ہندو عورت کی بڑی تعریف ہے۔ کہ وہ اپنے شوہر کو دیوتا سر دیے
سمجھتی ہے۔ اور اس کی بڑی وفادار اور تابعدار رہتی ہے۔ نہ کہ یورپین
اور امریکن عورت کی طرح شوہر کی حاکم اور حکم فرما ہوتی اور نت طلاق کے
مقدمات دائر کرتی ہے۔ مسلمان عورتوں کو بھی شوہروں کی ایسی ہی
فرمانبرداری کا حکم ہے۔ اور اسی وجہ سے قدیم زمانہ میں ہندو عورتیں شوہر کی چتا پر جلکر
قربان ہو جاتی تھیں۔ کسی ایرانی شاعر نے تعجب سے کہا ہے ؎
ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی دیوانہ نیست۔ سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست (مترجم)
۲ جنوری ۱۹۲۸ء کا اخبار لیڈر بحوالہ انڈین سوشل ریفارمر لکھتا ہے۔ کہ انگلستان
میں وومنس کونسل نے ایک ڈیپوٹیشن ہوم سکرٹری کی خدمت میں کم عمری

اب اس کے خاوند کا حال سنو۔ یا تو وہ بھی بچہ ہوگا۔ اور اس کی عمر اس کی بیوی کے برابر ہی ہوگی۔ یا وہ شائد پچاس برس کا رنڈوا ہوگا۔ جبکہ وہ پہلی بار اپنی بیوی سے تعلقات زناشوئی کا طالب ہوگا۔ ان دونوں حالتوں میں یا تو عدم بلوغیت یا ضعف و ناتوانی کے باعث اس میں زندگی کو آگے بڑھانے یا روانہ کرنے کی طاقت بہت کم ہوتی ہے۔

اس چھوٹی عمر کی ماں کو تباہی بخش حمل ہوجاتا ہے۔ حمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) کی شادی کے خلاف بھیجا مس بیری سکرٹری سنٹ جونس سوشل اینڈ پولیٹیکل الائنس نے چند حقائق اس کی تائید میں اس جواب کے شائع کئے کہ انگلستان میں اب تک کم عمری کی شادی کا رواج ہے۔ ہم ہندوستان میں کم عمری کی شادی کی شکایت سنتے ہیں۔ مگر انگلستان میں بھی لڑکیوں کو ۱۲ سال اور لڑکوں کو ۱۴ سال کی عمر میں شادی کرنے کی اجازت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان میں ہندوستان کے برابر کم عمری میں شادیاں نہیں ہوتیں اور ومنس کونسل نے جو تحقیقات کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گذشتہ بارہ سال میں انگلستان میں کسی بارہ برس کی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی۔ مگر ۱۹۲۴ء میں ۱۴ سال کی دو لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں۔ اور ۱۹ لڑکیوں کی ۱۵ سال کی عمر میں اور ۱۹۲۵ء میں دو اور کی اسی کم عمر میں شادیاں ہوئیں اور ۲۴ کی ۱۵ سال کی عمر میں ہوئیں۔ سال گذشتہ میں چار لڑکیاں چودہ سال کی عمر میں اور ۴۳ پندرہ سال کی عمر میں بیاہی گئیں۔ اور موجودہ انگریزی قانون کی رو سے ایسی کم عمری کی شادیوں کی ممانعت نہیں ہوسکتی۔

لیڈر ۴ جنوری ۱۹۲۸ء

کا خاتمہ بچہ پیدا ہونے پر ہوتا ہے۔ اس کے زچہ بچہ کی خاص تکلیفات اور درد کا حال تب تک خیال میں نہیں آئیگا۔ جب تک کہ اس کو ذرا توضیح اور تفصیل سے بیان نہ کر دیا جائے۔

جو بچہ پیدائش کی تکالیف کے بعد زندہ رہ جاتا ہے۔ وہ ہر حال بہت کمزور ہوتا ہے۔ عموماً اعضائے تناسل کے امراض سے زہر آلود اور ہڈیوں کے گودہ اور طاقتِ زندگی دونوں ہیں دیوالیہ ہوتا ہے۔ جو ہر ایک وبائی بیماری کا جو پھیل رہی ہو۔ آسانی سے شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی خبر گیری کے لئے اپنی بچہ ماں پر انحصار رکھتا ہے۔ اس بیچاری بچہ ماں کو قوانینِ حفظ صحت سے بالکل واقفیت نہیں ہوتی۔ صرف نہایت قدیم زمانہ کے عقائد باطلہ اس کی رہنمائی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ اس کو اُس کے کام میں مدد دینے والا سوائے گھرانہ کی بڑی بوڑھی عورتوں کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ کہ جن کا مبلغ واقفیت بھی باوجود ان کی بزرگ سالی کے خود اس کی واقفیت سے برائے نام کچھ ہی زیادہ ہوتا ہے۔ معاشرانہ طریقہ میں عورت کی جگہ ایسی ہے۔ کہ زندگی میں عورت کی دلچسپی حمل اور بچہ پیدا کرنے کے معاملات میں ہی گذرتی ہے۔ خواہ وہ ادنےٰ ذات یا اعلےٰ طبقہ کی عورت ہو۔ رات دن اس کو انہیں امور ہی کی بابت بات چیت کرنے میں گذرتے ہیں۔ اس لئے جو بچہ ایسے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کو جب سے الفاظ اور کلام کے معنے سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ تب سے وہ عورت اور مرد

کے تعلقات کے چرچے ہی سنتا رہتا ہے۔

شیوجی ہندوؤں کے بہت بڑے دیوتا ہیں۔ ان کے نام پر شارع عام اور سڑکوں پر بیٹھے ہوئے سادھوں اور مندروں میں یا گھروں کی چھوٹی پوجا کی پوجا گاہوں میں یا ذاتی تعویذوں (انتنوں) میں شوجی کے لنگ یا لنگم کی مورتی ہی نظر آتی ہے اسی شولنگ کو ہندو ڈنڈوت کرتے ہیں۔ پجاری اس پر نذرانہ اور چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔

وشنوجی کے پیرو۔ جن کی جنوبی ہند اور دکن میں بہت ہی کثرت ہے۔ بچپن ہی سے ان کی پیشانیوں پر پیدائش[۱] یا تناسل کے کام کی علامات نقش کی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات قبول کرلی گئی ہے۔ کہ ایسی اور ہیجوں قسم کی علامتوں کے قدیم موجدوں کی نیت ان علامتوں کے بنانے سے یہ تھی۔ کہ اس سے روح کو اپنی رفعتِ کمال میں مدد ملے گی۔ مگر دیوی دیوتاؤں کے خفیہ رازوں اور ان کے تعلقات کا بالتفصیل بیان ہوگا۔

---

[۱] ہر ایک ہندوستانی خالی الذہن ہوکر انصاف کر سکتا ہے۔ کہ مصنفہ کس حد تک یکطرفہ اور رنگین رائے رکھتی ہے وہ کونسی ایسی باتیں ہیں جو ہر وقت بچوں کے سامنے ایسی ہی مائیں کرتی رہتی ہیں۔ (مترجم) [۲] دیکھو کتاب "ہندوؤں کے طریقے۔ دستور و رواج اور رسومات" مولفہ ایبے جے اے ڈوبوئیس۔ کلیرنڈن پریس۔ آکسفورڈ بابت ۱۹۲۴ء صفحات ۱۱۱-۱۱۲-اور صفحات ۲۸ و ۶۳۱ وغیرہ

اگرچہ آگ کے گرد ٹھیکر گانے والے بھجنوں میں محفوظ ہے۔ مگر ان کے لفظی معنے اور مرادی مطلب اور عام لوگوں کے دلوں میں ان کی مذہبی حیثیت بھی نمایاں ہے۔

فالک (آلات تناسل) طریقہ کا ایک زمانۂ حال کا استاد اس طریقہ کے مذہبی احساس کے بارہ میں کہتا ہے۔ کہ "بیوقوف لوگ نہیں سمجھتے۔ اور وہ ہرگز اسے نہیں سمجھینگے۔ اس لئے کہ وہ تو اس پر صرف مادی اور دنیوی پہلو[1] سے نگاہ ڈالتے ہیں"

مگر اس دانشمند کی مذکورہ بالا جھڑکی کے باوجود ہندوستان میں عملی مشاہدہ کرنے والا مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ جو مذہب محض عُقلا اور دانشمند لوگوں کے لئے ہی موزون ہو۔ اُسکی بہت سی بھیڑیں گڈریئے کی حفاظت کے سوائے ہی رہ جاتی ہیں۔ اور جہاں کہیں یہ زنانہ یا مردانہ علامتیں موجود نہیں ہوتیں۔ وہاں مندروں کی درودیواروں پر سنگ تراشی میں یا مندر کی رتھوں (گاڑیوں) پر نقش ونگار اور محلات کے دروازوں پر اور بازاروں کی دیواروں پر تصاویر بنا کے مرد اور عورت کے باہمی تعلق اور الفت کے ہر ایک قابل فہم امر کو بالکل اس کی اصلی شکل میں دکھلا دیا جاتا ہے۔ انہی امور

---

[1] یہ رائے سوامی دیویکا نندا نے کتاب بھگتی یوگا میں دی ہے۔ اس مضمون سے متعلق مختصر اور آزادانہ بحث دیکھنی ہو۔ تو کتاب دی ہارٹ آف آریہ ورت کے ۱۳ باب کو دیکھو۔ یہ کتاب ارل آف رانلڈشے کی تالیف ہے۔ اور کنسٹیبل اینڈ کمپنی لمیٹڈ لندن نے ۱۹۲۵ء میں اس کو شائع کیا ہے۔

کے متعلق ہر جگہ گھر کی عورتوں کی زبان سے گیت گائے جاتے ہیں۔ المختصر تمام انسانی دنیا کی مذکورہ بالا باتوں کے متعلق مصروفیت اور محویت بچے کی نظر میں بھی ایسے ہی خیالات جما دیتی ہے۔

جنیوا میں ۱۲ ستمبر ۱۹۲۳ء کو تمام سلطنتوں نے ایک بین الاقوامی معاہدہ پر دستخط کیے۔ جس کا مفاد یہ ہے۔ کہ فحش مطبوعات کی اشاعت یا تجارت کو روک دیا جائے۔ یہ بات سچ ہے کہ اس معاہدہ پر عملدرآمد کرنے کے لئے مجلس واضعان قوانین ہندوستان نے تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوجداری کی باضابطہ ترمیم کر دی۔ اور اس ترمیم کی رو سے ایسے ہر ایک شخص کے لئے تعزیر مقرر کی۔ کہ جو کسی فحش چیز یا فحش کتاب یا فحش شکل کو بیچے یا کرایہ پر دے یا تقسیم کرے۔ یا پبلک کو دکھلائے یا نفع اٹھائے۔ اس قانون پر اگر بلا شرط عملدرآمد ہو جاتا۔ تو مسلمانوں کو تو اس سے خوشی حاصل ہوتی۔ مگر ہندوؤں کی مذہبی چیز لیست۔ ہندوؤں کی اکثریت کی قدیم روایات و دستورات اور پجاریوں کے خاص حقوق جو ہندوؤں کی اکثریت کو پسند ہیں۔ بالکل برباد اور کالعدم ہو جاتے۔ اس لئے ہندوستان کی مجالس قانون ساز نے جن میں ہندو عناصر کا نہایت غلبہ ہے۔ اس ترمیم میں ایک استثنیٰ بڑھوا دیا جس کا مفاد یہ ہے:۔

"کسی ایسی کتاب۔ رسالہ۔ تحریر۔ خاکہ یا نقشہ پر جو دیانتداری کے ساتھ مذہبی اغراض کے لئے رکھا جائے یا کام میں

۱؎ تعزیرات ہند ایکٹ نمبر ۸ بابت ۱۹۲۵ء کی دفعہ ۲۹۲

لایا جائے۔ یا کسی تصویر پر جس کو سنگ تراشی سے بنایا جائے یا نقش و نگار سے دکھلائی جائے۔ یا کسی مندر میں یا کسی مندر پر یا کسی رتھ یا گاڑی پر جو بتوں کے لیجانے کے لئے کام میں لائی جاتی ہو۔ یا کسی مذہبی اغراض کے لئے رکھی جاتی یا کام میں لائی جاتی ہو۔ ایسی تصاویر منقش ہوں یا ان کا روپ دکھلایا گیا ہو۔ تو اُس پر اس دفعہ کا اثر نہیں ہوگا۔"

شمال اور جنوب میں غرض ہندوستان کے بہت سے حصص میں ایک چھوٹا سا بچہ جس کا ضمیر اس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ یقیناً اگر اسکی شکل دلاویز ہو۔ اسکے خط و خال خوبصورت ہوں۔ تو اسکو بالغ آدمیوں کے تعیش کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ یا اس کو بدفعلی کے لئے مندر میں باقاعدہ طور سے وقف کر دیا جاتا ہے۔ اس دستور پر ماں باپ کو کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ خوش ہوتے ہیں۔ کہ ان کا بیٹا ایسا قبول صورت نکلا ہے۔

یہ معاملہ نہ تو درجہ اور طبقہ سے مخصوص ہے۔ اور نہ خاص جہالت کا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جس پہلو سے ہم لوگ (یعنی امریکن) اچھی یا بُری چیز کو دیکھتے ہیں۔ اس سے یہ لوگ (یعنی ہندوستانی) بہت دُور ہیں۔ اور جہاں ہیں وہیں سے اچھی اور

سلہ جہاں تک ہمیں علم اور تجربہ ہے۔ لڑکیوں کی صورت میں تو یہ محض بہتان ہے۔ البتہ جنوبی ہند میں دیوا داسیوں کے نام سے بعض لڑکیاں مندروں پر چڑھا دیجاتی ہیں جس رسم کو خلاف قانون قرار دیئے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے (مترجم)

بری چیز کو دیکھتے ہیں۔ یعنی کہ ماں خواہ اعلےٰ ذات کی ہو۔ یا ادنےٰ درجہ کی ہو۔ اپنے بچوں پر اچھے عمل کرتی ہے۔ یعنی اپنی لڑکی کو اچھی طرح سلاتی ہے اور اپنے بیٹے کو "مردانہ بناتی ہے"۔ تاکہ ایسی پرورش سے کہ جس میں بچے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بقیہ عمر بچا رہے۔

یہ آخری بات یاد رکھنی چاہیئے۔ ہندوستان کے وسیع طور سے پھیلی ہوئی جماعتوں کی نسبت اعلےٰ ترین میڈیکل افسروں (ڈاکٹروں) نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔ کہ عملاً ہر ایک بچہ جو ان کے ملاحظہ کے لئے خواہ کسی بیماری کے سبب سے لایا جاتا ہے۔ اس کے جسم پر اس عادت کی علامتیں موجود ہوتی ہیں۔ بچپن کے دوران میں اس عادت کے جسمانی اثر کی بابت رائے خواہ کچھ ہی ہو۔ مگر ابتدائے عمر میں تربیت خیالات پر اس کا جو کچھ اثر ہوتا ہے۔ وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب بلوغت کی عمر میں اس عادت کی مسلسل مشق کی جائے۔ تو پھر جسم اور اعصاب[1] کی بربادی میں کچھ شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابیں اس بات کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ کہ نابالغی یا کم سنی کی شادی کا جواز ہندوؤں کی ابتدائی مذہبی کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس دلیل کو ہر بار دُہرانے پر مذہبی کتابوں کے متن کے مقابلہ میں متن پیش کئے جاتے ہیں۔ اس بارہ میں پنڈتوں کا آپس میں بے حد اختلاف ہے۔ مگر اس تنازعہ میں جو کُہر پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ

---

[1] غالباً اس سے اس مرض کی طرف اشارہ ہے۔ جسے علت المشائخ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

میں روزانہ رواج اور دستور بالکل صحیح اور صاف طور پر پیش پا افتادہ ہیں ہندو رواج کا اقتضا ہے کہ ہر شخص کے جائز بیٹا جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد پیدا ہو جائے۔ تاکہ باپ کے مرنے پر اور باپ کے مرنے کے بعد بیٹا مناسب مذہبی رسومات ادا کرے۔ اور چتا پر باپ کے سر کی کھوپری توڑے۔ کیونکہ اس کے توڑنے پر اس کی روح کو نجات ملتی ہے اس سبب سے اور اسی طرح کے میلان طبع سے اوسط درجہ کے لڑکے کے تعلقات زناشوئی کی تجارت کی ابتدا بیوی کے بالغ یا قابل ہو جانے کا مشکل انتظار کرتی ہے۔ مگر نہ تو عام عادت اور نہ رائے عامہ ہی اس تجارت کو اُس کی بیوی یا بیویوں تک ہی محدود رکھتی ہے۔

مسٹر گاندھی لکھتے ہیں۔ کہ جب میری عمر تیرہ برس کی تھی تب میں اپنی بیوی کے ساتھ بطور میاں بیوی کے رہا کرتا تھا۔ اور اگر ایسی ہی حالت میں میں اپنے بھائی کے بالعکس اسکول جانے کے لئے کچھ عرصہ کے واسطے ہر روز اپنی بیوی کے پاس سے علیحدہ نہ ہو جایا کرتا۔ تو میں یا تو کسی بیماری کا شکار ہو جاتا اور قبل از وقت مرجاتا یا (اس وقت سے) تھکی ہوئی۔ بوجھل اور مصیبت زدہ زندگی بسر کرتا (دیکھو اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۷ جون ۱۹۲۶ء)

مغربی تعلیمات کے اثر سے مجبور ہو کر کم سنی کی شادی کے مضمون پر پچھلے کئی سال سے بہت کچھ بحث و مباحثہ ہوا۔ اور بظاہر اہل ہند کے قلوب میں اس معاملہ کے متعلق نمایاں بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر ہنوز بہت ہی کم لوگوں نے اس پر عملدرآمد شروع کیا ہے

اور کٹر ہندوؤں کی اکثریت کم سنی کی شادی کے متعلق قدیم دستور کی بہت سختی کے ساتھ مؤید ہے۔

ہندوؤں کے ہر دلعزیز شاستروں میں لوگوں کو ہر امر میں ضبط نفس کی تلقین بہت کم کی گئی ہے۔ اور مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے متعلق تو اور بھی بہت کم ضبط نفس ملحوظ رکھا گیا ہے ایک بہت ممتاز اور مشہور ہندو بیرسٹر نے مجھ سے کہا کہ "میرا باپ تمام صوبہ میں بہترین آدمیوں میں سے تھا۔ اور اس نے میرے بچپن ہی میں عقلمندی کے ساتھ مجھکو چھوت کے امراض سے بچ جانے کی تدبیر سکھلادی تھی۔

میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ اگر تمہارا باپ تم کو پاک بازی اور پاک نفسی سکھلاتا۔ تو کیا وہ زیادہ بہتر نہ ہوتی؟

بیرسٹر نے جواب دیا کہ آہ ہم اس بات کو ناممکن سمجھتے ہیں۔

ایک مشہور ہندو ویدانتی نے جو بیشمار ہندوؤں کا قابل ادب استاد ہے۔ مجھے بتلایا کہ "ایسے معاملات میں کسی صورت سے بھی حق اور باطل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا"۔ میں اس کام کو اسی وقت بھول جاتا ہوں۔ جبکہ میں اس کو ختم کر چکتا ہوں۔ میں یہ کام صرف اس لئے نہیں کرتا۔ کہ میں اپنی بیوی پر نامہربان ہوں۔ جو میری طرح روشن ضمیر نہیں ہے۔ اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کے کچھ بھی معنے نہیں ہیں۔ ایسی باتیں تو صرف وہم کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس سرسری خاکہ کے بعد جو میں نے ابھی کھینچدیا ہے۔ اس بیان پر بالکل تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ملک ہندوستان کے

ایک سرے سے دوسرے سرے تک اوسطاً تیس برس کی عمر کا ہندو مرد بشرطیکہ اس کے پاس اپنی خوشی اور تعیش کے پورا کرنے کے وسائل موجود ہوں۔ بالکل بوڑھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسے ہندوؤں میں سے جن کی عمریں پچیس اور تیس برس کے درمیان ہوں۔ ہر دس میں سے سات سے لیکر آٹھ تک نامرد[1] ہوتے ہیں۔ یہ شمار و اعداد صرف اٹکل پچو نہیں لکھے گئے۔ سوائے شرط مذکورہ بالا کے ان پر اور کسی چیز کا اثر نہیں پڑتا۔ زمین کی کاشت کرنے والا انسان کچھ تو اپنے افلاس کے سبب سے اور کچھ سال کے ایک حصہ میں اپنی صحت بخش جسمانی مشقت کی زندگی بسر کرنے کے باعث۔ کسی دولتمند شہری کی نسبت اس بیماری کا بہت کم شکار ہوتا ہے۔ اس بارہ میں کچھ روشنی ہندوستانیوں کے اخبارات کے بہرہ اشتہارات پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی پڑتی ہے۔ جو واقعات میں نے بیان کئے ہیں۔ اس کی تائید میں ہندوستانیوں کے اخبارات کے کالم ایسے اشتہاروں سے بھرے ہوتے ہیں ان میں جادو کی جڑی بوٹیاں یا مصنوعی چیزوں کے اشتہارات خواہ وہ صرف راجوں مہاراجوں یا دولتمندوں کے لئے ہوں یا غریب غربا کے لئے درج ہوتے ہیں۔ اور ایسے اشتہار تو اخباری کالموں میں عام ہوتے اور واقعات کی تائید کرتے ہیں۔ کہ آپ کے زوال پذیر جسم

---

[1] ایسے سخت اور ذمہ داری کے بیان کا کافی ثبوت نہیں دیا گیا۔ ہندوؤں میں تو برہم چریہ کا حکم ہے جس میں دیریج کی حفاظت کی سخت تاکید ہے۔ جو یورپ و امریکہ میں نہیں ہے۔ جہاں زناکاری زیادہ کھلم کھلا ہوتی ہے۔ تو کیا وہاں لوگ اس سے کمزور نہیں ہو جاتے۔ (مترجم)

کے بحال رکھنے کے لئے یہ قوت کے ۳۲ ستون (شائد ۳۲ مقوی گولیاں مترجم) صرف ایک روپیہ میں فروخت ہوتے ہیں (روپے کی بازاری قیمت تو دیگر ممالک کے بین الاقوامی نرخ زرِ تبادلہ کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مگر اس کتاب کے مطالب کے لئے ایک روپیہ کو ایک شلنگ چار پنس یا ۳۲ سنٹ کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ یا سلطنت متحدہ امریکہ کے سکہ ڈالر کے لحاظ سے تین روپے ایک ڈالر کے مساوی ہوتے ہیں۔ حاشیہ مصنفہ)

اکیلے صوبہ پنجاب میں ۲۹ دسمبر ۱۹۲۲ء اور ۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کے درمیان نہایت فحش اشتہارات چھاپنے پر گورنمنٹ کو گیارہ دیسی اخبارات پر الگ الگ فوجداری استغاثے دائر کرنے پڑے۔ ان میں سے سات اخبارات ہندوؤں کے۔ تین مسلمانوں کے اور ایک سکھوں کا تھا۔ ان اخبارات کو پچیس روپے سے لیکر دوسو روپیہ تک جرمانہ کی سزا دی گئی۔ اور ایک اخبار والے کو جرمانہ کے علاوہ تین مہینے کی قید بامشقت کی سزا بھی دی گئی۔ یہ بات بھی پورے طور سے بیان کر دینی مناسب ہے۔ کہ گورنمنٹ اخبارات پر ایسے استغاثے تب تک دائر نہیں کرتی جب تک کہ اس اشتہار میں صاف صاف اور غیر مشتبہ زبان میں جسمانی اعضاء کی نہایت فحش تفصیل درج نہ ہو۔

گیارھویں اخبار کو سزا دینے کے بعد گورنمنٹ نے تمام اخبارات کے نام ایک اعلان جاری کر دیا جس میں تمام ایڈیٹروں کو اس آخری استغاثہ اور نسبتہً سخت سزائے جرمانہ سے مطلع کر کے ان کو یہ مشورہ

دیا کہ اس قسم کے اشتہار چھاپنے سے پہلے ان کو دیکھ لیا جایا کرے
کہ ان میں کوئی فحش الفاظ تو نہیں ہیں۔ گورنمنٹ کے اس نوٹ پر
اخبار برہمن سماچار نے (جو لاہور کا ایک ہندو اخبار ہے۔ اپنی ۱۲ فروری
۱۹۲۶ء کی اشاعت میں) اپنے ایڈیٹوریل میں حسب ذیل روشنی اپنے
قارئین کرام کی اطلاع کے لئے ڈالی:۔

"گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ایسے فحش اشتہارات شائع نہ ہوں۔
اور ایسے اشتہاروں کے شائع کرنے سے پہلے ایڈیٹروں کو ان
اشتہارات کو بغور پڑھ لینا چاہئے۔ اگر گورنمنٹ کا محکمہ اطلاع وہی
اپنی رپورٹ کے ساتھ ایسے فحش اشتہارات کو بھی شائع کر دیا کرتا
تو یہ بات زیادہ بہتر ہوتی۔ تاکہ اشتہار کے مضمون اور اشتہار کے
لکھنے کے طریقہ سے پبلک واقف ہو جاتی"۔

یہ بات سچ ہے۔ کہ مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا
مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۳۰۹ پر ایسے فحش اشتہارات پر
اپنی ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ کہ دوائیں اور
میکنیکل تدابیر سے ممکن ہے کہ جسم کو کچھ صحت کی حالت میں کر دیں
مگر ان سے ضمیر کی جڑ تو بالکل کھوکھلی ہو جاتی ہے۔

مگر ایک بہت زیادہ مخصوص عام حالت کی شہادت حال کے
اس واقعہ سے ملتی ہے۔ ایک نہایت معزز اور دولتمند ہندو نے
اپنی بیٹی کی شادی کرنے سے پہلے اپنے آئندہ ہونے والے داماد

---

[1] یہ بیان بھی مبالغہ آمیز ہے کہ صرف اس حد تک کہ نہایت سخت فحش پر ہی گورنمنٹ گرفت
کرتی ہے۔ اور کہ اعضائے تناسل کی ایسی فحش تشریحات ہی مشتہر ہوتے رہتے ہیں۔

سے کسی برٹش ڈاکٹر کا سارٹیفکیٹ مہیا کرنے کا مطالبہ کیا۔ کہ جس میں وہ برٹش ڈاکٹر اس بات کی شہادت درج کر دے کہ یہ شخص آتشک یا سوزاک میں مبتلا نہیں ہے۔ اس کی تشریح بہت آسان ہے۔ کیونکہ ایک بانجھ اپنے والدین کے لئے سخت پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ شادی ہونے کے بعد اگر اولاد پیدا نہ ہو۔ تو عام طور سے جھٹ بیچاری عورت پر بانجھ ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اولاد پیدا نہ ہونے کا زیادہ تر سبب خاوند کی ناقابلیت ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا صورت میں باپ نے محض ایک عملی بینش ہندی یا احتیاط برتی تھی باپ کی یہ خواہش کبھی نہ تھی۔ کہ میری دختر۔ حالانکہ اس کی غلطی اس میں بالکل نہ ہو۔ میرے گھر واپس آجائے اور اس کا خاوند دوسری شادی کر لے۔ مرد کو بیماری کا کوئی الزام نہیں لگایا جاتا ۔ اور نہ رائے عامہ کوئی اثر دکھاتی ہے۔

لیکن اگر کسی ہندو بیوی کے عرصہ دراز تک کوئی اولاد پیدا نہ ہو۔ تو ہندو خاوند پھر آخری تدبیر کے طور پر یہ کارروائی کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کسی مندر کے جاترا کے لئے چڑھاوا دیکر بھیجدیتا ہے۔ بلکہ اس بارہ میں یہ بات بھی بیان کی جاتی ہے۔ کہ بعض ہندو قوموں میں رواج ہی یہ پڑا ہوا ہے۔ کہ وہ وقت بچانے کے لئے شادی کے بعد پہلی رات کو ہی دلہن کو مندر میں بھیجدیتے ہیں۔ مندر میں دن کے وقت دلہن دیوتا سے التجا کرتی ہے۔ کہ مہاراج مجھکو ایک بیٹا عطا ہو۔ اور رات کو دلہن کو مندر کی عمارت کے حدود کے اندر سونا لازمی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے۔ تو عورت

پجاری سے وہ حکایت بیان کرتی ہے۔ کہ رات کے اندھیرے میں اس کے ساتھ یہ معاملہ گذرا۔

پجاری جواب دیتا ہے کہ "اے دختر عزت و آبرو۔ جس نے تیرے ساتھ یہ کارروائی کی۔ وہ دیوتا ہی تو تھا"۔

پھر وہ عورت مندر سے اپنے گھر واپس آجاتی ہے۔ اگر ایک سال کے بعد اس عورت کے بچہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اور وہ زندہ بھی رہتا ہے۔ تو یہ عورت پھر مندر کو جاتی ہے۔ اور دوسرے تحفے تحائف اور چڑھاوے کے ساتھ اپنے بچہ کے سر کے بال بھی لے جاتی ہے (دیکھو کتاب ہندوؤں کے طریقے۔ دستور۔ رواج اور رسومات کے صفحات ۵۹۳ تا ۵۹۴۔ حاشیہ مصنفہ)

آجکل مندروں کی سیر کرنے والوں کی توجہ بعض اوقات ایک درخت کی طرف بھی جاتی ہے۔ جس کی شاخوں میں سینکڑوں چھوٹی چھوٹی تھلیاں پرانے میلے کچیلے کپڑے کی بندھی ہوئی لٹکتی رہتی ہیں۔ اور اس درخت کی جڑوں کے گرداگرد انسانی بالوں کی سیاہ لٹوں کی ایک موٹی چٹائی بچھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیوتا کا منت کا درخت ہے۔ یہ اس کی عنایتوں کا مظہر ہے۔ مندر کا اعزاز قائم رکھنے کے لئے اس مندر کے پجاری احتیاط کے ساتھ موٹے تازے نئے برادر بھرتی کرتے رہتے ہیں۔

لہ ایسے ہی بیانات ہیں جنہوں نے مس میو کی کتاب سے ہندوؤں کو بیجا طور پر ناراض کیا ہے۔ کہ سنی سنائی قصے کہانیوں کو اس نے سچ سمجھ کر ان کو ہر کس و ناکس پر چسپاں کردیا ہے اگر کوئی امریکہ سے ایسے فضول قصے چھاپے تو کیا وہ سارے اہل امریکہ پر صادق آسکتے ہیں (مترجم)

بظاہر ہر ایک آدمی اس تمام حال سے خوب واقف ہے۔ مگر اولاد کی التجا کرنے والی عورت کو اور اس کے گھر والوں کے دل کو ان پجاریوں کی پاکبازی اور زہد پر سچّے طور سے یقین آجاتا ہے۔

اس عام مضمون پر کافی روشنی اس بات کے واضح کرنے کے لئے ڈالی جاچکی ہے۔ کہ ہندو اپنی غلامانہ ذہنیّت پر سخت متاسف ہیں۔ اور اس کا کافی ثبوت بھی دیا جاچکا ہے۔

اس سے اس بات کا پتہ بھی لگتا ہے۔ کہ ہندوؤں میں کیوں اصلی یا پائیدار لیڈر پیدا نہیں ہوتے۔ اور کس لئے ایسے آدمی جو وقتاً فوقتاً لیڈری کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ اپنے پیروؤں کو ان کی تلوّن مزاجی کے سبب سے صرف مختصر عرصہ کے لئے ہی اپنا پیرو رکھ سکتے ہیں۔

ہندوستانی اس حالت کو ایک خاص درجہ تک خوب سمجھتا ہے۔ مگر وہ شاذ و نادر ہی بات کی تہ تک پہنچتا ہے۔ نہ تو وہ اس کی پوری پوری اہمیّت کو تسلیم کرلیتا ہے۔ اور نہ اس کے نتائج سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ مایوسانہ انداز میں بار بار کہتا ہے کہ کس لئے ہمارے بہترین آدمی جن کو ہمارا لیڈر بننا چاہئے۔ جوان عمری ہی میں فوت ہو جاتے ہیں؟ پھر وہ اس کا صرف وہی جواب دیتا ہے۔ کہ جو ممکن ہے یعنے یہ قسمت یا کرم ہے۔ اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۵ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۷۵ میں تحریر ہے۔ کہ ہندو ڈاکٹر ہری پرشاد کہتے ہیں۔ کہ ہمارے باشندوں کی اوسط عمر تیئیس (۲۳) سال ہے۔ اور وہ اس کم عمری کا الزام خرابی حفظان صحّت پر لگاتا ہے۔ ایک اور بالخصوص ہندوستانی نظریہ کو منی لال سی پاریکھ نے اخبار سرونٹس آف انڈیا مورخہ

۸- اپریل ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۴۴۸ پر اٹیوریکولوسس (جگر کے پھوڑے) کے حملے کے ذکر اور بڑے خوف کے ساتھ کیا ہے - یہ ایسی مصیبت ہے جو لوگوں کے ناقابل مزاحمت ایذان اور (حفاظت) خالی کر دینے والی عادات میں اپنے حملہ کے لئے خاطر خواہ ترغیب پاتی ہے -

"اس وقت تو کسی کو اس خوفناک زیادتی کے اسباب پر خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے - موجودہ راقم کی یہ تمنّا ہے - کہ ہندوستان کو جہانتک جلدی ممکن ہو سکے - سواراج مل جائے - تاکہ اس ملک کے لوگ اس وہشتناک عظیم مسئلہ کا خاطر خواہ بندوبست کرسکیں"

اس طور سے وہ اب تک یہ ذمّہ واری دوسروں کے کندھے پر پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں - اور امر واقعہ کا مقابلہ کرنے سے بچنا چاہتے ہیں -

ایک بہت ہی ممتاز ہندوستانی ڈاکٹر نے جو بمبئی کا برہمن ہے - اور علم امراض کا ماہر طبیب ہے - مجھکو اپنی حسب ذیل تشخیص سے آگاہ کیا :-

میرے اہل وطن اپنی جسمانی فضولخرچی کو اپنے ذہنی اور مادّی افلاس کا باعث قرار دینے سے مسلسل طور پر غفلت کر رہے ہیں - یہ ناقابل انکار امر کہ ہماری قوم روز بروز تنزّل کر رہی ہے - اور ہماری قوم کی ایک مرکز پر جمع ہو سکنے کی قوت - کام شروع کرنے کی قابلیت استقلال مقصد اور مستقل مزاجی کا قدرتی فقدان ہماری اس زندگانی بخش قوت اور طاقت کے بیجا اسراف سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کہ جس اسراف اور بیجا خرچ کو وہ عیاشی اور جنسی تعیش کے نذر کر رہے

ہیں۔ اس لئے پھر ایک بار ہر شخص کو اس ابتدائی نتیجہ پر مجبوراً پہونچنا پڑتا ہے۔

دیوالیہ کے سرمایہ سے جسمانی دیوالیہ لوگوں کو دنیا میں داخل کرو اور ان کو ایسے زمانۂ طفولیت میں پرورش کرو۔ کہ جس کے اثرات اور مشق ان کے جوہر زندگانی کو کھا جائیں۔ اور اوائل بلوغت میں ان کو اپنی طاقت پیدایش کا تمام سرمایہ بلا روک ٹوک صرف ایک اکیلے پہلو میں بیجا خرچ کرنے دو۔ تو پھر تم ایسے آدمیوں کو اس عمر میں کہ جس عمر میں انگریز (یا انگلو سیکسن) اپنی مردمی کی پوری پوری شان و شوکت میں پائے جاتے ہیں۔ اور بلوغت کے کمال پر پہنچتے ہیں۔ اعصاب شکستہ ضعیف۔ ناتوان۔ مردہ دل۔ پریشان خیال اور چڑچڑے مزاج والا پاؤ گے۔ اب جب تک یہ حالت غیر متبدل رہے گی تب تک تم کو اس امر کے لئے کسی اور دوسرے اسباب کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کے لوگ کیوں اس قدر غریب اور بیمار ہیں۔ اور کیوں اس کثرت سے مرتے ہیں۔ اور کیوں ان کے ہاتھ اتنے کمزور اور کپکپاتے ہیں۔ کہ وہ اپنے ملک کی حکومت کی باگ خود پکڑ یا تھام نہیں سکتے؟

کم سنّی کی شادی اور عمرِ رضامندی

بچپن کی شادی کے مسئلہ کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کا جو رویہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اگرچہ وہ اس کی ترقی اور تبدیلی کی طرف ترغیب دہی کا اثر مسلسل طور سے ڈال رہی ہے۔ مگر گورنمنٹ کی اس پالیسی پر دو عام اصولوں کا ہمیشہ غلبہ رہا ہے۔ ایک تو جہانتک ہو سکتا ہے۔ وہ محکوم رعایا کے مذہبی معاملات میں دخل دینے سے بچتی ہے۔ دوسرے وہ ایسا کوئی قانون کبھی منظور نہیں کرتی۔ کہ جس پر عملدرآمد نہ ہو سکتا ہو۔ ہندوستانیوں کے مذہبی فرائض۔ مذہبی ممنوعات۔ اور خدا کے عطا کردہ حقوق کے اعتقادات میں اگر کبھی مداخلت کی جائے۔ تو اس سے ہندوستانیوں کی عقل میں بالکل گرہن لگ جاتا ہے۔ اور وہ دیوانہ ہو کر بلوہ اور فساد اور کشت وخون پر اُتر آتے ہیں۔ اور کم سے کم ہندوستان جیسے ملک میں ایسے قانون کو نافذ کرنا کہ جس کا قائم رکھنا یا توڑنا ایک خانگی خفیہ معاملہ ہو۔ بالکل ناممکن ہے۔

اس پر ہندوستانی اور انگلش مدبرین بالکل متفق ہیں۔ کہ کسی

ایسے قانون کو کہ جس میں لڑکیوں کی شادی کی عمر بڑھا دی جائے ہندوؤں کو آجکل پورے طور سے منظور نہیں ہوگا۔ اس بارہ میں پبلک کی ذہنیت عامہ کی موجودہ حالت کا لحاظ کرکے زیادہ سے زیادہ امید یہی کی جاسکتی ہے۔ کہ شادی کی شرائط میں رضامندی کی عمر بڑھا دی جائے - تجربہ کار آدمیوں کی یہی رائے ہے۔ ۱۸۹۱ء میں گورنمنٹ نے اس طرف کارگر تدبیر کا ایک قدم اٹھایا تھا۔ تب گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ایک حصّہ کی تائید اور حمایت سے رضامندی کی عمر کو دس سال سے بدلکر بارہ سال مقرر کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اگرچہ اس بارہ میں سخت بحث وتکرار رہی۔ کہ جس میں نہایت شدّت کے ساتھ بڑے بڑے بارسوخ راسخ الاعتقاد ہندوؤں نے گورنمنٹ پر یہ الزام لگایا۔ کہ وہ ہندو دنیا کی نہایت پاک بنیادوں پر حملہ کررہی ہے۔ مابعد کی لیجسلیٹو اسمبلی کی مجالس میں یہ معرکہ پھر ازسرنو نمودار ہوا۔ اسمبلی کے غیر سرکاری ہندوستانی ممبروں نے ایسے مسودات پیش کئے۔ کہ جن کا مطلب عمر رضامندی کو اور بڑھا دینا تھا۔ مگر وہ مسودات بحث کے ایک نہ ایک درجہ میں کٹّر ہندوؤں کی کثیر اکثریّت کی مخالفت سے ناکام رہے۔ اور درجۂ قانون حاصل نہ کرسکے۔

ایسے موقعوں پر وائسرائے کی گورنمنٹ کا روّیہ ہمیشہ یکساں طور سے یہ رہا ہے۔ کہ مدنظر مقصد اعظم کو ہمیشہ پسند کیا جائے مگر رائے عامہ کی حمایت اور تائید کے حصول سے پہلے ایسے قوانین

کے پاس کرنے کے خلاف حزم اور احتیاط برتی جائے۔" تاکہ صرف اپنی ہی موجودگی سے یہ قوانین بدنام نہ ہو جائیں۔ لہذا ایسے قوانین کو پاس نہیں ہونے دیا جاتا۔ چونکہ ہندوستان کے پبلک لیڈر کو یہ ترغیب ہوتی ہے۔ کہ وہ قانون کے خالی خولی پاس کر دینے کو ہی اپنے فرض کی تکمیل سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس قانون پر عملدرآمد کرنے کے لئے خیال یا ارادہ یا معقولہ ذمہ داری پر وہ کچھ لحاظ نہیں کرتا۔ اس لئے گورنمنٹ کو مجبوراً زیادہ تر مذکورہ بالا رویّہ پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ کی کارروائی سے کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ ایک طرف سے تو گورنمنٹ پر مذہب کی پاک حدود میں مداخلت کرنے کا ناپاک الزام لگایا جاتا ہے دوسری طرف سے بھی ایسے ہی تلخ و ترش الزام گورنمنٹ پر لگائے جاتے ہیں۔ مگر وہ طرف ثانی کے الزاموں کی نسبت دوسری قسم کے ہوتے ہیں۔

اسمبلی کا ایک کٹر برہمن ممبر چلّا کر کہتا ہے۔ کہ تم کو خاوند اور بیوی کے ایک دوسرے سے الگ کر دینے کا کیا حق ہے؟ تم ہمارے قدیمی تخیّلات اور روایات پر اپنے ناپاک ہاتھ رکھ سکتے ہو۔ مگر ہم تمہاری پیروی نہیں کرینگے۔ (دیکھو مباحث لیجیلیٹو اسمبلی بابت ۱۹۲۵ء کی جلد پانچ کا تیسرا حصہ ۲۸۹۰) پھر اتنی ہی سختی کے ساتھ دوسرا ممبر کھڑا ہو کر یہ تقریر کرنے لگتا ہے۔"

[illegible]

لوگوں کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔

ان مباحث کے مطالعہ سے اس تمام مضمون کے متعلق پبلک رائے کی حالت کا خاصی طرح سے ایک عام منظر سامنے آجاتا ہے۔ بظاہر حالت موجودہ سے تمام ممبران اسمبلی بہت اچھی طرح سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں اختلاف صرف ان دلائل کے وزن سے ہو جاتا ہے۔ جو وہ ان حالات کے مطابق انہیں دیتے ہیں۔

رائے بہادر بخشی سوہن لال حلقہ جالندھر کے ممبر نے شادی کی عمر رضامندی کو چودہ سال تک بڑھانے کے لئے ایک غیر سرکاری ترمیم پیش کرتے ہوئے حسب ذیل دلائل پیش کیں (مباحثہ لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۲۲ء کی جلد دوم کے تیسرے حصّہ کا صفحہ ۲۶۵۰)

"اس ملک کے اعلےٰ طبقوں کے نوزائیدہ بچوں اور نوجوان شادی شدہ بیویوں کے درمیان اموات کی بہت بڑی شرح تعلقات زناشوئی اور لڑکی کی عمر بلوغت تک پہنچنے سے پہلے یا اس کے جسمانی اعضاء کے پورے طور سے نشو ونما پانے سے قبل حاملہ ہو جانے کے باعث رونما ہوتی ہے۔ اس طرح جسمانی نشو ونما سے پہلے خاوند بیوی کی یکجائی کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کی صحت کمزور ہو جاتی ہے۔ بلکہ اکثر بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ کہ جو کمزور اور بیمار ہوتے ہیں۔ اور ان کی بہت بڑی تعداد معمولی قسم کی کسی بیماری یا موسم یا آب وہوا کی سختی کی بھی مزاحمت نہیں کرسکتی۔ اس طرح سے بعض بچے تو پیدائش کے بعد

فوراً ہی ملک عدم کو چل دیتے ہیں۔ یا اپنے بچپن کے دوران
میں مر جاتے ہیں۔ اگر ایسے بچے زندہ بھی رہیں۔ تو پھر ہمیشہ ان
کو ضرورت رہتی ہے۔ کہ ان کی زندگی کو کسی نہ کسی طرح بچانے
ڈاکٹر کے بلانے یا طبی مشورہ لینے یا طبی علاج کی ضرورت رہتی
ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بچے اپنے
آپ یا اپنے خاندان یا اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی نسبت
زیادہ تر گروہ حکماء اور ڈاکٹروں کو نفع پہنچانے کے لئے پیدا
ہوتے ہیں۔ ایسے بچے نہ تو اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ نہ اچھے
سویلین ہو سکتے ہیں۔ نہ باہر کا کام کرنے کے لئے اچھے مزدور
اور نہ اندر کا کام کرنے کے لئے اچھے محنتی بن سکتے ہیں۔ نہ وہ
کسی دشمن پر حملہ کر سکنے کے قابل اور نہ کسی دشمن کے حملہ سے
اپنا بچاؤ کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔ نہ چوروں اور ڈاکوؤں کے
حملوں سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ المختصر بہت سی حالتوں
میں ایسے بچوں کی پیدائش سے اکثر ان کے ماں باپ کی صحت
طاقت اور فراغبالی برباد ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ
سوسائٹی کو کوئی فائدہ ان سے نہیں پہنچتا۔ اکثر حالتوں میں....
خاوند کو اپنی زندگی کے دوران میں بار بار شادی کرنے کا بندوبست
کرنا پڑتا ہے۔ یا تو اس سبب سے کہ اس کی کئی نوجوان بیویوں
کی پے در پے موت واقع ہو چکتی ہے۔ یا اس سبب سے کہ اس
کی بیوی کے بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ جو بچپن میں ہی مر جاتے
ہیں۔

کونسلوں کے پے درپے مباحثات سے اس امر کا پتہ لگتا ہے۔ کہ ہندوستان کی ممبران پارلیمینٹ (لیجس لیٹو کونسل) میں بہت کم ایسے ہیں۔ جو لڑکی کے بالغ ہونے تک اس کے بچہ پیدا ہونے کے زمانہ کو ملتوی کرنے کی قیاسی خردمندی کے منکر ہوں۔ بلکہ ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ نابالغ لڑکیوں کی شادی کے رواج کی ممانعت کرنے کے بغیر ایسا نتیجہ حاصل ہونا بالکل ناممکن ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ سب متفق الزبان ہو کر یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ ممانعت تین اسباب کی وجہ سے کی نہیں جاسکتی۔

پہلا سبب تو یہ ہے۔ کہ ہندوؤں میں غیر متبدل رواج کے مطابق اس کی ممانعت ہے۔ اور شادی سے پہلے بالغ ہو جانے کو عام طور سے اگر مذہبی گناہ نہیں۔ تو معاشرتی گناہ ضرور سمجھا جاتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے۔ کہ باپ اپنی لڑکی کو جب وہ آٹھ دس سال کی ہو جائے۔ تو زیادہ دیر تک اپنے گھر میں رکھنے کی اس لئے جرأت نہیں کرتا۔ کہ کہیں اس کی نیکنامی پر حرف نہ آجائے۔ اس بات کا خاصکر مشترکہ خاندان کے گھرانوں میں زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ جہاں ایک ہی مکان میں بہت سے مرد اور لڑکے۔ بھائی چچازاد بھائی چچے وغیرہ اکٹھے رہتے ہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے۔ کہ شباب کے آغاز ہو جانے کے بعد والدین اس بات کی جرأت نہیں کرتے۔ کہ ان کی لڑکی اپنی

سلہ ۲۳ اور ۲۴ مارچ ۱۹۲۵ء کی لیجس لیٹو اسمبلی کے مباحث کے جلد پنجم کے نمبر ۳ حصے کو اور یکم ستمبر کی جلد ششم کے مباحث دیکھو۔

خواہشات کے پورا نہ ہونے پر ان پر قادر رہ سکے۔

ان گہرے خطرات کو مدّ نظر رکھکر لجسلیٹو اسمبلی کے ایک فاضل برہمن مدراسی ممبر دیوان بہادر ٹی رنگا چاریہ نے ۱۹۲۵ء کے غیر سرکاری مسودہ قانون کے متعلق کہ جس میں رضامندی کی عمر شرائط شادی میں چوّدہ سال تک بڑھانے کی تجویز کی گئی تھی۔ نہایت سرگرمی کے ساتھ اس تجویز کے خلاف تقریر کی۔ عام طور سے اس بات کو تسلیم کر لیا گیا۔ کہ ایسے قانون کو اگر نافذ کر دیا گیا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کسی نہ کسی عذر پر زوجہ کو اس کے خاوند سے الگ رکھا جائیگا۔ اور اس طرح سے لڑکی اپنے باپ کے گھر ہی میں رہا کرے گی۔ چنانچہ اس مدراسی ممبر اسمبلی نے ممبران اسمبلی کو یوں متنبّہ کرتے ہوئے التجا کی۔

" ہمارے ملک میں بارّہ سے لیکر چوّدہ سال تک کی عمر والی لڑکیوں کی جو حالت ہے۔ اس کو یاد رکھو۔ کیا ہماری لڑکیاں ہمارے گھروں میں نہیں ہیں۔ کیا ہماری بہنیں ہمارے گھروں میں نہیں ہیں؟ اس بات کو یاد رکھو۔ اور اپنے پڑوسیوں کو بھی یاد رکھو۔ ہماری عادتوں کو یاد رکھو۔ ہمارے دستورات اور رواجات کو یاد رکھو۔ ہمارے بچپن کی چھوٹی عمر کی ہوشیاری کو یاد رکھو۔ ہمارے ملک کی آب وہوا کی حالت کو یاد رکھو۔ اپنے وطن کی حالتوں کو یاد رکھو۔ میری درخواست ہے۔ کہ اس معاملہ کا نہایت سوچ بچار سے فیصلہ کرو۔"

لیجسلیٹو اسمبلی کے مباحثات کو اسی جلد کے صفحہ ۲۸۹۰

پر ایک اور برہمن ممبر اسمبلی نے بڑی سختی سے اسی قانون کے حسب ذیل مخالفت کی۔

"اس ملک میں لڑکی کے بالغ ہو جانے کی روایات یا حالت کسی اور ملک کی لڑکی کے بالغ ہونے کی حالت سے بالکل ہی مختلف ہے۔ عورت کے بالغ ہونے کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے۔ کہ ہماری عورتوں کو بچپن میں ہی جب وہ اپنی ماں کا دودھ پیتی تھیں۔ یہی بات ذہن نشین کی گئی تھی۔ کہ ان کا شوہر ہی زمین پر ان کا خدا ہوتا ہے۔ برہمن لڑکی زوجہ کے لئے اس کا خاوند بہ نسبت تمام مجتمع معاشرتی مصلحوں کے زیادہ بڑا اور زیادہ سچا اور زیادہ عزیز محسن یا نیکی کرنے والا سمجھا جاتا ہے ... شادی کی تقدیس کے متعلق ہمارے اس قدیم اور شریف روایتی دستور میں دخل دینے کا تم کو کیا استحقاق ہے؟ اس قانون سازی کا مطلب کیا ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو۔ کہ ہندوستان کی عورتوں کو مضبوط اور ان کے بچوں کو طاقتور بنا دو؟ مگر یہ بات یاد رکھو۔ کہ اگر تم ایسا کرنے کی کوشش کروگے تو تم ایسی خرابی پیدا کردوگے۔ کہ جو اس برائی سے زیادہ بڑی ہوگی۔ کہ جس کو تم رفع کرنا چاہتے ہو ... ہر ایک ذریعہ سے لڑکی کے جسم کی خبرگیری کرو۔ مگر اس کو اخلاق سکھلانے میں اور اس کی روح کی سکھلائی کرنے میں بھی کمی نہ کرو۔ تاکہ وہ اس قابل ہو جائے۔ کہ اپنے خاوند کو اپنا خدا سمجھا کرے۔ چونکہ کم از کم ہندوؤں میں ہندوستان کے اندر

درحقیقت یہی حالت ہے .... میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ کہ برباد نہ کرو۔ ہمارے ہندو گھرانوں کو تباہ نہ کرو۔"

لیجس لیٹو اسمبلی کے مباحث کی جلد ششم کے صفحہ (۵۵۸) میں لکھا ہوا ہے۔ کہ اس قسم کی بحث و تمحیص کے دوران میں سلیم اور کوئمبٹور کے ممبر اسمبلی مسٹر شان موکھم چیٹی نے بڑا تلخ جواب حسب ذیل دیا۔

"یہ امر کہ شادی کی برائے نام رسم کسی جرم کے ارتکاب سے پہلے ادا کر دی جائے۔ اس جرم کے ارتکاب کو نہ تو جائز کر سکتی ہے۔ اور نہ وہ جرم ہی جائز ہے۔ مجھکو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔ کہ اگر تم کسی مردم خور سے دریافت کرو گے کہ وہ آدمیوں کو کیوں کھاتا ہے۔ تو وہ اپنے اس نفرت انگیز کام کی بابت یہی جواب دے گا۔ کہ میں اپنے مذہب کے حکم کے مطابق یہ فعل کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ایس کے دتا کلکتہ کے دیسی عیسائی ممبر نے اس بارہ میں یہ تقریر کی:-

"اگر کبھی کا انسان کا بنایا ہوا قانون دنیا میں کوئی موجود ہے تو وہ نوجوان لڑکیوں کو جبریہ ماں بنا دینے کا یہ قانون ہے"

(مباحث لیجس لیٹو اسمبلی ۱۹۲۵ء کی جلد پنجم کے تیسرے حصہ کا صفحہ ۲۸۳۹)

آخر کار عمر رضامندی کو بڑھا کر چودہ برس مقرر کر دینے کا یہ مسودہ قانون عوام کی عدم منظوری کے برف کے طوفان کے

نیچے مدفون ہو کر منتشر ہو گیا۔

دوسری اسمبلی میں وائسرائے کی گورنمنٹ کے لیڈر سرالیگزینڈر مڈیمین نے اس بارہ میں ایک سرکاری قانون کا مسودہ تیار کرکے اس رواج کو توڑنے کی ٹھان لی۔ اور اس درجہ تک ترقی کرلی۔ کہ جس درجہ تک ہندوستان کے پرانے خیال کے لوگ عمر رضامندی کے متعلق متفق ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کے مطابق شادی کی صورت میں عورت کی عمر رضامندی تیرہ سال اور بغیر شادی شدہ عورت کی حالت میں عمر رضامندی چودہ سال مقرر کردی گئی ہے۔ اور یہ بل قانون بن گیا۔ اور اس قانون کا نام ایکٹ انتیس بابت ۱۹۲۵ء رکھا گیا۔

اسمبلی کے جلسہ میں اس قانون کے متعلق جس قدر بحث ہوئی اس سے اس بارہ میں ہندوستانیوں کے میلان طبعی پر اور بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔

بعض مقررین نے بتلایا کہ اس بارہ میں پبلک رائے بتدریج بڑھ رہی ہے۔ جیسا کہ مختلف ذاتوں۔ جماعتوں اور ایسوسی ایشنوں کی کونسلوں۔ قراردادوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس سے زمانہ مستقبل کے لئے بہترین امید پیدا ہوتی ہے۔ یہ قابل نفرت قانون رنجیدہ اور فضول ہے۔ مگر یہ اس امر کی طرف ہماری توجہ منعطف کرتا ہے۔ کہ کٹر ہندوؤں کی جماعت جو تمام ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت پر مشتمل ہے۔ وہ بچپن کی شادی کی قانونی ممانعت کو حرف بحرف جنگ مقدس

کا حکم نامہ سمجھیگی۔

اسی طرح سے یہ بھی بتلایا گیا۔ کہ نہایت کمسن بیوی کو اس کی بچپن کے دوران میں محفوظ رکھنے کی کسی عملی کوشش کو ہندو لوگ شادی کے پاک تعلق پر حملہ سمجھینگے۔ اس لئے یہ کوشش کارگر ہونی ناممکن ہے۔ یقیناً اس کا نتیجہ کشت وخون ہوگا۔ اور ملک میں بدامنی پھیل جائیگی۔

اجمیر میرواڑہ کے رائے صاحب ایم ہربلاس ساروا نے کہا[1] کہ گو یہ بات سچ ہے کہ :-

"جہاں کوئی معاشرتی دستور یا مذہبی رسم انسانیت کے احساس پر حملہ کرے۔ یا لوگوں کے ایک بے بس اور بیکس طبقہ پر بے انصافی کرے۔ تو ملک کی مجلس واضعان آئین وقوانین کو اس میں مداخلت کرنے کا استحقاق حاصل ہو جاتا ہے۔ تین یا چار سال کی لڑکی سے شادی کر لینا یا نو یا دس سال کی لڑکی سے تعلقات زناشوئی کی اجازت دینا ہرجگہ انسانیت کے احساس پر سخت ظلم کرتا ہے۔

مگر الہ آباد کے پنڈت مدن موہن مالویہ کا خیال مذکورہ بالا ممبر کے خیال سے مختلف تھا[2] جس نے کہا کہ :-

"مجھکو حالت کی تلخ اصلیت کا مقابلہ کرنا پڑ گیا۔ اس اصلیت میں لڑکیوں کی بارہ سال کی عمر ہونے سے پہلے شادی کرنے کی عام اجازت یا یہ کہ ایک وسیع دستور شامل ہے۔ اور اسی سے لئے

---

[1] مباحثات لیجس لیٹو اسمبلی مذکورہ جلد ششم صفحہ ۵۶ [2] ایضاً صفحہ ۵۷۳۔

شادی شدہ جوڑہ کو ملنے کی ممانعت کرنا ممکن نہیں ہے .... میری یہ رائے ہے۔ کہ شائد یہ بات سر دست سب سے بہتر ہو گی ۔ کہ ہم فی الحال شادی شدہ لوگوں کی حالت میں موجودہ قانون پر قناعت کریں۔ اور تعلیم کی ترقی اور معاشرت کی اصلاح پر اعتماد کریں۔ کہ یہ دونوں باتیں شادی کی عمر رضامندی کو بڑھا کر مناسب سطح پر لے آئیں گی ۔ صاحبان مجھکو یقین ہے ۔ کہ اس معاملہ میں بہت بڑی حدتک ترقی ہو چکی ہے ۔ بہت سے صوبجات میں اعلےٰ طبقہ کے لوگوں میں شادی کی عمر بڑھ رہی ہے ۔ اس خرابی کے بسمل سب سے زیادہ بدقسمتی سے غریب طبقہ کے لوگ ہیں ۔ اعلےٰ طبقوں کی نسبت کم سنی میں غریب طبقہ کے لوگوں میں شادیاں بہت زیادہ کی جاتی ہیں ۔

بردوان کے مسٹر امرناتھ دت نے مجوّزہ قانون کے خلاف حسب ذیل تقریر کی :۔

"ہم کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ۔ کہ ہم اپنے ترقی یافتہ خیالات کا اپنے سے کم ترقی یافتہ اہل ملک پر دباؤ ڈالیں .... ہمارے دیہات کے لوگوں میں بڑی دھڑہ بندی ہے اگر رضامندی کی عمر بڑھا کر تیرہ سال کر دی جائے ۔ تو صحیح یا غلط طور سے ہم یہ بات پائیں گے ۔ کہ گاؤں میں فریق مخالف کے ممبروں کے کہنے سے پولیس سخت تفتیش کرے گی ۔ جس سے لوگوں کی بڑی بدنامی ہو گی ۔ اور ان کو تکلیف بھی بہت ہوا کرے گی ۔

میری (گورنمنٹ سے) یہ درخواست ہے ۔ کہ وہ اس مسودہ

قانون کو فوراً واپس لے لے ... میں چونکہ بنگال سے آیا ہوں۔ اس لیے صوبہ مذکور کے لوگوں کی رائے کی اکثریت سے واقف ہوں۔"

جنوبی ارکاٹ کے ممبر مسٹر ایم کے اچاریہ نے اس تبدیلی عمر کی تجویز کی سخت مخالفت[1] کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ سوچا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آجکل جو کام قصور نہیں ہے۔ اس کو قصور بنا دیا جائے۔ اور آج کل جو کام جرم نہیں ہے اس کو جرم بنا دیا جائے۔ اور جس کام کو ہم جرم سمجھ نہیں سکتے۔ خواہ اس بارہ میں بعض اور لوگوں کا خیال ہمارے اس خیال سے کتنا ہی مختلف ہو۔"

اس کے بعد اسی ممبر نے چند منٹ کے بعد پھر یہ کہا کہ:۔

"ہندوستان میں لوگوں کی کسی معزز اور شریف جماعت کی یہ رائے بہت ہی کم ہے۔ جو اس اصلاح کو نہایت ہی ضروری سمجھتی ہو۔ اپنے وقت مناسب پر یہ اصلاح ہو کر رہے گی۔ اور اس اصلاح میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ صرف آنریبل ممبروں کو کچھ قانون سازی کے انٹے گولی۔ اور لٹو اس وقت تک کھیلنے کے لئے دیدیئے گئے ہیں۔ کہ جب تک ہم لوگوں کا شملہ میں قیام ہے۔

---

[1] مباحثات لیجس لیٹو اسمبلی جلد ششم صفحہ ۵۵۸
[2] " " " " ۵۵۱
[3] " " " " ۵۵۶

کم سِنی میں شادی کرنا اور جوانی کی مَوت مرنا

ہندوؤں کے بے نتیجہ چکّروں پر گاہ بگاہ شمالی ہند کا ایک دلیر ممبر بھی آواز کس دیتا ہے۔ مگر شاذ و نادر۔ کیونکہ اس مضمون پر وہاں بہت کم دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے۔ تاہم جب کبھی یہ آواز اُٹھتی ہے۔ تو بالغ نظری کے ساتھ آتی ہے۔

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم جیسا کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ایک مسلمان ممبر ہیں۔ دور و دراز شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قایم مقام کی حیثیت سے انہوں نے حسب ذیل تقریر کی:۔

"میں معاملۂ زیر بحث کے عملی پہلو کی نسبت صرف چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے وطن صوبہ سرحدی میں کم سنی میں شادی نہیں ہوتی۔ اس لئے یقیناً اس مسودۂ قانون سے ہم پر تو بہت کچھ اثر نہیں پڑیگا۔ ... میرے خیال میں .... مناسب علاج یہی ہے۔ کہ مرد کی شادی کے لئے ایک خاص عمر اور عورت کی شادی کے لئے ایک اور خاص عمر مقرر کردی جائے۔ ...مگر میرے خیال میں ملک اس اصلاح کے لئے تیار نہیں ہے ... اچھا اب آپ

خیال فرمائیں سینیئنٹ کون ہے گا۔ تحقیقات کون کرے گا۔ گواہ کون نہیں گے۔ اور فیصلہ پر عملدرآمد کون کراتے گا ؟ . . . اس کے علاوہ ایک مشکل اور بھی ہے . . . . تم نوجوان جوڑہ کو شادی کرنے اور باہم رہنے کی اجازت دے دو گے۔ اور ان کے باہمی اشتہاتے زنا شوئی کے تیز تر کرنے کا موقعہ ان کو دے دو گے۔ اور پھر ان کو قدرتی راہ ورسم کے پیدا کرنے سے قانون کے خوف سے باز رکھنا چاہو گے۔ صرف اس لیے کہ وہ ابھی کسی مقررہ عمر کی حد تک نہیں پہنچے . . . . اچھا اب فرض کرو کہ یہ قانون نفاذ پذیر ہے۔ اور نوجوان جوڑہ باہمی راہ و رسم پیدا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ اس رکاوٹ سے تم بڑی کثرت سے نوجوان لڑکوں کو باہر بازاروں میں بھیجد وگے . . . البتہ جبتک تم نوجوان لوگوں کی شادی کی اجازت دیتے رہو گے۔ تب تک اس بات کی کوئی کافی دلیل موجود نہیں ہے۔ کہ تم کیوں ایسے قوانین بناؤ۔ کہ جن سے ان کی خانگی زندگی میں مداخلت کرنی پڑے۔

بہت سے لوگ آخری طور سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ قانون کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائیگا۔ اور قانون کے نفاذ پذیر ہونے کے باجود بھی کم سن بیوی کو چھونے کا کام خاوند کے پاک حقوق کے ماتحت قدرتی عقل حیوانی کی روشنی میں بدستور جاری رہے گا۔

بہرحال ہندوؤں کے دلائل میں بظاہر اس بات کا عام

یقین پایا جاتا ہے کہ معاشرتی دستور (سوشل) تہذیب کے لئے قانون کے بن جانے سے خواہ اس قانون کے نفاذ پذیر ہونے کی بالکل بھی امید نہ ہو۔ قوم پر تعلیمی اثر ضرور پڑتا ہے۔ اس لئے خوشی کے ساتھ اس قانون کو ایک مکمل کام کا حصہ سمجھ لینا چاہئے ہندوستانی لیڈر اپنی یہ رائے ظاہر کردیا کرتا ہے کہ "لوگوں کو تعلیم سے بہرہ مند کردینا چاہئے" پھر وہ اسی مسلک پر چلنے لگیں گے۔ کہ جو میں اس وقت سنا رہا ہوں" یہ رائے دیکر وہ اس معاملہ سے اپنا قطع تعلق کرلیتا ہے۔ گویا اس کا کام پورا ہو چکا۔

دیوان بہادر ٹی رنگا چاریہ۔ اسمبلی کے مدراسی برہمن ممبر نے جو آواز اٹھائی تھی۔ اور جس کا اس سے پہلے بھی ذکر ہوچکا ہے۔ وہ ان چند آوازوں میں سے ایک آواز تھی۔ جو اس خصوصیت سے مدنظر نقطہ پر نکتہ چینی کی غرض سے بلند کی گئی تھیں۔ اس اصلاح کی ترمیم کرنے والے ممبروں کو مخاطب کرکے ان سے اسمبلی کے جلسہ میں کہا کہ:۔

"کیا میں اپنے آنریبل دوست سے یہ بات دریافت کرسکتا ہوں۔ کہ اس ہال کے باہر اس امر کے متعلق اس نے کتنے جلسوں میں تقریریں کی ہیں (ایک آواز۔ کبھی نہیں) کیا اس نے اپنے خاص صوبہ میں کبھی کوئی جلسہ منعقد کرکے ایسی اصلاح کے بیش بہا ہونے کے متعلق لوگوں کے سامنے تقریر کی ہے؟ جناب من! آپ کی اس اسمبلی میں جو پوزیشن

ہے۔ اس سے یہاں تو آپ آسانی سے فائدہ اٹھا کر ایسی مجلس سے اپیل کر رہے ہیں۔ کہ جس مجلس کے سب کے سب لوگ آپ کی ہم خیال ہیں۔ اور یہ سب لوگ قانون مجوزہ بنانے میں آپ کی مدد بھی کر سکتے ہیں۔ مگر... ملک میں جا کر اپنے اہل وطن مردوں اور اہل وطن عورتوں کو اس اصلاح کی عمدگی کا یقین دلانا آسان کام نہیں ہے۔

اس طرح سے ان کونسلوں میں ذمہ داری کا بوجھ کبھی آگے اور کبھی پیچھے پھینکا جاتا ہے۔ گویا ذمہ داری فقیر بنکر اپنے ٹکاؤ کی جگہ تلاش کرتی ہے "صرف یہ برہمن لوگ ہیں جو بچپن میں اپنی لڑکیوں کو بیاہ دیتے ہیں" یا "ان کے برابر ہی صرف سنچ ذاتیں ہیں۔ کہ جن میں کم سنی میں شادی کر دینے کا دستور ہے"۔ غرضکہ "ہر حال میں کم سنی کی شادی کی خرابیوں کو بہت بڑے مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں دخل دینا نادانی ہے۔ اور رضاکار معاشرتی اور مذہبی اصلاح کی مجالس پر ان اپنی بیویوں کی حفاظت کا بھروسہ کر لیا جائے۔

مگر سیاست دانوں کے قیاسات۔ اور اودھر اُدھر کی زٹلوں اور حاصل شدہ ترقی کی بے ٹھکانا تصدیقوں سے منہ موڑ کر جب ہم سرد تحریرات کی شہادت کو مطالعہ کرتے ہیں۔ تو پھر ہم کو جھٹکا دیکر کوئی پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے حسب ذیل انکشاف ہوتا ہے:۔

"تمام عملی اغراض کے لئے یہ بات قرار دی جا سکتی ہے

کہ ہر عورت کی بالغ ہونے پر یا بالغ ہونے کے بعد فوراً شادی کر دی جاتی ہے۔ اور اس لئے وہ ہر ایک حالت میں بالغ ہونے پر ہمبستری شروع کرتی ہے"

اس امر کی اہمیت اس اندازہ سے اور بھی ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہر نسل میں بیس مائیں بچہ پیدا ہونے کی تکالیف سے لقمۂ اجل ہو جاتی ہیں[1] دنیا کے جنگ عظیم میں سلطنت برطانیہ۔ فرانس۔ بلجیم۔ اٹلی اور سلطنت متحدہ امریکہ کی فوج کے جتنے آدمی مارے گئے۔ ان تمام سلطنتوں کے ان مقتولین کی مجموعی تعداد سے بھی بہت زیادہ عورتوں کی موت کے یہ شمار و اعداد ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستان کی آبادی کی جسمانی قوت کا درجہ بین الاقوامی فہرست کی تہ میں یعنی سب سے نیچے ہے۔

اب ہم پھر لیجس لیٹو اسمبلی کی طرف اپنی عنان بیان پھیر کر شمالی ہند کے ایک اور شخص کی تقریر کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ شخص ایک سپید ریش سپاہی۔ طویل۔ سیدھا۔ دُبلا۔ پتلا۔ مگر طاقتور اور میخ کی طرح سخت ہے۔ اور اپنے گرد و پیش کے جنوبی ہند کے ممبر اس پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ یہ شخص سردار بہادر کپتان ہیرا سنگھ براڑ سکھ پنجاب ایک ضعیف العمر سکھ سپاہی ہے۔ کپتان ہیرا سنگھ نے کہا کہ:۔

---

[1] رپورٹ مردم شماری ہند ۱۹۲۱ء ضمیمہ صفحہ ۵ مباحثات لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۲۲ء جلد سوم حصہ اول صفحہ ۸۰۲ [2] ایضاً ۱۹۲۵ء جلد پنجم حصہ سوم صفحہ ۲۹-۲۸-۳۱)

"جناب کم سنی کی اموات کو روکنے کا اصلی حل میرے خیال میں یہ ہے۔ کہ جو ماں باپ ایسے بچے پیدا کریں۔ ان کو سزا دی جائے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہمارے اُن بہت سے دوستوں کے مُنہ پر تھپڑ لگایا جائے۔ کہ جو صحت مند بچوں کے پیدا کرنے کے لئے عمر رضامندی کے بڑھانے کی ہمیشہ ہی مزاحمت کیا کرتے ہیں ... کیا یہ گناہ نہیں ہے۔ کہ جب یہ نو یا دس برس کی لڑکی یا دس سالہ لڑکے کو میاں بیوی کہیں؟ یہ تو شرم کے مارے ڈوب مرنے کی بات ہے (آوازیں نہیں نہیں) یہ امر موجودہ اور آیندہ نسل کے لئے بڑی بدبختی اور مصیبت ہے ... نو یا دس برس کی لڑکیاں جو خود بچہ ہوتی ہیں۔ اور جن کو زوجہ بننے کی نسبت زیادہ تر اپنی گڑیوں اور کھلونوں سے کھیلنا چاہیئے۔ بچوں کی مائیں بنا دی جاتی ہیں۔ کم عمر لڑکے جن کو اسکولوں میں سبق لے کر علم حاصل کرنا چاہیئے۔ باپ بنا دیئے جاتے ہیں۔ جن پر نصف درجن لڑکے اور لڑکیوں کے کنبہ کی پرورش کا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے ... میں ایسے لوگوں کی صحبت میں جانا پسند نہیں کرتا۔ مجھکو شرم آتی ہے اس لئے کہ وہاں مردمیّت یا کوئی زنانیّت نہیں ہے۔ مجھکو ایک چھوٹی سی بارہ برس کی لڑکی کو بطور اپنی زوجہ کے ساتھ لیکر سوسائٹی میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہونی چاہیئے ....

ہم یہاں صرف باتیں بناتے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ وہ تمام

باتیں اسی بازار میں چھوڑ جاتے ہیں۔ تمام باتیں اسی چبوترہ
پر رہ جاتی ہیں اور ہم اپنے گھروں کو ایک بات بھی ساتھ نہیں
لے جاتے۔ اس لئے کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلتا... صحت مند بچے
طاقتور قوم کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ہر ایک شخص جانتا ہے۔ کہ
ماں باپ صحت مند بچے پیدا نہیں کر سکتے۔ ہم فائدہ مند
تب ہی ہو سکتے ہیں۔ جبکہ ہماری زندگی طویل ہو۔ اگر کم سنی اور
بچپن کی شادی کی ممانعت نہیں ہوگی۔ تو ہم طویل الحیات ہو
ہی نہیں سکتے۔ ہندوستانیوں کا یہ مقولہ ہے۔ کہ کم سنی میں شادی
کرنا۔ اور نوجوانی میں مرجانا۔

انڈین لیجن میں ہندوستانی اور ہندوستانی کے درمیان
صفائی سے گفت و شنید کا معاملہ اصل میں واقعات پر مبنی
ہے۔ مگر اس پوشاک کے دیکھنے سے بھی کچھ علم حاصل ہو جاتا
ہے۔ کہ جو لباس یہ واقعات اس وقت پہن سکتے ہیں۔ کہ جب
اس لباس کو کوئی شاعر غیر ملکی لوگوں کے غور کے لئے آراستہ
کرتا ہے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے حال میں ایک مضمون "شادی
کے متعلق ہندوستانیوں کا مطمح نظر" کے عنوان سے لکھا جس میں
بچپن کی شادی کو ارفع روح کا پھول بتلایا ہے بچپن کی شادی
جنسیت اور مادیات کے اوپر ایک فتح ہے۔ جو قوم کی عورتوں
کے ابھارنے کے لئے اعلیٰ رتبہ کی عقل اور ہوشیاری نے حاصل
کی ہے۔ مگر سر رابندر ناتھ ٹیگور نے جو نتیجہ بچپن کی شادی کا نکالا
ہے۔ اس سے منطقی اور عقلی طور سے اس بات کا پختہ یقین ہو

بتایا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو پیشتر اس کے کہ وہ بلوغت کے درجہ تک پہنچیں۔ لازمی طور سے جکڑ بند کر کے ان کے خاوندوں کو دے دیا جائے۔ تاکہ وہ بخوبی قابو میں رکھی جائیں۔ مسٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے الفاظ[۱] یہ ہیں:-

"خواہش... جس کے خلاف ہندوستان کے شادی کے مسئلہ کے حل نے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ قدرت کی سب سے زیادہ زبردست جنگجو ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ کہ اس خواہش کو کس طرح مغلوب کیا جائے۔ ایک آسان مسئلہ نہیں ہے۔ ایک خاص عمر ہوتی ہے۔ اس وقت مرد اور عورت کے درمیان یہ خواہش یا قوت جاذبہ اپنے کمال عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ پس اگر شادی کو معاشرتی مرضی کے مطابق سرانجام دینا ہے (تعلق رکھنے والے مرد یا عورت کی پسند سے الگ ہو کر) تو شادی کی مراسم کو مذکورہ بالا خاص عمر سے پہلے پہلے لازمی طور سے ختم کر دینا چاہیئے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں کم سنی کی شادی کا رواج پڑ رہا ہے۔"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ عورت میں اس سمجھ کے پیدا ہونے سے پہلے کہ میں عورت ہوں اس کی شادی ضرور کر دینی چاہیئے۔

لیبے معاملہ سے جیسا کہ یہ ہے۔ اور چونکہ زمانۂ حال کے ہندوستانی اہل قلم میں سے سب سے زیادہ مشہور و معروف

---

[۱] کتاب "دی بک آف میریج" کیسر لینگ جوناتھن کیپ لمیٹیڈ لنڈن ۱۹۲۶ء۔

شخص کی قلم سے نکلا ہوا ہے۔ دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم مادہ پرست اگر فوراً ہی اس مشرقی اہل قلم کے استعارات کو جھٹ قبول کرلیں۔ کیونکہ یہ راقم روزانہ انسانی زندگی کی جس کا وہ ذکر کرتا ہے۔ مو بہو اور ہو بہو تصویر کھینچ رہا ہے۔ تو ہم سیدھی راہ سے بھٹک کر غلط راہ پر پڑ جائینگے۔

اب تک جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے۔ وہ کم سنی کی شادی کے سلسلہ میں بچوں کی قسمت کے متعلق تحریر کیا ہے۔ ہندوستان میں پیشہ ور طوائفوں کے متعلق عام مضمون کو اس کتاب میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس حیاسوز کام کی چند شکلیں یہاں درج کردی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان سے قطب نما کی اطراف کا رُخ معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان کے بعض حصص میں بالخصوص احاطۂ مدراس اور صوبہ اڑلیسہ کے ہندوؤں میں ایک دستور مروّج ہے۔ کہ جس کے مطابق دیوتاؤں کو کسی خاص امر کی مہربانی کرنے کے لئے راضی کرنے کے واسطے ماں باپ یہ وعدہ کرلیتے ہیں۔ کہ اب کے ان کا جو بچّہ پیدا ہوگا۔ اگر وہ لڑکی ہوئی۔ تو اس کو دیوتاؤں کی نذر کردیا جائے گا۔ یا بالخصوص کوئی خوبصورت لڑکی جو اپنے قدرتی ماحولات میں کسی نہ کسی سبب سے زائد از احتیاج سمجھی جاتی ہے۔ تو اس کو مندر میں چڑھاوے کے طور پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس چھوٹی سی جان کو مندر کی عورتوں کو دیدیا جاتا ہے۔ یہ بھی اس سے پہلے

اسی طرح سے منت چڑھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ تاکہ وہ اس چھوٹی سی جان کو ناچنا اور گانا سکھلائیں۔ اکثر پانچ برس کی عمر ہی میں جبکہ وہ بہت مرغوب اور دل پسند سمجھی جاتی ہے۔ وہ پجاریوں کی خاص کسبی یا طوائف بنادی جاتی ہے۔

اگر وہ جوانی سے گذر کر ادھیڑ عمر تک زندہ رہی۔ تو وہ مندر کی روزانہ عبادت کے وقت دیوی یا دیوتا کے روبرو ناچتی اور گاتی ہے۔ اور مندر کے گرداگرد مکانات میں جب جاتری دیوتاؤں کی زیارت یا عبادت کے لئے آکر ٹھہرتے ہیں۔ تو وہ عورت ہمیشہ ان مکانات میں تیار رہتی ہے۔ اور کرایہ پر جو جاتری چاہے۔ اس عورت کو اپنے کام میں لاسکتا ہے۔ اس حالت میں اس کو نہایت خوبصورت کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اکثر دیوتاؤں کے زیور اور جواہرات سے اس کو لاد دیا جاتا ہے۔ اور جب تک کہ اس کی رعنائی اور خوبصورتی مرجھا نہ جائے وہ اسی کام میں اپنی زندگی گذارتی ہے۔ پھر جب اسکی خوبصورتی اس کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ تو اس کے جسم پر اس دیوتا کی تصویر گود کر کہ جس کے زیرسایہ اس نے اب تک اپنی زندگی بسر کی۔ اس کو مندر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ کہ پبلک سے خیرات مانگ کر اپنا گذارہ کرے۔ مندر سے بھی اس کا تھوڑا سا وظیفہ مقرر کردیا جاتا ہے۔ اور اس کو یہ مسلمہ حق دیدیا جاتا ہے۔ کہ وہ خیرات مانگ مانگ کر گداگرانہ زیست بسر کرے۔

اس لڑکی کے ماں باپ جو اچھے کھاتے پیتے اور اچھی ذات اور

اچھے طبقہ میں سے ہوتے ہیں۔ اپنی لڑکی کے اس طرح سے مندر کی خادمہ بنا دینے پر ذرّہ بھر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ بلکہ لوگ ان کے ایسے فعل کو ان کی نیکنامی کا باعث سمجھتے ہیں اس لڑکی کی اور اس کے مانند اور دوسری عورتوں کی ایک خاص ذات بن جاتی ہے۔ جس کو دیوا داسی یا دیوتاؤں کی رنڈیاں کہتے ہیں۔ یہ مندر کے ساز و سامان میں ایک مسلمہ جزو لاینفک سمجھی جاتی ہیں۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے۔ کہ کس طرح سے ایک ذمّہ دار گورنمنٹ نے ملک میں اس رواج کے جاری رہنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ تو اس کے جواب کی تلاش کے لئے بہت دور جانا ضروری نہیں ہے۔ اس رواج نے پبلک احساس کی حمایت کے سبب سے لکیر کے فقیر اور مذہبی جوشیلے لوگوں میں قدیم الایام سے بڑے گہرائی تک جڑ پکڑ رکھی ہے۔ اگر اس رواج کے بند کرنے کے لئے براہ راست کوئی تدبیر کی جائے۔ تو جو شخص کہ اس تندہی اور ناراضی کا منظر دیکھنا چاہے۔ کہ جس کے ساتھ یہ لوگ کھلم کھلا اور خفیہ دونوں طور سے اور مذہب کے نام سے اس دستور کو جاری رکھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اس کا جواب اس غیر معمولی کتاب جنوبی دکن کے ضلع

---

[1] دیکھو کتاب دی گولڈن بف مؤلفہ جے۔ جی فریزر مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی لنڈن ۱۹۱۱ء۔ اور کتاب ایڈونس۔ ایٹیس اسیرینر جلد اول صفحات ۶۱ و ۶۵۔

تناولی کے قصبہ ڈوھنا دُور)

اور مس ایی ولسن کار میکائیل کی بنائی ہوئی بہت زیادہ خاموش
کتاب "لوٹس ھرڈس تھنگز ایڈدے آر" وغیرہ مطبوعہ مارگن اینڈ
سکاٹ لندن سے پا سکتا ہے۔

دیوتاؤں سے بچیہ" لڑکیوں کی شادی کے دستور کو اگر
جبرًا روک دیا جائے۔ تو وہ صوبہ مارے غصہ کے دیوانہ
ہو جائے۔
تم اہل مشرق کو زبردستی تیز نہیں چلا سکتے" مگر مغربی حیاء
اور مغربی لوگوں کے میل جول نے زیر سطح کام جاری کر رکھا
ہے۔ اور سالہا سال سے برٹش حکام کی مسلسل مگر خاموش تعلیم
نے اغلبًا اتنا زیادہ کام انتہائی تبدیلی پیدا کرنے کا کر دیا
ہے۔ کہ جو اور کسی جبر و تشدد سے انجام نہیں پا سکتا تھا۔
مثلًا جب ایک تجویز لیجیسلیٹو اسمبلی میں پیش ہوئی کہ شادی
کے قطع نظر رضامندی کی عمر بڑھا دی جائے۔ تو ایک ممتاز
ممبر راؤ بہادر ٹی رنگا چاریئر نے اس تجویز کی نہایت سختی سے
مخالفت کی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ ایسی تدبیر سے مندر کی
رنڈیوں کو بہت سخت مصیبت پیش آ جائے گی۔
کس لئے مصیبت آ جائے گی
اس نے بتلایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ دیوا داسیوں کی

بیٹیاں کسی اعلےٰ ذات کے ہندو سے بیاہی نہیں جا سکیتں۔ تو چونکہ ان لڑکیوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ تو اُن کی مائیں ایک خاص طبقہ کے زمینداروں سے جو بہت بڑے رئیس یا مالکان اراضی ہوتے ہیں۔ کچھ بندوبست کرکے اپنی لڑکیوں کا تعلق ان زمینداروں سے کرا دیتی ہیں۔

آگے چلکر یہ ہمدرد قانون ساز اسمبلی کو متنبہ[1] کرتا ہے۔ کہ اگر لڑکی کی عمر رضامندی بڑھا دی جائیگی۔ تو پھر کوئی زمیندار اس بڑی عمر کی لڑکی کی خواہش نہیں کریگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک اچھا سودا بنتے بنتے بگڑ جائیگا۔ اور لڑکی پھر اپنی غریب ماں کے ہاتھوں میں آکر جم جائیگی۔ اس مباحثہ میں دلچسپ بات اس ممتاز برہمن ممبر کے اپنے اہل وطن کی عمومی احساس کے اظہار میں آواز بلند کرنا نہیں ہے۔ بلکہ دلچسپ بات وہ مخالفت ہے۔ کہ جو اس کی تقریر سُنکر اس کے گرد اگرد کی نشستوں والے ممبروں نے کی۔ جنہوں نے بالکل ہم آہنگ ہوکر اس دلیل کو کہ اب سے ایک نسل پہلے اس تجویز کو اور قسم کی قبولیت حاصل ہوتی۔ پسند نہیں کیا۔

پھر آڑلیسہ کے ممبر مسٹر مصرا نے ایک تقریر کی۔ جس میں اس نے دیوا داس اور معمولی داس یا رنڈی طوائفوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار حسب[2] ذیل کیا :۔

---

[1] مباحث لیجس لیٹو اسمبلی ۱۹۲۳ء جلد سوم حصہ چہارم صفحہ ۲۸۰۷ و ۸)

[2] مباحث لیجس لیٹو اسمبلی ۱۹۲۳ء جلد سوم حصہ چہارم صفحہ ۲۸۲۶-۷)

"یہ قدیم الایام سے چلی آئی ہیں .... وہ پرانوں اور دوسرے
جلسوں کے لئے اور دیوتاؤں کی عبادت کے گیت گانے کے
وقت ضروری سمجھی جاتی ہیں .... اس بارہ میں بہت کچھ کہا
گیا ہے۔ کہ ان کی لڑکیوں کو زمینداروں اور راجاؤں کو دے
دیا جاتا ہے ... زمیندار لوگ بھڑووں کی معرفت لڑکیوں کو
کبھی نہیں لیتے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ:۔
جب کسی زمیندار یا راجہ کی شادی ہوتی ہے۔ تو ان کی بیوی
یا رانی اپنے ہمراہ چند لڑکیوں کو خادمہ کے طور پر لاتی ہیں۔ او
بھڑووں کی معرفت لڑکیوں کو بہم پہنچانے کا کام کبھی ہوا ہی
نہیں۔ اور کوئی شریف آدمی۔ خواہ وہ زمیندار ہو یا راجہ ہو یا
معمولی آدمی ہو۔ لڑکیوں کے حصول کے لئے ایسے بدنام ذریعہ
سے کبھی کام نہیں لیگا۔ ہم ان (نابالغ) لڑکیوں کے لئے
کہ جو اپنی خبرگیری اپنے آپ کرسکتی ہیں۔ اتنا خیال کیوں کریں"
مسٹر مصرا کی اسپیچ نے اگرچہ اس میں سیدھے سادے
واقعات کا بیان تھا۔ مغربی اثر کی ایک اور علامت کا اظہار
کیا یعنی اسمبلی کے بہت سے اس کے ہم مذہب ممبروں کو
اس کی یہ تقریر قطعی طور سے ناگوار گذری۔ اصل بات
ہے۔ کہ وہ اس کے نئے بیان کو اسمبلی کے کاغذات میں درج ہو
پسند نہیں کرتے تھے۔ بار بار ممبروں نے یہ زور ڈالا۔ کہ "ا
بیان کو واپس لے لو"۔ ان کے بار بار دخل دینے سے مسٹر مصرا
کی تقریر میں ہرج پڑنے لگا۔ اور ان دوسرے ممبروں نے

الفاظ نے کم سے کم ایک جدید واقفیت یعنی اس زوردار ذہنی تحریک کا کافی ثبوت دیدیا۔ جو اس سرزمین میں نئی پیدا ہو رہی ہے۔

ان لوگوں میں کہ جن کا مذہب ان کو یہ سکھلاتا ہو۔ کہ ہر قسم کے عمل سے آزاد رہنا کامل کامیابی اور تحصیل مطلب کا تاج ہے۔ ذہنی احساس کو ٹھوس عمل کی شکل میں تبدیل کرنے کے لئے ایک اور غلامانہ ذہنی کارروائی درکار ہوتی ہے۔

پانچویں فصل

عیاں راچہ بیاں

بچپن کی شادی کا جیسا کچھ خاکہ مذکورہ بالا واضعان آئین نے اوپر کھینچا ہے۔ اگر اجنبیوں کو اس کم سنی کی شادی کے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھنے منظور ہوں۔ تو اس کا بہت آسان ذریعہ یہ ہے۔ کہ وہ عورتوں کے ہسپتال کا جاکر ملاحظہ کریں۔ چنانچہ میں نے پنجاب سے بمبئی تک اور مدراس سے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ تک تمام زنانہ ہسپتال دیکھے۔ مردان زنانہ ہسپتالوں کو بمشکل دیکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ ڈاکٹر ہو۔ یا کوئی ہو۔ اس کو مریضہ عورت کو دیکھنے کے لئے شاذونادر ہی داخل کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے شمال مشرقی شہروں میں سے ایک میں پردہ دار عورتوں کے معالجہ کے لئے ایک چھوٹا سا زنانہ ہسپتال ہے۔ جو ہندوستانی عورتوں کو نہایت پسند ہے۔ یہ ڈرپوک عورتیں جن کا اس ہسپتال میں ہجوم ہوتا ہے۔ اکثر اپنے گھروں کی چار دیواری میں سے پہلے ہی بار باہر نکل کر یہاں نہ آتیں۔ مگر ان کا درد۔ اور تکلیف ان کو زبردستی یہاں لے آتی ہے۔

سلمان عورتیں تو ہمیشہ ہی ۔ مگر اکثر ہندو عورتیں بھی پردہ دار
ڈاڑیوں میں یہاں آتی ہیں ۔ ان سواریوں کے چاروں طرف
پردے پڑے ہوتے ہیں ۔ ان پردوں میں یہ عورتیں چھپی
ہوئی ہوتی ہیں ۔ یا سربند صندوقول (ڈولیوں) میں بیٹھکر
تی ہیں ۔ کہ جن کو کہار کندھوں پر اسباب کی گٹھڑیوں کی
طرح اٹھاکر لاتے ہیں ۔ اور جن کے اندر ان عورتوں کے بیٹھنے
کے لائق مشکل گنجایش ہوتی ہے ۔ ان میں گورنمنٹ کے کلرکوں
کی بیویاں ۔ اہلکاروں یا پیشہ وروں کی بیویاں کبھی دولتمند
عورتیں ۔ کبھی غریب عورتیں ۔ کبھی اعلےٰ ذات کی عورتیں کبھی
نیچی ذات کی عورتیں غرضکہ سب قسم کی عورتیں ہوتی ہیں ۔
بالکل ناامیدوار مایوس ہوتی ہیں ۔ مگر چونکہ وہ درد اور تکلیف
کے مارے مررہی ہیں ۔ اس لئے مذہبی منافرت اور ذات
پات کی رکاوٹوں کا کچھ خیال نہ کرکے یہاں شفا حاصل کرنے
کی امید میں آتی ہیں ۔

اس ہاسپتال میں بہت سے ایک منزلہ بنگلے ہیں ۔ ان
میں سے کچھ تو وارڈ ہیں ۔ اور کچھ الگ الگ کمرے بنادیئے
گئے ہیں ۔ ابتدا میں جسے کئی سال گذرے ہیں ۔ جب یہ ہسپتال
یہاں قائم کیا گیا ۔ تو عورتیں بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ معالجہ
کے لئے آنے لگیں ۔ پہلے سال صرف نو عورتیں بچے جننے کے
لئے یہاں آئیں ۔ مگر اب تو یہاں ہر ایک پلنگ رکا ہوا ہے ۔ بلکہ
برآمدہ بھی مریضہ عورتوں کی کھاٹوں سے بھرا ہوا ہے ۔ اور

بیسیوں عورتیں جن کے لئے مزید گنجایش نہیں ہے۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے درخواست کر رہی ہیں۔

اگر تم اندر کی راہ سے چلکر جاؤ۔ تو تم کو ٹکیوں کے سفید قطار کے اوپر غیر آریا نسل کی عورتوں کے سیاہ چہرے پہاڑیوں کے گندمی۔ شمالی ایرانی النسل مسلمانوں کے خوبصورت اور دکھن والیوں کے بھدے چہرے نظر آئیں گے۔ یہ سب عورتیں درد تکالیف اور بے بسی کے عام پردہ کے پیچھے سے یکساں طور سے دکھتی ہیں۔ ان ہسپتالوں میں زیادہ تر کام بچے جنانے کے متعلق ہوتا ہے۔ زیادہ تر عورتیں بالکل نوجوان ہیں۔ قریبًا سب کی سب عورتیں وینرئیل یا عضو نہانی کے امراض کی مریضہ ہیں۔

بعض عورتیں تو اسواسطے آتی ہیں۔ کہ وہ بے اولاد ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ کہ اولاد ہونے کے لئے یا تو دوا دیدو یا اپریشن کر دو۔ تاکہ اولاد ہو جائے۔ کہ جس کی بدولت ہندو بیوی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قابل بن جائے۔ برٹش سرجن سپرنٹنڈنٹ لیڈی کا بیان ہے۔ کہ ایسی عورتوں میں مسلسل ایسی مریضہ آتی رہتی ہیں۔ کہ جن کے ایک ہی بچہ اور وہ بھی اکثر مُردہ تولد ہوتا ہے۔ اور پھر جن کو سوزاک کی بیماری پیدا ہو گئی ہے۔ کہ جس سے ان کے پیڑو کے رگ اور پٹھے بالکل خراب ہو گئے ہیں۔ ان نوجوان لڑکیوں کی تعداد کہ جن کی حالت شادی سے چند ہی سال کے اندر ہی نہایت خراب ہو جاتی

ہے۔ خوفناک طور پر زیادہ ہے۔ جو یہاں علاج کے لئے آتی ہیں نوّے فی صدی کیسوں میں پیڑو کا ورم صرف سوزاک کے سبب ہوتا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر نے مجھے ایک نوجوان لڑکی مریضہ کے پلنگ کی پٹی کے پاس ٹھہرایا۔ وہ لڑکی ہماری طرف ایسی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ کہ جیسے کوئی بھوکا جانور دیکھا کرتا ہے۔ ڈاکٹرنی نے کہا کہ یہ نئی مریضہ ہے۔ اس کے کئی بچے پیدا ہوئے۔ مگر سب کے سب مردہ پیدا ہوئے۔ اس کے خاوند نے اس سے کہہ دیا ہے۔ کہ اگر اب کے تیرے زندہ بچّہ پیدا نہیں ہوگا۔ تو میں تجھے اپنے گھر میں نہیں رکھوں گا۔ اس لئے وہ یہاں بچّہ جننے کے لئے آئی ہے۔ حسب دستور یہ بھی سوزاک و آتشک کے امراض کی مریضہ ہے۔ مگر مجھے امید ہے۔ کہ ہم علاج کرکے اس کو تندرست کر سکتے ہیں۔

ایک اور نوجوان عورت کی نسبت میں نے دریافت کیا۔ یہ کس مرض میں مبتلا ہے۔ اس کے چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ اندرونی تکلیف سے بہت بیکل تھی۔

ڈاکٹرنی نے جواب دیا کہ یہ ایک ہندو اہلکار کی بیوی ہے۔ تین دن ہوئے وہ اس کو یہاں چھوڑ گیا۔ اس کے دوسرا بچّہ پیدا ہوا۔ پہلا بچہ زندہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کو دل کی بیماری بھی ہے۔ دمہ بھی ہے۔ اور اس کی ٹانگ بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں نے ایک ہی وقت میں اس کی ٹانگ بھی

جوڑی۔ اور بچہ بھی پیدا کرایا۔ دو بچے توام تھے۔ مگر دونوں مُردہ ان کو چھٹے سے لٹکا لگیا۔ مریضہ اندرونی طور سے بہت کمزور ہے آتشکی مرض کے سبب سے۔ اب اس کے آیندہ کوئی بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر مریضہ ہنوز اس بات سے آگاہ نہیں ہے۔ اگر میں اس سے یہ بات ابھی کہہ دوں۔ تو وہ اپنے آپ کو مار ڈالیگی

میں نے اس کی عمر دریافت کی۔ کہا تیرہ سال اور کچھ ماہ کی ہے۔ میں نے ایک زرد رُو مریضہ لڑکی کو دیکھا۔ کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ اور...... وہ پرندہ کی مانند بیچے ایک کاغذی کھلونا کو پکڑے ہوئے تھی۔ میں نے پوچھا اسے کیا بیماری ہے ؟

ڈاکٹرنی نے افسوس سے آہ سرد بھر کر کہا کہ یہ گورنمنٹ پرائمری سکول کی ایک طالبعلم تھی اور بہت خوش طبع اور ایسی ہوشیار تھی کہ اس کو گورنمنٹ کی طرف سے انعام میں وظیفہ ملا۔ پانچ ماہ کا عرصہ گذرا۔ سکول کی تعطیلوں میں اس کے بھائی نے اس کو اس آدمی کے گھر بھیجدیا۔ کہ جس سے اس کی شادی کردی گئی تھی۔ اس آدمی کی عمر پچاس سال کی ہے۔ اُن کے نزدیک تو وہ ایک ہندو شریف آدمی ہے۔ کہ جس کے چال چلن پر کوئی داغ نہیں ہے۔ مگر ہمارے خیال میں وہ ایک درندہ حیوان ہے....

جو معاملہ اس لڑکی کے ساتھ گذرا۔ اس کو بتلاتے ہوئے یہ ذراسی جان بہت ڈرتی ہے۔ ہفتوں تک اس لڑکی کی حالت خراب سے خراب ہی ہوتی گئی۔ آخرکار اس لڑکی کا دماغ بالکل چل گیا۔ پھر اس کی بہن جو ہمارے ہسپتال کی قدیمی مریضہ ہے۔ چپکے

سے وہاں گئی۔ اور اس کو زبردستی اٹھاکر یہاں لے آئی۔
میں نے کسی جان کو ایسا خراب کیا ہوا آجتک نہیں دیکھا
اس کے اندرونی زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ یہاں آنے
کے بہت دنوں بعد تک یہ اپنی چار پائی پر بالکل چپ چاپ
پڑی رہتی تھی۔ یہ بالکل آواز تک نہیں نکالتی تھی۔ صرف
آدھی نیند اور آدھی خوف زدہ آنکھوں سے ٹک ٹک دیکھتی
رہتی تھی۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا۔ کہ ایک بچہ جس کے بازو
کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی یہاں علاج کے لئے لایا گیا۔ اور اس
کی چار پائی اس لڑکی کے پاس بچھا دی گئی۔ میں وارڈ میں
سے گذرتے ہوئے اس بچہ کے ساتھ کھیلنے لگی۔ یہ چھوٹی سی
لڑکی دیکھ رہی تھی۔ شائد بظاہر اس نے یہ خیال کرنا شروع
کیا۔ کہ ہم سب لوگ ظالم اور جابر نہیں ہیں۔ دوسرے دن
جب میں وہاں سے گذری۔ تو یہ لڑکی مسکرائی۔ اس کے دوسرے
روز اس نے اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔ اس وقت
سے کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا۔ اور اس کا دماغ درست ہوگیا
تھا۔ اگرچہ اس کا جسم ابھی تک بیمار ہے۔ خوش قسمتی سے اس کو
ہی اپنا قریبی زمانۂ گذشتہ پورے طور پر یاد نہیں۔ اب وہ اپنے
کھلونوں اور گڑیوں کے ساتھ لیٹی رہتی ہے۔ اور ان کو دیکھکر
ہنسا کرتی ہے۔ بہت کمزوری کے ساتھ ان سے کھیلتی رہتی
ہے۔ یا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کمرہ میں ہمارا آنا جانا
دیکھتی رہتی ہے۔ اس کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ مگر وہ

اس پر قانع ہے۔

اس اثنا میں اس کے خاوند نے بازو کا دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ اور اس پر پھر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ابھی اس کی عمر پورے تیرہ سال کی بھی نہیں ہوئی۔

ایسی حالت میں دماغ کے پھر جانے کی کئی مثالیں کافی طور سے عام ہیں۔ اگر بچوں کی وراثت بجائے نہایت کمزور ہونے نہایت مضبوط بھی ہوتی۔ تو بچوں کی ساخت ایسی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لئے اتنی طاقت کہاں سے لاتی؟ مذکورہ بالا آخری مثال جو لکھی گئی ہے۔ وہ اچھے کھاتے پیتے۔ تعلیم یافتہ اور شہر کے رہنے والے اشخاص کی ہے۔ مگر یہ مثال اپنی ضروری ضروری خط وخال میں ایک اور بھی چھوٹی لڑکی کی مثال سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ کہ جسے میں نے یہاں سے دور تین (۳۰۰) سو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں دیکھا تھا۔ اس لڑکی کی شادی شیر خوارگی میں ہی کر دی گئی۔ اور دس برس کی عمر میں اس کو اس کے خاوند کے گھر بھیج دیا گیا۔ مسلسل استعمال کا صدمہ اُس کے دماغ پر بہت زیادہ پڑا۔ چنانچہ اس بیچاری بچّی کا دماغ چل گیا۔ اس کے بعد اس کا خاوند اس کو چاہے جس قدر بیدردی سے مارتا۔ وہ سوائے اس کے کہ ایک کونہ میں جا کر دبک کر بیٹھ جاتے۔ اور ہانپتی ہوئی ذرا سا ڈھیر درد اور تکالیف کا بن جاتے۔ اور کچھ نہ کرتی۔ اب اس کے خاوند نے سمجھ لیا کہ وہ رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ آخر کار رنج ومصیبت اور غصّہ میں اس نے یہہ

سوچکر کہ اس سے پیار کرتے ہیں تو میرا نقصان ہی رہا۔ اس نے اس کے چھوٹے سے جسم کو اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔ اور جنگل کے کنارہ لے جا کر جھاڑیوں میں ڈال آیا۔ تاکہ وہ مر کر رہ جائے وہ لڑکی وہاں ضرور مر جاتی۔ مگر ایک ہندوستانی گواہ نے جو یہ معاملہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سارا واقعہ ایک انگریز میم صاحبہ سے جا کر کہدیا۔ یہ انگلش لیڈی خود جنگل میں گئی اور بچی کو تلاش کر کے اپنے ہمراہ لے آئی۔ اس بچی کا دماغ غشی سے بہت آہستہ آہستہ نکلنے لگا۔ آرام و تسکین پا کر اور محبّت و پیار کی گفتگو سنکر اور ایسا برتاؤ دیکھکر کہ جو بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آخرکار اس بچّی کے دماغ میں عقل و ہوش لوٹ آنے لگے۔ اس کو جنگل میں چھوڑنے کے سولہ مہینے کے بعد جب میں نے اس کو پہلے ہی پہل دیکھا۔ تو وہ ایک خوشنما پرانے باغ میں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے زندہ دل ہشاش بشاش بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اور بڑی خوشی کے ساتھ ایک گڑیا کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے تھی۔ اس کی بچانے والی میم صاحبہ جب تک اُن سے ہو سکیگا۔ اس کو اپنے پاس رکھینگی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا۔ اس کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جو حالت کہ اس طرح بیان کی گئی ہے۔ وہ سوائے زیادہ شمالی علاقہ کے باقی ہندوستان کے زیادہ حصوں میں یکساں رائج ہے۔ احاطۂ بمبئی میں تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ عورتوں

کی بہت کثرت ہے۔ مگر اور صوبوں کی طرح احاطہ بمبئی میں بھی نہایت کثرت سے عورتوں کی حیثیت ایک اور انتہائی مثال سے بہت اچھی طرح سے معلوم کی جاسکتی ہے جس بیوی کو میں نے دیکھا۔ وہ ساڑھے نو سال کی عمر میں ماں بن گئی۔ اور اپریشن کرکے اس کا بچہ نکالا گیا جس کا وزن صرف پونے دو پونڈ (یا چودہ چھٹانک) تھا۔

بمبئی کے مشرق میں جزیرہ نمائے ہند کے بیچوں بیچ خواہ تم ایک ہزار میل سفر کرتے ہوئے چلے جاؤ۔ تم ہر جگہ یہی حال پاؤگے ایک ہسپتال کی سپرنٹنڈنٹ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ کہ ان بچہ بیویوں سے کیا امید ہوسکتی ہے؟ یہ لیڈی ڈاکٹر بہت ہی لائق اور حاذق ڈاکٹرنی ہیں۔ اس کا جواب وہ بھی یہی دیتی ہیں۔ کہ ان کی روح و زندگی کا جتنا تھوڑا بہت سرمایہ ہوتا ہے۔ وہ سب کا سب پہلے ہی حمل میں خرچ ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے جلد جلد بچے بعد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کو وہی تکالیف اور مصیبت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ مگر پھر کوئی موقعہ ان کی طاقت اور قوت کے پہنچنے کا ان کو نہیں ملتا۔ اور نہ وہ اپنی طاقت میں سے کچھ طاقت اپنے بچوں کو دے سکتی ہیں۔ پانچ پونڈ (یعنی اڑھائی سیر کا) وزنی بچہ بڑا سمجھا جاتا ہے چار پونڈ تو بچہ کا معمولی وزن ہے۔ بہت سے بچے مردہ ہی تولد ہوتے ہیں۔ اور تمام بچے کیونکہ ان میں زندگانی کی قوت بہت کم ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک وبائی بیماری کا بآسانی شکار

ہو جاتے ہیں۔ اس ہسپتال میں میرے زیر علاج جتنی مریضہ ہیں۔ وہ زیادہ تر یونیورسٹی کے طلبا رکی بیویاں ہیں۔ عملاً ان میں سے ہر ایک عورت سوزاک یا آتشک یا جریان وغیرہ امراض میں مبتلا ہے جب میں پہلے پہل ہندوستان آئی تو ایسی ہر ایک مریضہ کے ماں باپ کے پاس گئی۔ اور ان سے ان کی لڑکی کی حالت بیان کی۔ اس امید پر کہ وہ اپنی لڑکی کی جانب سے کوئی کارروائی کریں گے۔ مگر جبکہ مجھکو یہ معلوم ہوا۔ کہ اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے پہلے ہی وہ اپنے داماد کے مرض کی کیفیت سے واقف تھے۔ اور اس بارہ میں اب بھی نہ ان کو شرم وحیا ہے۔ اور نہ وہ کوئی نقصان اس میں دیکھتے ہیں۔ تو پھر میں نے آنا اور جانا اور اس بارہ میں کوشش کرنی ترک کر دی۔ وہ اس کو اپنی لڑکی کی تکلیف یا مصیبت نہیں سمجھتے۔ نہ وہ اس امر پر پورے طور سے خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے بچوں کو نہایت خراب چیز ودیعت دے رہے ہیں۔

اب میرا سوال یہ ہے۔ کہ آیا اپنے ہسپتال فنڈ کے امراض مزمنہ کے ناکافی سرمایہ پر خیال کرکے ہم اس مرض کی مریضہ عورتوں کا علاج کرنے میں حق بجانب ہوں یا نہیں۔ ہر ایک مریضہ پر ایک پونڈ سترہ شلنگ چھ پنس (یا بقدر بیس روپیہ) خرچ آتے ہیں۔ اور جب وہ عورت اچھی ہو کر پھر اپنے گھر واپس چلی جاتی ہے۔ تو پھر اسی روز اس کو وہ ہی بیماری

دوبارہ چھوت سے لگا دی جاتی ہے۔ میں ان قیمتی بیس روپوں سے اور بہت سے دوسری عورتوں کا علاج کر سکتی ہوں۔ تاہم۔۔۔ پھر وسیع احاطہ مدراس میں خواہ مشرق ہو یا مغرب اس سے بہتر حالت نہیں پائی جاتی۔ ایک نہایت تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کا بیان ہے۔ کہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے شادی کرنا ایک المناک اور غم انگیز جسمانی واقعہ ہے۔ لڑکی شادی کے بعد ایک یا دو تندرست بچے پیدا کر سکتی ہے۔ مگر پھر وہ خود برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جان گھل جاتی ہے۔ یا تو متعدی مرض سے یا ظالمانہ استعمال سے۔ میں نے ہزارہا بچوں کی پیدائش کے وقت دایہ گری کا کام کیا ہے۔ اور اب تک کر رہی ہوں۔ مگر میں نے آج تک ایک عورت کو بھی ایسا نہیں پایا۔ کہ جو آتشک یا سوزاک کی کسی نہ کسی شکل میں مبتلا نہ ہو۔

جو لڑکیاں بچپن میں ماں بن جاتی ہیں۔ اور اس کے سبب سے جس قدر مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس کے متعلق بہت کثرت سے تصدیقی بیان ہندوستان کے دیگر صوبجات میں اور بہت سے ڈاکٹر صاحب اور لیڈی ڈاکٹر صاحبہ اور یورپ سے تعلیم یافتہ اور مغربی ممالک کے تربیت یافتہ ہندوستانیوں۔ ڈاکٹروں نے یکساں طور سے بہم پہنچائے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچہ ماں ٹوبرکلوسس (جگر کے پھوڑے) اعضائے بدن کے اپنی جگہ سے سرک جانے۔ کچی ہڈیوں کے بسبب ریڑھ کی ہڈی اور پیڑو پر بوجھ پڑنے

کے نازک ہو جانے کہ جس سے پیدائش میں مصیبت ناک رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔ ہسٹریا (اختناق الرحم) اور دماغ میں فتور پڑ جانے کے کہ جس سے دماغی اور جسمانی ترقی بالکل رک جاتی ہے۔ اور مختلف متفرق امراض کا شکار بن جاتی ہے۔

زمانہ موجودہ کی ایک نہایت تجربہ کار لائق لیڈی ڈاکٹر نے بیان کیا۔ کہ ہندوستانی عورتوں کی نہایت کم فی صدی تعداد صحت مند اور طاقتور ہوتی ہے۔ مجھکو یقین ہے۔ کہ اس حالت کے ہونے کے اسباب بگڑی ہوئی اور نہ بیدار کی ہوئی ذہنیت ہے۔ کہ جو اعضائے بنائی کے امراض متعدی اور جنسی تھکاوٹ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ عام طور سے ان بیماریوں کو دن میں دو یا تین مرتبہ تعلقات زناشوئی کا تجربہ کرنا پڑتا ہے

چھتیس سال کا عرصہ گذرا جبکہ ہندوستان کی مجلس آئین سازی میں عمر رضامندی کے قانون کے مسودہ پر مباحثہ ہو رہا تھا۔ تو اس وقت جس قدر ڈاکٹر عورتیں ہندوستان میں کام کر رہی تھیں۔ ان سب نے متحدہ طور سے وائیسرائے کی خدمت میں ایک میموریل ارسال کیا۔ اور التماس کیا کہ ان عورتوں کو مصیبت اور بربادی سے بچایا جائے۔ کہ جن کی امداد کے لئے ہم نے اپنی جانیں وقف کر رکھی ہیں۔ اگر اس بات کا اقبال بھی کر لیا جائے۔ کہ ان لیڈی ڈاکٹروں نے صرف معمولی کیس مثال کے طور پر پیش کئے۔ یعنی صرف وہی کیس جو کہ ان میں سے کسی نہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے عام

ذاتی تجربہ میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ تو انہوں نے ان مریضوں کی جو پہلے بار اُن کے زیرعلاج آئے حسب ذیل حالت لکھی :-

(الف) عمر نو سال۔ شادی کے دوسرے دن۔ بایاں تلہ اپنی جگہ سے الگ۔ پیٹرو ایسا کچلا ہوا کہ اس کی شکل ہی نہیں پہچانی جاتی۔ گوشت کے چیتھڑے لٹک رہے ہیں۔

(ب) عمر دس سال۔ کھڑی نہیں ہو سکتی۔ نہایت کثرت سے خون بہہ رہا ہے۔ گوشت بےحد زخمی ہو گیا ہے۔

(ج) عمر نو سالہ۔ اس طرح کامل طور سے زبردستی خراب کیا گیا ہے۔ کہ ڈاکٹر لیڈی کی جراحی امداد سے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے خاوند کے دو بیویاں پہلے سے زندہ موجود ہیں۔ اور وہ بہت شستہ انگریزی بولتا ہے۔

(د) عمر سات سال۔ خاوند کے ساتھ رہتی ہے۔ تین دن کے بعد نہایت اذیت اور تکلیف سے مر گئی۔

(ر) عمر دس سال۔ اپنے دونوں ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں سے رینگ کر ہسپتال میں آئی ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے تب سے بالکل سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

جتنی فہرست یہاں دی گئی ہے۔ اصلی فہرست اس سے زیادہ بڑی ہے۔ اس فہرست کو اس کتاب کے ضمیمہ میں دیکھو۔

یہ معاملہ ۱۸۹۱ء میں پیش ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ معاملہ دوبارہ پھر انڈین لیجس لیچر کے روبرو پیش ہوا۔ لیڈی ڈاکٹروں کی یہی عرضی ایک بار پھر قانونی کونسل میں پیش کی گئی بیتیر

اکیس برس کے بعد بھی بیچاری عورتوں پر بعینہٖ وہی بات
صادق آتی ہے۔ ان امور کے مسلسل جاری رہنے پر کوئی بھی
انکار نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی اتنا انکار کر سکتا ہے جس انگریز
نے اس معاملہ کو کونسل میں مباحثہ کے لئے پیش کیا۔ وہ بھی
اس مضمون کے متن کو شرم کے مارے زور زور سے نہیں
پڑھ سکا۔ اس وقت عمر رضامندی کے بڑھانے کا مسودہ
قانون زیر بحث تھا۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے
اپنی اسپیچ کو اس طرح سے ختم کر دیا۔

"بہت سے ممبروں نے کہا ہے... کہ یقیناً اس بل سے
ایجی ٹیشن پیدا ہوگی۔ ایجی ٹیشن سے جتنی مجھکو نفرت ہے۔
شائد اور کسی کو اتنی نہ ہوگی میں ایجی ٹیشن سے بڑا دکھی ہوں
مگر جناب جبکہ یہ قانون عورتوں اور بچوں کی جانوں کی حفاظت
کے لئے ہے۔ تو میں ڈیوک آف ولینگٹن کے الفاظ میں صرف
یہی کہہ سکتا ہوں کہ "ایجی ٹیشن برپا کرو۔ اور ملعون بنو"!

اپنے ہفتہ وار ینگ[1] انڈیا میں مسٹر گاندھی نے ایک
مضمون اپنے خاص نام سے شائع کیا ہے جس کا عنوان
ہے "بچپن کی شادی کی لعنت" مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ:-

بچپن یا کم سنی کی شادی ہمارے ہزارہا ہونہار لڑکوں
اور لڑکیوں کے جوہر زندگانی کی جڑ کو کھوکھلا کر رہی ہے کہ
جن پر ہماری سوسائٹی کا مستقبل بالکل منحصر ہے۔

---

[1] ینگ انڈیا ۲۶۔ اگست ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۰۲

بچپن کی شادی ہر سال ہزارہا کمزور اور ناتواں لڑکے اور لڑکیوں کو معرض وجود میں لا رہی ہے۔ جو کہ کچے اور نابالغ والدین سے پیدا ہوتے ہیں۔

آجکل ہماری سوسائٹی میں بچوں کی موت کی تعداد اور مردہ بچوں کے تولد ہونے کی تعداد کی خوفناک کثرت ہے۔ اور کم سنی کی شادی اس امواتِ بچگان کا نہایت بارآور سرچشمہ ہے۔

ہندو سوسائٹی کے بتدریج اور مسلسل زوال کا بہت بڑا سبب یہ کم سنی کی شادی حسب ذیل امور کے متعلق بن رہی ہے۔ (۱) تعداد (۲) جسمانی طاقت۔ جرأت اور دلیری (۳) اموات۔

خود یہ مضمون جس قدر دلچسپ ہے۔ اس سے کم دلچسپ وہ جوابی آرٹیکل بھی نہیں ہے۔ جو ایک ہندوستانی نامہ نگار نے بھیجا تھا۔ اور جس کی نسبت مسٹر گاندھی نے تصدیق کی ہے۔ کہ اس نامہ نگار کی حیثیت سوسائٹی میں بڑی اعلےٰ ہے۔[۱]

یہ نامہ نگار لکھتا ہے۔ کہ:۔

آپ کا مضمون "بچپن کی شادی کی لعنت" کے عنوان والا پڑھکر مجھکو نہایت صدمہ اور سخت رنج ہوا۔۔۔۔"

میں اس بات کے فہم اور ادراک سے قاصر ہوں کہ

[۱] ینگ انڈیا ۲۶۔ اگست ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۱۸

آپ اُن لوگوں کو کیوں فیاضانہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے
کہ جن کی رائے آپ کی رائے سے مختلف ہوتی ہے۔ میں
اس کہنے کو نامناسب سمجھتا ہوں۔ کہ جو لوگ بچپن کی شادی
پر زور دیتے ہیں۔ وہ سر سے پاؤں تک برائیوں میں
ڈوبے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔

"کم سنی کی شادی کسی ایک صوبہ یا سوسائٹی کے کسی
ایک طبقہ میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ عملاً تمام ہندوستان
میں اس کا رواج ہے۔

"کم سنی کی شادی پر خاص اعتراض یہ ہے کہ اس سے
لڑکی اور اس کے بچوں کی صحت کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر
حسب ذیل دلائل سے یہ اعتراض بہت زیادہ وزنی یا
قابل یقین نہیں پایا جاتا۔ شادی کی عمر اب خود ہندوؤں
میں بھی بڑھ رہی ہے۔ پھر بھی ہندوؤں کی قوم زیادہ تر
کمزور ہوتی جارہی ہے۔ پچاس یا سو برس کا عرصہ گذرا۔ زمانۂ
موجودہ کی نسبت اس زمانہ میں مرد اور عورت علی العموم زیادہ تر
مضبوط۔ طاقتور اور صحت مند ہوتے تھے۔ اور زمانۂ حال
کی نسبت ان کی عمریں بھی زیادہ طویل ہوتی تھیں۔ حالانکہ
اس زمانہ میں کم سنی کی شادی کا بہت زیادہ رواج تھا۔
"ان امور سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اغلباً کم سنی
کی شادی اس قدر جسمانی ابتری اور بربادی کا باعث نہیں
ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو یقین ہے۔۔۔"

جو اخیری پیرگراف ہم نے اوپر لکھا ہے۔ اس میں جس طرز کی
منطقی دلائل سے کام لیا گیا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک بالکل
ہندوستانی طرز کی منطق ہے۔ اور یہ طرز ایسی ہے۔ کہ جس پر
خاص طور سے نوٹس لئے بغیر آگے گذرا نہیں جا سکتا۔ معلوم
ہوتا ہے۔ کہ اس مضمون نگار نے اپنے آباؤ اجداد کے عمل
اور ان کے پوتا پوتیوں کی حالت کے درمیان کوئی تعلق قائم
نہیں رکھا۔ اگرچہ وہ اپنے سامنے کاغذ پر دونوں کا حال
لکھ رہا ہے۔

مسٹر گاندھی لکھتے ہیں۔ کہ میری اصلی مضمون پر بہت
زیادہ خط وکتابت جاری ہے۔ اور حملہ مسلسل ہو رہا ہے۔
چنانچہ ایک آواز آئی ہے۔ جو صدا بصحرا ثابت ہو گی۔
"ایک بنگالی ہندو خاتون اپنے خط میں لکھتی ہیں۔ کہ
آپ نے ہماری ہندو سوسائٹی کی غریب اور بے بس اور بیکس
کم عمر بیویوں کی طرف سے جو آواز اٹھائی ہے۔ اُسکی بابت
میں نہیں جانتی۔ کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں ....."
ہماری عورتیں رنج اور غم کا بوجھ ہمیشہ خاموشی اور
بردباری کے ساتھ برداشت کرتی ہیں۔ ان عورتوں میں
کوئی طاقت بھی باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ کہ جس سے وہ
کسی خرابی یا برائی کے خلاف لڑ سکیں"
اس خط کے تسلسل میں مسٹر گاندھی اپنی واقفیت سے

---

[1] ینگ انڈیا، اکتوبر ۱۹۲۶ء (صفحہ ۳۴۹)

اس خط کی تائید اور حمایت میں اپنی ذاتی واقفیت کی چند مثالیں لکھتے ہیں۔ مثلاً ایک ساٹھ برس کے بڈھے محکمہ تعلیم کے ملازم نے نو سال کی ایک بچّہ لڑکی سے شادی کر کے اس کو بیوی بنا کر اپنے گھر لے گیا۔ اور پبلک میں اس کی کسی قسم کی بدنامی یا بے حرمتی نہیں ہوئی۔ مسٹر گاندھی نے اپنے مضمون کو ایک نرالے اور نئے قسم کے نوٹ پر ختم کیا ہے اور ہندوستان کی مغربی تعلیم یافتہ عورتوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ کہ وہ اپنی تمام طاقتیں سیاسیات۔ شہرت طلبی۔ اور خالی خولی باتیں بنانے میں خرچ کر رہی ہیں۔ اور ہندوستان میں اس سخت وظالمانہ کام کو بند کرانے کی کوشش کرنے سے بالکل غفلت برت رہی ہیں۔ کہ جو کام صرف یہ عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔

خدا کرے۔ عورتیں ہمیشہ مردوں کے سر الزام لگاتی رہیں اور اپنے ضمیر کو غلام بناتی ..... اگر وہ چاہیں۔ تو وہ عورتوں کے لئے ووٹ کا حق حاصل کرنے کے لئے لڑ سکتی ہیں۔ اس میں نہ تو وقت خرچ ہوتا ہے۔ اور نہ تکلیف ہوتی ہے۔ یہ ان کے لئے پاک تفریح ہے۔ مگر وہ بہادر عورتیں کہاں ہیں۔ کہ جو معصوم کم عمر بیویوں۔ اور معصوم کم عمر بیواؤں کے لئے ان کے اندر جا کر کام کریں۔ اور جب تک کہ اتنی کم عمر کی لڑکیوں کی شادی ہونا ناممکن نہ ہو جائے۔ تب تک نہ تو خود آرام کریں۔ اور نہ مردوں کو آرام لینے دیں۔

ان معاملات پر پہنچنے میں عادت یہ ہو گئی ہے۔ کہ ان کی عریانی اور برہنگی کے آگے پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ان کے پاس سے جلدی سے آگے نکل جائیں۔ عیسائی پادریوں کو طویل مدت قیام کے باعث خوب حال معلوم ہے۔ اگر ان پادریوں کی رپورٹ میں تلاش کیا جائے۔ تو تلاش کرنے والے کو نقطوں کی بڑی خوشنما قطاریں جا بجا نظر آئیں گی۔ گویا یہ نقطے بے حیائی اور بے شرمی کی باتوں کی خاموش قبروں کی علامت ہیں۔ اس لئے کہ مشنری لوگ پہلے تو انگلستان کے ان مخیر لوگوں کا خیال کرتے ہیں کہ جن کے پاس سے ان کو چندہ کے طور پر روپیہ آتا ہے۔ اور جن کی نشستگاہ کے کمرہ کی میز پر ان کی رپورٹ رکھی جائے گی دوسرے یہ پادری لوگ ان زود حس ہندوستانیوں کی خاطر کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ہی برداشت اور تحمل سے پادریوں کو یہاں تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جو مسیحی لوگ دیندار ہیں۔ مگر پادری نہیں ہیں۔ اور جو کہ ان تمام واقعات سے واقف ہیں۔ انہوں نے ان واقعات کو چھوڑ کر ادھر اُدھر کی باتیں لکھدی ہیں۔ اور ناگوار واقعات کو نرم اور ملائم الفاظ میں ظاہر کر کے رپورٹ کی جگہ بھر دی ہے۔ اس طور سے کچھ تو وہ ہندوستانیوں کے غصہ سے بچنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہندوستانی اُن سے ناراض نہ ہو جائیں۔ کہ جن کے دلائل نہ وہ معلوم کر سکتے ہیں۔ اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اور کچھ مغربی لوگوں کے مذاق کے لحاظ سے جو ان کی تحریر کو پڑھینگے

وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔

تاہم ایسے معاملات میں جیسا کہ یہ ہے۔ محض سچ کو چھپانا یا اس پر پردہ ڈالنا۔ بالکل واقعات کو جھٹلانا ہے۔ کیونکہ مغرب کے چند پڑھنے والے بغیر صاف صاف کہنے اور بیلچہ کو بیلچہ کہنے کے سوا اُن حالتوں کا بالکل خیال ہی نہیں کر سکتے۔ جو موجود ہیں اگر ہندوستان کے مسائل کے سمجھنے کی اصل میں کسی دل میں تعمیری خواہش بھی ہو۔ تو جس طرح مسٹر گاندھی کہتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستانی زندگی کی ان اصولی شکلوں میں واقعات کا مقابلہ کرنے سے رُخ پھیر لینا ایک بدترین گناہ ہے۔

اور اگر کوئی شخص اس کام کو جلدی سے کرنا چاہے۔ تو اس کو اس بات پر غور کرنے کے لئے رُک جانا چاہیئے۔ کہ آیا اس کو خود اپنے آپ کے ساتھ ایسا مذاق کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ حق یہی ہے۔ کہ کروڑوں چھوٹے بچے اور عورتیں کہ جو مشکل بچپن کی حدود سے باہر نکلی ہوئی ہوتی ہیں آج کے دن تک سخت جسمانی اذیّت اور صعوبت برداشت کر رہی ہیں۔ ان تکالیف کی بابت گفتگو کرنا یا ان کو سننا بھی ان کو سخت گذرتا ہے۔

دوسرا حصہ

گرینڈ ٹرنک روڈ

خیبر میں گرینڈ ٹرنک روڈ (سڑک اعظم) کو دیکھا۔ سیاہ جلی ہوئی۔ بے برگ و بار۔ دندانہ دار پہاڑیاں جس تنگ وادی کے اطراف میں ہیں۔ اس پر جھکی پڑتی ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف پٹھانوں کے گاؤں واقع ہیں۔ ہر ایک مکان ایک چھوٹا قلعہ ہے۔ اس کے بلند جنگی برج کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں ہیں۔ جن میں رائفل کو فائر کرنے کے لئے سوراخ بنے ہوئے ہیں۔

اگر تم مالک مکان سے استفسار کرو۔ کہ تمہارا کیا پیشہ ہے؟ تو وہ اس سوال کا یہی جواب دیگا۔ کہ کیا پیشہ؟ وہی جو میری قوم کا پیشہ ہے۔ ہم سب لوٹیرے ہیں۔

یہ لوگ سڑک پر کسی حصہ میں گولی نہیں چلاتے۔ کیونکہ وہ ملک معظم کی شاہراہ ہے۔ لیکن سڑک کے دونوں طرف جہانتک چاہیں۔ یا جس طرح چاہیں فائر کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ ملک پٹھانوں کا ہے۔ ان کی تمام زندگی جنگ میں بسر ہوتی ہے۔ ہر شخص دوسرے سے۔ ہر ایک مکان

دوسرے سے ۔ ہر ایک فرقہ یا قوم آپس میں ۔ مسلمان ہندو
سے محض تفریح طبع کے لئے مصروف جنگ رہتا ہے ۔ اس
علاقہ کی پہاڑیاں بے برگ و بار اور بنجر ہیں یہاں اشیاءِ خوردنی
بہت کم ہیں ۔ ان لوگوں کو زندگی کا مزا بھی اس بات میں آتا
ہے ۔ کہ گھات میں بیٹھکر ۔ اپنی چالاکی اور مکاری سے انسان
کا شکار کریں ۔

دو میل تک شاندار اونٹوں کی قطاروں کا سلسلہ
اس طور سے کہ ایک کی نکیل دوسرے کی دُم میں بندھی ہوئی
تھی ۔ ہندوستان سے ایشیا کو نمک ۔ روئی اور قند کا بار
لئے ہوئے جا رہا تھا ۔ دوسری جانب سے دو میل طویل
اُونٹوں کی قطار کا عظیم سلسلہ اسی طور سے کہ ایک کی نکیل
دوسرے کی دُم میں بندھی ہوئی تھی ۔ ایشیا کی اجناسِ تجارت
ہندوستان کو لے جا رہا تھا ۔ آفریدی سپاہیوں کے مسلح
بدرقے دونوں قافلوں کے ہمراہ تھے ۔ جابجا مسلح سپاہیوں
کی چوکیاں قائم ہیں ۔ حفاظت کے لئے سڑک پر جابجا تین
چار تا در انداز سپاہی رفلوں سے مسلح گڑھیوں میں مامور ہیں
ان کی حفاظت کے لئے ان کے رہنے کی جگہ کے گرداگرد
خاردار تار کا جنگلہ لگا ہوا ہے ۔ پٹھان لوگ سڑک پر پیدل
چل رہے تھے ۔ جن کی باز جیسی ناک ۔ اور باز جیسی تیز
دوربین آنکھیں ہوتی ہیں ۔ دو دو رائفلیں اٹھائے ہوئے
ذرا سے شبہ پر بھی فوراً زمین کی آڑ لے لیتے تھے ۔ دیکھنا

۲۔بٹالین رائل فیوزلیئرز پلٹن کا ایک دستہ شپا شپ کوچ کرتا ہوا سڑک پر جا رہا تھا۔ان انگریز جوانوں کے کشادہ چہرے اور سفید رنگ تھے۔جو بہت ہی چست اور تیز تھے۔وہاں ان کو اس مقام پر دیکھکر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ انگلش لڑکے ہیں۔مگر حال یہ ہے۔کہ صرف ان گورہ پلٹنوں کی موجودگی کے سبب سے ہندو لوگ آجکل درۂ خیبر کے علاقہ میں جانے کی جرأت کر سکتے ہیں۔جبتک برطانیہ اعظم کا دخل خیبر کے علاقہ میں نہیں ہوا تھا۔تب تک اس علاقہ میں جا کر شاذ کوئی ہندو زندہ بچکر واپس آجاتے ہوں۔بشرطیکہ وہ اونٹ یا گھوڑے پر سوار عورتوں کا بھیس بدل کر سفر کرتے ہوں۔

یہ گرینڈ ٹرنک روڈ درۂ خیبر سے جانب جنوب چلی گئی ہے۔سڑک اعظم کیا ہے۔امن و امان اور آرام و سکون کا ایک عریض اور ہموار دریائے رواں ہے۔جس کی امواج بے خیال انسانیت ہے۔سڑک کے برابر برابر دونوں کناروں پر بہت سی اقسام کے بندر کھیلتے پھرتے تھے۔طاؤس اور ہرن بیشمار تھے۔اونٹوں کے گلّے کے گلّے چر رہے تھے۔جن کی چھوٹے چھوٹے عریان اور بے شمار لڑکے رکھوالی کر رہے تھے۔آمد و رفت کا گرد اڑ رہا تھا۔بادام چشم سفید بیل لدّو چھکڑوں کو کھینچ رہے تھے۔ان چھکڑوں میں جاپان جانے والی اون کے اونچے اونچے انبار لگے ہوئے تھے۔بیلوں کی گردنوں اور سینگوں

کے گرد اگرد آسمانی رنگ کے پھولوں کی بیسیوں لڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے بعد گاؤں چلے آتے تھے۔ ہندوستان کے اصلی گھر یہ گاؤں ہی ہیں۔ جو کشادہ ملک کے آر پار بسے ہوئے اور آپس میں ایک گاؤں کا دوسرے گاؤں سے کئی میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ہر ایک گاؤں گارے اور اینٹ کے چند کچے مکانات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو جوہڑوں کے کنارے پر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی جوہڑ کی مٹی کھود کر گارا بنا کر اس سے مکانات بناتے ہیں۔ یہ جوہڑ رُکے ہوئے بند پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اسی پانی میں یہ لوگ نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں۔ اور اسی کا پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ایسے ہی گاؤں میں ہندوستان کی تمام آبادی کا $\frac{9}{10}$ واں حصہ آباد ہے۔ ان گاؤں میں ہندو اور مسلمان یکساں محنت سے زمین کو بوتے ہیں۔ یہ لوگ بالکل سیدھے سادے ناخواندہ۔ صلح و امن پسند اور مہربان و شفیق ہوتے ہیں۔ البتہ جب کوئی آپس میں چوری کرنے لگے۔ تو پھر وہ بندوق کی گولی سے مقابلہ کرنے سے نہیں چوکتے۔

غروب آفتاب + بھوتوں کا بھوت۔ نیلے رنگ کا ایک پتلا لمبا پردہ جو زمین سے دو آدمیوں کی لمبائی کے برابر ہوا میں اونچا نظر آتا ہے۔ یہ آہستہ آہستہ چوڑا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کر تمام فضا سے ہوا نیلگوں ہو جاتی ہے۔ اور

نیلگوں نظر آتے ہیں۔ اب اس کا سانس نمودار ہوتا ہے۔ دھوئیں کا ایک کاٹنے والا چھوٹکا۔ تمام دیہات کے گھروں کے چولہوں میں سے اس وقت یہ دھواں اُٹھتا ہے۔ یہ وقت ہے۔ یہ بخور کے بخارات ہیں۔ یہ مادر ہند کی مناجات کا وقت ہے۔ جو درختوں کے تنوں کے بیچ میں شفق کے لباس میں قدم چلتی ہے۔ اور اپنے بچوں کے چولہوں کے دھوئیں کے پردہ میں چھپی ہوئی آتی ہے۔ اس کے ہاتھ التماس اور مناجات کے لئے پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس کے بالوں میں نیلے ستارے چمک رہے ہیں۔

باقی کے لئے گرینڈ ٹرنک روڈ ٹھیک اسی طرح جیسی کہ کیمؔ[1] نے بیان کی ہے۔ اس کہانی کو پھر پڑھ لو۔ یہ بالکل سچی ہے۔ زمزمہ توپ ابھی تک لاہور میں کھڑی ہے۔ محبوب علی کو انتقال کئے۔ تین برس گذر چکے۔ مگر اُس کے دونوں لڑکے ہنوز انگلستان کے اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اور معمر خاتون اپنی بیل گاڑی میں اب تک سفر کرتی ہے۔ اور گاڑی کے پردہ میں سے ریت کے بادلوں کو اپنی تیز آواز سے بُرا بھلا کہہ رہی ہے۔

---

[1] مسٹر رڈیارڈ کپلنگ مشہور انگریز مصنف نے اس نام کے ایک ناول میں ایک کیریکٹر لکھا ہے اور گرینڈ ٹرنک روڈ اور زمزمہ ثانی اس توپ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جسے بھنگیوں والی توپ کہتے ہیں۔ اور لاہور آرٹس سکول کے سامنے سڑک پر پڑی ہے کیونکہ کپلنگ صاحب نے لاہور ہی میں اپنا بچپن گذارا ہے مترجم۔

چھٹی فصل

دنیوی دیوتا

ہز ہائینس نے ایک خوبصورت رولز رائس موٹر کار میرے لینے کو بھیجی۔ جس میں بیٹھکر میں مہمان خانہ سے محل کو روانہ ہوئی۔ میرے معیّت میں ہز ہائینس کے محل کا بڑا اہلکار تھا یہ اعلیٰ ذات کا تعلیم یافتہ کٹّر برہمن ہے۔ جو یورپین لباس میں اچھی طرح سے ملبوس تھا۔ اس نے مجھ سے گفتگو اور تفصیل بیان کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔

میں نے اس سے دریافت کیا۔ فرض کرو۔ کہ تمہارے ایک شیر خوار دختر ہو۔ تو تم کس عمر میں اس کی شادی کرو گے اس نے بہت اچھی طرح انگریزی میں جواب دیا۔ کہ پانچ یا سات سال کی عمر میں۔ بہر حال اس کی عمر کا نواں سال پورا ہونے سے پہلے پہلے میں اس کو لازمی طور سے بیاہ دوں گا۔

اگر تم نہ بیاہو۔ تو اس کی کیا سزا ہوگی؟ اور وہ سزا کس کو ملیگی؟

مجھکو ملیگی۔ ذات سے مجھکو خارج کر دیا جائے گا۔ کوئی برادری والا نہ تو میرے ساتھ کھائیگا۔ نہ مجھکو پانی پینے

کو دے گا۔ نہ مجھکو کسی رسم میں شامل کرے گا۔ کوئی آدمی اپنی لڑکی میرے بیٹے سے نہیں بیاہے گا۔ اس طور سے میرے صحیح الحسب پوتا ہو نہیں سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ آیندہ میری کوئی معاشرتی زندگی ہی نہیں رہے گی۔ میری ذات کا کوئی آدمی اپنا کندھا میری نعش کو مرگھٹ تک پہنچانے کے لئے نہیں دے گا۔ اور آیندہ زندگی میں میری سزا اس سے بھی بھاری ہو گی۔

پھر تمہاری لڑکی کو کیا سزا ملیگی؟

کیا بچی کو؟ آہ! ہاں! ہمارے شاستر کے مطابق میں اس کو اپنے گھر سے نکال دوں گا۔ اور اس کو اکیلی جنگل میں بھیج دوں گا۔ وہاں میں اُس کو خالی ہاتھوں چھوڑ آؤں گا۔ اُس کے بعد میں اس کا کسی طرح سے بھی خیال نہیں کروں گا۔ کوئی ہندو بھی نہ تو اس کو خوراک دے گا۔ اور نہ اس کو درندوں سے بچائیگا۔ تاکہ وہ بھی لعنت کی سزا میں شریک نہ ہو۔

اور کیا تم واقعی یہ کام کرو گے؟

نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ ایسا موقعہ ہی پیش نہیں آئے گا۔ میں دانستہ ایسا گناہ نہیں کر سکتا۔ کہ جس کا نتیجہ یہ ہے۔

اس تصویر میں یہ بات قابل لحاظ ہے۔ کہ اس برہمن نے سوائے اپنی ذات کے اور کسی مصیبت پانے والی شکل کو نہیں دیکھا۔

ہندو سلسلہ میں لڑکی معمولی طور سے ایک بھاری اور

نامبارک قرضہ ہے۔ لڑکی کے پیدا ہونے پر خاندانی احباب رسمی طور سے تعزیت کرنے آتے ہیں۔ مگر کوئی شخص ہمیشہ ایسا صاف گو سمجھدار گواہ نہیں مل سکتا۔ جیسا کہ وہ متمول معمّر ہندو زمیندار ہے۔ جس نے مجھ سے کہا کہ:-

میرے بارہ بچے ہوئے۔ دس لڑکیاں جو طبعًا زندہ نہ رہیں۔ اصل میں کون ان کا بوجھ اٹھا سکتا۔ بشیک دو بیٹے ہیں، نے بچا رکھے ہیں۔

تاہم سر میکائیل اوڈوائر نے جس زمانہ میں کہ وہ بھرت پور کے افسر بندوبست تھے۔ اس وقت کی ایک مثال لکھی ہے جو علانیہ تقریر میں بیان کی گئی تھی[1]۔

مہاراجہ کی بہن کی شادی پنجاب کے ایک بڑے سردار سے ہونے والی تھی۔ مہاراجہ تو نابالغ تھے۔ ان کے خاندان نے اس بات پر زور دیا کہ تیس ہزار یا چالیس ہزار پونڈ خوب دل کھول کر حسب معمول اس شادی پر خرچ کیا جائے۔ سٹیٹ کونسل کے مقامی ممبروں نے ان کی رائے کی تائید کی۔

چونکہ ریاست مذکور اس زمانہ میں برٹش نگرانی میں تھی۔ اس لئے پولٹیکل ایجنٹ اور میں نے سخت قحط سالی اور مصیبت کے زمانہ میں اس قدر فضول خرچی کرنے کی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ آخر کار یہ معاملہ پوری کونسل میں زیر بحث لایا گیا۔ میں نے

---

[1] انڈیا ایز آئی ... (ہندوستان جیسا کہ مجھے معلوم تھا) ہیں۔ مصنفہ سر مائیکل اوڈوائر طابع و ناشر کانسٹیبل اینڈ کمپنی، لمیٹڈ لندن ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۰۲۔

کونسل کے سب سے سینئر ممبر سے دریافت کیا۔ کہ سابقہ نظائر بیان کرو۔ کہ گذشتہ زمانہ میں کسی مہاراجہ کی دختر یا بہن کی شادی کے ایسے ہی موقعوں پر کتنی رقم خرچ کے لئے منظور کی گئی تھی ممبر نے اپنا سر ہلایا۔ اور کہا۔ کہ کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ کہ یہ کیا بات ہوئی؟ اس ریاست کو قائم ہوئے دو سو برس سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا۔ اور گیارہ۔ بارہ مہاراجہ گدی نشین ہو چکے ہیں۔ باپ کے بعد بیٹا گدی پر بیٹھتا گیا ہے کسی راجہ نے کسی کو متبنےٰ نہیں کیا۔ تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے۔ کہ آج تک کسی مہاراجہ کے کوئی لڑکی ہی پیدا نہیں ہوئی؟

اس معمّر آدمی نے تھوڑی سی پس وپیش کے بعد کہا کہ صاحب آپ ہمارے رواج سے واقف ہیں۔ تو یقیناً آپ اس کے دلائل سے بھی واقف ہوں گے۔ مہاراجوں کے لڑکیاں ضرور پیدا ہوئیں۔ مگر اس نسل تک ان کو بڑا ہونے ہی نہیں دیا گیا۔ اور یہ بات بالکل اسی طرح گذری ہے۔

مگر یہ بات یاد رکھنی مناسب ہے۔ کہ قدیم زمانہ میں لڑکیوں کو مار ڈالنا عام تھا۔ اور یہ رسم نہ صرف قدیم زمانہ کی اقوام ہی میں تھی بلکہ یونان۔ اور روم کے لوگوں اور تواریخ میں جن جن لوگوں کا مذکور ہے۔ ان سب میں رائج تھی۔ البتہ جو لوگ مسیحیت یا مذہب اسلام کی تہذیب سے متاثر ہو گئے۔ ان میں یہ رسم نہیں تھی۔ اس رسم کو ہندوستان میں شہنشاہی

قانون کی رو سے ممنوع قرار دیا۔ مگر اس قدیم رسم کی پیروی خفیہ طور سے آسانی سے کی جاسکتی تھی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم اب تک ہندوستان میں بہت سے حصوں میں رائج ہے[1]۔

جیسا کہ اس فصل میں آیندہ چلکر میں نے لکھا ہے۔ ایسے معاملات میں شمار و اعداد کا ثبوت عملاً نہیں مل سکتا۔ مگر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے سپرنٹنڈنٹ مردم شماری[2] کا بیان۔ جو بڑی عمر کی لڑکیوں کے متعلق لکھا گیا ہے ایسی کافی احتیاط سے لکھا گیا ہے۔ کہ جو تمام غلطیوں سے معرّا ہے:۔

مجھے بڑا شک ہے۔ کہ آیا شیر خوار لڑکیوں سے والدین کو کس قسم کی عملی نفرت ہوتی ہے ...... لیکن اگر کوئی عملی نفرت نہ بھی ہو۔ تو اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ ان سے بھول غفلت ضرور برتی جاتی ہے۔ والدین اپنے لڑکے کی خبرگیری کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ لڑکی کی خبر گیری کرتا ہے۔ لڑکے کی نسبت لڑکی کو بہت ہی کم گرم کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ جب وہ بیمار ہوتی ہے۔ تو بہت کم توجہ اس کیطرف مبذول کی جاتی ہے۔ اور جب وہ اچھی ہوتی ہے۔ تو بہت

---

[1] ہندوستان کی سنس (مردم شماری) کی رپورٹ جلد اول حصہ اول ۱۹۲۱ء ضمیمہ چارم۔ نیز دیکھو ایم۔ ایل ڈارلنگ صاحب کی کتاب پنجاب کے کاشتکار کشادگی اور قرضہ میں" آکسفورڈ ۱۹۲۵ء صفحات (۹-۵۸)

[2] مردم شماری ہند ۱۹۱۱ء جلد پانزدہم صفحہ (۱۹۰)

کم اور خراب خوراک اس کو دی جاتی ہے۔ یہ باتیں کسی ظلم کے خیال سے ہی نہیں۔ بلکہ بے پرواہی سے بھی نہیں کی جاتیں بلکہ یہ باتیں صرف اس سبب سے کی جاتی ہیں۔ کہ دختر کی نسبت فرزند کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اور تمام لذیذ چیزیں لڑکے کو کثرت سے دی جاتیں۔ اور اسی پر توجہ اور خبر گیری مبذول کی جاتی ہے۔ مگر لڑکی کو یہ تینوں چیزیں بچی کھچی دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک برس کی عمر سے لیکر پانچ برس کی عمر تک کی لڑکیوں کی شرح اموات اسی عمر کے لڑکوں کی شرح اموات کی نسبت ہمیشہ کچھ زیادہ ہی رہتی ہے۔

بنگالہ کے ایک ہسپتال میں خود میرے سامنے ایک واقعہ ایسا گذرا۔ کہ جس سے غیر ضروری بچہ (لڑکی) کی طرف والدین کے اس رویہ کی بخوبی تشریح ہو جاتی ہے۔ مریضہ جو پانچ یا چھ برس کی لڑکی تھی۔ کنوئیں میں گر گئی۔ جس سے ان کے سر میں بڑا زخم آگیا۔ ماں اس خون بہتی اور بے ہوش بچی کو بازوؤں کے اوپر ڈالے ہوئے مدد کے لئے ہسپتال میں دوڑی آئی۔ ایک یا دو دن میں مرض ٹٹنس (کزاز۔ چاند تشنج) نمودار ہو گیا۔ اور لڑکی موت کے دروازہ پر پہنچ گئی۔ اس کو اسقدر اذیت اور تکلیف تھی۔ کہ جس کو دیکھکر دل لرزتا تھا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ماں غم اور اندیشہ کی تصویر بنکر اس کی چارپائی کی پٹی کے پاس بیٹھ گئی۔ اور چپکے چپکے اپنے دیوتاؤں

سے لڑکی کے اچھے ہو جانے کی دعائیں مانگتی رہی۔ یکایک اس کی پٹی کے پاس ایک آدمی بنگالی بابو آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ یا تو کوئی چھوٹا عہدیدار یا کلرک تھا۔ اس نے ڈاکٹرنی صاحبہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ مس صاحبہ۔ میں اپنی بیوی کو لینے کے لئے آیا ہوں۔

ڈاکٹرنی نے سختی سے چلّا کر کہا کہ تمہاری بیوی! اپنی بیوی کو دیکھو۔ اور اپنی لڑکی کو دیکھو۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟

اس نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ میں اپنی بیوی کو فوراً اپنے گھر لے جانے کے لئے آیا ہوں۔ تاکہ میں مناسب طور سے اس سے بیوی کا کام لوں۔

لیکن تمہاری بچّی مر جائے گی۔ اگر اس کی ماں اس کو اس وقت چھوڑ کر چلی جائے۔ بچّی کو تو دیکھو۔ اس وقت تم ان دونوں کو جدا نہیں کر سکتے۔ لڑکی کو اگرچہ مہلک تکلیف تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس دھمکی کو سمجھ گئی۔ اور وہ باوجود مہلک درد کے اپنی ماں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چمٹ گئی۔ عورت زمین پر مُنہ کے بل لیٹ گئی۔ اس نے اپنے خاوند کے گھٹنوں کو پکڑ لیا۔ عاجزی کرنے لگی۔ اس کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ اور ہندوستانی طریقہ سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے خاوند کے پاؤں کی مٹی لی اور اس مٹی کو اپنے سر پر ڈال لیا۔ اور رو کر کہنے لگی کہ ”اے میرے آقا۔ اے میرے صاحب۔ مجھ پر رحم کرو“

اس نے کہا کہ "میں کہتا ہوں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم چلی آؤ۔ بہت دیر ہوئی کہ تم میرے پاس سے چلی آئی ہو۔"

"اے میرے مالک بچی.... چھوٹی بچی۔ اے میرے آقا۔"
اس نے اس ملتجی عورت کے ایک لات ماری۔ اور کہا ہیں کہہ چکا اور پھر کوئی لفظ بولے یا نگاہ ڈالے بغیر وہ دروازہ کی طرف مڑا۔ اور باہر چلا گیا۔

عورت اُٹھی۔ بچی نے چلانا شروع کر دیا۔

ڈاکٹرنی صاحبہ اگرچہ برسوں سے ایسی باتیں دیکھ رہی تھیں۔ مگر ان کو یقین نہ آیا۔ اور چلا کر کہنے لگیں۔ کہ کیا تم اپنے خاوند کا کہنا مان کر اب چلی جاؤ گی؟

عورت نے روتے ہوئے سُبکیاں لیکر کہا۔ کہ میں اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔ اور اپنے غمگین مُنہ پر اس نے پردہ ڈال لیا اور ایک چھوٹے سے کمزور جانور کی طرح دبک کر دوڑ کر اپنے خاوند کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

جو لڑکی اپنے عمر کے نویں یا بارھویں سال یا اس سے پہلے بیاہ کر اپنے خاوند کے گھر آجاتی ہے۔ اس کو بہت کم موقعہ اور بہت کم فرصت کتابوں سے کچھ سیکھنے کی ملتی ہے۔ مگر وہ باتیں اس نے یقیناً سیکھ لی ہوں گی۔ ایک تو اپنے خاوند کے متعلق اپنے فرائض اور دوسرے اپنے سے تعلق رکھنے والے دیوتاؤں اور بھوت پریت کے متعلق فرائض

عورت کے جو فرائض اپنے خاوند کی نسبت ہیں۔ جیسا کہ قدیم زمانہ سے پدم پوران[1] میں لکھے ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے[2]۔

"عورت کے لئے سوائے اس کے خاوند کے دنیا میں اور کوئی دوسرا دیوتا نہیں ہے۔ تمام اچھے کاموں میں سے سب سے اعلےٰ درجہ کا کام جو عورت کر سکتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اپنے خاوند کی کامل تابعداری کا اظہار کر کے اپنے خاوند کو خوش کرنے کی متلاشی رہے۔ یہ بات عورت کو اپنی زندگی بھر کا قانون بنا لینا چاہئے۔

"چاہے اس کا خاوند بدشکل ہو۔ بڈھا ہو۔ کمزور ہو۔ اس کے طریقے بہت خراب ہوں۔ چاہے وہ سخت بیمار ہو۔ زانی ہو۔ بدچلن ہو۔ شرابی ہو۔ قمار باز ہو۔ چاہے وہ بدنام جگہوں میں اکثر جاتا رہتا ہو۔ اور دوسری عورتوں کے ساتھ کھلے گناہ کی زندگی بسر کرتا ہو۔ اور اپنے گھر سے اس کو کچھ بھی محبت نہ ہو۔ چاہے وہ پاگلوں کی طرح آوارہ گرد ہو۔ چاہے وہ بدنامی کی زندگی بسر کرتا ہو۔ چاہے وہ اندھا۔ بہرا۔ گونگا اور اپاہج ہو۔ المختصر خاوند میں کتنے ہی عیب اور برائیاں ہوں۔ چاہے اس میں کتنا ہی شرارت اور فساد کا مادہ ہو۔ عورت کو ہمیشہ اس کو اپنا دیوتا سمجھنا

---

[1] پوران قدیم مذہبی نظمیں ہیں جو ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔

[2] ہندو رسوم و رواج اور دستور صفحات (۳۴۴-۹)

چاہیئے۔ اور اپنی تمام توجہ اور خبرگیری خاوند پر مبذول کرنی چاہیئے۔ اور اس کے چال چلن کی خواہ وہ کیسا ہی ہو کچھ بھی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اور کسی طرح سے بھی کوئی ایسی بات نہ کی جائے کہ جس سے وہ ناراض ہو جائے ....."

"بیوی کو کھانا صرف اسی وقت کھانا چاہیئے۔ جبکہ اس کا خاوند پہلے کھائے۔ اگر خاوند برت (روزہ) رکھے تو عورت کو بھی برت رکھنا چاہیئے۔ اگر خاوند کھانے کو ہاتھ نہ لگائے تو عورت کو بھی کھانے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے۔ اگر خاوند مصیبت میں ہو۔ تو عورت کو بھی مصیبت زدہ ہو جانا چاہیئے اگر خاوند خوش ہو۔ تو عورت کو بھی اس کی خوشی میں حصہ لینا چاہیئے ...... اپنے خاوند کے مرجانے پر عورت کو اپنے خاوند کی چتا پر زندہ جلکر مرجانا چاہیئے۔ پھر ہر شخص اس کی عفت و عصمت کی تعریف کریگا ..."

"اگر خاوند کوئی نغمہ گائے۔ تو عورت کو خوش ہونا چاہیئے اور اگر خاوند ناچے تو عورت کو خاوند کی طرف دیکھکر مسرت کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اگر خاوند علم کی باتیں کرے۔ تو بیوی ان کو سنکر اس کی تعریف کرے۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ خاوند کے سامنے عورت ہمیشہ شاداں و فرحاں رہے۔ اور رنج وغم یا ناراضگی کا کوئی نشان کبھی بھی ظاہر نہ کرے۔

عورت کو اپنے ماں باپ کے متعلق یا کسی دوسری عورت کی نسبت کہ جس کو اس کا خاوند اپنے پاس رکھنا

چاہتا ہو۔ یا کسی ایسی رنجش اور بات کے سبب سے جو
خاوند نے بیوی سے کہی ہو۔ خبرداری کے ساتھ گھر میں جھگڑا
پیدا کرنے سے بچنا چاہیئے۔ ان باتوں کے سبب سے اگر
عورت اپنے خاوند کا گھر چھوڑ کر چلی جائیگی۔ تو عوام النّاس کو
اس کا تمسخر اڑانے کا موقعہ مل جائیگا۔ اور پھر وہ اس عورت
کی نسبت بری بری باتیں کہنے لگیں گے۔"

اگر اس کے خاوند کو غصہ آجاتے۔ وہ اپنی عورت کو ڈرائے
دھمکائے۔ یا اس کو مغلظات گالیاں دے۔ یا اگر اس کو ظلماً
زدوکوب کرے۔ تب بھی بیوی کو بڑی نرمی سے خاوند کو
جواب دینا چاہیئے۔ اور خاوند کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر چوم
لینا چاہیئے۔ اور چلّا چلّا کر رونے اور اس کے گھر سے بھاگ
جانے کی جگہ اس سے معافی مانگنی چاہیئے۔۔۔"

"عورت کی تمام باتیں اور تمام کام ایسے ہوں۔ جس سے
عام طور سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ وہ اپنے خاوند کو
اپنا دیوتا سمجھتی ہے۔ پھر ہر ایک شخص اس کی عزت کریگا۔
اور اس طور سے وہ وفادار اور عفت و عصمت مآب بیوی
ہونے کی شہرت حاصل کرلے گی۔"

ایبے ڈوبوئس نے اس زمانۂ قدیم کے قانون کو انیسویں
صدی کے ہندو مذہب کا دستور اب تک مروّجہ قانون
پایا۔ اور فلاسفرانہ احتیاط کے ساتھ اس کے اثرات کا
وزن کیا۔ پھر اس نے اس بارہ میں حسب ذیل[1] رائے زنی کی

[1] ہندو منرز کسٹمز ...

ہندوؤں کے گھروں میں میاں بیوی میں اصلی دلی اتحاد اور باہمی محبّت یا امن چین بھی بہت ہی شاذ و نادر اور نہایت کم پایا جاتا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان اس ملک میں جتنی اخلاقی خلیج حائل ہے۔ وہ اتنی بڑی ہے۔ کہ اہل ملک کی نگاہ میں عورت محض ایک مجہول شئے ہے جس کو اپنے خاوند کی مرضی اور خیالات کا بالکل عاجزانہ اور ذلیل طور پر تابعدار بن جانا چاہیئے۔ عورت کو اس کا خاوند کبھی بھی اپنا دمساز رفیق نہیں سمجھتا۔ جو وہ اپنے خاوند کے خیالات کی شریک بن سکے۔ اور خاوند کی خبرگیری اور محبّت کے لئے پہلی چیز ہو۔ ہندو بیوی اپنے خاوند کو صرف ایک مغرور اور مغلوب الغضب آقا پاتی ہے۔ جو اپنی بیوی کو اپنے بستر اور اپنے کھانے پینے میں شریک کرنے کی عزت دے کر اس کو خوش قسمت عورت خیال کرتا ہے۔

زمانہ حال کے مشہور مؤلف ربیندر ناتھ ٹیگور نے اس مضمون پر رائے زنی کرکے ظاہرا ایک اور فایدہ مند اشارہ کیا ہے۔ کہ ہندو مقررین اور ہندو مولفین کی اظہار رائے کو جیسی کہ وہ ہم تک پہنچتی ہے۔ ویسا ہی قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کو قبول کرنے میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ ٹیگور لکھتا ہے کہ:۔

"شادی کے مطلب کے لئے خودبخود پیدا ہونے والی

۱؎ بک آف میریج (شادی کی کتاب) کیسرلنگ صفحہ ۱۱۲-۱۱۳)

محبت ناقابل اعتبار ہے۔ البتہ اگر مناسب طور سے محبت بڑھائی جائے۔ تو اس سے بہترین نتائج پیدا ہوتے ہیں... اور یہ محبت کا بڑھانا شادی سے پہلے شروع ہونا چاہیئے۔ اس لئے قدیم الایام سے ہماری لڑکیوں کے سامنے خاوند بطور ایک اعلےٰ خیال کی کہانیوں اور نظموں میں۔ رسوم۔ اور پرستش میں ہر وقت مدنظر رکھا جاتا ہے۔ جب آخر کار وہ لڑکیاں اپنے خاوند کو پالیتی ہیں۔ تو وہ اُن کے نزدیک کوئی آدمی نہیں بلکہ وفاداری۔ حب الوطنی یا اور ایسی ہی مستقل صفات کے مانند ایک اصول ہوتا ہے۔

معاملہ کا قیاسی حصہ خواہ کچھ ہی ہو۔ وقت یا زمانہ کے اصلی عمل کی بابت اس کتاب کے سابقہ صفحات میں ایسا مادہ پایا جائیگا۔ کہ جس سے ہندو خاوند کی مشابہت۔ وفاداری یا حب الوطنی یا کسی اور مستقل بالذات صفت سے کی جائے

مسٹر گاندھی قدیم زمانہ کے "تاثرات کے غلبہ کو بلا خوف بُرا کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ایک قدیم زمانہ کے بہت بُرے رواج کی بدولت نہایت ناواقف اور جاہل اور ناکارہ آدمیوں کو عورتوں کے اوپر غلبہ حاصل ہوگیا ہے۔ کہ جس غلبہ کے وہ ہرگز مستحق نہیں ہیں۔ اور نہ ہونے چاہئیں۔

مگر کوئی مذہب جو ہزار برس سے کمزور۔ جاہل۔ ناواقف اور مذہبی جوش والے لوگوں میں رائج ہو۔ وہ سو یا دو سو برس کے عرصہ میں بھی بیخ و بنیاد سے اکھاڑا نہیں جا سکتا

نہ کسی ایک اکیلے مصلح مذہب کے غصہ سے اس کو ہلایا جا سکتا ہے۔ خواہ لوگ اس مصلح کا کتنا ہی ادب اور لحاظ کرتے ہوں۔ قدیم زمانہ کے قانون کے عام احکام۔ جن کا تعلق عورت کے درجہ اور کاموں سے ہے۔ وہ عظیم ہندو اکثریت کے درمیان ابھی تک عملاً بڑی شدت سے رائج ہیں۔

پورانوں کے قانون میں عورت کو اپنی ساس کی خدمات ادا کرنے کے لئے بڑی تاکید لکھی ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر ہر ایک عورت کی زندگی کا طرزِ عمل تمام قائم کیا گیا ہے۔ ہندو شادی سے یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ عورت کے لئے ایک نیا گھر آباد کر دیا جائے۔ بلکہ اس کے برخلاف اس کم عمر دلہن کو اپنے دولہا کے والدین کے گھر کے آدمیوں میں ایک اور آدمی کے بڑھ جانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ وہ گھر پہلے ہی سے آباد ہے۔ اس گھر میں پہنچتے ہی یہ نئی دلہن فوراً اپنی ساس کی مسلمہ خادمہ بن جاتی ہے۔ اب ساس کے ادنےٰ اشارہ اور حکم پر اس کی زندگی کے بسر ہونے کا مدار ہے۔ خسر اور نند چاہے اس سے کچھ کام کرائیں۔ یا اس کو کچھ ہی کھلائیں پلائیں۔ دلہن کو اس سے روگردانی کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ اور اس خیال تک کی کہ وہ روگردانی کر سکتی ہے۔ یا کسی قدر بھی آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے دل میں نہ تو گنجائش اور نہ ہی جرأت ہوتی ہے۔ وہ تو پیدا ہی خدمت کرنے کے لئے ہوئی ہے۔

ساس اکثر سخت مزاج ہوتی ہے۔ وہ محبت یا رحم کے بغیر بہو پر حکمرانی کرتی ہے۔ اور اگر اتفاق سے اس بچہ بہو کے حمل ذرا دیر میں رہے۔ یا اگر اس بہو کے اولاد ہو تو لڑکیاں ہی پیدا ہوں۔ تو پھر اکثر ساس کی زبان غلیل بن جاتی ہے اور اس کے ہاتھ مکّے کا کام دیتے ہیں۔ اور اس کی بدلہ لینے والی طبیعت اپنی بسمل بہو کی زندگی کو یہ دھمکی دیکر ناگوار بنا دیتی ہے۔ کہ میں تو اپنے بیٹے کے لئے نئی بیوی لے آؤں گی۔ چونکہ ہندو شاستر کے مطابق اس بہو کی جگہ آجائے گی اور یہ بہو اس نئی بہو کی لونڈی بن جائے گی۔

مختلف اضلاع کے دیہات میں مجھے اپنی تحقیقات کے دوران میں اکثر ایسے تحریرات ملیں۔ کہ چودہ برس اور انیس برس کے درمیانی عمر والی ہندو عورتیں خودکشی کر لیتی ہیں۔ اور ہندوستانی پولیس کے محرروں نے اس خودکشی کا سب سے زیادہ عام سبب یہی لکھا ہے۔ کہ قولنج کے درد کی شدت یا ساس سے لڑائی خودکشی کا باعث تھی۔

آجکل کے اعلےٰ ذات کے ہندو خاندانوں میں خاوند اور بیوی کے براہ راست تعلق کو جس طرح سمجھا جاتا ہے اس کو ہندوستانی خاتونوں میں سے ایک نہایت ہی ممتاز عورت مس کورنیلیا سہراب جی نے اس طرح سے بیان کیا ہے۔ کہ جو نیچے لکھا جاتا ہے۔ مس سہراب جی کو ہر ایک درجہ اور مذہب کی عورتوں کا بہت وسیع عمیق۔ اور

مشفقانہ علم حاصل ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ:۔

بیوی اپنے خاوند کی خاص پجارن ہوتی ہے۔ اس کا مذہب اور اس کی خوشی یہی ہے۔ کہ اپنے خاوند کی خدمت کرے۔۔۔۔۔ تمام مطلبوں کے لئے خواہ وہ مذہبی ہوں۔ دماغی ہوں یا معاشرتی۔ وہ اس سطح سے جس پر اس کا خاوند چلتا ہے۔ بہت نیچی سطح پر چلیگی۔ وہ بڑی مسکین اور خاوند کو پوجنے والی ہوتی ہے۔ مگر خاوند کی زندگی کے بڑے بڑے فوائد میں شریک نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ اس کی یہ دو خواہشیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنی ساس کو خوش رکھے کہ جس کی وہ خاص خادمہ ہوتی ہے۔ دوسری خواہش یہہ ہوتی ہے۔ کہ اس کے ایک بیٹا پیدا ہو جائے۔۔۔۔ مشرقی ممالک میں شادی بیاہ کا تمام خیال محض زندگی کی تفہیم پر گھومتا ہے۔ اغراض کی یگانگت اور ہم نشینی یہ دو خیالات کبھی بھی عام اندازہ میں داخل نہیں ہوتے۔ جب خاوند کھانا کھاتا ہے۔ تو بیوی اس کے حضور میں چپ چاپ اور نیچے نگاہ کئے ہوئے بیٹھی رہتی۔ شوہر کے چہرہ کی طرف دیکھنا حقیقت میں بے حیائی ہے۔"

اپنی اس تصویر کا مزید حال بیان کرتے ہوئے مس سہراب جی آگے چلکر کہتی ہیں کہ:۔

---

[1] شفق کے درمیان (بیٹوین دی ٹوائی لائیٹ) کارنیلیا سہراب جی۔ ہارپر اینڈ برادرس لندن ۱۹۰۸ء صفحات ۳۲-۲۵،۱

"جب عورت ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے۔ تو پھر گھر کی تمام دوسری عورتیں اس کا زیادہ ادب اور لحاظ کرنے لگتی ہیں۔۔۔ کیونکہ اب وہ کامیاب ہو گئی۔ اور اس نے اپنی زندگی کو حق بجانب ثابت کر دیا۔ بیٹے کے پیدا ہونے سے خود عورت میں نہایت نمایاں خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کی تو ابھی تک وفادار لونڈی ہی رہتی ہے۔ مگر جہانتک ہندوؤں کے زنان خانہ میں ممکن ہے۔ اب وہ ایک جائز وجود اور ایک قابل قدر عورت بن جاتی ہے۔ جو عورتیں اسے طعنہ دیا کرتی تھیں اب وہ اپنا سر ان عورتوں کے سامنے اوپر اٹھا سکتی ہے اب اس کا دل کسی سوکن کے آنے کے اندیشہ سے خوفزدہ نہیں بلکہ خوش ہے۔

تعلیم یافتہ۔ اچھے کھاتے پیتے اور معزز ہندوؤں کے زنانہ میں ہندو بیوی کی جو عام خصوصیت ہے۔ وہ ایسے ہی بہت سے واقعات میں سے جو میرے نوٹس میں غریب لوگوں کے گھروں میں آئے۔ ایک واقعہ میں میں نے بالکل ایسی ہی ایک مثال پائی۔ اس لئے قدامت پرست ہندو عورت چاہے وہ کسی درجہ کی ہو۔ اپنے اسلاف اور اپنے دیوتاؤں کے قانون کے ساتھ پورے فخر اور دیانتداری سے دل سے فرمانبرداری کرتی ہے۔ اور اس کی سوشیل حالت پر اپنی فرمانبرداری سے کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دہلی کے قریب ایک ضلع ہے۔ جہاں کے ایک چھوٹے سے زمیندار کی بیوی کا یہ ذکر ہے۔ یہ شخص غیر معمولی طور سے روشن خیال تھا۔ جب اس کی بیوی کے پہلا بچہ ہونے لگا۔ تو اس نے اس کو وضع حمل کے لئے ہسپتال میں بھیجدیا۔ مگر بہت دیر میں بھیجا۔ اس لئے نہایت تکلیف کے بعد اس عورت کے مردہ بچّہ تولد ہوا۔

اگلے سال پھر یہی معاملہ پیش آیا۔ عورت ہسپتال میں دیر سے پہنچی۔ ہر چند کہ شکم چاک کر کے بچہ نکالا گیا۔ جو مُردہ پیدا ہوا تیسر حمل کے وضع کے وقت زمیندار خود اپنی بیوی کو لیکر ہسپتال میں آیا۔ مگر اس کو تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اپ کے عین وقت مناسب پر لایا۔ جب عورت کے بچّہ پیدا ہوا۔ تو نوجوان انگلش نرس اس کے اوپر جھک گئی۔ اور خوشی کی خبر سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس نے کہا کہ "اے چھوٹی سی ماں۔ اے خوش قسمت چھوٹی ماں۔ کیا تم اپنے بچّہ کو دیکھنا نہیں چاہتیں؟

عورت نے تکیہ پر اپنا سر موڑ لیا۔ کمزور آواز میں آہستہ آہستہ انتہائے ناامیدی میں اس کے یہ الفاظ سنائی دیئے۔

"کون چاہتا ہے کہ مردہ بچہ کو دیکھے۔ میں بہت سے بہت سے۔ مُردہ۔ مُردہ دیکھ چکی ہوں۔" پھر آواز آنی بند ہو گئی۔ بھاری پلکیں بند ہو گئیں۔

پھر سسٹر نے نوزائیدہ بچّہ کو اٹھا لیا۔ بچہ نے پتلی آواز سے چلانا شروع کیا۔ لیکن اس لمحہ میں ایک نیا اثر پیدا ہو گیا۔

اور دم زدن میں روبجلی کی طرح دوڑ گئی ۔ کہ اس کے طرفۃ العین میں ہو جانے کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا ۔ یا تو چار پائی پر زچہ مردہ کی شکل بیجان پڑی ہوئی تھی یا مضبوط ہو گئی ۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چوڑی ہو کر چمکنے لگیں ۔ پتلے پتلے بازو اس نے اوپر اٹھائے ۔ گویا بچہ کو مانگنے کا مطالبہ کیا ۔ شاید اپنی تمام زندگی میں یہ پہلا ہی موقعہ اس لڑکی کو پیش آیا ۔ کہ اس نے تحکمانہ لہجہ میں کوئی چیز طلب کی ہو ۔

اُس نے اس لہجہ میں کہ جیسے کوئی شہنشاہ بیگم بولتی ہے ۔ کہا کہ "مجھکو میرا بیٹیا دے دو" میرے گاؤں فوراً ایک آدمی کو بھیجو ۔ اور ۔ بیٹے کے باپ کو اطلاع دو ۔ کہ میں ان کے یہاں آنے کی متمنی ہوں ۔"

غرضکہ اس عورت کی سر سے پاؤں تک بالکل کایا پلٹ گئی ۔ اب اس میں احساس عزت ۔ خودداری اور اہمیت کے اوصاف پیدا ہو گئے ۔

باپ آگیا ۔ ہندوستانی عورتوں کے ہسپتال میں ۔ ہر ایک پرائویٹ کمرہ میں خاندان کے رہنے کے لئے چھوٹا سا فیملی کوارٹر ہوتا ہے ۔ تمام رشتہ دار مکھیوں کے مانند ہجوم کر کے اس فیملی کوارٹر میں بھر گئے ۔ جن کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی ۔ اور اس کمرہ میں جو بیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا تھا ۔ یہ سب لوگ دس دن تک ٹھہرے رہے ۔ دسویں روز ایک فخمندانہ جلوس بنا کر یہ لوگ زچہ

بچہ کو گاؤں کو زمیندار کے مکان میں لے گئے۔

امیر ہو یا غریب۔ اعلیٰ ذات ہو یا نیچ ذات۔ بیٹے کی ماں اپنے بچہ کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ ماں کو خود کچھ واقفیت نہیں ہوتی۔ جو وہ بچہ کو کچھ سکھلائے۔ سوائے عجیب عجیب مخالفتوں اور خوف اور ان دیکھی طاقتوں کی ہجوم کو راضی رکھنے کے لئے جنتر۔ منتر۔ تعویذ۔ گنڈا۔ اور رسومات کا علم اس کو ہوتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو کسی ضابطہ کی پابندی کبھی نہیں سکھلائیگی۔ خواہ وہ اس لفظ کے معنے بھی جانتی ہو۔ وہ اپنے بیٹے کو جوش۔ خواہش یا بھوک کو روکنا کبھی بھی نہیں سکھلائیگی۔ وہ ذرّہ بھر بھی اس بات سے واقف نہیں ہوتی۔ کہ بچہ کو کس طرح کھلائے۔ یا کس طرح اس کی پرورش کرے۔ کافی کھانا کھلا دینے کے لئے اس عورت کا یہ خیال ہے۔ کہ وہ اپنے چھوٹے سے گندم گوں بچہ کے جسم کے گرداگرد ایک ڈوری باندھ دیتی ہے اور جب تک وہ ڈوری تن کر ٹوٹ نہ جائے تب تک وہ اپنے بچہ کے پیٹ میں کھانا ٹھونسے جاتی ہے۔ اس طرح سے سے اپنی تمام طفولیت کے دوران میں یہ لڑکا اسی طرح بڑھتا ہے۔ کہ جس طرح اس کا باپ زمانہ قدیم کے گھر میں پل کر بڑا ہوا تھا۔

تاہم جب خود اس لڑکے کا بیاہ ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنی ماں کی عزت اپنی بیوی سے زیادہ کرتا ہے۔ اور اکثر ماں سے

سچی محبت کرتا اور اس کا ادب کرتا ہے۔ اس وقت عورت کو پورا اختیار مل جاتا ہے۔ اور وہ اپنے گھر کے اندر اپنی بہو وغیرہ پر آہنی ہاتھ سے حکومت کرنے لگے۔ اور بڑی مضبوطی کے ساتھ قدیم رسوم کو قائم رکھتی ہے۔ اور اپنی بہوپن کے زمانہ کے سابقہ مصیبت کو فراموش کرکے اپنی کم عمر بہو کے نازک کندھوں پر وہ تمام بوجھ اور غصہ ڈال دیتی ہے۔ کہ جو بوجھ اور غصہ جب وہ خود نوجوان تھی۔ تو اس کی کمر پر ڈالا گیا تھا۔ مگر شائد ایک زیادہ بلند درجہ اس کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ہر ایک پوتے کے ساتھ جو اس کی گود میں دیا جاتا ہے۔ اس کا رتبہ اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اب خاندانی پشت کا سلسلہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے خاوند کی روح عذاب سے بچ گئی۔ اب وہ عورتوں کے درمیان فخر سے بیٹھتی ہے۔ دیوتاؤں کو مبارک ہو۔

تصویر کا دوسرا رُخ ہندو بیوہ۔ بدقسمت ہندو بیوہ کی حالت کا صحیح نقشہ ہے۔ بیوگی کی ہیبت ناک مصیبت کا ہندو صرف ایک سبب بتلاتے ہیں۔اور وہ اس بدنصیب عورت کے موجودہ زندگی کے اعمال ہیں۔ بلکہ کسی غیر معلوم گذشتہ جنم کے اعمال کی سزا ہے۔اس کے شوہر کی موت سے لیکر اس کی بدقسمت زندگی کے ختم ہونے کے دن تک ان اعمال کی سزا اس کو بے عزتی بیکس پرسی تکلیف اور خود کو مٹا دینے والی نفس کشی کی شکل میں ملتی رہتی ہے۔

خواہ اس کی عمر تین سال کی ہو۔خواہ اس کے دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے ہوں۔خواہ وہ زناشوئی کے تعلقات کا مفہوم تک نہ سمجھتی ہو۔یا وہ حقیقت میں اپنے خاوند کے ساتھ بیوی کے طور پر رہ چکی ہو۔اس کی وہ ہی یکساں حالت ہوتی ہے۔شوہر کی موت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ

گنہگار ہے ۔منحوس ہے ۔مجرم ہے ۔سوختنی اور گردن زدنی ہے ۔جب وہ بڑی ہو کر سمجھدار ہو جاتی ہے ۔ تو اس کو اس بات کا یقین آ جاتا ہے ۔کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے ۔عدل و انصاف اسی بات کا مقتضی ہے ۔

مس سراب جی بیوگی پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ :۔

راسخ الاعتقاد ہندو بیوہ شہید ہونے کی ہیبت ناک خوشی کے ساتھ اپنی جبری بدنصیبی پر شاکر ہے ۔ دنیا کی کوئی طاقت اس مصیبت کو اس کے سر سے ٹال نہیں سکتی .... اس کے صابر اور شاکر ہونے سے اس کی تکالیف میں کمی نہیں ہو سکتی ۔گذشتہ جنم کے کسی گناہ عظیم کے باعث اس کو شوہر جیسی چیز سے دیوتاؤں نے محروم کر دیا ہے ۔ بحالت موجودہ اس کا کام صرف یہی ہے ۔کہ وہ متوفی کی نجات کے لئے دست بدعا رہے ۔اور عبادت اور مجاہدہ نفس سے اس کو برکت دے ۔تاکہ وہ آیندہ زندگی میں کسی بہتر جگہ پیدا ہو ۔اس کی ساس پر یہ مصیبت کیوں نازل ہوئی ہے ۔ اگر یہ بدنصیب نہ ہوتی ۔تو اس کا فرزند دلبند اس کو کیوں داغ مفارقت دے جاتا ۔اس لئے اس کی ساس اس پر لعنت بھیجتی رہتی ہے ۔

بیوہ کے ساتھ اس قسم کا شرمناک سلوک کرنا کسی عداوت یا رنجش کی بنا پر نہیں ہوتا ۔بلکہ ہم سب تقدیر کے جابر

ہاتھوں سے مجبور ہیں۔ اگر وہ بیچاری قابل لعنت ہے۔
اور تقدیر کا شکار رہے۔ تو اس پر لعنت کرنے والے
بھی تو تقدیر کے ہی آئے ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ جس مصیبت زدہ
پر ہم طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔ یہ اسی کی بھلائی کے
لئے ہیں۔ اس لئے ہم کو ذاتی رنجش نہیں ہے۔ درست
نہیں۔ یہ خود اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔

بیوہ اپنے متوفی شوہر کے گھر میں ہر شخص کی ایک ادنے
چاکر ہو جاتی ہے۔ تمام نہایت سخت اور نہایت تکلیف دہ کام
ان کے ذمے ہوتے ہیں۔ اور آرام اور راحت تو ان کے لئے
معدوم ہے۔ وہ دن میں صرف ایک وقت کھانا کھا سکتی ہے
اور وہ بھی بدترین قسم کا۔ فاقہ کرنا اس کے لئے لازمی ہے۔
اس کے تمام بال کتر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری
ہے کہ وہ خوشی اور مبارکبادی کی محفلوں سے اپنے آپ کو جدا
رکھے۔ بیاہ شادی اور مذہبی رسومات میں اس کا آنا موجب
گناہ ہے۔ حاملہ عورت سے گفتگو کرنا بلکہ اس کے یا کسی اور
کے سامنے آنا اُسے ممنوع ہے۔ تاکہ اس کی نظر بد نہ لگ
جائے۔ اس کو مخاطب کرنے والے گالی گفتار ہی سے پیش
آتے ہیں۔ غرضکہ دنیا کا ہر جابرانہ اور شرمناک سلوک اس پر
روا رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی بدقسمتی اس کے خود کردہ
گناہوں کی شامت اس کے نجات پانے کا صرف یہی ایک
طریقہ ہے۔ کہ وہ ان مصیبتوں کو مسلسل برداشت کرتی رہے۔

قدیم زمانہ کا مشہور فرانسیسی سیاح برنیئر لکھتا ہے کہ "بیوہ پران مصائب بیوگی کا عائد کرنا صرف اس وجہ سے تھا۔ کہ عورتیں آسانی سے شوہروں کے قابو میں رہیں۔ بیماری میں ان کی قرار واقعی خدمت کریں۔ اور دشمنی سے کبھی بھی شوہروں کو زہر نہ دیدیں"

بہرحال یہی باتیں میں نے ایک بار ایک ہندو کی زبان سے سُنیں۔ اس صاف گو شخص نے کہا کہ "ہم ہندوؤں نے عورتوں کو اس قدر دبا رکھا ہے۔ کہ ہمیں ہر وقت خوف رہتا ہے کہ کہیں اپنی ذلت سے گھبرا کر وہ ہمیں زہر نہ دیدیں۔ اسلئے ہمارے پیش بین اسلاف نے بیوگی کو اس قدر بھیانک بنا دیا ہے۔ تاکہ عورتیں اس قسم کی باتوں سے خود ہی باز رہیں

ہندوستان کے بہت سے حصص کے جیل خانوں کے زنانہ وارڈوں میں بیٹنے عورتوں کو دیکھا۔ کہ وہ اپنے خاوندوں کو مار ڈالنے کے جرم میں قید ہیں۔ شائد یہ شاذو نادر ہی ذہنیت کا کام ہو۔ شائد یہ بیماری ہسٹریا (اختناق الرحم) کے سبب سے ایسا ارتکاب جرم کر چکی ہیں۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ اس بار بار کے عملی ستی ہو جانے کی مثالوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو عورت کہ نئی بیوہ ہوتی ہے۔ وہ دانستہ

لے دیکھو سفرنامہ برنیئر بزمانہ حکومت مغلیہ خاندان ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء تک۔ یہہ سفرنامہ فرانسیسی برنیئر نے لکھا ہے۔ اور ۱۹۱۶ء کی اشاعت کے صفحات ۳۱۰ و ۳۱۱ میں یہ حالات لکھے ہوئے ہیں۔ یہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں شائع ہوا ہے۔

اپنے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑک لیتی ہے۔ اور ان میں آگ لگا کر جل مرجاتی ہے۔ قبیلہ کے لوگ چشم پوشی سے اس کو ایسا کرنے دیتے ہیں۔ اس غریب اور بے بس بیوہ نے اس سے قبل دوسری بیوہ عورتوں کی ذلت اور ذلیل حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتی ہے۔ کہ بیوگی کی حالت میں مجھکو رات دن لونڈیوں کی طرح کام کرنا پڑے گا۔ فاقہ کش رہنا ہوگا۔ سب لوگ جبر و ستم کریں گے۔ گالیاں دیں گے۔ لعنت ملامت کریں گے۔ اس لئے اس ذلت سے چھٹکارہ پانے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے۔ کہ مذہبی حکم کی پیروی کرکے ستی ہو جاؤں۔ غرضیکہ غیر ملکی حکمرانوں کے بنائے ہوئے ممانعت کے قانون کے باوجود وہ ستی کا پاک اور قابل تعریف کام کرکے دنیا کی موجودہ دوزخ سے بچ جاتی ہے اور اپنے نئے جنم میں زیادہ خوش گذران زندگی کی امید رکھتی ہے

اگرچہ ہندوؤں کے مقدس شاستروں میں تو اس طور سے ستی ہو جانے کا ثواب مذکور ہے۔ مگر خاوند کے چتا پر بیوہ کا جل کر مرجانا آجکل قانوناً ممنوع ہے لیکن یہ بات قابل یاد داشت ہے۔ کہ یہ تبدیلی ایک غیر معمولی واقعہ کا مظہر ہے۔ نہ کہ اس ممانعت سے ہندوستان کی پبلک رائے میں کوئی قدرتی ترقی رونما ہوئی ہے بلکہ یہ ہندوؤں کے مذہب کے میدان میں برٹش گورنمنٹ کے طاقتور ہاتھ کی ایک شاذونادر مداخلت سمجھی جاتی ہے۔ برٹش گورنروں نے در اصل برٹش تاج نے جب سے کہ براہ راست ہندوستان کی

---

[1] ہبر وٹے انگولیش (ضابطہ) صفحہ ہم ۱۸۹۰ء

حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ تب سے ۹۲ برس پہلے سے ستی کی رسم کی ممانعت کردی۔ راجہ رام موہن رائے نے جو ایک بڑے فاضل اور ترقی یافتہ ہندوستانی تھے۔ اس ممانعت کے قانون کی تائید اور حمایت کی۔ مگر اور دوسرے مقتدر بنگالی رؤساء نے اس قانون کی سخت مخالفت کی۔ بلکہ ستی کے دستور کو بدستور قائم رکھنے کے لئے وہ اپنی اس لڑائی کو سب سے آخری عدالت اپیل یعنی لنڈن میں عدالت پریوی کونسل تک لے گئے۔ مگر ناکام رہے۔

یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ اگر موقعہ مل جائے۔ تو ستی کا رواج جس کی اب تک جڑ بھی گم ہوگئی ہے۔ ہندو لوگ پھر زندہ کرکے اُسے دوبارہ جاری کرنے میں بالکل تردد نہ کریں مسٹر گاندھی کے ہفتہ وار ینگ انڈیا[1] مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۲۶ء میں ایک ہندو مضمون نگار نے یہ رائے شائع کرائی ہے۔ کہ جب تک متوفی خاوند اپنے مرض الموت میں اپنی بیوی کو دوسری شادی کی اجازت نہ دے جائے۔ تب تک آجکل کی بیوہ کی مکرر شادی ناممکن ہے۔ آگے جاکر مضمون نگار خود ہی اس بات کا اقرار کرتا ہے۔ کہ اپنی بیوی کا کوئی گرویدہ شوہر اسے ایسی اجازت نہیں دے گا۔ بلکہ اس بات سے زیادہ خوش ہوگا۔ کہ اگر اس سے ہو سکے۔ تو اس کی بیوی ستی ہو جائے۔

اگرچہ اپنے خاوند کی موت کے وقت تو وہ اپنے خاوند کے گھر کی ایک معزز رکن ہوتی ہے۔ مگر بیوہ ہونے پر اُس کو کوئی جائز

---

[1] ینگ انڈیا مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۲۶ء

حق اس گھر میں اپنی حفاظت کرلنے کا نہیں رہتا تاہم وہ اس گھر میں مذکورہ بالا ذلّت آفرین شرائط کے ساتھ رہ سکتی ہے یا اس کو اس گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ کہ جہاں چاہے چلی جائے اس وقت اس بیوہ کو یا تو بھیک مانگ کر یا طوائف بنکر اپنی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک پیشہ کو اختیار کرلیتی ہے۔ اس کا زرد چہرہ۔ اس کی بیکسانہ شکل۔ اس کے منڈے ہوئے سر پر کھڑے بال۔ رنج وغم کی زندگی بسر کرنے سے اس کا جھری دار چہرہ۔ اکثر مندر میں جانے والے ہجوم میں یا کسی تیرتھ کے بازاروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ جہاں کبھی کبھی کوئی بہت رحمدل یا سخی داتا کنجوس رحم کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔ کہ اس بیچاری کو ایک مٹھی بھر چاول دے دیتا ہے۔

کٹّر ہندوؤں میں بیوہ کی مکرّر شادی ناممکن ہے۔ ان کے خیال میں شادی ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ جو قابل انفساخ ہیں۔ بلکہ ابدالآباد کے لئے ایک دوامی معاہدہ ہے۔ یہ بات بھی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے۔ کہ ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت سخت کٹّر قسم کی ہے۔ خواہ یہ بیوہ بالکل ہی بچّہ ہو۔ اور اس آدمی کو بالکل جانتی بھی نہ ہو۔ کہ جس کی موت سے اس کو یہ کہکر اطلاع دی گئی ہے۔ کہ تیرے گناہوں کے سبب سے وہ مر گیا ہے اور خواہ یہ بیوہ بیس برس کی ہو۔ اور اپنے خاوند کی ہم بستر اور ہم نوالہ رہی ہو۔ مگر ہندو کے کٹّر پن نے ان دونوں قسموں کی بیواؤں کے لئے شادی کی ممانعت کر رکھی ہے۔ لیکن دس بارہ

سال سے مغربی تعلیم کے بتدریج مگر غیر مسلمہ اثر نے بیوہ کی مکرر شادی کی جانب ہندوؤں کو کچھ کچھ آمادہ کردیا ہے۔ ہندوستان کے متفرق حصص میں بعض مجلسیں قائم ہوگئی ہیں جن کے ظاہر کردہ مطالب میں سے ایک خاص مطلب کنواری بیواؤں کی شادی کرا دینا ہے۔ مگر ابھی یہ تحریک ہندو سوسائٹی کے بہت ترقی یافتہ عناصر کے طبقہ میں ہی بالکل محدود ہے۔ اور اس کا اثر ابھی بظاہر اتنا کم ہے۔ کہ جس سے مکرر شادی بیوگان کے شمار و اعداد[1] تیار نہیں ہو سکتے۔

سو برس کا عرصہ گذرا۔ اس بارہ میں ایبی ڈوبوئس نے اپنی کتاب میں جو رائے ظاہر کی تھی۔ وہ ابھی تک بدستور عام طور سے ٹھیک اُتر رہی ہے۔ اس نے لکھا تھا۔ کہ ایک چھوٹی سی بچی کی شادی ایک ساٹھ برس کے مرد سے کردینا اور اس بڈھے کے مرجانے کے بعد اس بچّی بیوہ کی دوسری شادی کی ممانعت ہونے کا نتیجہ یہ نکلیگا۔ کہ پھر اس بچی بیوہ کو اپنی زندگی رنڈیوں کے طور پر بدچلنی کے ساتھ بسر کرنی پڑیگی۔ اس وقت بیوہ کی مکرر شادی سے کوئی شخص واقف بھی نہ تھا۔ ایبی لکھتا ہے۔ کہ اگر شادی بیوگان کی اجازت بھی ہوتی۔ تو براہمن چونکہ بہت چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ عجیب و غریب ترجیح سے پیش آتے ہیں۔ وہ بچّی بیوہ کی شادی تو شاذ کردیا کرتے۔ مگر ان کی

---

[1] لاہور میں سر گنگا رام مرحوم کی فیاضی نے ہندو بیوگان کی شادی کی ایک سوسائٹی کئی سال سے قائم کر رکھی ہے۔ جو اچھا کام کر رہی ہے۔

اپنی خاص بیواؤں کی حالت میں یہ اجازت شاید برائے نام ہی ہوتی
جس معاشرتی تعمیر کی نوجوان بیوہ ایک حصہ ہوتی ہے۔ اس معاشری
تعمیر پر نوجوان بیوہ کے اثر کا اندازہ لگانے میں کسی شخص کو یہ بات
فراموش نہیں ہوسکتی۔ کہ یہ نوجوان بیوہ اپنے بچپن میں جنسی نفسانی
خواہشات کے اسی کرہ ہوا میں پرورش پاتی تھی۔ کہ جس نے اس
کے بھائی کے لڑکے کو گھیر رکھا تھا۔ اگر کسی لڑکی کے بچپن میں ان
خیالات کے اندر پرورش ہوئی ہو۔ اور اس کی خواہشات کو ایسا
تیز کر دیا گیا ہو۔ اور اس کو اپنی خواہشات کے جائز طور سے رفع
کرنے سے روک دیا جائے۔ تو پھر اس بات پر تعجب کرنے کی
گنجائش ہی کیا ہو سکتی ہے۔ اگر ان معاشری قوانین کی پابندی کی
نسبت اس کی خواہش نفسانی اس پر زیادہ غالب آجاتے ہیں۔ اس
کا خاندان اس کے مُردہ شوہر کا خاندان اپنی بدنامی کے خیال سے
اگر اس کو روک سکتے ہوں۔ تو روک لیں گے۔ اکثر بلکہ نہایت
اغلب اس نوجوان بیوہ کو اپنی قربانی کی روح کے سوائے اور
کسی روک کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کی مخالف مثال پر
اکثر ہندوستانی تقریر کرنے والے رائے زنی کیا کرتے ہیں۔ سوراجی
پالی ٹیشین لالہ لاجپت رائے نے ہندو مہا سبھا کانفرنس کے
جلسہ منعقدہ بمبئی میں اپنے صدارتی خطبہ میں یوں اظہار ماتم
کیا ہے[2]

---

[1] ہندو منرس سمٹس اینڈ سپر مینر صفحہ (۲۱۲)

[2] صدارتی تقریر ہندو مہاسبھا کانفرنس منعقدہ بمبئی درماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

”بچہ بیواؤں کی حالت ناقابل بیان ہے۔ خدا ان لوگوں کو نیک راہ دکھلائے۔ کہ جو بیواؤں کی مکرر شادی کے مخالف ہیں مگر ان کی اس توہم پرستی نے اس قدر برائیاں پیدا کر دی ہیں اور اس قدر کثرت سے اخلاقی اور جسمانی مصیبت برپا کرنے کا سبب ہو گئی ہے۔ اور جس نے کل کی کل سوسائٹی کو لولا اور لنگڑا کر دیا ہے اور زندگی کی کشمکش میں اس کے لئے رکاوٹ پیدا کر دی ہے“

مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا[۵] میں ایک اور ہندوستانی نامہ نگار کا ایک مضمون بچپن کی شادی اور جبریہ بچہ بیوہ کو دوام بیوہ رکھنے کے عنوان پر شائع کیا ہے۔ اور اس مضمون سے مسٹر گاندھی نے اس طرح اپنا بھی اتفاق ظاہر کیا ہے۔

”اس رواج سے ہر سال ہزارہا بچہ بیوائیں معرض وجود میں آجاتی ہیں۔ جو کہ اپنی باری میں سوسائٹی کے لئے بد اخلاقی اور خطرناک متعدی بیماری کا سرچشمہ بن جاتی ہیں“

ہر ایک ذات اور قوم کے جلسوں میں اس ظلم و جبر اور تذلیل اور تحقیر کے بدل ڈالنے کے لئے تقریریں بھی ہوتی اور رزولیوشن بھی پاس کئے جاتے ہیں۔ مگر قومی اصلاح کے دعویدار اخبار کے لئے بھی کنواری بیوہ کی مکرر شادی ابھی تک صرف جلی حروف میں لکھنے کے قابل عنوان ہی ہے اور ہندو بیوہ کی مکرر شادی کو ابھی تک ناقابل خیال امر سمجھا جاتا ہے۔

یہاں کافی عجیب بات تو یہ ہے کہ وہ ہی اثر اور اقتدار

---

[۵] ینگ انڈیا مورخہ ۲۶۔ اگست ۱۹۲۶ء

جو ایک ہاتھ سے عورت کے بچانے کے لئے نہایت ہی سختی سے عمل کرتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے بہت زیادہ وسیع طور سے اس کو لونڈی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ برٹش عمل اور مغربی تعلیم سیڑھی کی چوٹی پر تو قدیم زمانہ کی تاریکی سے ہندوؤں میں ناراضگی پیدا کر رہی ہے۔ اور دوسری طرف برٹش تعمیرات عامہ اور برٹش طریقہ پر حفظانِ صحت اور زراعتی نشوونما ادنے طبقہ کی اقتصادی حالت کو مسلسل اُبھار رہی ہیں۔ اور ان میں زیادہ تر اعلےٰ معاشرتی اقتدار کی امنگیں پیدا کر رہی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوؤں کے معاشری ترازو کے ادنے طبقہ کے لوگوں میں قطعی طور سے بیوہ کی مکرر شادی میں اب زیادہ تر رکاوٹیں ڈالنی شروع کر دی ہیں۔ حالانکہ ان کی مذہبی کتابوں میں ایسی ممانعت موجود نہیں ہے۔ گو ہندوؤں میں ذات کا درجہ دنیوی دولت کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ مگر چھوٹی جگہ کا آدمی جو یکایک جاگ کر اپنے آپ کو نئی فراغبالی۔ دولت۔ حفاظت اور امن وامان میں پاتا ہے۔ تو ایسے آدمی کی پہلی امنگ یہ ہوتی ہے۔ کہ ان آدمیوں کے طریقہ کی نقل کرے کہ جن کا اپنی پرورش کے لئے وہ اب تک دست نگر تھا۔ وہ اب ہندوستان میں اور سلطنت متحدۂ امریکہ میں یکساں معاشرتی سیڑھی پر چڑھنے لگا ہے۔ اور منتخب لوگوں کی رکاوٹوں کی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہننے لگا ہے۔

بڑودہ کے مسٹر بنرجی ایک ہندوستانی افسر ۱۹۲۱ء کی مردم

شماری ہندوستان کی پہلی جلد کی ساتویں فصل کے ۱۳۴ ویں فقرہ میں جبراً بیوہ رکھنے کے رواج کو توڑنے کی کوشش کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ایسی تمام کوششیں تب تک بیکار اور کمزور رہیں گی جب تک کہ ہندوؤں کی عام رائے کا زور بیوہ کی مکرّر شادی کی مخالفت کو شرافت کا نشان سمجھتا رہیگا۔ نچلے درجہ کی ہندو ذاتوں میں جو ذاتی معاشرتی طور سے دولتمند ہیں۔ وہ برہمنوں کے مانند بڑی مستعدی سے بیواؤں کی مکرر شادی کے دستور کو بند کر رہی ہیں۔

پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر ایک نہایت ممتاز بنگالی تھے۔ جنہوں نے ہندوستانیوں میں کنواری بیواؤں کی مکرّر شادی کی تحریک کا آغاز کیا۔ اور ایسی مکرر شادی کے لئے گورنمنٹ نے جو قانون بنایا۔ اس کی پنڈت جی نے حمایت اور تائید کی۔ مگر پنڈت جی پر اور ان کے کام کی بارآوری پر ایک اور ممتاز ہندوستانی یعنی سر سریندر ناتھ بنرجی اپنی کتاب[2] میں اس طرح سخت افسوس اور رنج و غم ظاہر کرتا ہے۔

مجھکو وہ ایجی ٹیشن اور شور و شر اچھی طرح یاد ہے۔ کہ جو شادی بیوگان کی تحریک پر کٹّر ہندوؤں میں پیدا ہوا۔ اور انہوں نے کس طرح سر سے پیر تک اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ ہندو

---

[1] رپورٹ مردم شماری ہند بابت ۱۹۲۱ء جلد اول باب ہفتم فقرہ ۱۳۴

[2] اے نیشن ان دی میکنگ (قوم جواب بھی رہی ہے) مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۵ء صفحہ ۹۰)

بیواؤں کا حامی اور ہمدرد پہلوان اپنی تحریک کی ناکامی کی حسرت لیکر مر گیا۔ وہ مثل انہی بہت سے آدمیوں کی طرح مرا ہے۔ کہ جو اپنے عمر میں آئندہ زمانہ کی باتیں رائج دیکھنا چاہتے تھے اس کا پیغام ابھی پورا نہیں ہوا...... اس کی موت کے وقت یعنی ۱۸۹۱ء سے لیکر اب تک اس تحریک نے بہت ہی سست رفتار سے ترقی کی ہے اس وقت سے اب تک ایک نئی نسل پیدا ہو گئی ہے۔ مگر اس تحریک کے بانی کا کوئی جانشین ابھی پیدا نہیں ہوا۔ الیاس نبی کی چادر علیشاہ نبی کے کندھوں پر ابھی نہیں پڑی۔ ہندو بیوہ کی قسمت آج کے دن تک بالکل ہی ہے۔ کہ جو آج سے پچاس برس پہلے تھی۔ بہت کم لوگ ہندو بیوہ کے آنسو شفقت کے رومال سے پونچھنے والے اور جبریہ بیوگی کو جو اس کی تقدیر میں ہے ہٹانے والے ہیں شاید زبانی ہمدردی کرنے والوں کی جماعتوں میں ترقی ہو گئی ہے۔ جو ودیا ساگر کی برسی کے دن عام جلسے کر کے اس بارہ میں چلاتے رہتے ہیں۔ مگر ہندو بیوہ کے اس عظیم پہلوان کے پیغام پر عملدرآمد بالکل نہیں کرتے۔"

مسٹر گاندھی جو ہمیشہ اپنی عقل کے مطابق سچائی کے حامی ہیں۔ اپنے اخبار ینگ انڈیا[۲] میں خود اس طرح رقمطراز ہیں۔

"چھوٹی لڑکیوں پر جبریہ بیوگی کو قائم رکھنا ایسا خونخوار اور ظالمانہ جرم ہے۔ کہ جس کی پاداش میں ہم ہندو لوگ ہر روز بڑی گراں قیمت

---

[۱] ایک انگریزی مثل ہے۔ یعنی ابھی اس کام کی تکمیل نہیں ہوئی (مترجم)

[۲] ینگ انڈیا مورخہ ۵۔ اگست ۱۹۲۶ء صفحہ (۲۷۶)

ادا کر رہے ہیں۔ ایسی بیوگی کے لئے کسی شاستر میں کوئی اجازت نہیں ہے۔ اپنی خوشی سے دانستہ جو کوئی ایسی عورت بیوگی اختیار کرے۔ کہ جس کے شریک زندگی کی محبت نے اس کو بے چین بنا دیا ہو۔ تو ایسی بیوگی سے تو اس بیوہ کی زندگی کو شرف اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا گھر مقدس بن جاتا ہے۔ اور خود مذہب کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ مگر جو بیوگی مذہب یا رواج سے زبردستی ڈال دی جائے۔ وہ ایک ناقابل برداشت جوا ہے۔ ایسا بیوہ پن خفیہ خرابیوں سے گھر کو ناپاک اور مذہب کو بے وقار بنا دیتا ہے کیا ہندو عورت کی بیوگی۔ ہندو مردوں کے نتھنوں میں۔ اس بُو کا احساس پیدا نہیں کرتی۔ جبکہ کوئی بڈھا اور مریض پچاس برس سے زیادہ عمر والا شخص کسی کم سن لڑکی سے شادی کرکے یا اس کو مول لیکر۔ بلکہ بعض اوقات اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں۔ اس لڑکی کو اپنی بیوی بنا لینے کا ارادہ کرتا ہے۔"

مگر پھر بھی یہ ایک ذاتی رائے ہے۔ اور اس کو عام رائے کی قوت حاصل نہیں ہے۔ ایک ممتاز ہندوستانی مدبّر نے مجھے کہا۔ کہ ہم کو گاندھی کے اور زیادہ عقیدوں کی ضرورت نہیں ہے گاندھی تو خود ہی بھٹکا ہوا ہے[1]۔

ایک مشہور و معروف ہندوستانی سر گنگا رام سی آئی۔ ای۔ سی۔ وی۔ او نے گورنمنٹ کی کچھ امداد سے شہر لاہور میں ہندو بیواؤں کے لئے ایک عمدہ مکان اور اسکول بنا کر وقف کر دیا

---

[1] گویا او خویشتن گم است کرا رہبری کند (مترجم)

ہے۔ اس آشرم میں ۱۹۲۵ء میں چالیس سے زیادہ بیوائیں رہتی
تھیں۔ احاطہ بمبئی میں بیواؤں اور چھوڑی ہوئی بیویوں کے لئے
گورنمنٹ کی امداد سے پانچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں۔ ان کا خرچ محبِ وطن
ہندوستانی برداشت کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی اور بھی بے
وجہ آشرم موجود ہوں لیکن اگر وہ موجود ہیں۔ تو ان کی موجودگی سرکاری
محرروں کو معلوم نہیں ہو سکی ہوگی۔ بنگال کے ایک تیرتھ میں جس کا
نام شہر نوادویپ ہے۔ میں نے خود بیوہ عورتوں کے لئے ایک
آشرم دیکھا ہے جس کا خرچ مقامی چندہ اور جاتریوں کے انعام و
بخشش سے چلتا ہے۔ وہاں یہ آشرم چودہ برس سے قائم ہے
اس میں صرف آٹھ بیوائیں رہتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کے بنانے
والوں کا صرف اتنی ہی بیواؤں کی امداد کرنے کا ارادہ تھا۔ اور
اتنی ہی اس میں گنجایش ہے۔

تازہ ترین مطبوعہ سرکاری شمار و اعداد کے مطابق ہندوستان
میں بیوہ عورتوں کی تعداد دو کروڑ ۶۸ لاکھ ۳۴ ہزار ۸ سو ۳۸[۱] ہے۔

۱؎ سٹیٹسٹکل ابسٹرکٹ کا برٹش انڈیا (خلاصہ شمار و اعداد برٹش ہند) ۱۹۱۵ء-۱۶ء سے
۱۹۲۳ء-۲۴ء تک گورنمنٹ ہند کی مطبوعات ہے۔ بابت ۱۹۲۵ء ہے دیکھو صفحہ ۳۰۔

آٹھویں فصل

بھارت ماتا

چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جن کی عمریں چار چار پانچ پانچ چھ چھ اور سات سات برس کی ہیں۔ مندر کے فرش پر آلتی پالتی مارے دیوی کی برنجی مورت کے سامنے بیٹھی ہیں۔ ہر ایک کے سامنے سیدھے اور صاف ستھرے کچھ تحائف رکھے ہیں جن میں ایک پھول۔ ایک یا دو پوتھ۔ تھوڑے سے پھل ہیں۔ ان قیمتی چیزوں کو یہ لڑکیاں دیوی کے سامنے چڑھانے لائی ہیں۔ یہ عبادت سکھلانے کا دن کا مدرسہ ہے۔ یہ بچیاں منتر سیکھتی ہیں۔ کہ جس کو وہ ڈنڈوت کے وقت زبان سے پڑھتی جاتی ہیں۔ اور ان تمام مذہبی رسومات کو سیکھ رہی ہیں۔ کہ جن کا تعلق ان متفرق مراسم سے ہے۔ کہ جن کا ذکر کرنا ہندو عورتوں پر فرض ہے۔ فقط یہی ان کی تعلیم ہے پس انہی باتوں کا ان کو جاننا ضروری ہے۔ دیکھئے اب وہ سب اکٹھی دعا مانگ رہی ہیں۔

ایک متین چہرہ والی ہندو استانی سے پوچھا گیا۔ کہ وہ کس بات کی دعا مانگ رہی ہیں؟ استانی نے کہا۔ کہ لڑکی اور کیا دعا

مانگ سکتی ہے ؟ یہی کہ اگر وہ کنواری ہے۔ تو شوہر کی دعا مانگے۔ یا اگر بیاہی ہوئی ہے۔ تو اپنے دوسرے جنم میں بہتر خاوند ملنے کی دعا کرے۔

عورتیں سب سے پہلے خاوند کے لئے دعا مانگتی ہیں۔ اس کے بعد لڑکا پیدا ہونے کی دعا مانگتی ہیں۔ مگر مردوں کو اپنی روح کی نجات کے لئے لڑکوں کی ضرورت لازمی ہے۔

ہم اس سے پیشتر ہندوؤں کے اولاد نرینہ کے لئے عام شوق کے متعلق کچھ شہادت قلمبند کر چکے ہیں۔ لڑکا پیدا ہونے سے پہلے سب سے بڑے فکر اس کو یہی رہتی ہے۔ کہ جلد ہی میرے لڑکا ہو جائے۔ مگر ایک اہم بات جو ہندوستانی قابلیت کی کسی عملی جانچ پڑتال میں نہ متنازعہ ہے۔ اور نہ نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ وہ طریقہ ہے۔ کہ جس میں تمام طبقوں کے ہندو اپنے بہت ہی چاہیتے بیٹے کو اس دنیا میں نمودار ہونے دیتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف حصص میں زنانہ ہسپتالوں کی موجودگی کا حال ہم لکھ چکے ہیں۔ جو بہت اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔ بالخصوص بچے جنانے کا کام ان میں خوب ہوتا ہے۔ مگر کثرت کام کی مقابلہ میں زنانہ ہسپتالوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہندوستانی عورتوں کی وسیع اکثریت کو ان کے نشو و نما کی موجودہ حالت میں زنانہ ہسپتال سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب ہی نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ ہسپتال ان کے مکان کے دروازہ سے بالکل لگا ہوا ہی ہو۔

معمولی طور سے ہندوستانی عورت کو دردِ زہ کے وقت جن چیز

کی قدیم دستور کے موافق ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دائی ہے۔ یقینی آنے کے لئے دائی جیسی عجیب وغریب شئے دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے

ہندوؤں کے شاستر کے مطابق عورت اپنے زچگی کے زمانہ اور چلہ نہانے تک رسماً بالکل ناپاک سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ جس چیز کو ان ایام میں عورت چھولے۔ وہ بھی بھرشٹ ہوجاتی ہے۔ اس لئے دائی صرف وہ ہی عورتیں بن سکتی۔ کہ جو خود بھی گندی یا نیچ ذات اور اچھوت قوم کی ہوں۔ کٹر ہندو جو نیچ ذات کے لوگوں کو اپنے قریب آنے تک نہیں دیتا۔ وہ چھوت چھات سے بچنے کے لئے اسی دلیل کو عمدہ اور کافی سمجھتا ہے۔ کہ وہ اچھوتوں کو ان کی گندہ عادتوں کے سبب سے اپنے قریب نہیں آنے دیتا۔ پھر ہندوؤں کے شاستر کے مطابق زچہ اور بچہ دونوں پر نظر بد کا اثر خاص طور سے ہوجاتا ہے۔ اس لئے ایک آدھ عورت کہ جس کے بچے مرچکے ہیں۔ اور دوسری وہ عورت کہ جس کو کبھی اسقاط حمل ہوچکا ہو۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں دائی نہیں بن سکتی۔ اسلئے کہ کہیں خفیہ طور سے اس کے دل میں رنج وحسد پیدا نہ ہوجائے اور بچہ یا زچہ کو نظر نہ لگ جائے۔ بیوہ عورت بھی اپنی بدشگونی کی وجہ سے دائی کا کام انجام نہیں دے سکتی۔ مگر ہر ایک جگہ دائی کے متعلق مذکورہ بالا تمام باتوں پر خیال نہیں رکھا جاتا۔ مگر ان میں سے الگ الگ ہر بات پر ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد کا اعتقاد ہے۔

ایک لطف اور ہے کہ دائی کا کام کرنے کے لئے کسی قسم کی تربیت ضروری نہیں سمجھی جاتی - یہ پیشہ بعض خاندانوں میں مورو ثی چلا آتا ہے - کوئی دائی مرجاتی ہے - تو اس کی بیٹی یا بہو اپنی ماں یا ساس کا کام اور دائی کے کام کی پریکٹس فوراً شروع کر دیتی ہے خواہ اپنی تمام زندگی میں اس نے کسی زچہ کے بچہ پیدا ہوتے دیکھا بھی نہ ہو - اسی طرح اور دوسری عورتیں بھی جو دوسری ذات کی ہوں دائی کا کام کر سکتی ہیں - بشرطیکہ ان میں شرائط ممانعت میں سے کوئی شرط نہ ہو - تو ان کے کہنے پر انہیں دائی کے کام پر فوراً لگا لیا جاتا ہے -

اس لئے المختصر آدھی اندھی معمر - لولی - لنگڑی - لقوہ زدہ - بیمار - گندہ ترین عورت دائی تنہا اس وقت ہندوستان کی عورتوں کی مدد کے لئے تیار ہوتی ہے - کہ جو وقت عورتوں کی زندگی میں نہایت ہی نازک - نہایت ہی خطرناک اور نہایت ہی اہم ہوتا ہے زچہ اپنے بچہ کے آنے کے لئے کچھ بھی تیاری نہیں کرتی اس بچہ کے لئے کسی قسم کی چھوٹی سی پوشاک پہلے سے تیار نہیں کی جاتی - اگر ایسا کیا جائے - تو وہ خطرناک طور سے دیوتاؤں کی ناراضگی کا موجب سمجھا جاتا ہے - مگر وہ یہ کام ضرور کرتی رہتی ہے - کہ سال بھر کے دوران میں سے گھر کا کوئی آدمی کسی میلے کچیلے یا ناقابل استعمال پھٹے پرانے کپڑے یا چیتھڑے کو زمین پر پھینکدے

لہ دیکھو رسالہ نشنل سلیتھ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء کا صفحہ (۱۲۵) مرتبہ ادریس گریفن میلیتھ وزیٹر دہلی -

تو وہ اس کو کسی کونے یا اندھیری کوٹھڑی میں جمع کرلی جاتی ہے
جب نوجوان عورت کے دردزہ شروع ہوجاتا ہے۔ اور
بچہ پیدا ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ تو وہ اسی بدبودار اور چیتھڑوں
سے بھری ہوئی کوٹھڑی میں آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔ زچہ کو
ناپاک سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور جس چیز کو وہ ہاتھ لگادے اس کو بھی
ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے صرف ضائع کردینے کے قابل خیال
کیا جاتا ہے۔ کفایت شعاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے پاس
رہنے کے لئے اس کو صرف ناپاک اور ناکارہ چیز ہی دی جاتی
ہے۔ خواہ وہ چیز انسان ہو یا بیجان۔ اگر گھر میں کوئی پائے ٹوٹی
ہوئی۔ ناکارہ اور واہیات چارپائی ہو۔ تو زچہ کو لیٹنے کے لئے وُہ
ہی چارپائی دی جاتی ہے۔ یہ چارپائی اسی کال کوٹھڑی میں پڑی
رہتی ہے۔ تاکہ پھر بوقت ضرورت دوبارہ بچہ پیدا ہونے کے
وقت کام میں لائی جائے۔ اگر ایسی چارپائی بھی نہ ہو۔ تو اسکے
ٹکنے اور سہارا لینے کے لئے گائے کے گوبر کے اُپلوں یا پتھروں
کا ذرا سا سہارا خالی فرش زمین پر بنا دیا جاتا ہے۔ کوئی عورت
بھی اتنی تکلیف گوارا کرکے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ کہ بچہ
پیدا ہونے سے پہلے پہلے وہاں جھاڑو دیدی جائے۔ یا وہاں سے
کوڑا کرکٹ اور مٹی اٹھا کر پھینک دیا جائے یا اس کو دھوکا دیا جائے
جب دردزہ شروع ہوتا ہے۔ تب دائی بلائی جاتی ہے۔

ہ نیشنل ہیلتھ بابت ۱۹۲۵ء صفحہ ۷۔ لیڈی منیجی گھوس کا مضمون "زچگی کا بخار"
وکٹوریا میموریل سکالرشپ فنڈ رپورٹ میں دیکھو۔

اگر بلانے کے وقت دائی اتفاق سے صاف کپڑے پہنے ہوئے ہو۔ تو خواہ کتنی ہی جلدی جانے کا موقعہ ہو۔ وہ اپنے گھر میں ٹھہر کر صاف کپڑے اتار کر غلیظ اور میلے کچیلے کپڑے۔ جو ایسے وقت کے لئے مخصوص ہوتے ہیں پہن لیتی ہے۔ یہ کپڑے بار بار بیمار زچہ عورتوں کی گندگی سے کہ جن کا بچہ جنانے کے لئے یہ دائی جاتی رہتی ہے۔ اور عفونت اور جراثیم سے پُر ہوتے ہیں۔ ان نہایت میلے کچیلے سڑے ہوئے اور بیماری کے گھر کپڑوں کو پہن کر دائی بیچاری حاملہ کے ساتھ کوٹھڑی میں بند ہو کر قسم قسم کی جراثیم وبائی کے پھیلانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اگر اس کوٹھڑی میں کوئی سوراخ یا روشندان ہو۔ تو وہ اسے کوڑا کرکٹ اور تنکوں سے بند کر دیتی ہے۔ کیونکہ زچگی میں تازہ ہوا نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور پرسوت کا بخار پیدا کر دیتی ہے۔ اگر گھر میں چیتھڑے موجود ہوں۔ تو انہیں گونتھ گانٹھ کر ان کا ایک پردہ بنایا جاتا ہے۔ جسے ایک گوشے میں لٹکا دیتی ہے۔ اور زچہ کی چارپائی اس کے پیچھے کے ساتھ بچھا دیتی ہے۔ تاکہ اس غریب تک تازہ ہوا نہ پہنچ سکے۔ پھر اندھیرے کو اور زیادہ بھیانک بنانے کے لئے ایک مدھم سا کڑوے تیل کا چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی مٹی کے تیل کی ڈبیہ جلاتے ہیں جس پر چمنی نہیں ہوتی اور جس میں سے بدبودار اور زہریلا دھواں نکل نکلکر تمام ہوا کو خراب کرتا رہتا ہے۔ زاں بعد دائی ایک کڑاہی میں دُھکتے ہوئے کوئلے لاکر اس کی چارپائی کے نیچے یا زچہ کے پاس رکھ دیتی ہے۔ جس میں سے زہریلی دھوئیں نکلکر بدبوؤں کے ساتھ ملتی رہتی ہیں۔

پہلی دائی کو جو میں کام کرتے ہوئے دیکھنے گئی۔ تو دائی نے میرے کمرہ میں داخل ہوتے ہی آگ پر کوئی بو دار دوائی مٹھی بھر کر ڈال دی تاکہ زچہ نظر بد سے یعنی میری نظر بد سے بچی رہے ایک شعلہ بھی اٹھا۔ اور تمام کمرہ دھوئیں سے پُر ہو گیا۔ اس شعلے کی روشنی میں مجھے زچہ کے پاس بیٹھی ہوئی ایک چڑیل یا بھتنی کا چہرہ نظر آیا۔ تو اس کے کرخت اور بکھرے ہوئے جوؤں سے پُر بالوں میں اس کے غلیظ اور دریدہ کپڑے۔ اس کے غلیظ ہاتھ اور اس کی سڑی گلی اور چندھیائی ہوئی آنکھیں دھوئیں کے بادلوں میں سے جو اس نے پیدا کر دیئے تھے دکھتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں لیکن اس شعلے سے جو اس بیہوش و حواس زچہ کے بستر کو آگ لگ گئی۔ اور اس کا جسم اس سے تلملا اٹھا۔ دائی نے اس کو بجھایا تک نہیں۔ وہ ایسی اندھی اور بیہوش تھی کہ نہ شعلہ دیکھ سکتی تھی۔ اور نہ اس کی گرمی محسوس کر سکتی ہو گی۔ اگر بچے کے پیدا ہونے میں دیر لگے۔ تو دائی کا فرض ہے۔ کہ اس دیر کی وجوہات تلاش کرے۔ یہ دریافت کرنے کے لئے وہ اپنا غلیظ اور میلا کچیلا ہاتھ جس میں متعدد انگوٹھیاں اور چوڑیاں پہنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور جس میں ناپاکی اور غلاظت کی وجہ سے لاکھوں جراثیم چپٹے ہوتے ہیں۔ اس بیچاری کے جسم کے اندر داخل کر دیتی ہے۔ جو کچھ وہاں اس کے ہاتھ آئے۔ اسے توڑنا۔ مروڑنا۔ اور کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔ اگر اس پر بھی وضع حمل نہ ہو

۱؎ وی۔ ایم۔ ایس۔ الیف رپورٹ۔ ہندوستان میں پیدائش بچگان کی حالات کی ترقی کی رپورٹ صفحہ ۷۰ ومابعد

اور دیر ہو رہی ہو۔ بشرطیکہ حاملہ کا شوہر اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔ تو دوسری اور کبھی تیسری دائی بھی بلائی جاتی ہے۔ اور یہ سب ملکر بچے کے ٹکڑے توڑ توڑ کر اور کھینچکر نکال لیتی ہیں۔ کبھی بچّہ کی ٹانگ ٹوٹ کر آجاتی ہے کبھی کوئی ہاتھ بچہ کا توڑ کر باہر لایا جاتا ہے۔

ایک اور لیڈی ڈاکٹر کی شہادت لیجئے:۔

ہڈی کے نرم ہو جانے کے باعث پیڑو سکڑ جانے کی مریضوں میں بچہ رحم میں بے طرح پھنس جاتا ہے۔ اگر سر کسی طریقے سے نیچے نہ نکلے۔ تو بچے کا دایاں ہاتھ یا پاؤں جو ان کے ہاتھ لگے۔ کھینچنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور اگر ممکن ہو۔ تو بسا اوقات ان کو توڑ ڈالتی ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی طاقت آزما کر جس طرح بھی ہو سکے۔ بچہ کو زور سے گھسیٹ کر نکال لیں۔ حاملہ کو ایسی ترکیبوں سے بُری طرح نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ اکثر جسم کا اندرونی حصہ اور مثانہ بُری طرح پھٹ جاتا ہے۔ ہندوستانی عورتوں میں ایک تکلیف دہ بیماری یعنی زخم رحم یا ناصورِ رحم بکثرت پائی جاتی ہے۔ اور جس سے ان کو بیحد تکلیف اور مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

یہ تکلیف (بچّے کا پیدا نہ ہونا) تین۔ چار۔ پانچ بلکہ چھ چھ دن تک جاری رہتی ہے۔ اس عرصہ میں حاملہ کو کسی قسم کی غذا دینا بروئے شاستر ممنوع ہے۔ دائی قسم قسم کے جاہلانہ علاج کرتی ہے۔ کبھی، تو مریضہ کے تمام جسم کو اپنی مٹھیوں سے آٹے کی طرح

گوندھتی ہے کبھی دیوار کے برابر زچہ[1] کو کھڑا کر کے اپنے سر کو اس کے کمر میں بٹھا دیتی ہے کبھی زچہ کے ہاتھ پکڑ کر اس کی رانوں پر زور زور سے لاتیں مارتی ہے حتیٰ کہ بقول ڈاکٹروں کے زچہ کا گوشت اس کے ہاتھ پاؤں کے لمبے لمبے ناخنوں سے پھٹکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ وہ زچہ کو چت لٹا کر اس کے جسم پر چلتی ہے۔ جیسے کہ انگوروں پر چلا کرتے ہیں کبھی عجیب وغریب چیزوں کی پوٹلیاں بنا کر اس کے جسم کے اندر رکھتی ہے جن میں زیادہ تر اونٹ کٹارے کی جڑ۔ موج کی میلی رسیاں اور بہی کے بیج ہوتے ہیں۔ یا مٹی اور لونگیں مکھن اور گندے کے پھول۔ اخروٹ یا گرم مصالحہ غرضکہ کوئی محرک چیز لیکر جسم میں ٹھونس دیتی ہیں۔ تاکہ بچہ جلد پیدا ہو جائے ملک کے بعض حصوں میں بکری کے بال بچھو کے ڈنک، بندر کی کھوپڑی اور سانپ کی کھال اس مطلب کے لئے مفید سمجھی جاتی ہیں۔

ان اشیا سے داخل کرنے اور ان کے پیدا کئے ہوئے زخموں سے بعض اوقات رحم کا راستہ جزاً یا کلاً بند ہو جاتا ہے۔ اگر بچے کے بعد آنول یا آل الش وغیرہ نکلنے میں پانچ منٹ سے زیادہ دیر لگے۔ تو پھر وہی انگوٹھیوں اور چوڑیوں سے بھرا ہوا گندہ ہاتھ کہنی تک اندر داخل ہوتا ہے اور جسم کی جھلی[2] وغیرہ

---

[1] دی ایم ایس ایف رپورٹ صفحہ (۱۵۱-۲) مسز چودھری سب اسسٹنٹ سرجن

[2] ایضاً صفحہ (۸۶) ڈاکٹر ایم اے واٹلی۔

توڑنا اور تمام الائش کھینچتا ہوا باہر لے آتا ہے۔

ایام زچگی میں نہ تو صاف کپڑے اور نہ ہی گرم پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ اگر زچہ کا جسم سرد ہونے لگے۔ تو گائے کا گوبر یا بکری کی مینگنی یا جلسی ہوئی راکھ سے اسے گرم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے[1]

بنارس میں جو مقدس شہر ہے۔ اور جو کٹر اور راسخ العقیدت ہندوؤں کا ملجا اور ماوے ہے بھنگیوں کو جو کہ سب کے سب اچھوت ہیں۔ سات درجوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ بھنگیوں کے پہلے طبقہ کی عورتوں میں سے دائیاں بنتی ہیں۔ اور سب سے نچلے اور اخیری درجہ کی عورتیں نال کاٹنے والی بنتی ہیں۔ آنول نال کاٹنے کو ایسا ذلیل کام سمجھا جاتا ہے۔ کہ پاک شہر بنارس میں بھنگی اس کام کو کرتے ہیں۔ اس لئے یہ غلیظ اور ناقابل بیان دائیاں اپنے ساتھ ایک اور غلیظ تر اور ناقابل بیان خادمہ لاتی ہیں۔ کہ جو بچہ کی نال کاٹنے کا کام انجام دیتی ہے۔

بعض اوقات بانس کی کھپچیوں بعض وقت کسی پرانے ٹین کے کنستر کے ٹکڑے سے یا کسی زنگدار لوہے کی کیل سے کبھی ٹوٹے ہوئے مٹکے کے ٹھکرے سے۔ یا ٹوٹے ہوئے شیشہ کے ٹکڑے سے آنول نال کاٹی جاتی ہے جب کبھی یہ کاٹنے کا آلہ کسی خادمہ کے پاس آنول نال کاٹنے کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ اور کوئی تیز دھار کی کاٹنے والی چیز بھی ادھر ادھر پڑی ہوئی نہیں دکھلائی دیتی۔ تو

---

[1] دی ایم ایس ایف رپورٹ صفحہ ۱۵۲ مس ودیا بائی ایم رام

پھر وہ آس پاس کے گھر میں جا کر ہمسائی سے ایسی چیز مانگ لاتی ہیں۔ میں یہ آواز بہت جلد کبھی فراموش نہیں کروں گی "ارے پھٹی اندر جانے والیو۔ میرا چاقو دے جاؤ۔ میں تو ابھی کھانا پکانے کے لئے تمام ترکاری سبزی کاٹ بھی نہیں چکی"

نال کا سرا بغیر مرہم پٹی کئے خود بخود خشک ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں بچّہ کی زیادہ تر احتیاط مقصود ہو۔ وہاں مٹّی۔ یا لپسا ہوا کوئلہ یا کوئی اور اسی قسم کا سفوف جو کئی چیزوں کو پیس کر بنایا جاتا ہے۔ اور جس میں گائے کا گوبر بھی ملا دیا جاتا ہے۔ کٹی ہوئی جگہ پر چھڑک دیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ ایسے بچوں کی بہت بھاری فیصدی تعداد جو پیدائش کے وقت کی ایسی شدید تکالیف سے زندہ بچ جاتی ہے۔ وہ اگر تشنج یا سرخ بادہ[1] کے بخار سے مرجاتی ہے۔

بچّہ کے پیدا ہوتے ہی اس کو عام طور سے خالی فرش زمین پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اور جب تک دائی زچہ سے فرصت پا کر بچّہ کے لینے کے لئے تیار نہ ہو جائے تب تک بچہ زمین پر

---

[1] بنگال میں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ معمولی طور سے ان میں سے نصف بچے تو آٹھ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مرجاتے ہیں۔ اور آبادی کا صرف ایک چوتھائی حصّہ چالیس سال کی عمر تک پہنچتا ہے...... جن اسباب سے بچے ہلاک ہوتے ہیں۔ ان میں سے پچاس فیصدی موتیں تو پیدائشی کمزوری کی وجہ سے ہوتی ہیں اور ۴ء۱۱ موتیں تشنج سے ہوتی ہیں۔ دیکھو بنگال کے ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ کی ۵ء۴ ویں سالانہ رپورٹ کے صفحات (۸۔ اور ۱۰)

کھلا پڑا رہتا ہے۔ اور کوئی اس کی خبر نہیں لیتا۔ اگر یہ بچہ لڑکی ہو۔ تو اس کی نامبارک زندگی کو وہیں اور اسی وقت ختم کر دینے کے لئے بہت سے آسان قاعدے جو نسلاً بعد نسل بطور امانت چلے آتے ہیں۔ کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

بچہ کو مختلف مقامات میں مختلف خوراک دی جاتی ہے۔ صوبجات متوسط میں عام طور سے یہ قاعدہ ہے۔ کہ بچہ کو پہلی خوراک جو دی جاتی ہے۔ وہ گرہ میں اسی بچہ کا بیشاب[1] ملا کر پلا دی جاتی ہے۔ دہلی میں قند اور بعض مسالے شراب یا شہد میں ملا کر پلا دیئے جاتے ہیں۔ یا بچہ کو تین دن تک گٹلی غالباً (گھٹی) پلائی جاتی ہے گھٹی چند مصالحوں سے بنائی جاتی ہے اس میں چند پرانے زنگ آلود سکے اور تعویذوں کا کاغذ بھی ڈالکر ابال لیتے ہیں مختلف حصص ملک کی مختلف ذاتوں اور قوموں میں گھٹی کی چیزیں مختلف ہوتی ہیں گھٹی کے اجزاء میں خواہ بڑا فرق ہو۔ مگر ان کا اثر سب جگہ یکساں ہی سمجھا جاتا ہے۔

زچہ کے متعلق اس سے پہلے ہی بتلایا جا چکا ہے کہ اس بیچاری کو درد زہ شروع ہونے کے زمانہ سے چار دن سے لیکر سات دن تک علی العموم کوئی چیز کھانے یا پینے کو نہیں دی جاتی۔ یا اگر اس کو خوراک دی بھی جاتی ہے۔ تو بادام یا چھوہارے وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ اس خوراک نہ دینے کا مطلب بعض اوقات تو کفایت شعاری ہوتا ہے۔ کہ کنبہ کے برتن بھرشٹ نہ ہو جائیں۔

---

[1] وکٹوریہ میموریل اسکالرشپ فنڈ رپورٹ کا صفحہ ۸۲ مرتبہ ڈاکٹر ایم لے داتیلی۔

بہر حال اس کا مطلب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس طور سے قدیم الایام کے اعتقاد خوب زندہ رہتے ہیں۔ اور گھر والوں کی کفایت شعاری کی روح اس اعتقاد کو خود بخود مدد دیتی ہے۔

بعض مذہبوں یا ذاتوں میں بچہ کو تین[1] دن تک ماں کا دودھ نہیں پینے دیتے۔ اس دستور سے اکثر خوفناک نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ بعض جگہ زچہ کو صرف اپنے نوزائیدہ بچہ ہی کو دودھ پلانا پڑتا ہے کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ تین تین سال کے بچے بھی درد زہ کی سخت تکلیف کی حالت میں اندر جاکر اپنی ماں کا دودھ پیتے رہتے ہیں۔ دریافت کرنے پر گھر کی عورتیں باہر سے چلا کر کہہ دیتی ہیں کہ یہ بھوکا رو رہا تھا اور کسی چیز کو نہیں کھاتا۔ نہ کسی چیز سے بہلتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو لیے کمزور اور مریض مورثوں کے فعل سے پیدا ہونے سے اور دوسرے ردی اور خراب خوراک کھانے اور تیسرے خود اپنی بچپن کی شادی اور وقت سے پہلے تعلقات زناشوئی کے کام میں لانے سے اور متعدی مرض کے ہو جانے سے ہندوستان کی عورتوں کی بہت بھاری تعداد فیصدی یا تو عام طور پر بہت ہی منحنی چھوٹی ہڈیوں والی ہوتی ہے۔ یا اندر سے ایسی بدشکل اور مریض ہوتی ہے کہ شاذ ہی کسی کے معمولی طور سے بچہ ہوتا ہو گا۔ اس لئے ان عورتوں کو

---

[1] نیشنل ہیلتھ بابت اکتوبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۲۳ مولفہ ادریس گریفن

[2] وکٹوریہ میموریل اسکالرشپ فنڈ رپورٹ صفحہ ۸۶

ڈاکٹری امداد کی احتیاج رہتی ہے۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی
جاسکتی ہے کہ اگر اس قسم کی مریض عورتوں کا کوئی برٹش میم ڈاکٹرنی
یا برٹش ہسپتال میں کام سیکھی ہوئی ہندوستانی ڈاکٹرنی احتیاط سے
ساتھ علاج نہ کرے۔ اکثر یہ عورتیں دردوں اور تکلیفوں سے گھل
گھل کر مر جاتی ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی ڈاکٹری امداد اور احتیاط چاہے
وہ مکان کے قریب ہی موجود ہو۔ قدیم مذہبی خیالات کی بنا پر
یا تو اس کا خاوند یا خاندان کی بڑی بوڑھی عورتیں مریضہ کو اس سے
فائدہ نہیں اٹھانے دیتیں۔

ان حالتوں میں بھی کہ جن میں ہندوستانی نقطۂ خیال سے
بچہ[1] طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ نتیجہ اکثر موت سے بھی زیادہ
تباہ کن ہوتا ہے سرینگر زنانہ ہسپتال[2] کی ڈاکٹر کے۔ اووان جو ایک
نہایت حاذق لیڈی سرجن ہیں۔ اس بات کی اس طرح سے تشریح

---

[1] ہندوستان میں مرد ڈاکٹر طالبعلم کے لئے بچہ پیدا کرانا اور دایہ گری کی سکھلائی حاصل
کرنا بہت ہی مشکل ہے اس کا سبب یہ ہے کہ جن ہسپتالوں میں مرد ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ وہاں
ہندوستانی عورت کو شاذ و نادر ہی ترغیب دیکر لایا جاسکتا ہے اس لئے بعض نہایت ہی محدود
موقعوں کو چھوڑ کر فن ڈاکٹری کے ہندوستانی طالبعلم کو زچگی اور بچہ پیدا کرانے کے متعلق تمام باتیں صرف
کتابوں سے یاد کرنی پڑتی ہیں اگر یہ طالبعلم غیر ممالک میں آکر یہ سکھلائی سیکھ بھی لے تب بھی اس پر عمل کرنے کا
اپنے ملک میں اس کو موقعہ ہی نہیں ملتا اگر یہ بات سچ ہے کہ بعض اوقات مغربی ممالک کا تعلیم یافتہ ہندوستانی ڈاکٹر
ایک موٹے پردہ کے پیچھے بیٹھ کر ولادت کے کام میں اس طرح مدد دیتا ہے کہ دائی زچہ کے پاس
بیٹھی ہوئی چلا چلا کر جو بیان کرتی جاتی ہے اس بیان کی بنا پر ڈاکٹر اس کو دور ہی سے زبانی مشورہ
دیتا جاتا ہے مگر لفظ "عملی" سے جو بات مقصود ہے اس طرح سے وہ بالکل حاصل نہیں ہوتی۔

[2] وکٹوریہ میموریل فنڈ۔ رپورٹ صفحہ (۹۹۔۹۸)

کرتی ہیں کہ :-

بہت سی عورتیں صرف اس وجہ سے بے اولاد اور مستقل طور سے بانجھ ہو جاتی ہیں کہ ایام زچگی میں ان کی خبر گیری بہت بری طرح سے کی جاتی ہے بہت سے مردوں کے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ناواقف دائیوں کی جہالت سے اس مرد کا لڑکا پیدا ہوتے ہی مار ڈالا گیا۔ یا ان کی بیویوں کو دائیوں نے ایسا بری طرح ملادلا کہ گوشت ٹوٹ کر ان کے زخم پڑ گئے کہ جس سے عورت آیندہ بچہ جننے کے قابل بالکل نہ رہی ....

" میں اپنے ریمارک کو چند اس قسم کے نمونہ کی مثالوں سے ظاہر کرتی ہوں کہ جس قسم کے واقعات ہندوستان میں مطب کرنے والی ڈاکٹر عورتوں کو اکثر پیش آتے رہتے ہیں :

ایک جگہ سے بلاوا آیا کہ چلئے ایک عورت کے بچہ ہونے والا ہے۔ اور وہ درد زہ کی سخت تکلیف میں مبتلا ہے جب ہم وہاں پہنچے۔ تو ہم کو ایک تنگ و تاریک اور غلیظ کمرہ میں عورتیں لے گئیں۔ ایسے کمرہ میں عموماً کوئی کھڑکی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کھڑکی ہو۔ تو اس کو بند کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دیسی عورتوں کو یہ خیال ہے کہ تازہ ہوا سے پرسوت کا بخار ہو جاتا ہے۔ ایک انگیٹھی میں کوئلہ کی آگ جل رہی تھی جس سے اس کمرہ کی باقی ہوا بھی خراب ہو رہی تھی۔ اور چارپائی یا فرش زمین پر عورت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک یا دو میلی کچیلی بڈھی عورتیں بیٹھی تھیں جن کے کپڑے غلیظ تھے۔ ہاتھ کیچڑ میں لت پت

تھے۔ اور جن کے سر کے بالوں میں جوئیں پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دائیاں ہیں۔ حاملہ تین دن سے دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ مگر بچہ کو نکال نہیں سکے۔ ایک بار اور کوشش کرنے سے پہلے وہ اپنے ہاتھ فرش زمین پر رگڑ رہی تھیں۔ ہم نے مریضہ کا معائنہ کیا تو معلوم ہو گیا۔ کہ اندام نہانی پر ورم ہے۔ اور وہ پھٹا ہوا ہے۔ دائیوں نے بتلایا۔ کہ بچہ کے پیدا ہونے میں مشکل ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم نے دونوں ہاتھ اور پاؤں کا زور لگا کر بچہ کو نکالنے کی کوشش کی... خیر ہم نے حاملہ کو کلوروفارم سونگھا کر بیہوش کیا۔ اور بچہ کو چمٹوں سے نکالا۔ ہم نے اندر سے اونٹ کٹارے کی جڑ۔ میلے کچیلے چیتھڑے اور رسیاں جن میں بیج بندھے ہوئے تھے۔ نکالیں۔ جو کہ ان دائیوں نے حاملہ کے جسم کے اندر ٹھونس دی تھیں۔

یہ نہ سمجھنا کہ غریب زچہ ہی ان مصیبتوں کا شکار ہوتی ہے۔ میں تم کو بہت سے ہندوستانی تعلیم یافتہ اشخاص کے گھر کہ جنہوں نے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ دکھلا سکتی ہوں۔ کہ جن کی بیویوں کو بھی ولادت کے وقت میلے کچیلے گدیلوں پر لٹایا جاتا ہے۔ اور ایسی ہی جاہل بازاری دائیوں کو بلوا لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہی دستور ہے۔ اور بی اے کی ڈگری کے تعلیم میں عام سمجھ ذرا بھی شامل نہیں۔

ڈاکٹر وان نے اپنے ذاتی تجربہ سے اس کے بعد اور بہت سی مثالیں بیان کیں۔ جن میں سے ایک مثال نمونہ کے طور

پر یہاں لکھدی جاتی ہے۔

"ایک دولتمند ہندو نے جو کہ ایک ہندوستانی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہونے کے علاوہ خود بھی لکچرار ہے۔ اور بہت اعلےٰ تعلیم یافتہ ہے ہم کو اپنے گھر بلایا۔ کیونکہ اس کی بیوی کے بچہ پیدا ہوا تھا۔ اور زچہ کو بخار آنے لگا تھا... ہم کو معلوم ہوا کہ دائی کے پاس دافع تعفن اور جراثیم کش ادویات نہ تھیں۔ کیونکہ ان پر دو شلنگ دو پنس انگریزی یا امریکن ڈالر یا تین روپے کے قریب خرچ آتا تھا۔ اس کے علاوہ دائی کو ایک روپیہ اور کچھ میلے کچیلے کپڑے فیس کے طور پر دینے پڑتے۔ زچہ میلے کچیلے کپڑوں میں غلیظ کپڑوں کے ڈھیر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس ڈھیر میں پھٹی پرانی پھینکی ہوئی واسکٹ تھی ایک انگریزی ریلوے کمبل تھا۔ ایک ٹکڑا موم جامہ کا تھا۔ جو شاید کسی پارسل کا پاروانہ ہو گا۔ اور اس کے خاوند کی ایک غلیظ اور میلی کچیلی چادر تھی۔ اس کے علاوہ وہاں نہ کسی قسم کی صاف چادریں تھیں۔ اور نہ صاف کپڑوں کے ٹکڑے وغیرہ تھے۔ زچہ کے خاوند نے مجھے کہا کہ ہم اب تو نہیں مگر بچہ کی ولادت کے پانچویں دن زچہ کو صاف کپڑے پہنائینگے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں یہی رواج ہے۔

باوجود اس کے کہ ہم سے جہانتک ہو سکا ہم نے اس زچہ کا علاج کیا۔ مگر وہ خون میں سمیت پیدا ہونے سے مر گئی۔ یا تو اس کے خون میں یہ زہر ان میلے کچیلے اور غلیظ کپڑوں کے ذریعہ سے پہنچا۔ کہ جو کینہ بھر میں ایک زچہ کی ولادت سے فارغ ہونے کے بعد آئندہ

لے وکٹوریہ میموریل فنڈ رپورٹ صفحہ (۹۹-۱۰۰)

کبھی اور بچہ پیدا ہو۔ تو اس وقت کی بچہ کی ولادت کے لیئے سنبھال کر رکھ لیئے جاتے ہیں۔ اور ان کپڑوں کو دھویا تک نہیں جاتا۔ بے دُھلے ہی سمیٹ کر رکھ لیئے جاتے ہیں۔ اور ان کپڑوں کو دھویا تک نہیں جاتا۔ بے دُھلے ہی سمیٹ کر رکھ لیئے جاتے ہیں۔ یا گرم پانی، صابن۔ ناخن کے بُرش یا دوسری دافع لتعفن ادویات کی عدم موجودگی سے دائی نے جو کچھ کام زچہ کا کیا۔ اس دائی کے ہاتھوں سے زہر زچہ کے بدن میں سرایت کر گیا۔

اس بات کی شہادت موجود ہے۔ کہ تعلیم یافتہ سفر کردہ اور دولتمند ہندوستانی کہ جو خود بھی یورپ کی یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ ہیں اس بات کی اجازت دیدیتے ہیں۔ کہ ان کی بیویاں جہالت اور تاریکی کی اسی ورثہ کو برداشت کریں۔ اس کے ثبوت میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر انگلستان کی یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔ اور طب میں اس نے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی۔ اور اس کو ہیئل طور سے لائق اور ممتاز ڈاکٹر سمجھا جاتا ہے اور آجکل حقیقت میں وہ گورنمنٹ کے ایک مرکز کا انچارج ہے جہاں دائیوں کو زمانہ حال کی دایہ گری کی سکھلائی کی جاتی ہے۔ اس کی نوجوان حاملہ بیوی کے جب بچہ پیدا ہونے کا وقت آیا۔ تو وہ اپنے کنبہ کی بڑی بوڑھیوں کے دباؤ سے اس بات پر راضی ہو گیا۔ کہ اس کے بچہ کی ولادت کے لئے قدیم زمانہ کی غلیظ، گندی اور جاہل دائی بلائی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زچگی کے بخار سے اسکی بیوی فوت ہو گئی۔ اور لڑکا بھی پیدا ہونے کے وقت مر گیا۔ پھر ڈاکٹر وان

لکھتی ہیں۔ کہ جب ہمارے سامنے یہ تماشہ موجود ہے۔ کہ انگلش ڈگریاں حاصل کئے ہوئے ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے۔ کہ وہ ناواقف اور جاہل دائیوں کے ہاتھ سے اپنی بیویوں اور بچوں کو مرواڈالنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ تو ان کی زیادہ غریب بہنوں کی تکالیف اور مصیبت کا خیال کرنے سے روح کانپ جاتی ہے۔

مگر اس معاملہ میں دنیوی دولت یا درجہ کچھ اثر نہیں ڈالتا۔ اس بارہ میں انگلش اور امریکن لیڈی ڈاکٹروں کا کام قابل تعریف ہے۔ اور انگلش اور امریکن ڈاکٹرنیوں کا متحدہ کام اس بات کا ثبوت ہے۔

لیڈی ڈاکٹر میرین اے[1] وائیلی لکھتی ہیں کہ یہ باتیں صرف نہایت غریب لوگوں کے گھروں یا نہایت جاہل طبقہ تک ہی محدود نہیں ہیں۔ میں نے راجاؤں کے عالیشان محلوں میں بھی زچگی کی یہی حالت دیکھی ہے۔ بلکہ ایسے بہت سے رواج وہاں بھی برتے جاتے ہیں۔ جب میں نے وہاں زچہ خانہ میں تازہ ہوا کی آمدورفت کے لئے روشندان یا کھڑکیاں کھلوادیں۔ اور دافع عفونت تدابیر اختیار کیں۔ تو عورتوں نے میری سخت مخالفت کی۔

بھنگی کی لڑکی ہو یا برہمن کی۔ نیچ ذات ہو یا رانی۔ اس تند لمحہ کے وقت کہ جس کے لئے تنہا صرف عورتیں ہی پیدا کیگئی ہیں۔ اصل میں ان سب کی تقدیروں میں بالکل کوئی امتیازی بات

[1] وکٹوریہ میموریل فنڈ رپورٹ صفحہ ۷۰۔

منتخب کرنے کے لئے نہیں ہے۔ اس وقت سب کی حالت یکساں ہوتی ہے۔

ایک ہندو مسیحی عورت کہ جس کا درجہ ممتاز تھا اور جو بہت قابل تھی۔ اور جس کے عمدہ چال چلن نے اس کے آنے کے لئے بہت سے ایسے دروازے کھول دیئے تھے۔ کہ جو دیگر عورتوں کے لئے سختی سے بند رہتے ہیں۔ وہ اپنی رحمدلی سے ایک بچی شہزادی کو دیکھنے گئی جس کا قصہ وہ اس طرح بیان کرتی ہے:۔

"یہ چھوٹی سی بچی شہزادی جو ایک فرمانروا رئیس کی بیوی تھی دس برس سے کچھ ہی زیادہ عمر کی تھی جب میں اس کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ تو وہ پہلے ہی سے دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ دائیاں اپنے کام میں مصروف تھیں مگر معاملہ بظاہر سخت تھا پیشوایانِ مذہب سے دعائیں منگوائی جا رہی تھیں۔ دروازہ کے باہر ایک معمر مذہبی پیشوا بیٹھا ہوا تھا جو مذہبی کتاب کے منتر وقتاً فوقتاً زور زور سے چلا کر پڑھتا تھا۔ اور اس کتاب کے الفاظ کے معانی کی تشریح کر کے دائیوں کو ہدایت کرتا جاتا تھا۔

"یکایک وہ چلایا کہ ٹھہر جاؤ۔ اب وقت ہے۔ کہ اس عورت کے جسم پر آگ جلاؤ۔ جلدی سے اس کے جسم پر آگ جلا کر روشن کر دو"۔

دائی فوراً اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

"اس مسیحی عورت نے خوف کا اظہار کئے بغیر اس پنڈت سے آہستہ سے دریافت کیا کہ آگ سے ہماری اس چھوٹی سی رانی کو

کیا فایدہ پہنچیگا؟ اس کا جواب عورتوں نے بے پروائی سے یہ دیا کہ اگر اس کی تقدیر میں زندہ رہنا ہے۔ تو وہ زندہ رہے گی۔ اور اتنا ہوگا۔ کہ آگ سے اس کے جسم پر بڑا سا داغ پڑجائیگا۔ یا اگر اس کی قسمت میں مرنا ہی لکھا ہے۔ تو وہ مرجائے گی۔ یہ کہکر وہ پھر آگ جلانے کو تیار ہوگئیں۔

"مگر یہ ہوشیار اور عقلمند عورت دوڑکر اس پنڈت کے پاس پھر بھاگ گئی۔ کہ جو آلتی پالتی مارے ہوئے دروازہ پر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ پنڈت جی مہاراج۔ کیا آپ دیوتاؤں کے حسد اور رنجش سے واقف نہیں ہیں؟ تم آگ پر قربانی چڑھا رہے ہو مگر یہ تورانی ہے۔ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ کیا گنگا مائی! اس کو دیکھکر یہ حسد نہ کریں گی۔ کہ گنگا مائی کا کچھ بھی اعزاز نہیں کیا گیا۔؟

"بڈھے پنڈت نے حیران ہوکر اوپر دیکھا۔ اور کہنے لگا۔ کہ ہاں یہ بات تو سچ ہے۔ سچ ہے کہ دیوتا ایک دوسرے کے ہمیشہ حاسد رہتے ہیں اور جلدی سے مشتعل ہوکر غصہ میں بھر جاتے ہیں۔ مگر پوتھی تو یقینی طور سے یہی کہتی ہے۔ اس کی پریشان آنکھیں پھر پورانی کتاب پر جھک گئیں۔ کہ جو اس کے گھٹنوں پر کھلی ہوئی رکھی تھی

مسیحی عورت نے دریافت کیا۔ کیا اس گھر میں گنگا جل ہے بڈھی عورت نے جواب دیا۔ کہ موجود ہے۔ کیا گنگا جل کے بغیر اس گھر والے رہ سکتے ہیں۔

"پھر اس نے کہا کہ میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔ روشن آگ پر
گنگا جل ڈال دیا جائے۔ تاکہ سہ چند گرم ہوجائے۔ پھر اس کو ایک
عجیب تھیلی میں ڈال دیا جائے۔ یہ عجیب تھیلی دیوتا یہاں میرے
ہاتھ سے مہیا کرادیں گے اور اس تھیلی کو مہارانی کے جسم پر رکھدیا
جائیگا۔ اس طور سے آگ اور پانی کو ملا کر ایک متحدہ چڑھاوا بنایا
جائے۔ تاکہ دیوتا راضی ہوجائیں۔ اور ان کا غصہ جاتا رہے"

بڈھے پنڈت جی مہاراج نے چلا کر کہا کہ یہ بات عقلمندی کی
ہے۔ ایسا ہی کرو چنانچہ وہ مسیحی عورت دوڑ کر اپنے گھر آئی۔
اور لندن کے بانڈ سٹریٹ بازار سے خریدا ہوا گرم پانی کا بیگ
رانی کے محل میں لے گئی۔

ہندوستانی لوگوں میں عقائد باطلہ اور توہم پرستی کسی امیری
یا غریبی یا کسی خاص طبقہ یا درجہ پر محدود نہیں ہے۔ عام طور سے
عورتوں کو اس بات کا یقین ہے۔ کہ بیماری کسی دیوتا کے آنے
کی علامت ہے۔ دوائی اور جراحی کے کام اس دیوتا کو بھگا
دیتے ہیں جس سے دیوتا ناراض ہوجاتا ہے۔ اور دیوتاؤں
کو غصہ دلانا بہت بُرا کام ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تعویذ یا
جنتر منتر سے یا دیوتاؤں کو چڑھاوے چڑھا کر بیماری کا علاج
کیا جائے۔ تاکہ کوئی نقصان نہ ہونے پائے۔

دیوتاؤں کے علاوہ بھوت اور پریت اور بد ارواح بھی ہیں
ان کی تعداد سمندر کے ریت کے ذرّوں کے برابر ہے۔ کہ جس
سے زیادہ اور کسی تعداد کا اظہار ہو نہیں سکتا۔

بُری قسم کی چڑیلیں۔ یا بھوتنیاں ان عورتوں کی روحیں ہوتی ہیں۔ کہ جو بچہ پیدا ہونے سے پہلے عالم زچگی میں مرجاتی ہیں یہ چڑیلیں جب چلتی ہیں۔ تو ان کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ خالی سڑکوں پر اور گھروں میں پھرتی رہتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ اذیت اور تکلیف پہنچاتی ہیں۔

اس لئے جب کوئی عورت قریب المرگ ہوتی ہے۔ اور ابھی تک اس کے بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور کئی روز سے وہ دردِ زہ میں مبتلا رہکر کمزوری ہڈیوں کے جڑ جانے کے سبب سے بچہ پیدا نہ ہونے سے قریب الموت ہوجاتی ہے۔ تو دائی لازمی طور سے اس گھر بار کے لوگوں کی حفاظت کے لئے احتیاطی کام شروع کردیتی ہے۔

اول تو وہ مرچیں لاتی ہے۔ اور مرنے والی زچہ کی آنکھوں میں ان کو خوب ملتی ہے۔ تاکہ اس کی روح اندھی ہوجائے۔ اور اس کو باہر جانے کے لئے راستہ ہی نہ مل سکے۔

اس کے بعد دائی لوہے کی دو لمبی کیلیں لیتی ہے۔ اور اپنی بسمل زچہ کے نہ مزاحمت کرنے والے بازوؤں کو پھیلا کر ایک ایک کیل اس کی ہتھیلی کو فرش زمین پر رکھکر ہتھیلی میں ٹھونک دیتی ہے۔ مرنے والی زچہ بیچاری اس بات کو جانتی ہے۔ اور اپنی قسمت پر شاکر رہکر کچھ بھی مزاحمت نہیں کرتی۔ یہ کام اس لئے کیا جاتا ہے۔ کہ اس کی روح زمین سے پیوست کردی جائے۔ تاکہ وہ دیر میں جائے یا وہ اُٹھنے اور ادھر اُدھر پھرنے

نہ پائے۔ اور زندہ آدمیوں کو حیران و پریشان نہ کرے۔ یہ عورت بیچاری نہایت قابل رحم طور سے دیوتاؤں سے التجا کرتی ہوئی کہ میرے وہ سیاہ گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ کہ جو پہلے جنم میں میں نے کئے تھے۔ اور جس کے لئے میں اب مصیبت بھگت رہی ہوں آخر کار مر جاتی ہے۔

مذکورہ بالا بیان اگرچہ بڑا ہیبتناک ہے لیکن ہندوستان کے بہت دور دراز پھیلے ہوئے حصوں کی بہت سی ایسی لیڈی ڈاکٹر گواہوں کی شہادت پر مبنی ہے۔ کہ جن کی نسبت کبھی یہ خیال ہو نہیں سکتا۔ کہ وہ جھوٹ بولتی ہونگی۔ اس فصل کے خاص خاص بیان ایسی ہی شہادتوں اور میرے خاص مشاہدہ کی بناء پر لکھے گئے ہیں۔

گو دائی کے تمام کام نہایت غلیظ اور ہیبتناک ہیں۔ مگر پھر بھی یہ فرض کر لینا کہ ان سب باتوں کی ملزم صرف دائی ہی ہے سخت ناانصافی ہوگی۔ ہر ایک حرکت یا بات جو دائی کرتی ہے۔ وہ قدیم الایام سے اس کے پیشہ کا مسلمہ کام ہے۔ اگر دائی اس میں سے ایک کام بھی چھوڑ دے یا ایک بات میں بھی تبدیلی کر دے۔ تو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ جن گھرانوں میں وہ کام کرتی ہے۔ ان گھرانوں کی بڑی بوڑھیاں صرف اس کو جھڑک دیں گی۔ کہ تو بڑی نالائق دائی ہے۔ تو کچھ نہیں جانتی۔ اور اس کی جگہ کسی ایسی دوسری دائی کو بلا لیں گی کہ جو رواج اور رسم کی باتوں کو پورے پورے طور سے انجام دیتی ہو۔

دائی کی خدمات میں بچہ کی ولادت کے وقت اور اس کے پیچھے کم وبیش دس دن تک زچہ کے پاس رہنا لازمی ہے ماندازاً یہ وہ مدت ہے۔ کہ جس کے دوران میں اس گھر کا کوئی آدمی بھی زچہ کے پاس اس کو ناپاک جاننے کی وجہ سے نہیں جاتا۔ اس عرصہ میں دائی وہ تمام کام انجام دیتی ہے۔ کہ جس کا کرنا بیمار عورت اور بچہ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس عرصہ کے ختم ہونے پر اس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے۔ کہ وہ اس غلیظ کمرہ کو صاف کر دے گی۔ اور اس کی فرش زمین اور دیواروں پر گوبر پھیر دے گی۔

جس جنس کا بچہ پیدا ہو۔ اس کے مطابق دائی کو کام کی اجرت دی جاتی ہے۔ اجرت کی رقم مختلف ہوتی ہے۔ دولتمند آدمی کے اگر لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ اس کل مدت کی خدمت کے لئے دائی کو پندرہ روپے دیتا ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں کے گھر بیٹا پیدا ہو۔ تو دائی کو ایک روپیہ اور اگر بیٹی ہو تو آٹھ آنہ معمولی طور سے دیدیئے جاتے ہیں۔ دائی کے پندرہ دن کی خدمات کا معاوضہ غریب لوگ اس طرح دیتے ہیں۔ کہ اگر ان کے لڑکا ہو تو چار یا پانچ آنے اور اگر لڑکی ہو تو دو یا تین آنے دے دیتے ہیں۔ دائی خود غریبوں سے بڑھکر غریب ہوتی ہے۔ اس کی آمدنی خود اتنی نہیں ہوتی۔ کہ جس میں سے وہ صابن کی ٹکیہ، صاف سوتی کپڑے کا ٹکڑا خرید سکے۔ یہ

---

[1] اس میں بیحد مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ لاہور میں تو آجکل ایسے لوگوں سے معمولی دائیاں چار پانچ روپیہ سے کم نہیں لیتی (مترجم) [2] دائیاں اتنی غریب نہیں ہوتی۔ شاید شہر سے دور اُفتادہ کسی گاؤں میں ایسا ہوتا ہو (مترجم)

چیزیں اس کے لئے کسی گھر میں بھی مہیا نہیں کی جاتیں۔ پس اسی طرح
سے زچہ عورتیں برابر ذبح اور ضائع کی جا رہی ہیں۔

برٹش لوگوں کی فیاضی اور خیرات کے چندہ سے بہت سے متفرق
فنڈ قائم ہیں۔ ان متفرق فنڈوں کے سرمایہ سے ہندوستان کے
بہت سے حصص میں زچہ اور بچہ کی پرورش اور ان کے رکھ
رکھاؤ کے کام چل رہے ہیں۔ ہر جگہ لیڈی ڈاکٹرنیاں دائیوں کو
دایہ گری کے کام علمی اصول کے موافق سکھلانے کی کوشش کرتی
رہتی ہیں مگر یہ کام نہایت مشکل ہے۔ دائی ہمیشہ یہ عذر کر دیتی
ہے کہ مجھکو کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس عذر میں
دائیوں کے ججمان دائیوں کی رائے سے متفق ہو جاتے ہیں۔ ایک
لیڈی ڈاکٹر نے اپنی دائیوں کی جماعت مجھکو دکھلائی۔ یہ سب دائیاں
بڑی عمر کی بڈھی اور ضعیف تھیں جن کو ایک کلاس میں بیٹھا ہوا
دیکھکر خوف معلوم ہوتا تھا۔ کلاس دکھلا کر لیڈی ڈاکٹر نے کہا:۔

"انگلستان کے فیاضوں کے چندہ کے سرمایہ سے ہم ان دائیوں
کو یہاں کلاس میں آ کر دایہ گری کی سکھلائی کرنے کے لئے کچھ رقم
دیتے ہیں۔ ہم ان میں سے بعض دائیوں کو اس بات کے لئے بھی کچھ
رقم دیتے ہیں کہ وہ دایہ گری کا کام اب نہ کیا کریں۔ مگر یہ رقم اتنی
قلیل ہوتی ہے کہ جس سے ان کا صرف گذارہ ہی چلتا ہوگا۔ یہ دائیاں
بہت معمر، بہت بیوقوف اور مفلس ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ مشکل سکھلائی
سیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر جب ہم نے ان سے یہ کہا کہ تم کسی زچہ کے

۱؎ وکٹوریہ میموریل فنڈ رپورٹ صفحہ (۸۹)

پاس جاکر بچہّ کے پیدا کرانے کا کام نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ تمہارے ہاتھوں سے بہت سی زچہّ اور بچے مرجاتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ پھر ہم کیا کھاکر زندہ رہینگی؟ روزی کمانے کے لئے ہمارے پاس تو صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اور دائیوں کا یہ کہنا بالکل سچ ہے۔"

جن فنڈوں کے سرمایہ کا ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک فنڈ کے روپے سے شمالی ہندوستان میں ایک لیڈی ڈاکٹر کو ایک شہر میں صحت عامہ کے قاعدوں کا انسٹرکٹر مقرر کرکے مامور کیا گیا چنانچہ اس کو ایک خاص قسم کا واقعہ پیش آیا۔ وہ کہتی ہے کہ جب یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا گیا۔ تو اسی وقت کچھ چند گھنٹے پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ اس تماشہ کا بیان اس وقت اچھی طرح سمجھ میں آئیگا جبکہ ہم انسٹرکٹر صاحبہ کی ظاہری وضع قطع بھی بیان کردیں۔ یہ ایک نہایت خوبصورت اور زندہ دل خوش طبع لیڈی ہے۔ وہ ہر حالت میں عمدہ پوشاک پہنتی ہے۔ اور بالوں میں کنگھی کئے رہتی ہے۔ وہ لاہور میں دائیوں کے کلاس کو دایہ گری کے کام کی سکھلائی کیا کرتی تھی۔ اس نے اپنی گریجوایٹ دائیوں سے یہ کہدیا تھا۔ کہ جب تم کسی جگہ بچہّ کی ولادت کے لئے جاؤ۔ اور بچہ پیدا ہونے میں مشکل پڑجائے۔ تو مجھکو صلاح اور مشورہ کے لئے بلا لیا کرو۔

۱۹۲۶ء میں ایک روز جاڑے کے موسم میں تین بجے صبح کے قریب اس کی ایک گریجوایٹ دائی نے اسے بلوایا۔ ڈاکٹرنی صاحبہ اس آدمی کے ہمراہ چلیں۔ وہ ان کو ایک نیچ ذات ہندو کے گھر لیگیا۔ وہ گھر مٹی گارے سے بنا ہوا ایک جھونپڑا تھا جس کا اندر سے

طول چار گز اور عرض پونے تین گز تھا۔ اس کمرہ میں ایک ہی کنبہ کی تین نسلوں کے دس آدمی رہتے تھے۔ سوائے مریضہ کے سب آدمی سو رہے تھے۔ ایک بھیڑ دو بکریاں۔ کچھ مرغیاں اور ایک گائے بھی اسی کمرے میں بندھی ہوئی تھیں۔ اس لئے گھر والے کو اپنے پڑوسیوں پر اعتبار نہیں ہے۔ خوف ہے کہ وہ کہیں ان کو چرا نہ لیں۔ روشنی بھی نہ تھی۔ صرف ایک مٹی کی ہنڈیا میں ذراسی آگ تھی۔ اس کے سوائے کسی قسم کی آگ کی گرمی۔ سوائے آدمیوں اور جانوروں کی جسم کی گرمی کے وہاں موجود نہ تھی۔ کوئی سوراخ بھی سوائے دروازہ کے نہ تھا۔ اور دروازہ بھی بند تھا

ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جو کمرہ کے پیچھے تھی۔ چار چارپائیاں اس طرح بچھی ہوئی تھیں۔ کہ ایک پر ایک اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں ان چاروں پر اس کنبہ کے چار آدمی سو رہے تھے۔ زمین سے تیسری چارپائی پر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی۔ جو سخت دردِ زِہ میں مبتلا تھی۔

دادی نے سوتے سوتے کہا کہ دائی باہر گئی ہے۔ اور پھر دیوار کی طرف کروٹ لیکر سو گئی۔ یہ موقعہ زچہ کے لئے ایسا نازک تھا کہ ایک سیکنڈ بھی کھونا نہیں چاہیئے تھا۔ دائی کے تلاش کرنے کے لئے بالکل موقعہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے گائے پلنگوں کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس غریب اور سر بھی نہ ہلانے والی حلیم گائے کی پیٹھ پر پاؤں رکھکر ہماری خوبصورت چھوٹی سی انگلش ڈاکٹرنی صاحبہ کھڑی ہو گئیں۔ اور اس فائدہ مند جگہ سے

کامیابی کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے ہندوؤں کا ایک توام جوڑا ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ دنیا میں لانے کا باعث نہیں۔

بچوں کے پیدا ہوتے ہی دائی واپس آگئی۔ وہ بڑے غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ وہ مکان کے صحن میں زچہ کے خاوند سے داموں کے لئے لڑ رہی تھی۔ کہ اس سے بڑا سکہ میری ہتھیلی میں رکھو۔ تاکہ اس پر آنول نال کاٹ سکوں۔ جب تک دائی یہ سکہ پہلے سے اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتی تب تک کوئی ہشیار دائی آنول نال نہیں کاٹتی۔

یہ تو صرف روزمرہ کا معمولی تجربہ ہے۔

"ہمارے ہندوستان میں دایہ گری کا جو موجودہ طریقہ مروّج ہے۔ بیشک اس سے مختلف طریقہ دایہ گری کا مروج ہونا چاہئے۔"

یہ رائے ان ہندوستانی جنٹلمینوں کی ایک جماعت کی اس طریقہ کے متعلق ہے جو انکے اعلےٰ حلقہ میں دایہ گری کا مروج ہے۔ اور جس تمام طریقہ پر وہ مباحثہ کر رہے تھے۔ مگر پھر وہ بھی کہتے تھے۔ کہ کیا یہ بات ممکن ہے۔ کہ اتنی کافی انگلش لیڈیاں مہیا ہو سکیں گی کہ کہ جو یہاں آکر دائی کا کام کر دیا کریں۔

نوجوان بیویوں کی بہت ذرا سی فیصدی تعداد آجکل زمانہ حال کی ڈاکٹری امداد قبول کر لینے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ مگر اس بارہ میں سخت اور کارگر مزاحمت کنیہ کی صرف بڑی بوڑھیاں ہی کرتی ہیں۔

لیڈی ڈاکٹر اگینس سکاٹ ایم۔بی پی ایس پنجاب کی ان[1] تمام برٹش میڈیکل عورتوں ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگی ہندوستانی عورتوں کے علاج کے لئے وقف کر دی ہے۔ اپنی ہشیاری اور عمدگی سے علاج کرنے کی وجہ سے ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تعلیم یافتہ آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ سیکھی ہوئی دایہ زچگی میں اسکی بیوی کی خدمت کرے۔ مگر وہ جہالت کی اس سنگین دیوار کے مقابلہ میں بالکل لاچار اور بے بس ہے۔ کہ جو اس کے زنانہ کی بوڑھی عورتوں نے بنا کر قائم کر رکھی ہے۔ اس لئے کہ گھر کی حکمران اصل میں یہی بوڑھی عورتیں ہی ہیں"

ڈاکٹر لیڈی کے۔ او وان اس بارہ میں لکھتی ہیں[2] کہ:۔

"عورتیں ہی خود اپنی سب سے بڑی دشمن ہیں۔ اگر کوئی آدمی گھر کی ان بڑی بوڑھیوں۔ یعنی دادی۔ پڑدادی اور سکڑدادی کی تعلیم اور تہذیب کے لئے کوئی ایسا طریقہ وضع کرے۔ کہ جس سے ترغیب دیکر ان بڑی بوڑھیوں کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ جاہل اور میلی۔ گندی بازاری دائیوں سے اپنی زچاؤں کی خدمت دایہ گری نہ لیا کریں۔ تو وہ شخص ہندوستانی قوم پر بڑا ہی احسان کریگا۔ میری رائے میں یہ کام ناممکن ہے۔

---

[1] وکٹوریہ میموریل فنڈ رپورٹ صفحہ ۹۰ نیز سر ہربرٹ کے بھیچر کی کتاب "دی میڈیکل پریکٹس ان انڈیا" مطبوعہ ہمفری فراڈ ڈائیڈ ہاڈر اینڈ سٹاؤٹن لندن ۱۹۲۳ء صفحہ (۱۲۱ - ۱۲۵)

[2] وکٹوریہ میموریل فنڈ رپورٹ صفحہ (۱۰۱)

ایک اور لیڈی سرجن صاحبہ لکھتی ہیں[1] کہ :۔

دستور یہ ہے کہ ساس یا کوئی اور بڑی بوڑھی زچہ اور بچہ کے پیدا ہونے کے کام کا انتظام کرتی ہے۔ یہ بڑی بوڑھی صرف انہی قدیم باتوں کی پابندی کرانی چاہتی ہے۔ کہ جن باتوں کا اس کو اپنے زچہ پن کے زمانہ میں تجربہ ہو چکا ہے.... قدیم الایام سے یہی دستور چلا آتا ہے۔ کہ زچہ اور اس کے بچہ کی پیدائش کا انتظام کرنا صرف گھر کی بڑی بوڑھی عورتوں کا منصبی فرض ہے اس بارہ میں مرد بالکل بے اختیار ہیں۔ وہ اس کام میں دخل دے ہی نہیں سکتے۔

اس طور سے ایک حیرت انگیز تصویر پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصویر مرد کی ہے۔ کہ جس نے قدیم الایام سے اپنی بیوی کو اپنی لونڈی بنا رکھا ہے۔ اور جس کی زندگی کی سب سے زیادہ ضرورت موجودہ اور آیندہ دونوں زندگیوں کے لئے یہ ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہو جائے۔ پھر اسی آدمی کو اپنی دلی خواہش میں مایوسی اور ناکامی جس ذریعہ سے ہوتی ہے۔ وہ اس کی تابعدار لونڈی یعنی بیوی کی مرضی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مرد نے اس بات کو بہتر سمجھ رکھا ہے۔ کہ عورت ہمیشہ ناواقف اور جاہل ہی رہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اپنی قدرتی خواہش اور روح زندگی کو مٹا ڈالے۔ اور رسم و رواج کے سخت جکڑ بند والے ساز و براق میں کس کر قدم قدم اس کے آگے جو اپنی عورت کا زینی دیوتا ہے

---

[1] وکٹوریہ میموریل فنڈ رپورٹ صفحہ (۷۱)

چلا کرے۔

عورت اپنے بچپن سے لیکر اپنی موت تک تابعدار اور فرمانبردار رہکر اس بیرحمانہ اور ظالمانہ ضابطہ کی پابند لاانتہا صدیوں سے قدم قدم چل رہی ہے۔ حالانکہ مرد نے اپنے بچپن سے لیکر اپنی موت تک لاانتہا صدیوں کے دوران میں اپنے آپ کو کسی قسم کے بھی ضابطہ کا پابند نہیں کیا۔ اور اب ان کی کھیتی میں جنس پک کر تیار ہو گئی ہے۔ عورت کے لئے تو یہ جنس ہے۔ کہ وہ قدیم قانون یا رواج کے چٹان پر موت کے منھ میں ہر دم کھڑی ہے۔ اور اپنے بھاری وزن میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے بالکل انکاری ہے۔ خواہ اس کی کیسی ہی قابل رحم حالت ہو۔ مرد کے لئے یہ جنس ہے۔ کہ وہ مرضی اور ارادہ کا کمزور ہے۔ اور اس کے رگ و پٹھے درماندہ اور روح زندگی تھکی ہوئی ہے کہ جس نے اس کو اس کے گھر ہی میں مار کوٹ کر اس کی لونڈی (عورت) کے ہاتھوں میں ڈال دیا ہے۔

ہندوستان میں جتنے زندہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر سال کوئی بیس لاکھ کے قریب مر جاتے ہیں۔ ہندوستان کی تازہ ترین مردم شماری کی رپورٹ میں لکھا ہوا ہے۔ کہ جس قدر شمار و اعداد مل سکے۔ اُن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ بچوں میں چالیس فیصدی سے زیادہ موت ان کی پیدائش کے بعد ایک ہفتہ کے اندر اندر ہوتی ہے۔ اور ساٹھ فی صدی سے زیادہ

۱؎ رپورٹ مردم شماری ۱۹۲۱ء جلد اول حصہ اول صفحہ (۱۳۲)

موت پیدائش کے بعد ایک مہینہ کے اندر اندر ہو جاتی ہے۔

جو بچے مردہ پیدا ہوتے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے مُردہ پیدا ہونے کے بڑے بڑے سبب آتشک اور سوزاک ہیں۔ اس کے ساتھ یہ سبب بھی ملا دینا چاہئے کہ دنیا میں آنے کی کوشش کرنے کے لئے یہ بچے بالکل ہی ناقابل ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں پیدائش اور اموات کے شمار و اعداد بالکل قابل بھروسہ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کو جمع کرنے والے زیادہ تر ناخواندہ اور جاہل گاؤں والے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ مرجاتا ہے۔ تو اس عورت کا رونا چلانا ایک یا دو راتوں کی تاریکیوں تک رہتا ہے لیکن اگر وہ گاؤں کسی دریا کے پاس ہو تو کفن کے لئے کسی چیتھڑے یا کپڑے کو ضائع کئے بغیر بچہ کی چھوٹی سی نعش کو دریا میں پھینک دیتے ہیں چیلیں اور کچھوے اس چھوٹی سی نعش کا گوشت پوست کھا کر اس کی تو ارتج زندگی کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور یہ بات نہایت اغلب ہے کہ گاؤں میں کوئی شخص بھی اس بچہ کی پیدائش یا موت کی رپورٹ کرنا کچھ ضروری نہیں سمجھتا۔ اس لئے بچوں کی پیدائش اور اموات کے شمار و اعداد محض تخمینہ سمجھنے چاہئیں۔

مگر موجودہ حالتوں کو زیر نظر رکھکر یہ بات اغلب معلوم ہوتی ہے کہ اگر بچوں کی اموات کے صحیح صحیح شمار و اعداد کا جاننا ممکن ہوتا۔ تو اس سے اہل مغرب کے دماغ کو بہ نسبت ان کی

اموات کی زیادتی کے ان کی اموات کی کمی پر حیرت ہوتی ۔

ایک امریکن لیڈی ڈاکٹر کا بیان ہے ۔ کہ میں شیرخوار بچہ کو نازک ترین چیز سمجھا کرتی تھی ۔ مگر ہندوستان کے تجربہ نے جبراً یہ بات میرے ذہن نشین کردی ہے ۔ کہ شیرخوار بچہ نہایت سخت جان چیز ہے ۔ کہ جو ایسی حالتوں میں بھی زندہ رہتا ہے ۔"
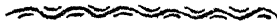
اس سے پہلے جتنی فصلیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں خاصکر ہندوؤں کا ذکر لکھا گیا ہے جن کی تعداد ہندوستان کی آبادی میں موٹے حساب سے تین چوتھائی ہے۔ باقی ایک چوتھائی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ ان میں شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت فرق ہے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی رگوں میں ایران اور افغانستان کی قدیم فاتح اقوام کا خون دوڑ رہا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر ان ہندوؤں کی نسل سے ہیں۔ کہ جنہوں نے ہندو مذہب ترک کرکے دین اسلام اختیار کر لیا تھا۔ ان میں ہنوز بہت سی ہندوانا طریقے اور عادتیں کم و بیش موجود ہیں۔

بعض باتوں میں مسلمان عورتیں اپنی ہندو بہنوں کی نسبت بہت زیادہ فوائد سے متمتع ہیں۔ ان فوائد کی بڑی بڑی نمایاں باتیں یہ ہیں۔ کہ ایک تو مسلمانوں میں بچپن میں شادی نہیں ہوتی دوسرے مسلمان عورتیں جبراً بیوہ رہنے سے آزاد ہیں۔ ان دونوں

باتوں میں سے ہرایک بات کے ساتھ جس قدر مصیبتوں ۔ ذلتوں اور تکلیفوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس سے بھی مسلمان عورتیں بالکل آزاد ہیں۔ اس لئے ان کا بہتر ورثہ کہ جس کی تائید اور امداد ان کی خوراک بھی کرتی ہے ۔ کہ جو ہندو عورتوں کی خوراک سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے مسلمان عورتوں کو بلوغت کے دروازہ پر ایسی حالت میں لاتے ہیں۔ کہ ہندو بالغ عورتوں کی نسبت وہ بہت زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں ۔ مگر بلوغت کی دہلیز سے گذر جانے کے بعد شریف خاندانوں کی مسلمان عورتوں کا وہ فائدہ ضبط ہو جاتا ہے ۔ اس لئے کہ پھر وہ مکان کی چاردیواری کے اندر عملاً عمر قید کے مانند پردہ میں بند رہتی ہیں۔

پردہ کا طریقہ ہندوستان میں مسلمان فاتح اپنے ساتھ لائے اور انہوں نے اس پر عملدر آمد رکھا ۔ پھر بہت جلد اعلیٰ ذات کے ہندو بھی یہ سمجھکر کہ پردہ معاشرتی رعب و داب کا نشان ہے۔ اپنی عورتوں کو پردہ میں رکھنے لگے ۔ چونکہ آجکل ملک کی فراغبالی میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے ۔ اس لئے زمانہ وسطےٰ کا یہ رواج ہندوؤں میں کنواری بیوہ عورتوں کی مکرر شادی کی ممانعت کی طرح ایسا معلوم دیتا کہ درحقیقت بڑھ رہا ہے ۔ ہر ایک ایسی شریف عورت کے عوض میں کہ جس کو مغربی اثرات پردہ سے آزاد کر دیتے ہیں اس سے کم درجہ کی مگر آسودہ بہنیں جو معاشرتی عزت کی خواہشمند ہوتی ہیں ۔ دانستہ پردہ اختیار کر لیتی ہیں ۔

پردہ کے رواج کا اغلباً ابتداءاً ... [illegible]

میں فریق غالب کے آدمی عورتوں کو پکڑ کر لیجایا کرتے تھے۔ اس
خوف سے مردوں نے عورتوں کو پردہ میں رکھنا شروع کیا۔ جب
مرد اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر عورت کو بند کر دیتا ہے۔ تو پھر
وہ اپنے گھر کے دروازہ کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اگر اس معاملہ میں
ہندوستانیوں کی شہادت لی جائے۔ تو اس سے یہ بات ظاہر ہو گی
کہ بعض حالتوں میں آجکل کے زمانہ میں بھی یہی ضرورت موجود ہے
ہندوستان کے ایک حصہ میں جہاں پردہ کا بہت کم رواج ہے۔
میں نے کئی اعلےٰ ذات کی ہندو عورتوں کو متحدہ طور سے یہ درخواست
کرتے ہوئے دیکھا کہ انگلش اور ہندوستانی لیڈیوں کے لئے جو تفریح
طبع کے واسطے امیوزمینٹ کلب قائم ہے۔ اور جس سے ہمارا بھی
تعلق ہے۔ کلب کی ممبری کی عمر گھٹا کر ضرور بارہ سال یا بہتر تو یہ ہے
کہ گیارہ سال کر دی جائے۔ ان عورتوں نے کشادہ دلی کے ساتھ
کہا کہ یہ بات ہم اس لئے چاہتی ہیں۔ کہ گیارہ یا بارہ برس کی عمر کی اپنی
لڑکیوں کو گھر پر اکیلی چھوڑنے سے ہم کو خوف لگا رہتا ہے۔ ہماری
خواہش ہے کہ ہم ان کو ایک سہ پہر کے لئے بھی ماں کی آنکھ سے دور
نہ رہنے دیں تاکہ کنبہ کے مردان کے پاس نہ آسکیں۔

یہ حال تو شریف خاندانوں کی عورتوں کا تھا معاشرتی لحاظ
سے کم درجہ کی عورتوں کو بھی اسی فکر میں مبتلا پایا۔ گاؤں کے ہندو
کسان کی بیوی اپنی کم عمر لڑکی کو ایک گھنٹہ کے لئے بھی اپنے گھر
میں تنہا نہیں چھوڑتی۔ اس کو عملاً اس بات کا یقین ہے۔ کہ اگر
وہ اپنی لڑکی کو ایک گھنٹہ کے لئے بھی تنہا اپنے گھر میں چھوڑ دے

تو وہ لڑکی برباد کردی جائے گی۔ میں اس بات کی تصدیق کرنے کی جرأت تو نہیں کرتی۔ کہ یہی حالت ہر ایک جگہ یکساں ہے۔ مگر میں اس بات کی تصدیق کرسکتی ہوں کہ ہندوستان کے بہت سے پھیلے ہوئے علاقوں میں جو آپس میں ایک دوسرے سے بہت دور دور ہیں۔ ہندوستانی اور یورپین لوگوں نے ملک کی روزانہ زندگی کی حالت کے متعلق میری توجہ اس طرف منعطف کرائی۔

کوئی شریف مسلمان اپنے زنانہ میں دوسرے مسلمان کے آنے پر اعتبار نہیں کریگا محض اس لئے کہ وہ جانتا ہے۔ کہ ایسی آزادی موقعہ دینے کے مترادف سمجھی جائے گی۔ اگر تھوڑے سے ہندو دوسرے خیال کے ہوں۔ تو یہ اس لئے ہوتا ہے۔ کہ وہ عورتوں کی جانب اہل مغرب کے برتاؤ کے کچھ حصہ کی نقل اتارتے ہیں۔ مگر ان کو بھی اور دوسرے ہندوؤں پر کافی بھروسہ نہیں ہوتا۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان بے روک ٹوک اور پاک خلا ملا ہو۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ جن پر ہندوستانی ضمیر یقین نہیں کرتے۔

اس لئے ہندوستان کے بہت سے حصوں میں شریف ذات کے ہندوؤں کے زنانہ میں بھی کوئی آنے جانے نہیں پاتا۔ اور

۱؎ یہ بے انتہا مبالغہ آمیز اور شر انگیز بیان ہے۔ یہاں تو صرف اندیشہ ہی ہے مگر یورپ اور امریکہ میں لڑکیوں کی ایسی حفاظت سے بے پروائی کرنے کی خرابیاں روزانہ دیکھی جاتی ہیں اور اخبارات میں درج ہوتی رہتی ہیں۔ فرانس میں اب تک جوان لڑکیوں کے ساتھ گھر سے بڑی بوڑھی عورت یا مرد باہر جاتے ہیں اور اسے اکیلا نہیں جانے دیتے۔ اسے شیپرون (Chaperone) یعنی محافظ کہتے ہیں۔ آخر یہ رواج کیوں ہے؟

عورتیں چار دیواری کے اندر بند رہتی ہیں۔ پردہ دار مسلمان عورتیں اگر اپنے مکان میں سے باہر نکلتی بھی ہیں۔ تو وہ یا تو پردہ دار برقع میں۔ یا پردہ دار سواریوں میں بیٹھکر باہر نکلتی ہیں۔ ایک ہندو فرمانروائے ریاست کی بیوی کی رولس رائیس موٹر کار کی کھڑکی میں سیاہ شیشہ بعض وقت لگا ہوا ہوتا ہے جس میں سے وہ سب آدمیوں کو آرام سے دیکھ سکتی ہے۔ مگر اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن ایک آسودہ حال مسلمان باورچی کی بیوی جب کوئی پیغام لے کر باہر جائے گی تو وہ سر کی چوٹی سے پاؤں کے تلوے تک اپنے آپ کو موٹے سوتی کپڑے کے برقعہ میں چھپا لیگی جس میں دیکھنے کے لئے آنکھوں کی جگہ تین انچہ مربع جالی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ جس میں سے وہ بمشکل دیکھ سکتی ہے

میں دہلی کے ایک مکان میں ایک دفعہ ایک پردہ پارٹی میں شریک ہوئی۔ یہ پارٹی صرف پردہ دار عورتوں کے لئے تھی۔ جس میں برقع اوڑھکر عورتیں آئیں۔ وہاں ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہگیا۔ تمام ہندوستانی خواتین پوری پردہ دار موٹر کاروں میں سے اتر کر بھاری برقعوں میں لپٹی ہوئی آئیں۔ ان کی میزبان ایک اعلےٰ عہدہ دار انگلش حاکم کی بیوی تھی۔ دہلیز تک جاکر وہ خود ہندوستانی لیڈیوں کا استقبال کرکے ڈرائنگ روم میں لاکر بٹھلاتی تھی۔ کیونکہ پردہ کے دستور کے لحاظ سے تمام مرد ملازموں کو کوٹھی سے دور باہر بھیجدیا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں جاکر عورتیں اپنا برقعہ اتار دیتی تھیں۔ یہ سب اپنی دیسی پوشاک میں زرق برق مزہ سے بیٹھی ہوئی ملائمت کے ساتھ ان انگلش لیڈیوں سے بات چیت کر رہی تھیں۔ کہ جو وہاں ان کی

ملاقات کے لئے مدعو کی گئی تھیں۔ سب سے بڑی ہندوستانی خاتون آسانی سے اپنی تمام پارٹی پر غالب نظر آتی تھی۔ اس کی عمر بھی بڑی تھی۔ وہ ہلکی فیروزی آسمانی مخمل کے ڈھیلے پائینچوں کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جو گھٹنے سے ٹخنہ تک بڑی تنگ اور چسپت تھی۔ اس کے سنہری کام کے سلیپر تھے۔ ریشمی کمخواب کی قمیص تھی۔ اور ایک نہایت خوبصورت کامدار کشمیری شال سب کے اوپر اوڑھے ہوئے تھی۔

ہم سب عورتیں چاء پینے اندر گئیں۔ چاء پلاتے وقت بھی یہ میزبان انگلش لیڈی ادھر اُدھر اکیلی تمام کام کرتی تھی۔ اور الماریوں میں سے چیزیں لا لا کر چاء کی میز پر اپنی ہندوستانی مہمانوں کے آگے رکھتی تھی۔ البتہ اس وقت اس کی امداد ان انگلش لیڈیوں نے کی کہ جن کو پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا۔

یکایک باہر کے برآمدہ میں سے چلنے پھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر مردوں عورتوں کی آوازیں زور زور سے پاس آتی ہوئی معلوم دیں۔ میزبان انگلش لیڈی خوفزدہ ہو کر دوڑ کر دروازہ میں گئی اندر کمرہ میں عورتوں پر خوف چھا گیا۔ ان کے سفید برقعے تو اس وقت ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ اس لئے ہندوستانی خاتونیں دوڑ دوڑ کر اور اپنا منہ دیوار کی طرف کر کے کونوں میں چھپنے لگیں۔ انگلش لیڈیاں ان کی حالت سمجھ گئیں۔ اور جہانتک ان سے ہو سکا۔ پردہ کر کے ہندوستانی خاتونوں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ تاکہ کسی غیر مرد کی نظر ان پر نہ پڑھ سکے۔

اس عرصہ میں باہر برآمدہ میں سے زیادہ شور کی آوازیں آتی رہیں

پھر یکایک خاموشی ہوگئی۔ اور پہیوں کے واپس جانے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی میزبان انگلش لیڈی دم چڑھے ہوئی برآمدہ میں سے اندر کمرہ میں آئی۔ اور سب مہمانوں سے اس پریشانی کی بابت معافی مانگنے لگی۔

میزبان نے کہا کہ مجھکو بڑا افسوس ہے۔ مگر اب معاملہ رفع دفع ہوگیا ہے آپ سب اس پریشانی کے لئے مجھکو معاف کردیں۔ تمام کپکپاتی ہوئی ہندوستانی خاتونوں سے میزبان لیڈی نے کہا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اور ہم باقیوں کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ نوجوان روز ویلٹ ہم سے ملاقات کرنے کے لئے آئے تھے۔ ان کو اس پردہ پارٹی کا حال معلوم نہیں تھا۔

اس کے بعد فوراً ہی جو گفتگو ہوئی۔ اس کے دوران میں ایک سب سے نوجوان ہندوستانی خاتون نے پکار کر کہا کہ:۔

آپ کو تو ہمارا پردہ کیوں پسند آنے لگا۔ مگر ہم پردہ کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ ہم اپنے گھر کی چاردیواری میں خاموش۔ امن چین والی اور محفوظ زندگی بسر کرتی ہیں۔ مردوں کے ہمراہ جیسے کہ وہ ہیں۔ باہر رہکر ہماری زندگی پر وبال اور خوفناک ہوجائے"

مگر ایک متوسط العمر خاتون نے اپنے دل کا حال اور دوسری طرز سے بیان کیا۔ اور آہستگی سے کہا تاکہ دوسری عورتیں نہ سنیں۔ کہ میں اپنے خاوند کے ہمراہ انگلستان گئی تھی جب ہم وہاں پہنچے۔ تو میرے خاوند نے کہا کہ پردہ ترک کردو اس لئے کہ انگلستان میں عورتوں کا ادب اور لحاظ کیا جاتا ہے میں وہاں دکانوں۔ بازاروں

تصویر گاہوں اور باغات میں آزادانہ بے روک ٹوک پھرتی تھی۔ دوستوں کے مکانات پر جاتی تھی۔ اور ہمیشہ خوش و خرم رہتی تھی نہ تو کوئی مجھکو ڈراتا تھا اور نہ پریشان کرتا تھا۔ میں لیڈیوں اور جنٹلمینوں سے یکساں خوب دلچسپ گفتگو کیا کرتی تھی۔ آہا! انگلستان کیسا حیرت انگیز ملک ہے بہشت ہے مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں مجھکو زنانہ مکان کی چار دیواری میں سخت پردہ میں رہنا پڑتا ہے جیساکہ ہمارے درجہ کے شایاں ہے۔ اور میں سوائے عورتوں اور اپنے خاوند کے اور کسی سے ملاقات نہیں کرسکتی۔ ہم کچھ نہیں دیکھتے ہم کچھ نہیں جانتے ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کوئی بات نہیں ملتی۔ ہم میں تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ غرضکہ عجب سُستی میں گذرتی ہے۔ پھر چوری چوری اپنا سر ایک بڑی بوڑھی کی طرف ہلا کر کہا۔ کہ ان بیگم صاحبان کو یہ سب باتیں پسند ہیں۔ یہ سب ہماری میزبان لیڈی صاحبہ کی وجہ سے ہے۔ کہ یہ ان جیسی آج یہاں آگئی ہیں۔ ورنہ وہ کہیں بھی آنے جانے پر راضی نہیں ہیں اگر ہم پردہ کے قانون میں ذرّہ بھر بھی کمی کردیں تو وہ جانتی ہیں۔ کہ ہر ایک گھرانے میں ہماری زندگی کیسی اجیرن بنا سکتی ہیں۔"

پھر ایک ایک مہمان کا چہرہ دیکھنے سے اس گفتگو کی تشریح ہر لیڈی کی آنکھوں سے نظر آتی تھی۔ نئی آنے والیوں کے خوبصورت مگر خالی چہرے۔ گفتگو کرنے والی بی بی کی ہم عمر عورتوں کی ناقابل بیان پژمردگی اور تکان اور بوڑھی عورتوں کی تیز نگاہ اور آہنی ہونٹوں کی حکومت نمایاں تھی۔

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں درج ہے کہ :۔

اعلےٰ اور شریف ذاتوں کی تمام کثیر بنگالی عورتیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ۔ اوائل عمر ہی میں پردہ کرنے لگتی ہیں۔ اور بقیہ تمام زندگی سب سے الگ ہو کر گھر کی چار دیواری کے اندر بسر کر دیتی ہیں گھر کی سب سے بڑی بوڑھی عورت کا قابو سب عورتوں پر رہتا ہے ۔ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں میں زیادہ سخت پردہ کیا جاتا ہے ... چند مغربی طریقہ اختیار کرنے والی عورتوں نے پردہ ترک کر دیا ہے مگر ان کو ان کی زیادہ تر ہم وطن عورتیں ذات برادری سے خارج سمجھتی ہیں "[1]

بمبئی میں پردہ کا بہت کم رواج ہے ۔ جو زیادہ تر پارسی عورتوں کے اعلےٰ ترقی یافتہ درجہ اور آزادی بخش اثر کا نتیجہ ہے ۔ احاطہ مدراس میں یہ خاص قاعدہ ہے ۔ کہ وہاں صرف مسلمانوں کی عورتیں اور دولتمند ہندوؤں کی عورتیں پردہ کرتی ہیں ۔ میں نے دو ہندو جنٹلمینوں سے کہ جو دونوں انگلستان میں کسی سائنٹیفک پیشہ کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے ۔ یہ بات سنی کہ ہم نے خود اپنی بیویوں کو پردہ چھوڑنے کی باصرار ترغیب دی ہے ۔ اور ہم نے اپنی چھوٹی بیٹیوں کو یورپین سکول میں داخل کر دیا ہے ۔ مگر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہماری بیویاں اپنے خیال میں اس بہت بے پردگی کو بہت ناپسند کرتی ہیں ۔ وہ بڑی خوشی سے پھر اسی پردہ میں رہنا پسند کریں گی ۔ واقعات موجودہ پر نظر کرنے سے کوئی آدمی بھی اس نتیجہ پر پہنچنے سے باز نہیں رہ سکتا

---

[1] جلد دوم حصہ اول صفحہ ۱۵ د ۵)

کہ پردہ کے حق میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر اکثر ہندو بزرگوں کے اس مقولہ کی عمدگی کو سنتا رہتا ہے۔ کہ عورتوں کا درجہ بڑا ارفع ہے۔ منو جی کے شاستر کا یہ قول اکثر لوگ بار بار دہرایا کرتے ہیں۔

"جہاں عورت کی عزت نہ کی جاتی ہو۔ وہاں چڑھاوا چڑھانے کی رسم بالکل فضول ہے"

مسٹر گاندھی نے مختصر طور سے اس کو ان الفاظ میں بہت اچھی طرح سے ادا کر دیا ہے کہ:۔

"جس علم پر عمل نہ ہو۔ اس کے سیکھنے سے کیا فائدہ؟"

پردہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے۔ کہ اس سے سل کی بیماری پیدا ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر آرتھر لنکاسٹر نے اس بات کا اظہار کیا ہے۔ کہ جن لوگوں میں عورتوں کو پردہ میں رکھنے کا دستور ہے۔ ان کی عورتوں میں خوفناک طور سے مرض سل سے اموات کثرت سے ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر کی گئی ہے۔ کہ انہیں وسائل اور انہیں عادتوں کے اور اسی جگہ کے رہنے والے لوگوں میں پردہ کرنے والے طبقہ کے آدمیوں میں سل سے اموات بہ نسبت ان لوگوں کے کہ جن کی عورتیں کم پردہ کرتی ہیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ کلکتہ کے ہیلتھ آفیسر نے ۱۹۱۷ء کی بابت اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:۔

"باوجود اس کے کہ شہر کی عام اموات کی شرح میں کمی ہو گئی ہے عورتوں میں شرح اموات مردوں کی شرح اموات کی نسبت

چالیس فیصدی سے بھی زیادہ ہے۔ جب تک لوگ اس بات کو اچھی طرح سے نہ سمجھ لیں گے کہ کسی بڑے شہر میں پردہ کی نہایت سخت پابندی سے عورتوں کی بہت بڑی تعداد لازماً قبل از وقت موت کا شکار ہو جاتی ہے تب تک شہر کے نام سے یہ مستقل داغ دور نہیں ہو سکتا۔ البتہ امیر آدمی کہ جن کی خود اپنی ملکیت کی زمین پر کشادہ مکانات بنے ہوئے ہوں۔ ان کی دوسری بات ہے۔"

لندن سکول آف ہائیجین اینڈ ٹراپیکل میڈیسن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اینڈریو بالفور نے بتلایا ہے کہ ہندوستانیوں کی عادتیں اس بیماری کے پھیلانے کے لئے بڑی موزوں اور موافق ہیں۔ ایک تو ان میں یہ عادت ہے کہ بڑے بڑے کنبے اکٹھے رہتے ہیں۔ دوسرے پردہ کا رواج جس کی وجہ سے عورتیں گھر کے گندے اور تاریک حصہ میں رہتی ہیں تیسرے کم سنی اور بچپن کی شادی کہ جس نے ہزارہا نوجوانوں کی روح زندگی کو کھوکھلا بنا ڈالا ہے چوتھے یا پیں وپیش ہر جگہ تھوک دینے کی سخت مذموم عادت۔ ان عادتوں کے ساتھ میل کچیل۔ خراب حالت صفائی۔ زچہ پن ہوا اور ورزش کی کمی کو بھی شامل کر دیا جائے۔ تو یہ سب باتیں ملکر سفید موت (تپدق) کے بڑھانے کی نہایت عمدہ جگہیں بن جاتی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ ہندوستان میں ہر سال سل

---

[۱] ہیلتھ پرابلمز آف دی امپائر مصنفہ ڈاکٹر اینڈریو بالفور اور ڈاکٹر ایچ ایچ سکاٹ مطبوعہ کالنس لندن ۱۹۲۴ء صفحہ (۲۰۶)

کی بیماریوں سے نو لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان انسانی جانوں کا اتلاف[1] ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ چار کروڑ عورتیں جن میں ہندو اور مسلمان[2] دونوں اقوام کی عورتیں شامل ہیں۔ آجکل ہندوستان میں پس پردہ رہتی ہیں۔ مگر ان تجربہ کار افسروں کی رائے ہیں کہ جن سے ہیں مستورہ کر سکی۔ اگر اس اندازہ سے ان عورتوں کی تعداد کا اظہار مقصود ہے۔ کہ جو اس قدر سختی کے ساتھ پردہ کی پابندی کرتی ہیں۔ کہ وہ سوائے اپنے خاوند یا اپنے بیٹے کے اور کسی مرد سے ملنے کے لئے کبھی بھی اپنے مکانات سے کہیں نہیں جاتیں۔ تو یہ اندازہ اغلباً تین گنا زیادہ ہے۔ جو عورتیں اپنی شادی کے دن سے اپنی موت کے دن تک بیرونی دنیا کو کبھی بھی نہیں دیکھتیں۔ ان کی تعداد کا زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم اندازہ جو بڑی احتیاط سے لگایا گیا ہے۔ وہ ایک کروڑ بارہ لاکھ پچاس ہزار اور ایک کروڑ ۲۷ لاکھ نوے ہزار کے درمیان ہے۔

جو عورتیں پس پردہ رہتی ہیں۔ پردہ کے طریقے نے ان کے دماغ پر جو اثر ڈالا اس بارہ میں بالخصوص ہندوستانی ڈاکٹر ہی رائے زنی کر سکتے ہیں۔

ایک ہندوستانی ڈاکٹر این این پارکھ[3] کا بیان ہے کہ:۔

"جہالت اور پردہ کے دستور نے ہندوستان کی عورتوں کو

---

[1] ایضاً صفحہ (۲۸۵) [2] انڈیا اور مشنیں مصنفہ بشپ آف ڈورناکلی [3] مباحثات لیجسلیٹو اسمبلی جلد سوم حصہ اول صفحہ (۱۸۸)

جانوروں کی سطح پر لاکر کھڑا کیا ہے۔ وہ خود اپنی خبرگیری کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ اور نہ ان کی اپنی کوئی خاص مرضی باقی رہی ہے وہ اپنے مالکان جنسِ ذکور کی لونڈیاں ہیں۔"

لالہ لاجپت رائے نے جو ایک مشہور سوراجی لیڈر ہیں۔ ہندو مہاسبھا کانفرنس کے جلسہ میں جو ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اپنی صدارتی تقریر میں بیان کیا کہ:۔

"موجودہ زمانہ کی ہندو زندگی کا بڑا نمایاں خط و خال کاہل وجودی اور سستی ہے۔ ان کی تمام انفرادی اور معاشرتی ذہنیت کا لب لباب "ایسا ہی ہونے دو" ہے۔ ہندوؤں کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ وہ چیز کو جیسی ہو قبول کر لیتے ہیں۔ ان کی یہ رغبت اور یہ ذہنیت اور یہ عادت اپنی ماؤں کی عادت کا پرتو ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے۔ کہ گویا یہ باتیں ان کے خون میں موجود ہیں ... ہماری عورتیں بہت سی رکاوٹوں کے ماتحت اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ صرف جہالت اور توہم پرستی ہی نے ان کی عقل کو زنگ آلود نہیں کر دیا۔ بلکہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ ایک کمزور قوم ہیں ... عورتیں کھلی ہوا بہت ہی کم کھاتی ہیں۔ اور ورزش تو وہ بالکل نہیں کرتیں۔ پھر یہ قوم روئے زمین پر کس طرح ترقی کر کے قابل بن سکتی ہے؟ ہماری عورتوں کی بہت بڑی تعداد سل کی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور بالکل جوانی میں فوت ہو جاتی ہے۔ جو عورتیں ماں ہوتی ہیں۔ ان سے یہ بیماری ان کے بچوں کو بھی لگ جاتی ہے۔ سل کے

تمام بیماروں کو کسی جگہ علیحدہ جمع کرنا قریباً ناممکن ہے جھگڑالو ملا ضرورت ضدی گستاخ۔ بدخلق عورت سے بڑھکر اور کوئی چیز قابل نفریں نہیں ہے۔ لیکن اگر ان تمام باتوں کی صرف یہی ایک سڑک ہوتی کہ جس سڑک پر سے گذر کر ہندو عورت قابل کار۔ بہادر آزاد اور جسمانی طور سے موزون ماں بن جائے۔ تو میں معاملات کی موجودہ حالت کی نسبت اس سڑک کو زیادہ پسند کرتا۔

اس موقع پر ایک سکول کی ماسٹرنی یعنی کلکتہ کے ایک لڑکیوں کے کالج کی پرنسپل انگلش خاتون کا عملی تجربہ لکھا جاتا ہے۔ کلکتہ کے ہیلتھ آفیسر کی رپورٹ کا کچھ خلاصہ اس سے پہلے ہم ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں۔ پرنسپل صاحبہ کا یہ بیان اس رپورٹ کے آٹھ برس بعد کا ہے۔ اور اس کا تعلق بنگال کے نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال خاندانوں[1] کی لڑکیوں سے ہے۔

"یہ لڑکیاں ورزش کو پسند نہیں کرتیں صرف جبر کے ماتحت کچھ ورزش کر لیتی ہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے سے بچ سکیں۔ تو وہ تازہ ہوا میں بھی جانا نہیں چاہتیں۔ اوسطاً لڑکی طالب علم بہت کمزور ہوتی ہے۔ اس کو اچھی خوراک۔ ورزش۔ اور اکثر علاج کے طور پر جمناسٹک کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا سینہ سکڑا ہوا۔ اور ریڑھ کی ہڈی اکثر جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کو کھیل کود کی بالکل تمنا نہیں ہوتی۔ ہم ایسا تحکم چاہتے ہیں۔ کہ جو طالب العلم لڑکی کو ایسے

---

[1] مسٹر میری ڈکشور۔ یہ پرنسپل ڈائیوسیزن کالج کا رگرلس جو بنگال میں ترقی تعلیم کی پانچویں پنجسالہ رپورٹ فقرات (۲-۱۰-۵۲۱)

علاج یا تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ کہ چپکے چپکے حکومت خفیہ

میں اس کو مدد دیں۔"

ہندوستان کی لڑکیوں کی دیوالیہ بدنی طاقت کو مدد دینے کے لئے جسمانی ورزشوں کی سکھلائی کا لڑکیوں کے سکولوں اور کالجوں میں جاری کرنا ابھی تک صرف مغربی طریق معاشرت میں دخل دینے والوں کی ایک خواب ہے۔ قدیم اہل ہندوستان اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

ہندو باپ ہمیشہ یہ شکایت کرتا ہے۔ کہ میں اپنی لڑکی کو ناچنے والی لڑکی نہیں بنانا چاہتا۔ اس کو خاندانوں کی محدود تعداد میں سے ایک کنبہ میں بیاہتا ہے۔ اور اس کنبہ کی بڑی بوڑھی عورت کو ہمیشہ اس بات کے کہنے کا موقعہ مل سکتا ہے کہ:۔

"اس لڑکی کو تو عام لوگوں کے سامنے ٹانگیں مارنا (ناچنا کودنا) سکھلایا گیا ہے۔ واقعی ایسی بے شرم لڑکی ہمارے گھر میں لانے کے قابل نہیں[1] ہے۔"

جس شخص نے مجھکو مذکورہ بالا شہادت کا حال سنایا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ یقیناً صرف کٹر اعتقاد کے لوگوں میں اس قسم کے عذر مان لیتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں آبادی کی اکثریت تو انہی کٹر لوگوں ہی کی[2] ہے۔

کلکتہ کی آکسفورڈ مشن نے اپنے ہفتہ وار اخبار مورخہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

---

[1] انسپکٹرس مدارس مشرقی بنگال رپورٹ کمیشن کلکتہ یونیورسٹی جلد دوم حصہ اول صفحہ ۲۳ [2] ایضاً صفحہ (۲۴)

میں ایک اڈیٹوریل مضمون زیر عنوان مجھکو قتل نہیں کرنا چاہیئے۔
شائع کیا تھا۔ اور وہ مقالہ افتتاحیہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔
چند سال کا عرصہ گذرا کہ ہم نے ایک آرٹیکل مذکورہ بالا عنوان کے ساتھ شائع کیا تھا جس میں ایک عورت نامہ نگار نے نہایت وضاحت سے زندگی اور صحت کی اس ہیبت ناک تباہی کا بیان لکھا تھا جوان عورتوں کی تعداد میں برپا رہتی ہے۔ کہ جو بنگالہ میں یا تو پس پردہ یا زنانہ مکانات میں اکٹھی رہتی ہیں۔
ہمارا خیال تھا کہ ہیلتھ آفیسر کی رپورٹ کی بنا پر جس قدر انکشافات اس آرٹیکل میں کیئے گئے ہیں۔ اس سے ناراض ہوکر خفگی کے خطوط کا ایک دریا بہ کر ہمارے پاس فوری اصلاح کا مطالبہ کرنے کو آئیگا۔ مگر اس کا اثر مردوں پر ذرہ برابر بھی نہ ہوا بظاہر دلچسپی کا ایک ذرہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جس مضمون میں تعویذ اور جنتر منتر کے استعمال کے بیوقوفانہ ضعیف الاعتقادی کو بُرا کہا جاتے۔ تو لوگ اس پر فوراً نکتہ چینی کرکے اس مضمون کو بُرا بھلا بتائیں گے۔ اور عقائد باطلہ اور توہمات کی پرستش کی فضولیات تعلیم یافتہ گریجوایٹ تک سختی کے ساتھ حمایت کرینگے۔ یعنی عقائد باطلہ اور توہمات کی پیروی کی تائید کریں گے مگر اس امر کی ہیبتناکی پر کہ کلکتہ میں اگر ایک مرد مرض سل سے مرتا ہے۔ تو اس کے مقابلہ میں پانچ عورتیں مرض سل سے مرجاتی ہیں ایک آواز بھی بلند نہیں کی گئی۔
تاہم نوجوان مغربی تعلیم یافتہ لوگوں میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ

موجودہ امور کے متعلق اب کچھ کچھ بے چینی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب ہم اہل مغرب (انگریزوں) کو ہندوستان سے باہر بھگا دیں گے۔ تو پھر ہم یقیناً عورتوں کے معاملہ پر غور کریں گے۔ مگر کوئی ایسی تبدیلی کو اتنی بے صبری سے ظاہر کرتے اکثر نہیں پایا جاتا کہ جیسی تبدیلی کی خواہش مذکورہ بالا اخبار میں کلکتہ کے آنجہانی موہن داس گپتا نے ظاہر کی ہے۔

"حرم میں ہماری ماؤں اور بہنوں کی جو حالت ہے۔ اس پر خیال کرنے ہی سے میں کانپ جاتا ہوں۔۔۔ وہ علی الصباح اٹھکر رات کے گیارہ بجے تک اپنی تمام زندگانی کے دوران میں گھر کا یکساں کام حرف شکایت لب تک لائے بغیر اس طور سے کئے جاتی ہیں۔ کہ گویا وہ مجسم صبر کی اوتار ہیں۔ بہت سی مثالیں ایسی موجود ہیں۔ کہ جن میں کوئی عورت شادی ہونے پر اپنے خاوند کے گھر میں داخل ہوئی۔ اور اس گھر میں سے تب تک باہر نہ نکلی۔ جبتک کہ موت نے اس کی زندگی کا خاتمہ نہ کر دیا۔ وہ کام کرنے کیلئے ہمیشہ ایسی مستعد رہتی ہیں۔ کہ گویا ان کی مرضی یا رنج کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف مصیبت کے لئے پیدا ہوئی ہیں مشقت کی برداشت پر اف تک نہیں کرتی ہیں۔ میں نوجوان ہندوستانیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ عورتوں کو آزادی دلانے کے لئے اپنے جھنڈے کو کھول دیں۔ عورتوں کو ان کے حقوق دلا دیں۔ کیا یہ میری صدا الصحرا ثابت ہو گی؟

بنگال نہایت تلخ پولٹیکل بے چینی کا گھر ہے۔ اس صوبہ میں ہندوستان کے انارکسٹوں، بم کے گولے پھینکنے والوں اور قاتلوں کی سب سے بڑی فصل پیدا ہوتی ہے۔ بنگالہ کا صوبہ ہندوستان بھر میں ذکور واناث کے جنسی تعلق کا سب سے مبالغہ آمیز گہوارہ ہے۔ اور کسی ملک میں ڈاکٹران اور افسران پولیس نے ایسی بدعادت اور عجیب و غریب جرائم پسند دماغوں کا باہمی تعلق نہ پایا ہوگا۔ جوش کے معمولی راستوں کے بالکل خرچ ہو چکنے پر غیر معمولی راستوں کی پیاس اور تلاش پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی بنگالہ پردہ کی سخت رسم کا ایک قلعہ ہے۔ اسلئے ہر شخص یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ بنگال کے نوجوان پولٹیکل آدمی جن غیر معمولی جرائم کے کرنے میں اس قدر مجرمانہ مادہ کو بھک سے اڑا چکے ہیں۔ اس مادہ کو اڑانے والا مصالحہ ان کو اپنے گھروں کی پردہ کی رسم کی زندگی کے ناقابل ذکر بے لطفی نے بہم پہنچایا۔ اور غیر ملکی اصولوں کے نیم ہضم شدہ معتاد نے ان کو زیادہ مصیبت زدہ اور پریشان بنا ڈالا ہے ؎
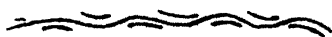
دسویں فصل

گوشہ نشین عورت

برٹش انڈیا کی عورتوں میں دو فیصدی سے بھی کم خواندہ ہیں۔ یعنی کسی ایک زبان یا بولی میں خط لکھ سکتی اور اس کا جواب پڑھ سکتی ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں ان خواندہ عورتوں کی ٹھیک ٹھیک تعداد فی ہزار اٹھارہ تھی۔[1] مگر ۱۹۱۱ء میں یہ تعداد فی ہزار صرف دس تھی۔ اس زیادتی کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ ایک صدی کا عرصہ گذرا۔ سوائے چند نایاب اور شاذ ستاروں کے خواندہ عورتیں عملاً ہندوستان میں بالکل موجود نہ تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ لوگوں کی عظیم تعداد ہمیشہ تعلیم نسواں کی سختی سے مخالف رہی۔ بلکہ نیم مذہبی اور نیم معاشرتی بنا پر آجکل بھی اسی طرح مخالف ہے۔

ایبے ڈیبوالیس نے انیسویں صدی کے آغاز میں اس بارہ میں یہ لکھا تھا کہ:۔

"برہمنوں کی بیویوں کی معاشرتی حالت میں اور دیگر ذاتوں کی عورتوں کی حالت میں بہت ہی کم فرق ہے۔۔۔۔ وہ ان

---

[1] ہندوستان ۲۳-۱۹۲۲ء مصنفہ ایل الیف رشبروک ولیمس سی بی ای صفحہ (۲۷۶)

اعلیٰ ذہنی لیاقتوں میں سے کسی ایک لیاقت کے نشوونما دینے
کے ناقابل سمجھی جاتی ہیں۔ جو ان کو زیادہ تر قابل ادب بنادیں۔ اور
نیز جس سے وہ زندگی میں زیادہ مفید حصہ کے طور پر کام کرنے کے
قابل بن سکیں.... چنانچہ ان دونوں باتوں کا طبعی نتیجہ یہ نکلا۔ کہ
تعلیم نسواں کی طرف سے بالکل بے پرواہی اختیار کرلی گئی۔ نوجوان
لڑکی کا دماغ بالکل ہی بے تربیت یافتہ رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ ان
میں بہت سی لڑکیوں میں اچھی لیاقتیں موجود ہوتی ہیں...۔" اگر
کوئی شریف عورت پڑھنا سیکھے۔ تو اس کو بے غیرتی کا کام سمجھا جاتا
ہے۔ اور اگر کوئی لڑکی پڑھ بھی جاتی ہے۔ تو وہ اپنے خواندہ ہونے
کا اقرار کرنے سے شرماتی ہے۔" گو یہ کیفیت مصنّف نے ہندو
عورتوں کی بابت تحریر کی تھی۔ مگر ہندوستان میں اہل اسلام نے بھی
عورتوں کی تعلیم کو ناپسند کیا ہے۔ اس لئے عورتوں کی تعلیم کو ہندو
مسلمان دونوں مذہبوں کی عظیم اکثریت نے غیر ضروری۔ نامناسب
اور خطرناک خیال کرلیا۔

۱۹۱۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل نے باجلاس کونسل
کلکتہ یونیورسٹی کے درجہ اور بنگال میں اسکولوں کی تعلیمی حالت کے
متعلق تحقیقات اور سفارشات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کی
تھی۔ اس کمیشن میں لیڈز۔ گلاسگو۔ مانچسٹر اور لندن کی یونیورسٹیوں
کے مختلف شعبوں کے بڑے عالم فاضل انگریز ماہران تعلیم اور بڑے
عالم فاضل ہندوستانی تعلیم پیشہ لوگ بھی شریک تھے۔ بنگال جو
کمیشن کی تحقیقات کا جولانگاہ تھا۔ برٹش انڈیا کے تمام دیگر صوبجات

میں عرصہ سے تعلیم کے بارہ میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ کیونکہ وہاں کے لوگ حصولِ تعلیم کی پیاس کے لئے مشہور تھے۔ چنانچہ اس بارہ میں کمیشن مذکور نے تین سال تک تحقیقات کر کے جو شہادتیں فراہم کیں۔ وہ تمام ہندوستان کے زیادہ وسیع افق پر جو عکس ڈالتی ہیں۔ انہیں بہر دانہ قیاس کرنا چاہیئے۔

اس لئے عورتوں کی تعلیم کے متعلق مسٹر براجالال چکرورتی دولت پور[1] کی ہندو اکیڈیمی کے سیکرٹری کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ :-

"ہندوستان کی مذہبی کتابوں میں اس بات کی سخت تاکید ہے کہ عورت کو اپنے کنبہ کے سوائے باہر کے اور کسی اثر کے نیچے آنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ اس لئے عورتوں کی ضروریات کے مناسب حال کسی قسم کی بھی اسکول اور کالج کی تعلیم کا طریقہ موزون نہیں ... گھر کے اندر ہی عورتیں کافی اخلاقی اور عملی تربیت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور اسکولوں کی طرزِ تعلیم جس قدر ان کو اخلاقی اور عملی تعلیم دے سکتی ہے۔ اس کی نسبت گھر کے اندر عورت کی تربیت زیادہ فائدہ مند ہے۔"

کمیشن کے ایک اور دوسرے گواہ مسٹر ہریداس گوسوامی آسنسول[2] ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے اس خیال کی مزید تشریح اس طرح کی کہ :-

"تعلیم کے ذریعہ سے لڑکیوں کے قلوب میں ایسے مذاق کا پیدا کرنا کہ جس سے وہ اپنی بعد کی زندگی میں لطف حاصل کرنے کا موقعہ

---

[1] ہندو رسم و رواج و دستورات صفحات (۷۔۳۴۶)

[2] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ جلد دوازدہم صفحہ (۴۰۱)

نہ پاسکیں۔ اور اس طور سے آیندہ بے چینی اور نااتفاقی کے بیج بو لئے عقل کی بات نہیں ہے"

مسٹر راجیندر اموہن دتا نے جو اسی یونیورسٹی کے ایک شعبہ کے رکن ہیں بھی اس بات پر اظہار ملال کرتے ہوئے کہ "جہالت اور توہم پرستی کی تاریکی نے ہندوستان کی عورت کو اس درجہ پر لاکر رکھدیا ہے۔ کہ "اس میں اور اس کے تعلیم یافتہ خاوند۔ بھائی اور بیٹے میں مسلسل لڑائی اور نااتفاقی رہتی ہے۔ بہ باوصف اس کے کہ میں اس بارہ میں پھر بھی کٹر ہندوؤں کی اکثریت کی پیروی کروں گا۔ اس لئے کہ مجھے سچے طور سے ہندوستانی گھر میں عورتوں کی جانب سے انقلاب پسندی اور عقلی بت شکنی کو داخل کرنے کا سچے طور سے اندیشہ ہے جو ہمارے تمام قدیم رسم و رواج کو جو کہ طویل زمانہ کا نتیجہ ہیں۔ اور گویا کہ ہمارے گوشت اور خون کا ایک حصہ ہیں تہ و بالا کردیں گے"

مگر جب عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کی پولٹیکل مجلسوں میں مباحثہ کے لئے پیش ہوتا ہے۔ تو تقریریں کرنے والوں کا رجحان تبدیلی کی طرف ہو جاتا ہے۔ دہلی لیجسلیٹو اسمبلی میں ڈاکٹر ہری سنگھ گوڑ[2] نے عورتوں کی قید اور ان کے حقوق کی پامالی کو بہت برا بتلایا۔ اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے شہروں کے میر منشی الیشور سرن[3] نے مذاقیہ پیرایہ میں کہا کہ یہ "... کلجگ (زمانۂ تباہی) کا گناہ ہے۔ کہ کم سن بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اور پھر جو کچھ ان کے بڑے بوڑھے حکم دیں۔ اس

---

[1] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جلد دوازدہم صفحہ (۲۲۴) [2] مباحثات لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۲۱ء جلد اول حصہ اول صفحہ ۳۶۲ [3] مباحثات لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۲۲ء جلد دوم حصہ دوم صفحہ (۱۶۳۱)

حکم کی تعمیل سے یہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ ہماری بیوقوفی ہے کہ ہم نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دینی شروع کر دی ہے .... اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا تم کو یقین ہے کہ تمہاری لڑکیاں تمہارا حکم مان لیا کریں گی ؟"

مجھے وہ جوش یاد ہے کہ جس سے ایک دولتمند نوجوان ہندو نے جس سے میری واقفیت تھی۔ اور جو حال ہی میں انگلستان کی کسی یونیورسٹی سے تعلیم پاکر آیا تھا۔ بیان کیا کہ میں کسی ہندوستانی دلہن سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ میں دسویں صدی کی بیوی سے اپنے آپ کو نہیں جکڑ دوں گا" اور زندگی کے اعلےٰ طبقات کے مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں اسی طرح کی تعلیمیافتہ بیویوں سے شادی کرنے کی خواہش یہاں تک بڑھ گئی ہے۔ کہ وہ ایسی تعلیم یافتہ دلہنوں کے ساتھ کم مقدار جہیز قبول کر لینے پر بھی آمادہ ہیں۔ جو انہیں دوسری صورت میں ملتا۔

مگر یہ عنصر گو نمودار ہو رہا ہے۔ مگر ہنوز بہت کم ہے۔ شاید کسی اور دوسرے صوبہ کی نسبت احاطہ بمبئی میں عورتوں کو بہت زیادہ آزادی حاصل ہے۔ تاہم یہاں کی تعلیمی رپورٹ یوں[1] ہے۔

تعلیم یافتہ مرد اپنے بیٹوں کے لئے تعلیم یافتہ بیویوں کے ملنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ اور اغلبًا اسی خیال سے وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلانے لگے ہیں۔ مگر جب وہ لڑکیوں میں آگے تعلیم پانے کا میلان پاتے ہیں۔ تو علی العموم ان کو سکول سے اٹھا لیتے ہیں۔ تا کہ

---

[1] ہندوستان میں ترقی کی رپورٹ بابت ۲۲-۱۹۱۷ء آٹھواں پنجسالہ ریویو صفحہ ۱۳۰-۱۲۹)

تعلیم میں پھنسے رہنے سے اُن کے بیاہ میں ہرج نہ ہو یا دیر نہ لگ جائے"

صوبہ متوسط کی رپورٹ سے اس کی تائید ہوتی ہے:-

"وہ والدین بھی کہ جن کو اپنی لڑکیوں کے خواندہ ہوجانے پر اعتراض نہیں ہے۔ لڑکیوں کے لئے پرائمری درجہ کی تعلیم ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اور ابتدائی تعلیم کے ختم ہونے پر ان کا خیال ہے کہ لڑکیاں اتنی بڑی ہوجاتی ہیں کہ ان کا گھر سے دور رہنا مناسب نہیں ہے"

صوبہ آسام کی رپورٹ[1] میں درج ہے کہ:-

"والدین اپنی لڑکیوں کو اسکول میں اس لئے بھیجتے ہیں۔ کہ ان کو زیادہ بہتر داماد مل جائیں۔ اور اکثر زیادہ آسان شرطوں پر ان کا بیاہ ہوجائے۔ مگر جونہی کہ کوئی لائق داماد مل جاتا ہے تو لڑکی کو فوراً پردہ میں بٹھا دیا جاتا ہے"

یقیناً بعض حالات کی تابعداری میں ان کا خیالی احساس سرنگون رہتا ہے۔ ان احساسات میں تبدیلی کرنے کو وہ مردانگی کو خطرہ میں ڈالنے کے مساوی سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر براجیندرا ناتھ سیل ایم اے ڈاکٹر آف فلاسفی جو کلکتہ یونیورسٹی میں دماغی اور اخلاقی سائنس کے پروفیسر ہیں۔ اس تخویف بخش خطرہ کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ہندو فلاسفر لکھتا ہے:-

"عورت شراب کشید کرنے والی کے خم میں آدمی خانہ ساز کشید کی شراب ہے" یا جس طرح کہ ہندوستانی اس کو اپنے الفاظ

---

[1] ہندوستان میں ترقی کی رپورٹ بابت ۲۲-۱۹۱۷ء آٹھواں پنجسالہ ریویو صفحات (۱۲۹-۳۰) [2] ایضاً

میں بیان کرے گا۔ "مرد چرخہ کاتنے والی عورت کے نکلے کا گھر کا کاتا ہوا سوت ہے۔"[1]

بقول کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کی ایسی ہی عام دلائل[2] پر عورتوں کی تعلیم کے خلاف جو احساس پھیلا ہوا ہے۔ بڑی کثرت سے مرد اس احساس کی حمایت کرتے ہیں۔ بلکہ وہ مرد بھی اس احساس کے موید ہیں۔ کہ جو مغربی تعلیم کے تمام کورس ختم کر چکے ہیں۔ اگر لڑکی کو سکول میں پڑھنے بھیج بھی دیا جاتا ہے۔ تو اس کو حصول تعلیم کے لئے نہیں بھیجا جاتا۔ کہ جس کے لئے بہت ہی کمزور ضرورت اور اتنی بڑی بدگمانی محسوس کی جاتی ہے۔ بلکہ زیادہ تر سکول میں اس کو اس لئے بھیجا جاتا ہے۔ کہ کنبہ کے راستہ سے باہر اس کو محفوظ جگہ میں رکھ دیا جائے۔

مسٹر پی مکرجی ایم اے۔ ایف آر۔ ای۔ ایس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔[3]

"معاشرتی طرز کی سخت پابندی کے سبب سے مذہبًا لڑکی کی شادی بارہ برس یا اس کے لگ بھگ عمر میں کر دینی لازمی ہے اس سبب سے بھی کہ شادی کی معمولی عمر کے گذر جانے کے بعد عام ہندو لڑکی کی تعلیم کے جاری رہنے کی تمام امیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔"

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اسکول کی (۷۳) فی صدی سے زیادہ لڑکیاں بخوبی نوشت کر سکنے سے پہلے سکول سے اٹھالی جاتی ہیں۔

---

[1] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جلد دوازدہم صفحہ (۶۲) [2] ایضاً جلد دوم حصہ اول صفحہ ۵ [3] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جلد دوازدہم صفحہ (۴۴)

۱۹۲۲ء میں بنگال کی عظیم پریزیڈنسی میں ہر ایک سو لڑکیوں میں سے جو تعلیم پاتی تھیں صرف ایک لڑکی پرائمری تعلیم سے اوپر کے کورس کی تعلیم پاتی تھی۔[1]

ہندوستان کی عورتوں کو نعمت تعلیم سے متمتع کرنے کے سخت مشکل کام کی کوشش میں اس قدر کم ترقی جو نمایاں ہوئی ہے۔ اتنی بھی سب سے زیادہ اور سب سے اول برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مسلسل اور صبر کے ساتھ ترغیب دیتے رہنے۔ دوسرے برٹش اور امریکن مشنریوں۔ اور تیسرے نہایت ترقی یافتہ ہندوستانیوں کی لیاقت کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ مگر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جب تک خود ہندوستانی اس بارہ میں اپنے خیالات میں غیر معمولی تبدیلی نہ کریں گے تب تک اور پچانوے سال تک مذکورہ بالا مشترکہ کوشش کے برابر جاری رکھنے کے لئے درکار رہیں گے تاکہ زنانہ آبادی کی بارہ فیصدی کے لئے ابتدائی تعلیم کا حق تعلیم کی مخالفت اور سستی سے چھین لیا جائے۔[2]

سیوا سدن سوسائٹی جو ہندوستانی عورتوں اور لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور فائدہ مند کام سکھلانے کے لئے ہندوستانی عورتوں کے سب سے پہلی مجلس ہے۔ جو ۱۹۰۹ء میں بمبئی کے قریب پونا میں قائم کی گئی تھی۔ اس کی تازہ ترین رپورٹ سے معلوم ہوا کہ

---

[1] پروگریس آف ایجوکیشن ان بنگال (بنگال میں ترقی تعلیم) مصنفہ جے ڈبلیو ہومس ایم اے بحوالہ ریویو ہندوستان میں دیہاتی مدارس (ولیج سکول) مصنفہ مس آنکاٹ ایسوسی ایٹیڈ پریس کلکتہ ۱۹۲۲ء صفحہ (۹۰)

اس میں ایک ہزار کے قریب شناگرد عورتیں موجود ہیں۔ اس سوسائٹی کی کامیابی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اگر اپنے دل میں ٹھان لیں۔ تو ہندوستانی عورتوں کا زیادہ خوش قسمت طبقہ بھی غریب اور بیکس عورتوں اور لڑکیوں کی امداد کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مگر یہ کام صرف احاطہ بمبئی میں ہی محدود ہے۔ سرکاری رپورٹ میں درج ہے کہ بدقسمتی سے ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ میں سیوا سدن سوسائٹی کی مثال کی کوئی مجلس نہیں پائی جاتی۔

اس کتاب کی کسی اور فصل کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہو گی کہ سررشتہ تعلیم براہ راست گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بلکہ یہ صیغہ کئی سال سے ہندوستانیوں کے انتظام میں دیدیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں برٹش انڈیا میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اسکولوں کی کل تعداد (۲۳۷۸۰) تھی۔ ان میں تمام درجہ کے سکولوں یعنی پرائمری سے لیکر آرٹس کالجوں اور پیشہ کے کالجوں تک شامل تھے۔ ان سکولوں کی پرائمری جماعتوں میں بارہ لاکھ ۹۷ ہزار ۷ سو ۴۳ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ ۲۴ ہزار ۵ سو ۵۵ لڑکیاں مڈل سکولوں میں۔ اور ان سے بھی کمتر تعداد یعنی ۵ ہزار ۸ سو ۸ لڑکیاں ہائی سکولوں میں زیر تعلیم تھیں[1]۔

گو اس رپورٹ میں درج ہے۔ کہ ان لڑکیوں کی تعداد جو پرائمری سے زیادہ تعلیم پاتی ہیں۔ ابھی تک افسوسناک طور سے کم ہے۔ یعنی ڈیڑھ کروڑ لڑکیوں میں سے جن کی عمر سکول جانے کے قابل ہے۔ صرف

---

[1] یہ اعداد پراگرس آف ایجوکیشن ان انڈیا سنہ ۱۹۱۷-۲۲ء جلد دوم سے اخذ کئے گئے ہیں

تیس ہزار لڑکیاں تمام ہندوستان میں تعلیم پا رہی ہیں۔ تاہم ۱۹۱۷ء کی نسبت لڑکیوں کی اس تعداد میں تیس فی صدی کی زیادتی پائی جاتی ہے[1]

احاطہ بمبئی میں ۲۵-۱۹۲۴ء میں کل نسوانی آبادی کا صرف ۱.۴ فی صدی ہر ایک قسم سے زیر تعلیم تھا[2] حالانکہ کل ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں ہندو عورتوں کی آبادی کا ۰.۹ فیصدی۔ اور مسلمان عورتوں کی آبادی کا ۰.۱ فیصدی حصہ سکولوں میں تعلیم پاتا تھا[3]

ایسے اسکولوں کی تعداد میں زیادتی کر دینا تو بالکل آسان ہے۔ کہ جن میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ابتدائی جماعتوں میں دل بہلانے کے لئے داخل ہو جائیں گی۔ اور لوئر پرائمری درجہ کی تعلیم کے دوران میں بتدریج ان سکولوں میں سے اٹھتی چلی جائینگی۔ ایسے شمار و اعداد کا نتیجہ تو دل پر اثر ڈالنے والا ہوگا۔ مگر ان کا تعلیمی اثر کچھ نہیں ہوگا۔ اور پبلک کا روپیہ فضول ضائع ہوگا[4]

مگر عورتوں میں جہالت قائم رکھنے کی لڑائی میں اسی طرح جس طرح کہ قدیم زمانہ کی جاہل دائیوں اور عورتوں کو ایک جگہ پردہ میں مسلسل رکھنے کی کوشش میں یعنی چیزوں کو بالکل اسی حال میں قائم رکھنے کے لئے کہ جس حال میں وہ موجود ہیں سب سے زیادہ کوشش کرنے

---

[1] ایضاً جلد اول صفحہ ۱۳۵ [2] بمبئی ۲۵-۱۹۲۴ء سنٹرل پریس بمبئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۵ اور ۱۶ [3] ترقی تعلیم ہندوستان پروگریس آف ایجوکیشن ان انڈیا جلد اول ۲۲-۱۹۱۷ء صفحہ ۱۲۶ [4] ایضاً صفحات ۱۳۹-۱۳۸

والی بھی گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں پائی جاتی ہیں۔ اپنے آسمانی دیوتاؤں اور زمینی دیوتاؤں کی عبودیت اور وفاداری کے سبب سے وہ اس کوشش میں مری جاتی ہیں کہ ان کی لڑکیاں بھی انہی کی طرح بالکل جاہل رہیں۔

ایک بار اس اصلاح کی تدبیر کے مباحثہ میں کپتان ہیرا سنگھ نے جو ایک سیدھا سادہ پرانا سکھ کسان سپاہی ہے لیجسلیٹو اسمبلی میں کہا[1]:-

"بہت سے لالہ اور پنڈت جی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب اس بار اس اصلاح کا وقت آگیا ہے۔ مگر ہوتا کیا ہے؟ جب وہ اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور جب ہم اگلی صبح کو ان سے ملتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم بے بس ہیں۔ جب ہم گھر واپس جاتے ہیں۔ تو ہماری بیویاں ہم کو وہ بات نہیں کرنے دیتیں۔ جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہم گفتگو کرتے ہیں۔ اس کی ان کو بالکل پروا نہیں مگر وہ ہم کو اس کام کے کرنے کی اجازت نہیں دیں گی"

عورتوں کو بدستور جاہل رکھنے کے قدیم رواج کی ان پجاری عورتوں کے برابر برابر ایک اور دوسرا زبردست اثر بھی کھڑا ہے۔ اور وہ اثر اقتصادی خود غرضی ہے۔ ہر شخص کو اپنی لڑکی کا بیاہ لازمی طور سے کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ اس کو ایسی آسمانی اور زمینی سزائیں بھگتنی پڑیں گی۔ کہ جن کو چند آدمی ہی برداشت کرنے کی

---

[1] مباحثات لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۲۵ء جلد پنجم حصہ سوم صفحہ (۲۸۳۰)

جرأت کریں تو کریں۔ وہ اس قدر جہیز کا سامان دے کر اپنی لڑکی کو بیاہتا ہے۔ کہ جس سے اس کے تمام ذرائع آمدنی صرف ہو جاتے ہیں۔ اس پر شادی کا خرچ اور مستزاد۔ وہ اس قدر بے اندازہ ہوتا ہے کہ عام قاعدہ ہو گیا ہے کہ لڑکی بیاہنے والا ایک بڑے قرض میں دب جاتا ہے۔ عام طور سے ہر شخص کو اپنی لڑکی کے گیارہ برس کی عمر ہونے سے پہلے ہی یہ بھاری خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے پھر وہ اپنی لڑکی کی تعلیم پر اور زیادہ روپیہ کیوں خرچ کرے یا اگر وہ غریب ہے اور لڑکی سے محنت کا کام لے سکتا ہے، تو وہ کیوں لڑکی کی مدد کے بغیر رہے۔ اور اس کو سکول بھیجے۔ اس لئے کہ وہ لڑکی بہت ہی کم عمری میں کسی دوسرے شخص کی خدمت کرنے کے لئے ہمیشہ کے واسطے چلی جائے گی حسب ذیل خیال جناب رائے ہری ناتھ گھوش بہادر فیلو کلکتہ یونیورسٹی نے ظاہر کیا ہے [1]

"لوگ طبعاً اپنے لڑکوں کو تعلیم دلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اس بات کو وہ بخوبی جانتے ہیں۔ کہ آئندہ لڑکے ان کی خدمت کر کے ان کو آرام پہنچا کر خوش رکھیں گے۔ اور ان کے خاندان کا نام روشن کریں گے۔ حالانکہ لڑکیاں اپنی شادی کے بعد اوروں کے رحم پر پڑی رہ جائیں گی"

اوسط ہندوستانی باپ کو خواہ وہ کسی درجہ کا ہو۔ یہ طریق استدلال بالکل قطعی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس طور سے ہندوستان کی ماں بننے کے نہایت اہم موقعے مسلسل ناخواندہ اور جاہل

---

[1] رپورٹ کمیشن کلکتہ یونیورسٹی جلد دوازدہم صفحہ (۲۲۵)

بچیوں کی عقل اور فیصلہ کے بدستور سپرد کر دیئے جا رہے ہیں۔

کمسن لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کی نسبت جن لوگوں کے خیالات عام طور سے ایسے ہوں۔ وہاں عورتوں کی زیادہ اعلےٰ تعلیم کی نسبت جو خیال ہوں۔ ان کا خود ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی ایک شعبہ کے پروفیسر مسٹر موہنی موہن بھٹا چارجی نے اظہار خیالات ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہندوستانی عورتوں کی اعلےٰ تعلیم ... کی بابت یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ عملی اصلاح کی حد سے بالکل باہر ہے۔ کسی راسخ العقیدت (پورانے خیالات کی) ہندو یا مسلمان عورت نے آج تک کسی کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ اور نہ اس نے آجتک کسی سکول میں ہائی کلاس میں پڑھائی کی ہے۔ جو لڑکیاں یونیورسٹی کی تعلیم پاتی ہیں وہ یا تو برہمو[1] ہوتی ہیں[2] یا عیسائی ... وہ وقت بہت دور ہے جبکہ بنگال میں لڑکیوں کی بہت بڑی خاصی تعداد کے لئے اعلےٰ تعلیم کا بندوبست کرنے کا یونیورسٹی پر کسی قسم کا تقاضا ہوگا۔

تازہ ترین رپورٹ سے جو مل سکی ہے۔ تمام برٹش ہندوستان کے آرٹس اور پروفیشنل کالجوں میں عورت طلباء کی تعداد ۹ سو اکسٹھ درج ہے۔ مگر مسٹر بھٹا چارجی کے توہین انگیز الفاظ کی نسبت رائے ستیش چندر اسین بہادر کے زیادہ صاف اور کشادہ دلی کے الفاظ حسب ذیل[3] ہیں

---

[1] برہمو سماج کی پیرو صرف ۵۵۰۴ ہیں جو سنہ ۱۹۲۱ کی رپورٹ مردم شماری صفحہ ۱۱۹ میں دکھائے گئے ہیں [2] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جلد دوازدہم صفحہ ۵۹

ممالک مغربی کی زیادہ تر ترقی یافتہ اقوام میں جہاں کہ عورتیں مردوں کے برابر ایک سطح پر قائم ہیں۔ اور جہاں کہ ہر ایک عورت سے یہ توقع نہیں کہ وہ ضرور متاہل زندگی کے حلقہ میں داخل ہوگی۔ اور عورتوں کے لئے اعلےٰ تعلیم بڑی ضروری چیز ہے مگر... مغربی ممالک کا طریقہ... ہندوستان کی عورتوں کے لئے... صرف نامناسب ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے چال چلن کو بھی خراب کر دینے والا ہے اور ہندوستانی عورت پن کے خیالات اور مطمحات نظر کو توڑ پھوڑ دیتا ہے"

پھر شادی ہونے کے بعد عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ ہندوستانی خیالات کی موجودہ حالت کے اندر یہ مسئلہ صرف ایک لفظ ناممکن العمل[1] سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لڑکی کے اپنے خاوند کے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ چھوٹی سی بیوی۔ خواہ وہ کسی رتبہ کی ہو۔ اپنے خاوند۔ اپنی ساس اور اپنے گھرانہ کے دیوتاؤں کی خدمت کرنے کے بھاری بوجھ سے فوراً دب جاتی ہے۔ پھر بہت جلد حمل رہجاتا ہے جس سے وہ بالکل مغلوب ہو جاتی ہے پھر اس میں اور دوسرے کاموں کے کرنے کے لئے نہ تو طاقت باقی رہتی ہے۔ اور نہ اس کو فرصت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس کو تعلیم بھی دی جائے۔ تو صرف عورتیں ہی اس کو تعلیم دے سکتی ہیں۔ اس لئے کہ صرف عورتیں ہی اس کے پاس جا سکتی ہیں۔ اس طرح

---

[1] بمبئی کی سیوا سدن سوسائٹی کے شاگردوں میں ایک خاص فیصدی تعداد مزدوری پیشہ لوگوں کی شادی شدہ عورتوں کی بھی ہے۔ جو ہر روز دو یا چند گھنٹے کی پڑھائی کیلئے وہاں آجاتی ہیں

سے تم اس سانپ کے پاس آجاتے ہو۔ کہ جس نے خود اپنی دُم نگل لی ہو یعنی وہی دورِ تسلسل شروع ہو جاتا ہے مترجم ؟

ہم نے ابھی دیکھا ہے کہ جس رکاوٹ نے ہندوستان کی عورتوں کو تعلیم سے روک دیا ہے۔ اُسی رکاوٹ سے استانیوں کی تعلیم کی جرأت بھی نہیں دلائی جاتی۔ کیونکہ یہ استانیاں اس روک کو توڑ ڈالیں گی۔ جن عورتوں نے استانیوں کی تعلیم حاصل بھی کر لی ہے۔ وہ مشکل اور کمزور طریقے سے صرف ان سکولوں کی لڑکیوں کو پڑھانے کے قابل ہیں۔ جو پہلے سے موجود ہیں۔ اس لئے زنانہ تعلیم جو ایک کمزور غیر ملکی طریقہ ہے۔ اب تک ایک ایسی زمین میں جو فصل کو پسند نہیں کرتی۔ زیادہ ترقی نہیں کر سکی۔

لڑکی کی بے فائدہ تعلیم پر زیادہ روپے خرچ کرنے کے فضول اور بیکار کام کا لوگوں کو ایسا یقین ہے۔ کہ اس کو خاص ایک فرقہ کا معاملہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ رؤسا اور دولتمند لوگ اس بارہ میں اپنے کم درجہ کے غریب اہلِ وطن کی طرح وہی خیالات رکھتے ہیں۔

لاہور میں کوئین میریز کالج کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ کئی سال کا عرصہ گذرا۔ اس کالج کو دو انگلش لیڈیوں نے اس بات کو دیکھکر قائم کیا تھا۔ کہ اس وقت ہندوستانی لڑکیوں کی نہایت قلیل تعداد زیرِ تعلیم ہے۔ جو زیادہ تر نیچ ذات کی لڑکیاں ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں امیروں اور رئیسوں کی لڑکیاں اور آیندہ ہونے والے والیانِ ریاست کی بیویاں اور مائیں جو غالباً اپنے نابالغ بیٹوں کی نابالغی کے زمانہ میں ریجنٹ بنیں گی جہالت کی

ایسی تاریکی میں مبتلا ہیں۔ کہ جس تاریکی کو بدستور رہنے دیا گیا ہے۔
ان دونوں لیڈیوں کی کوشش کو گورنمنٹ نے بنظر پسند دیکھا۔ والیان ریاست نے ہندوستان میں کوئین میری کے تشریف آوری کی تقریب پر چندہ دے کر تعلیم کے لئے کافی سرمایہ مہیا کر دیا۔ گورنمنٹ نے اپنے چندہ سے رقم تگنی کر دی چنانچہ کالج کے لئے مناسب عمارت قائم ہوگئی۔ اور ضروری سامان سے اس کو آراستہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد والیان ریاست کی فیاضی عملاً بند ہوگئی۔

ہر ایسے پہلو میں کہ جس میں کسی کی یادگار قائم ہو سکے۔ خواہ وہ کسی عمارت کی تعمیر ہو۔ خواہ اسکول یا ہسپتال ہو یا جو کچھ بھی ہو۔ ہندوستانی دولتمند کو اپنے نام کی شہرت کا شوق ہوتا ہے مگر ہیں یادگار کو مفید خدمت کے لئے قائم رکھنے کے واسطے شائد اسے ایک آنہ دینے کی بھی ترغیب نہیں دی جا سکتی۔ اس حالت میں شروع کی بے پروائی کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کالج میں لڑکیوں کو عملاً مفت تعلیم دینا ضروری تھا۔ مگر آجکل اس کالج میں تعلیم کے خرچ حسب ذیل بڑھا دیئے گئے ہیں:-

صرف دن میں تعلیم پانے والی کم عمر بچیوں کا خرچ ماہانہ چھ شلنگ تین پنس۔ بڑی لڑکیوں کا ماہانہ خرچ ۱۲ شلنگ چھ پنس۔

بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والی لڑکیوں کا ماہانہ خرچ بتفاوت ۲ پونڈ ۲ شلنگ سے لیکر چار پونڈ چار شلنگ تک ہے۔ اس رقم میں تعلیم کی فیس۔ بورڈنگ ہاؤس کا کرایہ۔ دھوبی کا خرچ اور معمولی ڈاکٹری علاج شامل ہے۔

جب تک لڑکیاں واقعی کالج میں رہتی ہیں۔ یہ تفصیل خرچ
اسی وقت کی ہے۔ مگر پھر بھی اصل لڑکیوں کے ماں باپ شاید ہی کبھی
باقی میں بہت دیر لگاتے ہیں۔ بلکہ خرچ کے متعلق جھگڑتے ہیں۔
ایک باپ لکھتا ہے کہ آپ نے دو روپے کا بل بھیجا کہ کتب دوات
قلم وغیرہ پر دو روپے خرچ ہوگئے۔ صرف دو مہینے میں میری دو لڑکیوں
پر آپ کے اسکول میں اتنا خرچ اسٹیشنری کا ہوگیا۔ میں اس بل کو
بہت زیادہ سمجھتا ہوں۔ ان کو اتنا قیمتی سامان استعمال کرنے کی
اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ایک اور
باپ اعتراض کرتا ہے۔ کہ یہ خرچ نہیں دینا چاہیئے۔ ایک چھوٹی سی
لڑکی کی خوبصورت سیاہ زلفوں کو باندھنے کے لئے دو گز فیتہ کے
دام کے متعلق اس کے باپ نے تین ہفتہ تک تحقیقات اعتراض
اور اس خرچ پر ملامت کرنے کے لئے خط و کتابت کی۔

کچھ تو اس ابتدائی پالیسی کی وجہ سے کہ گورنمنٹ نے لڑکیوں
کو ابتدا میں صرف برائے نام خرچ پر داخل کرنا منظور کیا تھا۔ اور کچھ اس
سبب سے کہ عورتوں اور علم کے یکجا جمع ہونے کو یہ لوگ قدیمی
روایات کے سبب سے ٹھیک نہیں سمجھتے۔ آج بھی ہندوستان کے
تمام دولتمند لوگوں کو دل سے یہی یقین ہے کہ اگر حقیقت میں ان
کی لڑکیوں کو تعلیم دلانی ضروری ہے۔ تو گورنمنٹ ان کو مفت تعلیم دلائے

کوئین میریز کالج ایک خوش نما قطعہ زمین پر واقع ہے۔ جس
میں کلاس روم۔ بورڈنگ ہاؤس میں لڑکیوں کے رہنے کے
کمرے، مشترک کمرے اور باغات مناسب اور دلکش طور سے

بنائے گئے ہیں۔ سٹاف ہیں یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ انگلش لیڈیاں ماموریں۔ تعلیم کا کورس لڑکیوں کی ضرورت کے مناسب رکھا گیا ہے۔ شاگردوں کو مختلف زبانوں کے مطابق عربی۔ ہندی اور اردو وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اگرچہ لڑکیاں کھتی ہیں مگر ان کی خواہش کے برخلاف پابندی کے ساتھ ان کو دیسی لباس پہنایا جاتا ہے۔ تاکہ گھر میں ان کے بڑے بوڑھے ڈر نہ جائیں کہ ان لڑکیوں کے قلوب پر مغربی خیالات چھاگئے۔ سکول کے متفرق کاموں کے دوران میں عادات کی صفائی سکھلانے پر مسلسل کوشش کی جاتی ہے۔ اور لڑکیوں کو نمبر نہ صرف اچھی طرح سے حصول تعلیم کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ باہمی امداد صفائی سچائی اور خوش فعلی کے لئے بھی نمبر دیئے جاتے ہیں۔

باغ کے کھلے میدان میں کھیل کود کی جرات دلائی جاتی ہے اصل میں جب یہ خوش نما چھوٹی چھوٹی غزال چشم لڑکیاں فیروزی اور گلابی اور ہر ایک رنگ کی پوشاکیں پہنے ہوئے ادھر ادھر کھیلتے ہوئے بھاگتی پھرتی ہیں۔ اور ان کے رنگین کپڑے ہوا میں اڑتے ہیں۔ تو ایک نہایت خوش منظر نگاہ کے سامنے آجاتا ہے۔

"ایک لیڈی ٹیچر نے تسلیم کر لیا کہ یہ لڑکیاں جوش سے ٹینس نہیں کھیلتیں۔ مگر پھر یہ کہا کہ لڑکیاں حال ہی میں اپنی دادیوں کے ہاتھوں سے نکل کر یہاں آئی ہیں۔ جو کہ چھوٹی بچیوں کے تیز قدم چلنے کو بھی مناسب نہیں خیال کرتیں۔ کیا تم اس چھوٹی سی خوشنما لڑکی کو گلابی اور سنہری کپڑے پہنے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ دو ٹرم

گذرے جب وہ یہاں پہلی بار آئی۔ تو اس نے سچ مچ یہ کہا کہ وہ دوڑ نہیں سکتی۔ اس کی ٹانگیں دُکھنے لگتی ہیں۔ اب یہ لڑکی کھیل کود میں بہترین لڑکیوں میں سے ہے۔

پھر اسی لیڈی ٹیچر نے کہا کیسے افسوس کی بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو برس کے عرصہ میں یہ سب لڑکیاں اپنی زندگی کو پہلے کی طرح بالکل مجہول حالت میں گذارنے لگیں گی۔ میں نے پوچھا کہ جو کچھ انہوں نے یہاں سیکھا ہے۔ کیا اس کا بڑا حصہ اپنی آخری زندگی کے لئے یہاں سے اپنے ساتھ لیجائینگی اس چاروں طرف سے محیط بھاری اثر کا خیال کرو۔ کہ جس میں یہ لڑکیاں جا پڑیں گی۔ قدیم زمانہ کی عورتوں کا محل میں ہجوم ہوگا جو موت کے مانند مقررہ رسومات کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان بیچاری بچیوں میں اتنی طاقت کہاں سے آئی کہ جو تنہا اپنی رائے پر قائم رہ سکیں اور سالہا سال کے اس قدیم غیر متبدل اور گلا گھونٹنے والے غلبہ سے جو بڑی بوڑھیوں کو حاصل ہے نجات پاسکیں۔ ہماری بہترین امید یہی ہے۔ کہ وہ کسی طرح سے اس مقوی خیال کا تھوڑا سا حصہ اپنے بچوں تک پہنچا دیں گی تاکہ وہ بھی اپنی لڑکیوں کو پڑھنے کے لئے ہمارے پاس بھیجیں۔ اس طرح سے ہر ایک نسل میں تھوڑا تھوڑا سا حصہ جمع ہو کر اخیر میں ہمارے کام کا جواز تسلیم کیا جائیگا۔

تمام ہندوستان میں صرف کوئین میری کالج ہی ایک ایسی تعلیم گاہ ہے۔ کہ جو بالخصوص امراء کی لڑکیوں کے لئے قائم کی گئی

ہے۔ اس لئے یہ ایک طبعی امر ہے کہ بعض ایسے ہندوستانی افسر کہ جن میں سوائے اس اقتدار کے جو اس عہدہ کے سبب سے ان کو حاصل ہے۔ اور کوئی رتبہ یا نسبت نہیں۔ وہ بھی سوشیل اقتدار کے حصول کے لئے اپنی لڑکیوں کو کوئین میری کے کالج میں داخل کرانے کے بہت متمنی رہتے ہیں۔ مگر اس کالج میں لڑکیوں کا داخل کرنا ایک انگریز کمشنر کے ہاتھ میں ہے۔ کمشنر مذکور لڑکیوں کو داخل کرنے کی اجازت دے دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دیسی رئیس (والیان ریاست) اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ زمانہ گذشتہ کی نسبت اب ان کی لڑکیاں اس کالج میں صرف دو چار ہی دکھائی دیتی ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ "کیا ہم اپنی لڑکیوں کو بابو لوگوں یعنی نو دولت بنگالی یا پالی ٹیشنوں کی لڑکیوں کے پاس بٹھلا کر ان کی حقارت کریں"۔ وہ یہ کہتے ہیں اور جو جواب ہو سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں رہتا۔

اس کالج کی بعض مقامی منتظمہ اسی سکول کے قائم کرنے کے اصلی مطلب کا خیال کر کے فکر مندی سے یہ پوچھتی ہیں کہ:

کیا والیان ریاست کی لڑکیوں کو اس سکول سے بھگا دینا عقلمندی ہے؟ کیونکہ اور عورتوں کی نسبت ان کا آئندہ اقتدار زبردست اور اس قدر دور رس ہوگا کہ خواہ اور عورتیں کتنی ہی عقلمند اور ہوشیار ہوں۔ ان کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا۔ کیا ہمیں ہر طرح کی کوشش کر کے ان امرا زادیوں کو یہاں لانا اور یہاں

رکھنا نہیں چاہئے۔

مگر جب یہ سوال براہ راست کیا گیا۔ تو ڈپٹی کمشنر نے اس کا یہ جواب دیا کہ:۔

برٹش ہندوستان میں ہم ایک جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دیسی ریاستوں کے متعلق آیندہ زمانہ کی مہارانیوں کو تعلیم دینا بیشک بہت اچھی بات ہے پس ان کے باپوں یعنی فرمانروا رئیسوں سے یہ کہتا ہوں کہ:۔

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک سکول ان کے درجہ کے شایاں قائم رہے۔ تو یہ بات آسانی سے ہو سکتی ہے لیکن گورنمنٹ کے روپے سے ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ تم کو اپنے سرمایہ سے ایسا سکول قائم کرنا چاہیئے۔ حالانکہ دیسی فرمانرواؤں کے سامنے ایک ایسے اسکول کے قائم کرنے کا خرچ نہایت معمولی امر ہوگا۔ مگر وہ ایسا کیوں کریں۔

لاہور میں دلچسپی کا ایک دوسرا مرکز وکٹوریا اسکول ہے۔ یہ قدیم شہر کے وسط میں عین بازار کے پاس مشہور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک پوتے کی حویلی میں قائم ہے۔ اس سکول کی ہیڈ مسٹرس ایک نہایت ہی لائق ہندوستانی خاتون مس کے ایم بوس ہیں جو ایک ہندوستانی عیسائی خاتون کی تیسری نسل سے ہیں۔

مس بوس مضبوط اور طاقتور چال چلن کی عورت ہے۔ اس کے خیالات آزاد ہیں اور وہ بہت زندہ دل ہے۔ اس کا زبردست رسوخ اور اعلیٰ درجہ کا دل ہندوستانی عورتوں کو آزاد کرانے کے امکانات کا مظہر ہے

وکٹوریہ اسکول میں پانسو لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں مس بوس کہتی ہیں۔ کہ بعض لڑکیاں امیروں کی ہیں اور بعض غریبوں کی۔ مگر یہ سب لڑکیاں اچھی ذاتوں کی ہیں۔ اور تمام لڑکیاں شہر کے معزز لوگوں کی ہیں اگر ہم پچھلی ذاتوں کی لڑکیوں کو بھی اس سکول میں داخل کرنا شروع کردیں۔ تو پھر خرچ اسکول کا اس قدر بڑھ جائیگا۔ کہ جس کا برداشت کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ اور یہ شریف لڑکیاں نہ ان کے پاس بیٹھینگی نہ ان کے ساتھ کھانا کھائیں گی۔ ان کے لئے الگ کلاس قائم کرنے پڑیں گے۔ استانیوں کے اسٹاف کو بالکل دوگنا کرنا پڑیگا۔ غرضکہ اسی طرح سے بیشمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پڑھائی کی فیس کیا ہے؟ بالکل برائے نام ہے ہم ہندوستانی اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کچھ خرچ کرنا پسند نہیں کرتے۔ ابھی تھوڑا زمانہ گذرا ہے۔ کہ سب سے زیادہ دولتمند آدمی کتابوں تک کے دام بھی نہیں دیا کرتے تھے۔ پہلے پہل کتابیں۔ پڑھائی اور سب چیزیں مفت دی گئیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا۔ تو ایک شاگرد بھی یہاں نہ آتی یہ سکول گورنمنٹ کی گرانٹ اور اہل انگلستان کے پرائیویٹ چندہ سے چل رہا ہے۔

اس محل کی متعدد منزلوں پر بہت سے کمرے قدیم وضع کے ایسے قریب قریب بنے ہوئے ہیں کہ جیسے خرگوش پالنے کا ڈربہ ہوتا ہے۔ اب ہر ایک کمرہ لڑکیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہاں تیسری درجوں میں چار یا پانچ برس کی لڑکیوں سے لیکر پندرہ یا سولہ برس تک کی بڑی اور خوشدل ایسی مسلمان لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں۔ کہ جن کی ابھی تک

شادی نہیں ہوئی ہے تو بھی میریڈ کالج کی طرح اس اسکول میں بھی پردہ کی سخت پابندی ہے۔ مرد کی آنکھ اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ جب پنڈت جی کے خاص علم لڑکیوں کو پڑھانے کے واسطے کسی فاضل پنڈت کو بلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو جس کلاس کی لڑکیوں کو پنڈت پڑھاتا ہے اس کلاس اور پنڈت کے درمیان ایک لمبا گہرا اور دبیز پردہ ڈالکر پنڈت کو الگ بٹھا دیا جاتا ہے۔ پنڈت جی کے صرف علم و فضل ہی کے سبب سے نہیں بلکہ ان کی ضعیف العمری کا بھی ان کے انتخاب کرنے میں خیال رکھا جاتا ہے۔

کمشنر نے افسوس کے ساتھ مسکرا کر کہا کہ میں ان اسکولوں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ اور پھر چونکہ میں مرد ہوں میں ان سکولوں کا کبھی بھی معائنہ نہیں کر سکتا

وکٹوریہ اسکول میں تعلیم چھ زبانوں۔ اردو۔ فارسی ہندی۔ پنجابی سنسکرت اور اختیاری زبان انگریزی میں دی جاتی ہے۔

مس لوس نے کہا کہ ہم بچوں کو تب تک کوئی کتاب نہیں دیتے جب تک کہ وہ اصل میں پڑھ نہ سکیں۔ ورنہ وہ صرف زبانی یاد کر لیتے ہیں اور مطلب کچھ نہیں سمجھتے[1] اس تمام تجویز کا منشا اور امید یہ ہے کہ لڑکیوں کے دلوں میں کوئی چیز اس طرح جڑ سے جما دی جائے

---

[1] ہندوستانی مسلمان لڑکا عربی قران شریف کے لمبے لمبے رکوع خوب اچھی طرح سے حفظ یاد کر لیتا ہے حالانکہ جو لفظ وہ اپنی زبان سے نکالتا ہے ان میں سے ایک لفظ کے معنی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اسیطرح سے ہندو نوجوان لڑکا بھی یاد کر لیتا ہے ہندو اور مسلمان دونوں ٹیچر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ لڑکے اپنی کتابوں کی فصلوں کی فصلیں بلا کچھ معنے اور مطلب سمجھنے کے رٹ کر لیتے ہیں۔

جو زنانہ ہیں ان کی آیندہ زندگی کے واسطے قطعی طور سے کار آمد ہو تاکہ اس کا کچھ حصہ ان کے دلوں میں تاریکی اور تنگی کے سالوں کے دوران میں بھی جو بہت جلد آنے والے ہیں ہمیشہ زندہ رہے۔

پڑھنا لکھنا، علم حساب اس قدر کہ جو ان کے گھر کے سیدھے سادے حساب کے رکھنے کے لئے کافی ہو۔ تھوڑی سے تاریخ۔ سینا پرونا۔ کہ جس فن سے ہندوستان کی عورتوں کی اکثریت بالکل ناواقف ہے تھوڑی سی نقشہ کشی اور موسیقی۔ صفائی کی عادات اور حفظان صحت کی باتیں۔ یہ دونوں مضمون ناقابل اعتبار طور سے مشکل ہیں۔ فرسٹ ایڈ حادثات میں (پہلی مدد) اپنے آپ کو اور اپنے آیندہ صغرسن بچوں کو خانگی ضابطے کے مظالم سے جہانتک ہوسکے بچانے کے لئے۔ غرضکہ اس عملی تعلیم گاہ میں ان بڑے بڑے مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے ان کاموں کے علاوہ لڑکیوں کو سادہ کھانا پکانا بالخصوص بچوں اور بیماری سے اُٹھے ہوئے کمزور آدمیوں کے لئے کھانا پکانا سکھلایا جاتا ہے کھانا پکانے کے وقت لڑکیاں ہمیشہ دیسی چولھے اور دیسی برتنوں سے کام لیتی ہیں۔ کھانا تقسیم کرنے کھلائی کے وقت اس بات کی خاص تاکید رکھی جاتی ہے۔ کہ صفائی اور فرش سے پرہیز کا پورا خیال رہے۔

اُستانی نے کہا کہ بعد کی زندگی کے دوران میں وہ اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں پکائیں گی۔ بلکہ کھانا پکانے کا تمام کام میلے کچیلے ملازموں پر چھوڑ دیں گی۔ کہ جس ذریعہ سے بیماری بڑھتی اور موت آتی ہے۔ ہماری کوشش یہاں یہی ہے۔ کہ ان لڑکیوں کو صفائی کی خوبصورتی اور تمام چیزوں کو ترتیب کے ساتھ استعمال کرنے کی عمدگی

کا یقین دلا دیں۔

ڈھاکہ کے لڑکیوں کے ایڈن ہائی سکول کی ہندوستانی لیڈی پرنسپل مس ایل سہراب جی استانیوں کی جدوجہد کا ذکر بڑی زہر کی کے ساتھ یوں کرتی ہے:۔

گھر کے ناپسندیدہ اثرات ترقی کے راستہ میں بڑی رکاوٹ ہیں وقت کی پابندی نہ کرنا سُست اور میلا کچیلا رہنا تندرستی اور حفظ صحت کے قوانین سے غفلت برتنا۔ غیر ذمہ داری۔ عزّت کے کسی قانون کی عدم موجودگی۔ گھر کے ربط وضبط کے قواعد میں کمی۔ یہ بعض مشکلات ہیں کہ جن کا ہمیں اپنے سکولوں میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس بات کی سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے۔ وہ چال چلن عمدہ بنا لینے کا کام ہے"

استانی کو صبر وتحمّل کے ساتھ رائے عامہ کو تعمیر کرنے کا کام پڑتا ہے۔ جو آخر کار اپنی مدد آپ کرنے کی طرف ایک اصلی اور عملی ہندوستانی تحریک کو پیدا کر کے اس کو قائم رکھے۔

بالفعل دیکھنے والے کو حیرت انگیز تماشہ نظر آئیگا۔ دولتمند مالکان اراضی مغرور اور ذی اثر برہمنوں جنگ جو قومیت پرست سیاستدانوں کی لڑکیوں کو جو سب ان گورے آدمیوں اور ان کے تمام کاموں کو بیحد بُرا بھلا کہتے ہیں ان بیبیوں اور دونیوں سے کھلایا پلایا اور پرورش کیا جاتا ہے۔ جو الی نائز (امریکہ) اور ڈربی شائر (انگلستان) کی پیاری بوڑھیا عورتیں چندہ کر کے بھیجتی ہیں کہ جس کے ذریعہ سے وہ قابل نفرت اور مرتد عیسائی عورتیں ان سب (ہندوستانی) لڑکیوں کو ذمہ دار زندگی بسر کرنے کی ابجد سکھلاتی ہیں۔

تیسرا حصہ

برہمن

شور کرتی ہوئی ریل جانب جنوب چلی اور بنگال سے مجھے مدراس میں لے گئی۔ ہاتھی کے رنگ جیسے سیاہ چٹانوں کے مربع ڈھیر۔ ایک کے اوپر ایک چنے ہوئے جن سے قائم الزاویہ پہاڑیاں بن گئی ہیں جس طرح ایک پر ایک قطعات بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ گویا چبوترے بنا کر ہاتھی دیوتا (غالباً گنیش جی مہاراج) براجمان ہیں۔ صدہا میل تک ایسا ہی ملک چلا گیا ہے۔

ریل برابر آگے ہی آگے لئے جاتی تھی۔ پھر ذرا زیادہ نرم ملک آیا جس کی زمین کا رنگ نارنگی کے رنگ کے مشابہ تھا۔ اور جہاں چھوٹی چوٹی والے زیادہ تاڑ کے درخت نظر آتے تھے جو دور سے اسی حصہ کے مقابل ایسے لمبے لمبے دکھلائی دیتے تھے۔ جیسے قلم سے کاغذ پر چیٹ پڑ جاتے ہیں۔

زراعت خوب تھی۔ دھان کے کھیتوں اور قطعات کے گردا گرد ہاتھ بھر کے برابر مٹی کی اونچے منڈیر بنا دیئے گئے تھے۔ تاکہ بیش قیمت پانی اندر ہی رہے۔ چھوٹے قد کے سیاہ چہرہ لوگ سرخ رنگ کی پوشاک پہنے ہوئے بالکل کالے جن کے سروں پر بڑے بڑے اور

بل کھائے ہوئے سیاہ بالوں کے گچھے تھے۔ یہ لوگ اسیطرح جہالت سے پانی کھینچ رہے تھے۔ کہ جس طرح ہزار برس پہلے ان کے باپ دادے کھیتی کرتے تھے یا بہت سے بیلوں سے چکر کٹوا کر ان کے پاؤں سے کچلوا کر غلہ کو بھوسہ سے الگ کرنے کے کام میں مشغول تھے۔ ملٹیگ کے ڈھیر بلند اور مربع شکلوں میں چھوٹے چھوٹے گاؤں کے باہر دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروں سے بنے ہوئے تھے جن پر بہت بڑی چھت تاڑ کے پتوں کی بنی ہوئی تھی۔ جو شکل میں شمع کش کے مانند معلوم ہوتی تھی۔ نارنگی کے رنگ جیسی بکریوں کے گلے کے گلے چر رہے تھے۔ نارنگی رنگ کی زمین پر چھالیہ خشک کرنے کے لئے پھیلا رکھی تھیں۔ جو پان کے ہمراہ کھائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے نارنجی رنگ کے باز اڑ رہے تھے۔ جن کے سر سفید تھے۔ غروب آفتاب کے وقت نارنجی رنگ کی شفق دھان کے کھیت کی ٹہنیوں کے اوپر نارنجی رنگ پھیلا رہی تھی۔ غرضکہ ایک نارنجی رنگ کی دنیا تھی جس میں جا بجا سیاہ انسانی اجسام رنگدار پوشاکوں میں کہیں کہیں نظر آتے تھے۔

مدراس برہمنی ہندو مذہب کا قلعہ ہے۔ قدیم زمانہ کے اصلی باشندوں یعنی سیاہ چمڑے والے ڈراویڈ لوگوں کی بقیہ نسل کا بھی یہی احاطہ ملجا ہے۔ برہمنی ہندو مذہب نے ان لوگوں کو توڑ پھوڑ کر پیچھے پھینک دیا۔ ان کو پامال کر دیا۔ اور ان کروڑوں آدمیوں کو اچھوت اور نیچ ذات بنا کر ذات سے باہر جاہل اور مفلس بنا ڈالا۔ پھر انگریز لوگ آئے۔ انہوں نے خواہ کسی سبب

سے ملک میں امن وامان اور عمدہ انتظام قایم کرکے جمہوریت کی ایسی
بنیاد ڈالی۔ جو اس ملک میں برقرار رہ سکے۔

رفتہ رفتہ ڈراوید لوگوں نے اپنی نگاہ اونچی کی اور پھر نہایت
ڈرتے ڈرتے اپنا سر بلند کیا۔ ان کے ساتھ ہی برہمنی دنیا کے کردڑوں
پنچ ذات لوگوں نے بھی اپنا سر اونچا کیا۔ اب یہ سب لوگ برہمنوں
کے خلاف ایک پارٹی بن گئے۔ اور کافی طاقت پکڑ گئے۔ اس
وقت انہوں نے مدراس لیجس لیٹو کونسل میں برہمنوں سے ان کی
پولٹیکل اکثریت چھین لی۔ یہ بات بھی ہندوستان کی تواریخ
میں ایک جدید دَور کے قائم کرنے کا باعث بن گئی۔ مگر
سنہ ۱۹۲۶ء کے انتخاب میں احاطۂ مدراس کی لیجس لیٹو کونسل میں برہمنوں
نے اپنی اکثریت پھر حاصل کر لی۔

شہر مدراس میں ان پنچ ذاتوں کے ایک شخص سے جو دولتمند
ہو گیا ہے جس کا لوگ ادب کرتے ہیں۔ اور جو پولٹیکل طور سے بھی
طاقتور ہے۔ میں نے تخلیہ میں ملاقات کی۔ یہ چھوٹے قد کا بڑا
خوش مزاج شخص تھا۔ اس میں بڑا جوش تھا اور زبان اس کی خوب
چلتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ کیا تم برہمن کی تصویر میرے لئے
اپنی زبان سے کھینچدو گے؟ اس نے جن الفاظ میں جواب دیا اس
کے وہ ہی اصلی الفاظ میں نے اسی وقت لکھ لئے۔ جو یہ ہیں:-

"ایک ایسا زمانہ تھا جبکہ تمام لوگ اپنی اپنی پسند کے موافق اپنی
زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ برہمن ہی صرف ایسا شخص تھا کہ جس نے
پڑھنا لکھنا اختیار کیا۔ پھر جب وہ عالم فاضل بن گیا اور طبعاً وہ بڑا

چالاک اور ہشیار تھا۔ تو اس نے چپکے سے مقدس کتابوں پر اپنا قبضہ کر لیا اور خفیہ طور سے ان کتابوں میں یہ غلط عبارت داخل کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ برہمن تمام لوگوں کا سردار یا مالک ہے۔ پھر عمریں گذر گئیں۔ اور بتدریج اس سبب سے کہ صرف برہمن ہی پڑھ سکتا تھا۔ اور اس سبب سے کہ اس نے مقدس کتابوں کے غلط متن لوگوں پر ظاہر کئے کہ جن کی رو سے دوسرے لوگوں کو علم کے سیکھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے اس کے زمینی دیوتا ہونے پر یقین کر لیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو یہی کہتا تھا اور سب لوگ اس کی فرمانبرداری کرنے لگے پس تمام ہندوستان میں برہمن نے لوگوں کی روح پر حکمرانی شروع کر دی۔ اور کسی شخص کو اس سے جھگڑا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا یہانتک کہ اہل انگلستان یہاں آئے اور اس نے تمام لوگوں کے لئے سکول جاری کر دیئے۔

اب یہاں اس احاطہ مدراس میں ہم برہمن سے لڑ رہے ہیں مگر وہ ابھی تک بہت طاقتور ہے۔ اس لئے کہ ہزارہا برسوں کی طاقت آہستہ آہستہ ہی ٹوٹتی ہے۔ اور وہ ایسا چالاک اور عیار ہے۔ جیسے کہ بیسیوں بھوت ہوتے ہیں۔ وہ اخبار دں کا مالک ہے۔ عدالتوں میں اس کو غلبہ ہے۔ وہ اسّی فیصدی سرکاری عہدوں پر قابض ہے۔ اس نے لوگوں کو بالخصوص عورتوں کو خوفزدہ بنا رکھا ہے۔ کیونکہ ہم سب عقائد باطلہ کے پیرو۔ اور ہم میں سے بکثرت لوگ بالکل جاہل ہیں۔ "زمینی دیوتا" یہ سب

کچھ جانتا ہے۔ وہ انگریز لوگوں سے اس لیئے نفرت کرتا ہے کہ وہ اس کو ہمارا گلا گھونٹنے سے منع کرتے ہیں۔ وہ حب الوطنی کے بلند بانگ نعرے لگاتا ہے۔ اور مطالبہ کرتا ہے۔ کہ برٹش لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ ہم لوگ یہ جانتے ہیں۔ کہ اس سے پہلے کہ ہم اپنے آپ کو مضبوط بنانے کا موقع پا سکیں اگر برٹش یہاں سے چلے گئے۔ تو برہمن پھر ہمارا گلا گھونٹ ڈالیگا اور ہندوستان ویسا ہی بن جائیگا۔ جیسا کہ انگریز لوگوں کے آنے سے پہلے تھا یعنی ایک ظالم مطلق العنان ملک جس میں موٹے موٹے پجاری اپنے غلاموں کے جم غفیر کے اوپر حکمرانی کریں گے۔ اس لیئے کہ ہمارے تخیلات ہنوز برہمن کے خوف سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اور سنئے :۔

ہندوستان میں ہر ایک ہندو جتنا ٹیکس گورنمنٹ کو ادا کرتا ہے۔ اس سے کئی گنا زیادہ رقم برہمن کو دیتا ہے۔ اپنی پیدائش کے دن سے لیکر اپنی موت کے دن تک ہندو اس "زمینی دیوتا" کو کھلائے ہی جاتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہو۔ تب برہمن کو نذرانہ دیا جائے۔ ورنہ وہ بچہ کبھی سرسبز نہیں ہوگا۔ پیدائش کے سولہ دن کے بعد پیدائش کی آلائشوں سے جب بچہ پاک وصاف کیا جائے تب برہمن کو پھر نذر دو۔ چھٹے مہینے جب بچہ کچھ ٹھوس چیز کھانا شروع کرتا ہے۔ پھر برہمن کو نقدی دو جب بچہ چلنا سیکھے تب برہمن کو نقدی دو۔ برس روز کے بعد بچہ کی سالگرہ ہو۔ اس وقت برہمن کو دچھنا دو۔ ساتویں

برس کے ختم ہونے پر بچہ کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اس وقت
برہمن کو اچھی طرح سے نقدی وغیرہ دو۔ امیر گھرانوں میں برہمن
بچے کو طلائی قلم سے لکھنا سکھلانے کی رسم کے وقت بچہ سے
وہ طلائی قلم آگے چلواتا ہے۔ یہ سونے کا قلم برہمن کی نذر
کر دیا جاتا ہے۔

جب کوئی لڑکی سال بھر کی ہو جائے۔ تو پہلی سالگرہ پر
اور جب اس کی ساتویں یا نویں سالگرہ ہو۔ جب لڑکا ڈیڑھ
سال یا دو سال یا سولہ سال تک کسی عمر کا ہو جائے۔ اور
ان کی منگنی ہو جائے۔ تو برہمن کو بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ جب
لڑکا یا لڑکی بالغ ہو جائے۔ یا جب شادی ہو جائے۔ تو بالغ
ہونے سے پہلے امیر لوگ برہمنوں کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ چاند
گرہن یا سورج گرہن کے وقت برہمن کو بہت زیادہ رقم دینی
پڑتی ہے۔ غرضکہ رات دن برہمن کو دینا ہی پڑتا ہے۔ جب
کوئی آدمی مر جاتا ہے۔ تو پہلے برہمن کو نقدی دی جاتی ہے
اس کی وصولی پر وہ نعش کو برکت دیتا ہے۔ صرف اس
دعا کے بعد ارتھی اٹھائی جا سکتی ہے۔ نعش کے جلانے
کے وقت پھر بہت سے برہمنوں کو بہت سا روپیہ دینا پڑتا
ہے۔ نعش کے جلا دینے کے بعد ایک برس تک ہر مہینے
متوفی کے لڑکے کو برہمنوں کی دعوت کرنی پڑتی ہے۔ یہ
دعوت جہاں تک ہو سکے بڑے سے بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے
پھر وہ برہمنوں کو کپڑے۔ زیورات۔ خوراک اور چیزیں کہ

متوفے اکو لپسند تحفیں دیتا ہے۔ چونکہ جو کچھ برہمن کھاتا ہے۔ یا پیتا ہے یا استعمال کرتا ہے۔ متوفے بھی اس سب کا لطف حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد متوفے کا لڑکا اپنی زندگی بھر تک ہر سال ایک بار لازمی طور سے یہی رسم ادا کرتا رہتا ہے۔

ایسی تمام رسموں کو اور بہت سی دیگر رسومات کو برہمن اپنا جائز حق بتلاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ مذہبی حکم کے موافق یہ حق برہمن کو حاصل ہے۔ جو کوئی ان حقوق کی ادائیگی سے غفلت برتتا ہے۔ وہ ابدی لعنت کا سزاوار ہوتا ہے۔ ہر ایک رسم کے ادا کرنے کے دوران میں ہم کو پانی سے برہمن کے پاؤں دھونے پڑتے ہیں۔ اور پھر ہم کو وہ دھوون کا پانی تھوڑا سا ہاتھ کی ہتھیلی میں لیکر پینا پڑتا ہے۔ برہمن کاہل الوجود ہے۔ وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتا۔ اور سوائے وکیل بننے یا گورنمنٹ کا عہدہ دار بننے کے وہ اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کرتا۔ اس صوبہ میں برہمنوں کی تعداد پندرہ لاکھ (۱۵۰۰۰۰۰) ہے۔ اور باقی ہم لوگ چار کروڑ دس لاکھ (۴۱۰۰۰۰۰۰) ہیں۔ اور ہم اس کو کھلاتے پلاتے ہیں۔

اب تم سمجھ گئی ہوگی۔ کہ جب تک ہم دوسرے لوگ ہندوستان میں اپنی آپ ٹانگوں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوجائیں تب تک ہم سمندر پار کے ایک دور دراز

ملک کے بادشاہ کی زیرِ حکومت رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کہ جس نے ہم کو امن وامان۔ اور انصاف دے رکھا ہے۔ اور جو ہم سے روپیہ لے کر ہم کو کچھ چیز واپس دیتا ہے۔ اور ہم کو مدراس کے احاطہ میں ہمارے صرف پندرہ لاکھ (۱۵۰۰۰۰۰) آقاؤں کی غلامی سے نکلکر آزاد ہو جانے کا موقعہ دیتا ہے۔ یہ ہمارے آقا تو ہم کو کھاتے جاتے ہیں۔ پھر ہمارے چھو جانے تک کو کہتے ہیں۔ کہ اس سے وہ بھرشٹ یعنی ناپاک ہو جائیں گے۔

گیارھویں فصل

انسان سے کم تر درجے کے لوگ

جب کوئی شخص ہندوستان کے مسائل کی چیستانوں کو بغور ملاحظہ کرے تو ان کا حل اسکو ان چیستانوں سے ہی مل سکتا ہے

بہت عرصہ سے اور آسانی کے ساتھ ہم نے مخفی ہندوستان کے تکیہ کلام کو قبول کر رکھا ہے۔ مگر جہانتک ٹھوس معاملات کا تعلق ہے۔ وہاں "خفیہ بھید" صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے۔ جب تک کوئی اس عجیب مظہر کی باصرار تلاش نہ کرے۔ اگر تم کسی عملی باعث کو تلاش کرو جیسا کہ تم کسی دوسرے عملی کاروباری ٹانک میں تلاش کرو گے۔ کہ جس پر "غیر ممکن التفحص" کا پرچہ چسپاں کیا گیا ہو۔ تو تمہارا وہ بھید دھواں بنکر غائب ہو جائیگا۔

ہندوستانی پالیٹیشن کا باربار یہ سوال ہے۔ کہ برٹش حکومت کے اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی ہم کیوں ۹۲ فیصدی ناخواندہ رہے ہیں؟ اور اتنی کثیر آبادی کو جاہل رکھنے کا الزام یہ لوگ اپنے حکمرانوں پر لگاتے ہیں۔

مگر ان شمار و اعداد کا ذکر کرتے ہوئے وہ تمہاری توجہ میں ایک

امر نہیں لاتا۔ جو اگر تم پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ تو تم کو اس کا بہت دیر میں خیال آئیگا۔ وہ تم سے یہ نہیں کہتا۔ کہ برٹش انڈیا کی چوبیس کروڑ ستر لاکھ (۲۴۷۰۰۰۰۰۰) آبادی میں سے کوئی پچیس فیصدی یعنے چھ کروڑ (۶۰۰۰۰۰۰۰) آدمی قدیم زمانہ سے خاص طور سے جاہل ہی رکھنے کے قابل قرار دیئے گئے ہیں۔ بلکہ ان کے بھائی ہندوستانیوں نے ان کو انسانیت سے بھی کم درجہ قرار دے رکھا ہے۔ یقیناً اگر ہندوستان میں کوئی مخفی بھید موجود ہے۔ تو وہ اس جگہ موجود ہے۔ وہ بھید ہر حالت میں اور ہر جگہ ہندوستانیوں کی اس لیاقت میں مستتر ہے۔ کہ وہ اس وقت تک ہر آدمی ہر سوسائٹی اور ہر قوم کو قومی تعصب کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ جب تک کہ ان کو ہندوستان میں چھ کروڑ (۶۰۰۰۰۰۰۰) ہندوستانیوں کی موجودگی کی یاد دلائی جاسکے۔ کہ جن کو وہ بڑی سختی سے انسان کے عام حقوق دینے سے بھی انکار کر رہے ہیں۔

لہ ہندوستانی سیاست دان کئی سال سے انگلستان کی گورنمنٹ پر پرشور اور مسلسل گولیاں برسا رہے ہیں۔ کہ وہ جنوبی افریقہ کی یونین گورنمنٹ کو مجبور کرنے کے لئے کوئی تدبیر تلاش نہیں کرتی۔ کہ جس سے وہ جنوبی افریقہ میں ہندوستان سے جاکر آباد ہونے والوں کی طرف ملائمت اور انسانیت کا رویہ اختیار کرلے۔ یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ جنوبی افریقہ میں اصل میں ایک لاکھ ۶۰ ہزار ہندوستانی نقل مکان کر کے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی اچھوت بکثرت احاطہ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ ان اچھوت لوگوں کی حالت اس فصل میں بیان کی گئی ہے۔ اگر یہ لوگ جنوبی افریقہ سے ہند ہندوستان میں واپس آجائیں۔ تو یہاں ان کا پھر یہی ذلیل درجہ ہو جائیگا۔ (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۲۷)

ابتدا میں اس بات کی تشریح کی جا چکی ہے۔ کہ موجودہ ہندوؤں کے گورے رنگ کے آبا و اجداد جب پہلے پہل ہندوستان میں وارد ہوئے۔ تو انہوں نے ہندوستان میں ایک سیاہ فام اور بھدّی خط و خال کی دیسی قوم ڈراویڈ پائی جنہوں نے جنوبی ہندوستان میں بڑے بڑے منادر تعمیر کئے تھے۔ ان نوواردوں کے مذہبی پیشواؤں نے یہ بات چاہی۔ کہ ہماری قوم کے لوگوں کا خون ان دیسی لوگوں کے خون میں مخلوط نہ ہونے پائے۔ بلکہ خالص الگ نسل قائم رہے۔ اس لئے انہوں نے ڈراویڈ لوگوں کو ناپاک اور اچھوت قرار دے دیا۔

پھر قدیم قانون بنانے والوں نے رفتہ رفتہ ذات پات کا طریقہ وضع کیا۔ اور اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ ذات کا قرار دیکر اپنا لقب "زمینی دیوتا" یعنی برہمن رکھ لیا۔ برہمن کے بعد دوسرے درجہ پر کشتری یعنی جنگجو آدمی تیسرے درجہ پر ویش یا زراعت پیشہ لوگ قرار دیئے گئے۔ کہ جن کو مذکورہ بالا دونوں اقوام اپنے سے کم درجہ کا سمجھتے ہیں۔ سب سے اخیر یعنی چوتھے درجہ پر شودر ذات قرار دی گئی۔ اور کہا گیا کہ مذکورہ بالا تینوں ذاتوں کی محض خدمت اور چاکری کے لئے شودر پیدا ہوئے ہیں۔ ان چاروں ذاتوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۷) ۱۹۲۲ء میں جنوبی افریقہ میں برٹش ہندوستانیوں کی کل تعداد سرکاری لیٹریک و رسالنامہ کے مطابق ایک لاکھ ۱۶ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ ان اعداد میں دس ہزار تو وہ تاجر شامل ہیں کہ جنہوں نے کچھ بعد میں نقل مکان کیا۔ اور پھر اس مشترکہ تعداد کے جتنے بچے پیدا ہوئے۔ وہ قدرتی زیادتی بھی داخل ہے۔

بھی آجکل ہر ایک ذات اندرونی طور سے فرقہ در فرقہ منقسم ہے۔
ورنہ ان چاروں ذاتوں پر ہندو سوسائٹی کی قومی عمارت بنائی
گئی ہے۔ ان چاروں سے باہر اور ان ذاتوں سے نیچے ہمیشہ
اچھوت ذات کے لوگ حقیر اور قابل نفرت رہیں گے۔ اور یہ
ان کے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بتلائی جاتی ہے۔

اس قانون کا ایک حصّہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ کہ جس کی رُو
سے ان بدقسمت لوگوں کو اچھوت قرار دیا گیا ہے۔ یہ حصہ اس قانون
کی عام حالت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ بھگوتؐ پوران میں
کسی برہمن کو قتل کر دینے کی سزا کے لئے حسب ذیل حکم ہے:۔

جو کوئی برہمن کو قتل کرنے کا مجرم ہو۔ اس کے مرنے پر اس
کو یہ سزا ملیگی۔ کہ وہ ان کیڑے مکوڑوں میں سے جو غلاظت کھاتے
ہیں۔ کسی ایک کی شکل میں جنم لیگا۔ اس کی بہت مدت کے بعد
وہ دوبارہ پیدا ہوگا۔ تو اچھوت کا جنم ہوگا۔ وہ اس نیچ ذات
سے علاوہ رکھیگا۔ اور گائے کے جسم پر جتنے بال ہوتے ہیں۔
ان بالوں کی تعداد سے چار گنا زیادہ برسوں تک اندھا رہیگا
لیکن اگر وہ چالیس ہزار برہمنوں کو کھانا کھلا دیگا۔ تو پھر اس کا
جرم معاف ہو جائیگا۔

اس طرح سے قلم کی ایک ہی کشش میں اچھوتوں کی زندگی

ملے یہ اٹھارہ پرانوں میں سے خاص کتاب ہے۔ پوران ہندوستان کی مقدس کتابیں
ہیں جس کے ترجمہ کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ ایبے ڈوبوئس نے کیا ہے۔ اس کی کتاب
کا نام ہندوؤں کے طریقے۔ دستور اور رسومات ہے۔

کی تشریح کردی گئی ہے۔ اور جن کی جتنی ذلت اور بے عزتی کی جائے۔ اُس کو حق بجانب سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے ناقابلِ بیان پنچ ذات ہونے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ اور اُس مظلوم کے غصے سے ظالم کی خوب حفاظت کردی گئی ہے۔ اسی طرح سے بیوہ ہونے پر جس قدر مصیبتیں اور عقوبتیں بیوہ پر نازل کی گئی ہیں۔ اسی طرح ایک دیوانی بیوی کی سرکشی سے بھی ہندو خاوند کی حفاظت کردی گئی ہے۔

اگر برہمن کسی شودر[1] کو مار ڈالے۔ برہمن قاتل سو بار گائیتری منتر کا جاپ یعنی وِرد کرلے۔ تو اس سے قتل کا گناہ بالکل مٹ جاتا ہے۔ اور کسی مخالف کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔

ان باتوں کی قدیم زمانہ کی بنیاد کو چھوڑ کر اب اس وقت سنہ ۱۹۲۶ء کے زمانہ میں ہم سرسری طور سے اچھوتوں پر کٹر ہندوؤں کی حکومت اس طرح پاتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل میں لکھا جاتا ہے:-

اچھوت کو انسانیت سے کم درجہ کا سمجھکر اس کے لئے جو کام مخصوص کردیئے گئے ہیں۔ وہ نہایت ذلیل کام ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ ہی بے عزتی کا لفظ شامل ہے۔

ان میں سے بعض کو بھنگی کا کام کرنے اور غلاظت وغیرہ اٹھانے کی اجازت دیدی جاتی ہے بعض جہالت اور بے علمی کے سبب سے کہ جو ان کے لئے مخصوص کردی گئی ہے۔ اپنی عادت میں بہت ہی کاہل الوجود ہیں۔ تمام اچھوتوں کو کسی قسم کی بھی تعلیم حاصل کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے۔ وہ ہندو شاستروں

---

[1] چوتھے درجہ کی یعنی سب سے ذلیل ہندو ذات شودر ہے تاہم یہ اچھوتوں سے بہت بلند پایہ رکھتے ہیں۔

کو نہ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ نہ ان کو پڑھ سکتے ہیں۔ کوئی برہمن پوجاری ان کی مذہبی خدمات انجام نہیں دیتا۔ اور نہایت ہی شاذ و نادر موقعوں کے سوائے وہ کسی ہندو مندر میں دعا یا پوجا پارٹ کے لئے داخل نہیں ہو سکتے۔ ان کے بچے سرکاری سکولوں میں تعلیم نہیں پا سکتے۔ وہ عام چاہات سے پانی نہیں کھینچ سکتے۔ اور اگر ان کے مکانات کسی ایسے قطعہ میں ہوں۔ کہ جہاں پانی کم ہے اور پانی کے چشمے دور دور ہیں۔ تو ان کو دوسرے لوگوں سے زیادہ رحم کی امید نہیں ہوتی۔ بلکہ پانی لانے کے لئے ان کو بہت زیادہ تکلیف اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔

وہ کسی انصاف کی عدالت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے بیماروں کے لئے دوائی لینے کے واسطے کسی ہسپتال میں نہیں گھس سکتے۔ وہ کسی سرائے میں نہیں ٹھہر سکتے۔ بعض صوبجات میں وہ شارع عام پر بھی نہیں چل سکتے۔ مزدوروں اور کسانوں کے طور پر کام کرنے میں ہی ان کو مسلسل نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ نہ تو وہ دوکانوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور نہ اُن بازاروں ہی سے گذر سکتے ہیں۔ کہ جہاں دوکانیں ہوتی ہیں۔ ان بیچاروں کو اپنی تھوڑی بہت چیزیں بھوکے آڑھتیوں کے خطرناک سلسلہ کی معرفت بیچنی اور خریدنی پڑتی ہیں۔ بعض کو انتہائے ذلت میں کام کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ورنہ یہ لوگ کچھ چیز نہیں بیچ سکتے ہیں۔ بلکہ اپنی دستکاری کی چیزیں بھی نہیں بیچ سکتے۔ یہ لوگ صرف

بھیک مانگ سکتے ہیں۔ بلکہ بھیک مانگنے کے لئے بھی وہ سڑک پر نہیں چل سکتے۔ بلکہ بہت دور چھپکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاکہ کوئی ہندو ان کو دیکھ نہ سکے۔ اور جو لوگ سڑک پر سے گذریں۔ ان سے دور سے چلا چلا کر خیرات مانگتے ہیں۔ خیرات اس طرح دی جاتی ہے کہ وہ سڑک سے بہت دور زمین پر پھینک دی جاتی ہے۔ اور جب خیرات کرنے والا نظر نہیں آتا۔ بلکہ بہت دور چلا جاتا ہے اور سڑک بالکل خالی ہوجاتی ہے صرف اس وقت یہ مانگنے والا اچھوت پیٹ کے بل چلکر وہاں جاتا ہے۔ اور خیرات کی چیز کو اٹھا کر پھر اپنے چھپنے کی جگہ کو بھاگ جاتا ہے۔

اگر سب کا نہیں تو بعض اچھوتوں کا سایہ بھی اگر کھانے کی کسی چیز پر پڑ جائے۔ تو بڑی ذات کے ہندو اس چیز کو نہیں کھاتے۔ اس طرح ناپاک ہونے کے بعد وہ چیز صرف ضائع کر دی جاسکتی ہے۔

بعض اچھوت اپنے بد نصیب جسموں سے گویا راستہ کی غلاظت کے ذرات اڑاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی اچھوت شاہراہ کے پاس جا کر ٹھہرے تو ٹھہرے کی جگہ سے شاہراہ عام تک اسکو زمین پر لیٹ کر جانا پڑتا ہے۔ اگر شاہراہ تک جانے کا یہ راستہ دو سو گز سے کم ہو۔ تو اس کو احتیاط کے ساتھ سڑک پر ایک سبز پتہ تھوڑی سی مٹی سے دبا کر رکھ دینا چاہیئے جس سے ظاہر ہو جائے گا۔ کہ ایسی گندی ہستی اس جگہ سے ناپاک کر دینے کے فاصلہ کے اندر اندر موجود ہے۔ گذرنے والا برہمن اس نشان کو دیکھکر ٹھہر جاتا ہے

اور چلاتا ہے۔ یہ شور سنکر وہ غریب اچھوت فوراً بھاگ جاتا ہے۔ اور جب وہ بھاگ کر کافی فاصلہ پر چلا جاتا ہے۔ تو چلاکر کہتا ہے۔ کہ میں اب دو سو گز کے فاصلہ پر ہوں۔ مہربانی کرکے آگے گذر جائیے۔

اور سنئے۔ ساحل ملیبار کے قوم پولیہ کے لوگوں کو اپنے لئے جھونپڑے بنانے کی بھی ممانعت ہے۔ ان کو صرف یہ اجازت ہے۔ کہ چوبوں پر پھوس کی چھت ڈالکر سائبان سا بنالیں۔ یا بڑے بڑے درختوں کے دو شاخوں میں اپنا آشیانہ بنائیں۔ اس سے بہتر مکان بنانے کی ان کو اجازت نہیں ہے یہ لوگ انسانیت کی اور کوئی طرز اختیار نہیں کر سکتے۔ ڈوبوس نے لکھا ہے۔ کہ اس کے زمانہ میں اگر کسی نائر (اونچی ذات کے ہندو) کو سڑک پر کوئی پولیہ مل جائے۔ تو نائر اس بات کا مستحق ہے۔ کہ اس خطاوار کو تلوار سے وہیں قتل کر ڈالے[۱]۔ مگر آج کل نائر اس کام کے کرنے میں پس وپیش کریگا۔ تاہم آجکل بھی یہ حال ہے۔ کہ کوئی پولیہ کسی اچھی ذات کے ہندو کے پاس نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اس سے ساٹھ یا نوے فٹ دور رہ سکتا ہے۔

اس مقدر کی ٹھہرائی ہوئی مصیبت کی حالتوں سے مجبور ہوکر اچھوتوں کے بعض فرقوں نے ارتکاب جرائم کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ اور انہوں نے خاص خاص جرائم مخصوص کرلئے ہیں

[۱] ہندو مینرز کسٹمس اینڈ سیرمنیز صفحہ ۶۰۔ نیز دیکھو کتاب ٹھگری دیگر دیتی بجری سفر آف واسکو ڈی گاما مگا سپر کو ریا ملکولٹ سوسائٹی لندن ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۵۵)

کوئی گروہ جیب کترا بن گیا ہے۔ کوئی فرقہ نقب زن ہے۔ کوئی جعل ساز ہے۔ کوئی ڈاکو ہے۔ کوئی قاتل وغیرہ ہے۔ ان لوگوں نے ان پیشوں کے ساتھ اکثر اپنی عورتوں سے بدکاری کا پیشہ بھی اضافہ کر لیا ہے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور آج کل ان کی تعداد پینتالیس لاکھ ہے۔

اب یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے۔ کہ اچھوتوں کا معاملہ ہندوؤں کے تمام دیگر معاملات کی طرح ہندو مذہب کے اندر تانے بانے کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ اور ہندو خوفناک طور پر مذہبی لوگ ہیں۔ اس بارہ میں ایک ممتاز ہندوستانی سر سریندرا ناتھ بنرجی کے الفاظ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔[1]

ہندو قوم پر اثر کرنے والے کسی ایسے معاشرتی مسئلہ کا تم خیال نہیں کر سکتے۔ کہ جو مذہبی خیالات کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ اور جب کسی معاشرتی ریت رسم کی امداد میں کسی نہ کسی صورت میں مذہبی منظوری حاصل کر لی جاتی ہے۔ تو یہ منظوری عام لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہو جاتی ہے۔ اور بڑی مضبوطی کے ساتھ جم جاتی ہے۔ اور اس کی جڑ دلیل کی نسبت زیادہ تر خیال پر مبنی ہوتی ہے۔"

خوفناک تجربہ نے یہ بات ظاہر کر دی ہے۔ کہ اگر یہ لوگ اس بات کی کھسر پھسر سن لیں کہ ان کی ذات معرض خطر میں ہے، یا یہ کہ ان کے دیوتاؤں کی توہین کی گئی ہے۔ تو گویا ان لوگوں

---

[1] اے نیشن ان میکنگ لندن ہمفری ملفورڈ ۱۹۲۵ء صفحہ (۳۹۶)

کے آنکس لگا دیا جاتا ہے۔ اور وہ خون میں تر بتر دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

یہ بات گورنمنٹ نے شروع ہی سے سمجھ لی تھی۔ چنانچہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ نے اپنے شہنشاہی اعلان مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک جملہ میں صریح الفاظ میں یہ لکھ دیا ہے کہ:-

ہمارے زیر حکم ہندوستان میں جو لوگ برسر حکومت ہوں ان سب کو ہم نہایت تاکید کے ساتھ حکم دیتے ہیں کہ وہ ہماری رعایا کے مذہبی اعتقادات یا عبادات میں ہر قسم کا دخل دینے سے محترز رہیں۔ ورنہ یہ بات نہایت درجہ ہماری ناراضگی کا باعث ہوگی۔

اس پر بھی ہندوستان میں اہل برطانیہ کا فوری میلان ان کشتگان معاشرت کی حمایت کی طرف رجوع رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ۱۸۵۴ء میں یہ سفارش کی کہ کسی شخص کو ذات پات کی بنا پر کسی گورنمنٹ سکول یا کالج میں داخل کرنے سے انکار نہ کیا جائے۔ اور وہ اپنے اس اصول پر تب تک قائم رہے جب تک کہ حکومت ہند ان سے تاج برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں نہ لے لی۔ اس وقت سے اس اصول پر مسلسل مضبوطی کے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے۔ مگر اس اصول پر ایسی احتیاط کے ساتھ عملدرآمد کیا جاتا ہے کہ جو شخص اس سرزمین کی نہایت نازک پیچیدگیوں سے واقف نہ ہو۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ کمزوردلی کے ساتھ اس

اصول پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ اگر اس غیر ملکی خیال کو ناطیار اور نہ سمجھنے والے کروڑوں آدمیوں پر زبردستی عائد کیا جاتا۔ تو اس سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

ذات پات کی کارروائیوں کو بناوٹ کی کارروائیوں کے ساتھ مخلوط نہیں کر دینا چاہیئے۔ آدمی کی ذات اس کی روح کی تواریخ کا بیرونی نشان ہے۔ ذاتوں کے بیشمار قانونوں میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی کر کے ذات کے توڑنے سے ابدی سزا ملتی ہے۔ اگر بطور ہندو کے ان قوانین کی فرمانبرداری کر کے تم کسی دوسرے شخص پر مصیبت ڈالو گے تو اس کا سبب صرف یہ ہو گا کہ اس کی روح کی تاریخ نے اس کو تکلیف کے راستہ میں رکھ دیا ہے۔ تمہارا اس معاملہ میں کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور وہ خود بھی ایک اچھے ہندو کی طرح خیال کر کے تم کو الزام دے گا۔ کیونکہ وہ اور تم دونوں خدا کی بنائی ہوئی تقدیر کے مطابق کام کر رہے ہو۔

سول قوانین کی مدد سے جس قدر ہو سکتا ہے۔ وہ سب کچھ آجکل اچھوتوں کی مدد کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ گورنمنٹ سے جہانتک ہو سکتا ہے۔ اس نے ہر ایک تعلیمی فائدہ اور بڑے بڑے سرکاری عہدے اچھوتوں کے لئے آزادانہ کھول رکھے ہیں۔ گورنمنٹ نے زمین کو ترقی دینے اور امداد باہمی کی بہت سی تجاویز جن میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھوتوں کو ترقی دینے کے لئے نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا

قائم کر دی ہیں۔ اور ان کے لئے اچھوت زندگی سے باہر نکلنے کے لئے بہت سے راستے بنا دیئے ہیں۔

مگر صوبوں کی گورنمنٹوں کے لئے ایسے قانون کو پاس کر دینا کہ جن میں ہر ایک شہری کی پبلک سہولیتوں جیسے کہ سرکاری اسکولوں سے متمتع ہونے کے حقوق تسلیم کر لئے جائیں۔ تو یہ ایک بات ہے۔ اور اس قانون کو بیشمار اطراف ملک میں اور ہزارہا چھوٹے چھوٹے گاؤں میں لوگوں کے اشتراک عمل کے بغیر اور ان کی مرضی کے خلاف جاری کر دینا دوسری بات ہے۔ اس بارہ میں ۱۷ مارچ ۱۹۱۹ء کا مدراس گورنمنٹ کے حکم کا یہ جملہ دیکھئے:-

"پنچما (اچھوت) لوگوں کے بچے احاطہ مدراس کے آٹھ ہزار ایک سو ستاون (۸۱۵۷) سکولوں میں سے صرف چھ سو نو (۶۰۹) سکولوں میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ قانون موجود ہے کہ صرف ذات پات کی بنا پر کسی لڑکے کو سکول میں داخل کر لینے سے انکار نہ کیا جائے۔"

"تاہم اگر ٹھیک طور سے پڑھا جائے تو یہ اعلان اس قطعی فتح کا اعلان کر رہا ہے۔ ایک نہایت کٹر ہند و صوبہ کے (۴۹) سکولوں میں نیچ ذاتوں کا داخل ہو جانا ہر چند کہ اس تعداد سے تیرہ گنا سکولوں میں ابھی اچھوت داخل نہیں ہو سکتے تاہم بڑی جیت ہے۔

بمبئی لیجسلیٹو کونسل میں ایک روز ماہ اگست ۱۹۲۶ء

میں ایک ریزولیوشن پر بحث ہو رہی تھی کہ لوکل بورڈوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اچھوتوں کے بچوں کو سکول میں جانے اور پبلک چاہات سے پانی پینے اور شہریت کے دیگر عام حقوق سے متمتع ہونے دیں بہت سے ہندو ممبروں نے اس ریزولیوشن کو اصولاً تسلیم کر لیا۔ مگر ایک ممبر نے جو بہت سے لوگوں کا قائم مقام تھا۔ یہ عذر پیش کیا کہ اگر اس ریزولیوشن پر عملدرآمد کیا گیا۔ تو مخالفت کا طوفان برپا ہو جائیگا۔ راسخ العقیدت ہندوؤں کی رائے بہت سخت ہے مجھکو ریزولیوشن سے تو ہمدردی ہے مگر میرا خیال ہے کہ اگر اس پر... عملدرآمد کیا گیا۔ تو اس کا نتیجہ مصیبت بخش[1] ہوگا میری رائے میں اچھوتوں کے دوستوں کے لئے عقلمندی کا راستہ یہی ہے کہ وہ اس ریزولیوشن کی تعمیل پر زور نہ دیں۔ بلکہ بجائے اس کے میری طرح اچھوتوں کے ساتھ زبانی ہمدردی کا اظہار کرنے پر قانع رہیں۔

ایک دوسرے ہندو ممبر نے مخصوص چالاکی سے اس بوجھ کو ان کندھوں پر رکھدیا۔ کہ جو اس کے اٹھانے کے لئے کافی چوڑے[2] ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے اس احاطہ میں بہت بزدلانہ پالیسی پر عمل کیا ہے۔ گورنمنٹ نے کسی سوشل قانون بنانے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اغلباً ایک اجنبی

---

[1] مباحثات بمبئی لیجسلیٹو کونسل ۱۹۲۶ء جلد ہژدہم حصہ ہنم صفحہ (۷۱۷)

[2] ایضاً صفحہ (۷۲۸)

گورمنٹ ہونے کے سبب سے گورمنٹ کو اندیشہ ہے کہ اس
پر مختلف اقوام کے مذہب میں دخل دینے کا الزام لگایا جائیگا
باوجود ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے کہ "متفرق مذاہب اور
اقوام کے درمیان مساوات قائم رکھی جائے گی۔ گورمنٹ
نے عملاً اس اعلان کو نافذ نہیں کیا"
مگر سندھ کے ایک مسلمان ممبر مسٹر نور محمد نے ایک کام کی
بات بتلائی۔ اس نے کہا کہ :۔
"میرا خیال ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جبکہ وہ لوگ جن
کو اعلےٰ ذات کے لوگوں کے ظلم نے سوسائٹی کے نچلے درجہ
میں رکھدیا ہے۔ اپنے آپ کو دوسرے کی گود میں بیٹھا ہوا پائینگے
اس وقت ہندو سوسائٹی کے پاس کسی طرح سے بھی کوئی دلیل
یہ شکایت کرنے کی نہیں رہے گی۔ کہ مسلمان یا عیسائی
پادری نیچ ذات کے لوگوں کو یہ ترغیب دے رہے ہیں۔ کہ
وہ اپنے پیدائش کے مذہب تبدیل کرلیں۔ اگر ہندو سوسائٹی
دوسری انسانی ہستیوں کو جو کہ ان جیسی ہی مخلوق ہے پبلک
سکولوں میں داخل کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اور اگر ....
ایک لوکل بورڈ کا پریزیڈنٹ جو کہ اس ہوس میں کئی لاکھ آدمیوں
کا نمایندہ ہے۔ اپنے ہمجنسوں اور بھائیوں کو محض ابتدائی انسانی
حقوق یعنی پینے کے لئے پانی دینے سے انکار کرتا ہے تو
پھر ہندوؤں کو موجودہ حکومت سے بہت سے حقوق مانگنے کا
کیا حق حاصل ہے؟ ... دوسرے ملک سے آئے ہوئے لوگوں

پر الزام لگانے سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ ہم خود اپنے ہی لوگوں کے ساتھ کیسا رویہ رکھتے ہیں۔۔۔ ہم کس طرح زیادہ سیاسی حقوق ملنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں جبکہ ہم خود اپنے ہمجنسوں کو اصولی حقوق دینے سے انکار کرتے ہیں؟

نیچ ذات لوگوں کو سکول کے دروازہ پر لانے کے لئے قوانین تو مروج ہیں۔ مگر ان میں خود اتنی کافی ہمت نہیں ہے۔ کہ وہ دہلیز کو عبور کر لیں۔ اس لئے کہ صدہا سال سے اس نے اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کے احساس کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ چنانچہ سکول میں نیچ ذات کے داخل ہونے کا بہترین مطلب یہ ہے کہ اس کو برآمدہ میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اور اس فاصلہ سے اپنے خالی کانوں سے جتنا سبق سن سکے۔ اس کو سنکر اخذ کر لے دیہاتی تعلیمی کمیشن نے لکھا ہے کہ:۔

"عام طور سے اب تک یہ حالت ہے۔ کہ اعلیٰ ذات کا آدمی نیچ ذات کے آدمیوں کو مہذب اور متمدن بنانے کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے راستہ میں اُلٹا اور رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ یہ جان کر کہ اگر وہ مہذب اور متمدن بن گیا ہے۔ تو پھر اس سے اور زیادہ خدمات نہیں لی جا سکیں گی۔

نیچ ذات کے جو لوگ اس قدر بیباک ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو سکول میں بھیجدیتے ہیں۔ چاہے وہ اسکول ان کے محلہ میں ہی ہو۔ اور اس طور سے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے بچوں کو ان سے

لے ایضاً ۵۔ اگست صفحہ (۷)

چھو جانے کی شکایت بھی نہ ہو سکتی ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایسی سختی اور تہدیدیں پاتے ہیں۔ کہ وہ مجبور ہو کر اپنے بچوں کو سکول میں سے اٹھا لیتے ہیں۔ اگر نیچ ذات کے لوگ نہ صرف تعلیم بلکہ عیسائی تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔ تو اس وقت بھی ان کو بہت زیادہ سختی کے ساتھ اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اعلےٰ ذات کے ہندوؤں کو یہ اندیشہ ہو جاتا ہے۔ کہ اگر یہ نیچ ذات کے لوگ مسیحی مذہب اختیار کر لیں گے۔ تو پھر وہ ہمیں ادنےٰ اور کمینہ خدمات انجام دینے کے لئے نہیں مل سکیں گے۔

نیچ ذات لوگوں کی آبادی کی نہایت ہی کم تعداد ابھی سکولوں میں تعلیم پاتی ہے۔ مگر ان میں اگر کوئی لڑکا تمام اژدہاؤں سے پھلانگ کر آگے نکل جاتا ہے۔ کہ جو دروازہ کو روک کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تو وہ اپنی قسم میں بہترین لڑکا ہو جاتا ہے۔ اپنی ذلت کی زمانہ دراز کی تاریخ کے باوجود ترقی کرنے کی طاقت کا تخم نیچ ذات کے لوگوں میں ابھی تک مردہ نہیں ہوا۔ بنگالہ میں نام شودر ایک نیچ قوم ہے۔ جن کی تعداد ۱۹ لاکھ ۷۰ ہزار ۵ سو ہے۔ انہوں نے نئی روشنی سے ہمت پاکر اپنے ابھار اور ترقی کے لئے سخت پائیدار اور کامیاب لڑائی لڑی ہے چنانچہ اب انہوں نے اپنے سرمایہ سے اپنے سکول خود ہی قائم کر لئے ہیں۔ تازہ ترین رپورٹ سے معلوم ہوا کہ بنگال میں اس قوم کے ۴۹ ہزار بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ ان میں سے (۱۰۲۵) لڑکے ہائی سکول اور ۱۴۴ لڑکے آرٹس کالجوں میں پڑھتے ہیں کالجوں میں ذات پات کے خیال سے گورنمنٹ نے مجبوراً ان کے

رہنے کے لئے خاص بورڈنگ ہوس بنا دیئے ہیں۔ تاہم شودر قوم بہت تیزی کے ساتھ اپنے درجہ کو بلند کر رہی ہے۔

پنجاب میں جہاں گورنمنٹ کے سررشتہ انہار نے بہت سی قدیم مصیبتوں کو دور کر دیا ہے۔ اس مخالفت کے کمزور ہو جانے کی صریح شہادت موجود ہے۔ کہ جس مخالفت کے سبب سے پنچ ذات لڑکے سرکاری سکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اگرچہ پنجاب کی بعض میونسپلٹیوں نے چالاکی سے اپنے یہاں کے سب سے زیادہ مفلس اور حاجت مند لوگوں کو تعلیم کے استحقاق سے محروم کر دیا ہے۔ صوبہ بمبئی کی تعلیمی رپورٹوں سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اچھوت ذاتوں کی کچھ تعداد نے حصول تعلیم میں زیادہ تر مشنری صاحبان کی کوشش سے کچھ نمایاں ترقی حاصل کر لی ہے۔ اور اس خاص نتائج سے بعض دلچسپ خیالات معلوم ہوتے ہیں۔

اس طرح سے پنچ ذات کے لوگوں نے سالانہ کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کر دی ہیں جن میں ان کے ڈیلیگیٹ جمع ہو کر اپنی حق تلفیوں کا اظہار کر کے حقوق کے مزید حصول کے لئے رزولیوشن پاس کیا کرتے ہیں۔ ان کے خاص نمائندے لیجسلیچر اور لوکل بورڈز میں ممبر منتخب ہونے لگے ہیں۔ وہ حصول حقوق کے لئے ہر سال زیادہ سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کی مستقل کوششوں سے ان کی اقتصادی حالت بعض قوموں میں اب رو بترقی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس ذلت کے لئے کہ جس میں

وہ اب تک چھپتے رہتے مگر اب چونکہ ان کی انسانیت ترقی کر رہی ہے۔ وہ اپنی ذلت کے احساس پر غم و غصہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان میں سے چند آدمی جو صاحب اقتدار و قابلیت ہو گئے ہیں۔ اب دنیا کے سامنے کھڑے ہونے لگے ہیں۔

آخر الامر ان کی عورتیں جنہوں نے مذہب مسیحی اختیار کر لیا ہے ہندوستان کی تمام ذاتوں کی لڑکیوں کے لئے ہندوستانی استانیوں کی سب سے بڑی تعداد بہم پہنچاتی ہیں۔ اور ہسپتال میں یہی تعلیم یافتہ عورتیں نرسوں کا کام کرتی ہیں۔ ان ہی دونو پیشوں کو اعلےٰ ذات کے لوگ حقیر اور نامقبول سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں پیشوں میں تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور ان دونوں کا اثر اور اقتدار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

اچھوت پن کے اصول کے مطلب کا احساس ذاتی طور سے مجھکو پہلی مرتبہ انسان کے ساتھ ظلم اور سنگدلی برتنے میں شمالی ہندوستان کے ایک شہر میں بچوں کے رکھ رکھاؤ کے مرکز کے معائنہ کے دوران میں ہوا۔

اس جگہ ہندوستانی عورتوں کا بہت ہجوم تھا جو اپنے شیر خوار بچوں کو ذمہ وار انگریز نرس کے ملاحظہ کے لئے لائی تھیں۔ وہ صحت عامہ کی تعلیم پائی ہوئی نرس تھی۔ اس سے یہ عورتیں اس طرح پیش آتی تھیں۔ کہ جیسے بچے اپنی عقلمند اور محبت کرنے والی ماں سے پیش آتے ہیں۔ ان کو اس نرس پر بھروسہ تھا۔ اس سے محبت کرتی تھیں۔ اور اس پر اعتماد کرتی تھیں۔

ان سب کی ضرورتیں مشترک تھیں۔ تمام صبح میں یہی دیکھتی رہی کہ اس نے بچوں کو نہلایا دھلایا۔ ان کو وزن کیا۔ پھر ان کا ملاحظہ کیا۔ ان کے لئے ان کی ماؤں کو سادہ دوائیں دیں۔ ماؤں کے سوالات کا جواب دیا۔ دوستانہ طور سے احتیاطیں برتنے کی صلاح دے دی گئی۔ اور ماؤں کو ہمت دلا کر ان کی تعریف کی گئی۔ اب میں نے ایک بڑی بوڑھی اعلےٰ ذات کی عورت کو دیکھا۔ جو سیانی تھی۔ اور جس کا چہرہ خوش وضع تھا۔ جو بھاری طلائی اور نقرئی زیور پہنے ہوئے تھی۔ اور ریشم کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ اپنے بچہ کو دکھلانے کے لئے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے لڑکے کو ایک پرانی رضائی کے پھٹے ہوئے ٹکڑے میں سے نکالا۔ کہ جس میں اس کو لپیٹ رکھا تھا۔ اور اسی قدر اس لڑکے کی پوشاک تھی۔ اس لڑکے کے چھوٹے سے تمام جسم پر سوکھے ہوئے اور نصف سوکھے ہوئے پاخانہ کی پپڑی جمی ہوئی تھی۔ یہ دیکھکر میں نے نرس سے کہا۔ نرس نے جواب دیا کہ:۔

ایسی عورتوں کے لئے ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے رومال رکھا کریں۔ اگر وہ رومال مول نہیں لیتیں۔ بلکہ خود ان بچوں کو نہلاتی دھلاتی بھی نہیں۔ اور نہلانے دھلانے والوں کو اجرت بھی نہیں دیتیں۔ ہر چند کہ وہ ایسا کر سکتی ہیں۔ یہ عورت دولتمند ہے۔ اس کا خاوند اچھا تعلیمیافتہ ہے۔ وہ کسی فن کا ماہر ہے۔ اور اس کو معقول تنخواہ ملتی ہے۔ اگر اس عورت کا دل چاہا۔ تو وہ اس رضائی کے ٹکڑے کو اپنے

مکان کے صحن میں دھوپ میں خشک ہونے کے لئے لٹکا دیتی ہے۔ اور جب وہ خشک ہو جاتا ہے۔ تو اس کو جھاڑ دیتی ہے۔ تاکہ جو کچھ اس میں لگا ہوا ہے۔ وہ گر پڑے۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرتی۔ اس واقعہ سے اس بات کی تشریح میں مدد ملتی ہے۔ کہ کسی ضلع کے لوگوں کے بچوں میں اسہال کی بیماری کیوں پھیل جایا کرتی ہے۔ یہ لوگ اپنی چیزوں کو صاف رکھنے کی کچھ بھی کوشش نہیں کرتے۔"

سسٹر یہ گفتگو کر ہی رہی تھی۔ کہ یکایک ایک نوجوان خوبصورت عورت کھلے ہوئے دروازہ کے سامنے آئی۔ اس کا چہرہ ایسا دلکش اور کھلا ہوا تھا کہ ہم سب کی توجہ فوراً اس کی طرف منعطف ہو گئی۔ وہ اپنی گود میں ایک بیمار بچہ لئے ہوئے تھی۔ مگر وہ آگے نہ بڑھی۔ بلکہ دروازہ کے بالکل باہر کھڑی رہی اور بناوٹ سے مسکراتی رہی۔ سسٹر نے اس کی طرف دیکھا اور وہ بھی مسکرائی۔

میں نے پوچھا کہ یہ عورت اندر کیوں نہیں آتی؟

"اس کو اندر آنے کی ہمت نہیں ہے۔ اگر وہ اندر آجائے تو یہ سب عورتیں یہاں سے چلی جائیں گی۔ یہ اچھوت ہے یعنی نیچ ذات کی عورت ہے۔ وہ خود ہی اس چوکھٹ پر قدم رکھنے کو برا سمجھتی ہے"۔

میں نے کہا کہ وہ تو ایسی شائستہ نظر آتی ہے جیسی کہ یہ سب عورتیں ہیں۔

سسٹر نے کہا کہ اچھوت عورتیں بھی ایسی ہی ذی شعور ہو سکتی

ہیں جیسی کہ اور سب عورتیں ہیں اور تم خود دیکھ رہی ہو۔ کہ وہ ان عورتوں سے زیادہ گندی بھی نہیں ہوں گی۔ مگر ہندوستان میں یہی دستور ہے چونکہ ہم اس رواج کو بدل نہیں سکتے ہم بھی آہستہ آہستہ چلکر جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے ہم ان اچھوت ذاتوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے یہ حلیم الطبع سال عورت تب تک بہت سی اچھوت عورتوں کے مجمع میں باہر ہی کھڑی رہی جب تک کہ سٹر کو باہر جانے کی فرصت ملی۔ اس نے کسی کو بچہ کی آنکھوں کے لئے مرہم دی کسی دوسری کو بچہ کے لئے کھانسی کا مکسچر دیا۔ اور تیسری عورت سے اس کے مرض کا حال سُنا۔

اچھوت عورتیں دوسری عورتوں کی طرح اپنے بچوں کو گرم پانی سے نہلانے کے لئے یہی اندر نہیں لا سکیتں۔ وہ سینا پرونا سکھلانے کی جماعت میں بھی نہیں آسکیتں۔ وہ یہ دیکھنے کے لئے کہ خیراتی دودھ جوان کو دیا گیا ہے۔ اس کا بچہ پر کیا اثر ہوا۔ وہ اپنے بچوں کو ترازو کے پلڑے کے ٹوکرے میں بھی نہیں رکھ سکیتں۔ تاکہ ترازو ناپاک نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ پہلے جنم میں ان اچھوت لوگوں نے بڑے ہیبت ناک گناہ کئے ہوئے ہیں اور جب تک وہ اپنے گناہوں کی لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ تب تک نہ تو وہ کسی امداد کے اور نہ کسی ہمدردی کے مستحق ہیں ؎

بارھویں فصل

ایک روشنی دیکھو

اس بارہ میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ کہ اچھوت لوگوں کے سالہاسے دراز کی ذلت سے ان کا چال چلن بہت ادنےٰ درجہ کا ہو گیا ہے۔ مگر صدیوں کی ذلت اور کچلے جانے کے باوجود بھی ان میں اچھی خصلتوں کی کمی نہیں ہے۔ مثلاً گاؤں کے اونچی ذات کے لوگ مہار قوم کے لوگوں کو نیچ ذات سمجھتے ہیں۔ اور مدراس کے پالیر عملاً غلام ہیں۔ اور ان سے صرف ذلیل ترین کام کرائے جاتے ہیں۔ مگر اب گورمنٹ نے ملازم رکھکر ان سے ہرکاروں کا کام لینا شروع کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کام کے لئے وہ نہایت ہی معتبر ثابت ہوئے ہیں۔ سینکڑوں روپے ادھر سے اُدھر پہنچاتے ہیں۔ اور اس میں سے ایک پیسہ تک خیانت نہیں کرتے۔ احاطہ بمبئی میں ڈھیڈ ایک اچھوت ذات ہے اس قوم کے بکثرت لوگ انگریز افسروں کے خدمتگار ہیں۔ ان لوگوں کو اعلےٰ ذات کے ہندوستانی اپنے قریب بھٹکنے دینا بہت کم گوارا کریں گے۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ یہ نیچ ذات بڑے دیانتدار

ملتبیات سے متنفر اور وفادار ہوتے ہیں۔

جتنے اچھوت لوگوں نے تبدیل مذہب کر کے مسیحی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ ان کے شمار کی بابت مختلف رائیں ہیں۔ مگر آجکل ان کی تعداد پچاس لاکھ کے قریب ہے۔ بہرحال امر واقعہ یہ ہے۔ کہ تبدیل مذہب کے بعد جہانتک وہ ذات پات کی قیود کا تعلق ہے۔ وہ بالکل آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ تو بالکل یقینی بات ہے۔ کہ ہندو مستقل طور سے ان کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔ مگر ان مسیحی لوگوں کی تیسری پشت کی نسبت بہت سے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے پایا گیا۔ کہ یہی لوگ ہندوستان کی امید ہیں۔

عیسائی مشنریوں کی بہت کچھ امداد سے برطانیہ نے اتنا بہت کچھ کام صبر و تحمل سخت کوشش تعلیم سے اور ترغیب سے اور تحریص دلا کر معاشرتی خلیج کے دونوں طرف کر دکھلایا ہے۔ گذشتہ چند سال سے آسمان پر جدید شگونوں کا طلوع ہوتا دیکھا جاتا ہے۔

ہندوؤں کی پولٹیکل مجلسوں۔ اور قومی سوشیل کانفرنس میں اب یہ ترغیب پائی جاتی ہے۔ کہ وہاں نیچ ذاتوں اور اچھوتوں پر ظلم کرنے کے خلاف کھلم کھلا تقریریں کی جاتی ہیں۔ لیکن ان فصیح اور شیریں اعلانات نے سوائے لفظی ہمدردی کے ابھی تک بہت کم نتیجہ پیدا کیا ہے۔ دوسری نادر الظہور بات یہ ہوئی ہے۔ کہ ہندوستانی والنیٹروں کی مجلسیں

قائم ہو گئی ہیں۔ جنہوں نے تھوڑا بہت یہ اعلان کیا ہے۔ کہ ہم اچھوت پن کی لعنت کو ملک سے دور کر دیں گے۔ ان ایسوسی ایشنوں میں سرونٹس آف انڈیا (خادمانِ ہند) کی سوسائٹی جو کہ پرملا پولیٹیکل مجلس ہے۔ اور بنگال اور آسام کے پنچ ذاتوں کی امداد کرنے کے لئے لارڈ سنہا کی سوسائٹی۔ برہمو سماج اور دیگر مجالس شامل ہیں۔ یہ مجلسیں جہاں کہیں بھی کام کر رہی ہیں وہ فائدہ مند کام ہے۔ مگر ضروریات ملک کے مقابلہ میں یہ کام بہت کم ہے۔ اس سے پہلے چونکہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسلئے مقابلتہً یہ قابل ذکر ہے۔

لیکن ایسا خیال ہندوستان کا وطنی خیال نہیں ہے۔ برہمو سماج کے لیڈروں میں سے ایک نہایت ممتاز لیڈر نے مجھ سے کہا کہ آجکل ہندوستان میں ہمارا سوشیل (معاشرتی) کام جس قدر جاری ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ انگریز لوگوں کی نقل ہے۔ اور ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار اور اثر کا ایک نتیجہ ہے۔ اس اٹھتی ہوئی تبدیلی کے منبع کے متعلق صاف طور سے میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لیڈروں کو بار بار یہی کہتے سنا کہ یہ سب باتیں انگریزوں کے اثر سے پیدا ہوئی ہیں۔

---

[1] سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے کام کی ایک مختصر کیفیت آریہ بھوشن پریس پونہ ۱۹۲۴ء (صفحہ ۱۔۲۰)

سر نارائن چندرا ورکر ایک ہندو ریفارمر اور بمبئی ہائی کورٹ کے جج نے ۱۹۲۰ء میں اخبار انڈیا میں مضمون شائع کیا تھا کہ[1]

"آج اچھوت پنے کی لعنت ہندوستان کے تمام حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی آزاد کرنے والی طاقتوں سے یہ مسئلہ پوری روشنی میں کود تا پھرتا ہے۔ گورنمنٹ کی مہربانی سے یہ مسئلہ .... اب آل انڈیا مسئلہ بن گیا ہے۔"

مگر مسٹر گاندھی اس سرچشمہ فیض کے اثر اور اقتدار کو تسلیم کرنے کو بہت کم تیار ہے۔ اس لئے یک قلم ہندوستان کے تمام انتظامی طریقہ کو ایسا خراب اور ناکارہ کہدیا ہے۔ کہ جس کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس جہاد میں جو اسنے گذشتہ پانچسال سے اچھوت پن کے خلاف کر رکھا ہے۔ کوئی بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کام میں استقلال کے ساتھ اس کی مددگار صرف برٹش گورنمنٹ ہے۔ کہ جس کی مدد سالویشن آرمی (مکتی فوج) بہت نمایاں طور سے کر رہی ہے۔ ہندوستان کے دیسی اخبارات میں سے اچھوت پن کے متعلق ایک فاضل برہمن پنڈت کے زمانہ حال کے بیان کو مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں نقل کیا ہے جس میں یہ فقرہ بھی شامل ہے۔

"انسان کے ترقی کے لئے اچھوت پنا ضروری ہے"۔

آدمی کے اردگرد مقناطیسی قوتیں محیط ہیں۔ یہ شکتی (خدائی طاقت) دودھ کے مانند ہے دودھ بہنا مناسب

---

[1] ایک ہندو مصلح سابق جج ہائیکورٹ بمبئی جو انڈیا ۱۹۲۰ء صفحہ ۵۵ پر اقتباس کیا گیا ہے۔

چیز مل جاتی ہے۔ تو وہ خراب ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی مُشک اور پیاز کو اکٹھا رکھ سکتا ہے۔ تو وہ برہمن اور اچھوت کو شامل کر سکتا ہے۔

"اچھوتوں (نیچ ذات) کے لئے بھی کافی ہے۔ کہ وہ دوسری دنیا کے حقوق سے محروم نہیں کئے گئے۔"

اس پنڈت کے مسلک پر مسٹر گاندھی[1] نے یہ رائے زنی کی ہے:-

"اگر ان لوگوں کو دوسری دنیا میں بھی اچھوت ہی رکھتے۔"

پروفیسر رشبروک ولیمز کا بیان ہے کہ "زندہ ہندوستانیوں میں سے مسٹر گاندھی نے نیچ ذات کے لوگوں کو ابھارنے کے لئے اپنے اہل وطن کے قلوب پر سب سے زیادہ یہ خیال نقش کیا ہے ... جس وقت وہ اپنی شہرت کے معراج کمال پر تھے تب بھی نہایت سخت راسخ العقیدت لوگوں کی رائے کو مسٹر گاندھی کی تجاویز سے اختلاف کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔"

مگر آجکل اچھوت پنے کے حامتی لاکھوں ہیں۔ اور گو مسٹر گاندھی ہنوز اپنے عقیدہ پر مستحکم ہیں۔ مگر ان کے حامئیتوں میں سے بہت کم لوگوں نے کسی وقت بھی اُن کی اس بارہ

---

[1] ینگ انڈیا ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۶۸ مسٹر گاندھی کا جو فقرہ چند سطروں میں اگر نقل کیا گیا ہے وہ مسٹر گاندھی کی معاملات ہندوستان پر خطوط میں درج ہے۔
مطبوعہ مدراس، وی نارائنز اینڈ کمپنی، صفحہ ۱۰

ہیں پیروی کی ہوگی۔

بمبئی میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا جلسہ ۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوا جس میں مسٹر گاندھی کی اس بدعت پر صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ کہ وہ اچھوت پن کو دور کرانا چاہتے ہیں۔ صدر نشین جلسہ مسٹر منموہن داس رامجی نے بیان کیا کہ اچھوت پن ایک ایسی سطح پر مقیم ہے کہ جیسے تمام متعدی امراض کے مریضوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جاتا ہے۔

اس جلسہ میں ایک مقرر نے بغیر تائید کرنے کے صلاح دی کہ جو بدعتی لوگ ہندو سوسائٹی کو توڑ دینے کی دھمکی دیں۔ ان بدعتیوں کے متعلق عوام الناس کو چاہئے کہ سرراہ پکڑ کر مار ڈالیں۔ اس نے کہا کہ ہندو مذہب کے لئے ہندو اپنی جانیں تک قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ تاکہ ہندو مذہب کی قدیم پاکیزگی قائم رہے۔ مسٹر گاندھی کے پروپیگنڈا کی بالخصوص جڑ کو کھوکھلی کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کر کے یہ جلسہ برخاست ہوا۔

یہ بات بلا روک ٹوک کہی جا سکتی ہے۔ کہ ہندوؤں کی بڑی بڑی مجلسوں میں بار بار اچھوت پن کے مضمون کو زیر بحث لانے اور اس پر مباحثہ کرنے سے خاصکر اس لعنت کے قائم رکھنے والوں کے جوش سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بہت کامیابی ہو چکی ہے۔

مسٹر گاندھی نے کہا کہ تم نے متعدد مہا سبھا میں اس مسئلہ پر جو

---

۵ سنہ ۱۹۲۶ء کی اس عظیم ہندو کانفرنس میں ایک گرماگرم اور بے قاعدہ مباحثہ ان لوگوں کے خلاف عمل میں آیا۔ جو اچھوت پن کے مصائب کم کرنے پر مصر تھے۔

جھگڑا ہو چکا ہے وہ دیکھ لیا ہے۔ مگر باوجود اس تمام مخالفت کے اچھوت پن جارہا ہے۔ اور بہت تیز قدمی کے ساتھ جارہا ہے اس نے ہندوستان کی انسانیت کو ذلیل کردیا ہے۔ اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ کہ گویا وہ جانوروں سے بھی کم درجہ پر ہیں۔ ان کا سایہ بھی پرمیشور کے نام کو ناپاک کردیتا ہے۔ میں اچھوت پن پر لعنت بھیجتا ہیں اسی قدر سخت یا اس سے زیادہ سخت ہوں جس قدر کہیں ہندوستان میں برٹش طریقۂ حکومت پر نفرین کرتا ہوں تاہم برٹش حکومت کو میں برداشت کرسکتا ہوں مگر اچھوت پن کو میں برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر ہندو مذہب اچھوت پن کو بدستور قائم رکھیگا۔ تو پھر ہندو مذہب جلد مردہ اور ضائع ہوجائیگا[1]

اس عرصہ میں اچھوتوں کی مدد کے لئے ایک اور حیرت انگیز امر ظہور پذیر ہوگیا ہے۔ گورنمنٹ کے عہدوں کو انڈیا نائز کرنے یعنی ان پر جلد جلد ہندوستانی لوگوں کو مقرر کرنے کے سبب سے اور دنیا کے جنگ عظیم کے بعد برٹش تعلم ونسق کی اس خصوصیت سے کہ وہ اہل ہند کو حکومت خود اختیاری کی رعایت دے رہے ہیں۔ اور ہندوستان کی آبادی کے تین چوتھائی ہندوؤں اور ایک چوتھائی مسلمانوں میں سخت حسد پیدا ہوگیا ہے۔ اس مضمون پر کسی اور جگہ رائے زنی کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا بیان کردینا کافی ہے کہ کیا سبب ہے کہ اچھوت لوگوں کو محض ان کی کثرت تعداد کے سبب سے یکایک ہندو دنیا نے اپنی فکر و تشویش کا مرکز بنا لیا ہے

---

[1] مصنف سے مسٹر گاندھی کا ایک زبانی بیان جسے خود انہوں نے ترمیم کیا تھا۔

اس بارہ میں سر ٹی ڈبلیو ہولڈرنیس نے ۱۹۲۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں یوں بیان کیا:-

ہندوستان میں نیچ ذاتوں کی نہایت وسیع آبادی ہے آجکل جس مسئلہ نے ہندو مذہب کو بے چین بنا رکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان نیچ ذاتوں کو ہندو شمار کیا جائے یا نہیں۔ آج سے دس سال پہلے اس سوال کا جواب نہایت تاکید کے ساتھ نفی میں ملتا۔ اب بھی لکیر کے فقیر ہندوؤں کا تو یہی خیال ہے۔ کہ نیچ ذاتوں کو ہندوؤں سے بالکل الگ رکھا جائے۔ مگر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے نہایت ترقی یافتہ حصہ کا ضمیر اس بارہ میں بالکل مختلف ہے حریف مسلمان پولیٹیشن جب اس بات کو یاد دلاتے ہیں۔ کہ ہندو آبادی کی کل تسلیم کردہ تعداد کی ایک تہائی سے زیادہ کو ہندو اپنا جزو ہی نہیں مانتے۔ اور برہمن پروہتوں کو اس آبادی کا مذہبی کام انجام دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اس آبادی کو ہندو اپنے مندروں میں بھی داخل نہیں ہونے دیتے۔ تو یہ بات ہندوؤں کو ناگوار گذرتی ہے۔ ایسی دلیل کی موجودگی میں بظاہر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ نیچ ذات کے لوگوں کو ہندوؤں کو اپنے مذہب کے دائرہ کے اندر رکھنے کا دعویٰ کرنا چاہئے۔ اگر ہندو نیچ ذاتوں کو بھی ہندو ہی سمجھنے لگیں۔ تو پھر عقل سلیم اس بات کی متقاضی ہے کہ جیسا آجکل ان سے سلوک کیا جاتا ہے۔ آئندہ اس سے بہت اچھا سلوک ہونا چاہئے۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو اس بات کا پورا خیال ہے۔ چنانچہ انڈین سوشل کانفرنسوں کے پروگراموں میں ان

پنچ ذاتوں کی آبادی کو ابھارنے پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے مگر مضبوط ترین دل سے مصلح کو بھی اس بات کا اقبال ہے۔ کہ اس معاملہ میں کارگر کارروائی کرنے کی راہ میں کثرت سے مشکلات حائل ہیں۔ کیونکہ ہندوستانیوں کے دل پر ذات پات کے خیال نے بڑی سختی سے اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔

مگر یہاں ایک تازہ عنصر اور آجاتا ہے۔ مغرب کی مداخلت کا یہ بھی ایک بےچین کر دینے والا پھل ہے ـــ اور وہ یہ کہ اس بات کا احتمال ہے۔ کہ حیرت انگیز جدید غیر ملکی ہمدردی سے متاثر ہو کر پنچ ذات کے لوگ اور زیادہ عرصہ تک اپنے مذہبی درجہ تک اپنے مذہبی درجہ کے مقرر کرنیکا فیصلہ اب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیں گے۔ اسلام جو بالکل جمہوری مذہب ہے۔ اچھوتوں کو فوراً اپنی گود میں لینے اور انہیں کامل مساوات دینے کے لئے آمادہ ہے۔ مسیحی مذہب اچھوتوں کو صرف اپنے مذہب کی دعوت ہی نہیں دیتا۔ بلکہ ان کو تعلیم بھی دیتا ہے۔ اور ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ اچھوت جس وقت سے مذہب اسلام یا مسیحی مذہب اختیار کریگا۔ اسی لمحہ سے ذلت سے رہائی پاکر آزاد ہو جائے گا۔ اب یہ مسئلہ خاصکر ایسا مسئلہ بن گیا ہے۔ کہ قرنوں کے مظلوم فرقہ کے لوگ جرأت ہمت اور دلیری حاصل کر کے کچھ مدت کے بعد اٹھ کھڑے ہونے ہیں اور ہوش میں آکر خاک جھاڑتے ہیں۔

۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں ہندوستان کے اس وقت کے وزیر ہند مسٹر ای ایس مانٹیگو نے جو گورنمنٹ کو بہت جلد

ہندوستانی افسروں سے مرکب بنا دیئے کے سب سے بڑے حامی تھے۔ دہلی میں بیٹھکر انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کے ایسے عناصر کے ڈیپوٹیشنوں کو شرف باریابی عطا کیا۔ کہ جو اس مسئلہ پر وزیر ہند کو سپاسنامے دینے کے لئے بیتاب تھے۔ ان سے ہر درجہ اور ہر طبقہ اور خیالات کے لوگ ملے۔ ہر قسم کی تحریری عرضداشتیں ان کے سامنے پیش کی گئیں۔ تمام قسم کے فوائد اور زود اپائے نظران کو بتلائے گئے۔ ان وفود میں ہندوستانی پولیٹکل اسٹیج پر ایک نیا عنصر یعنی اچھوت لوگوں کا وفد محض سادہ طور سے نمودار ہی نہیں ہوا۔ بلکہ یہ لوگ خواب خرگوش سے جاگ اٹھے۔ اوران کے متعدد منظم جماعتوں نے وزیر ہند سے التجا کی اور اپنے مطالبہ کی منظوری کے لئے اپنے حقوق جتلائے۔

بغیر کسی مخالف صدر کے ان لوگوں نے بالاتفاق ہندوستان کے لئے ہوم رول (سوراج) کے خیال کو بہت برا بتلایا۔ ان کی رائے کے اندراج سے بار بار ایک بات کا اعادہ ہوتا ہے۔ ان کی رائے کے دو اقتباسوں سے ان کا عندیہ کافی طور سے سمجھ میں آجائیگا۔

"پنچما کالوی ابی ویرتھی۔ ابی مانا سنگا کہ جو احاطہ مدراس کے نیچ ذات لوگوں کی مجلس ہے۔ ہندوستان میں پولٹیکل تبدیلی کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ اس مجلس کی یہ خواہش ہے۔ کہ نیچ ذاتوں

لے یہ ایڈریس ہندوستان میں ہز ایکسلنسی وائیسرائے اور رائٹ آنریبل وزیر ہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ لندن ۱۹۱۸ء صفحہ ۸۷

کو صرف برہمن کی دستبرد سے بچایا جائے۔ کیونکہ برہمن کا مطلب ملک کی حکومت میں زیادہ تر شریک ہونے سے بھی ہے۔۔۔ جو کہ کسی زہریلے سانپ کا کسی چھوٹی سی مینڈک کو اپنی حفاظت میں لینے سے ہوتا ہے۔

مدراس آدی دراویڈ جانا سبھا نے کہ جو احاطہ مدراس کے ساٹھ لاکھ قدیم زمانہ کے اصلی باشندوں (ڈراویڈ لوگوں) کی ترتیب وادہ انجمن ہے۔ اپنے ایڈریس میں لکھنی ہے کہ:-

ہندوؤں کی ذات پات کے طریقہ نے ہم پر اچھوت ہونے کا داغ بدنامی لگا دیا ہے۔۔۔ مگر اونچی ذات کے ہندو ہماری مدد کے بغیر زندگی بھی بسر نہیں کر سکتے۔ ہم مزدوری کرتے ہیں۔ اور ہماری مزدوری کا پھل وہ کھاتے ہیں ہمیں ہماری مزدوری کے معاوضہ میں نہایت کم اجرت دیتے ہیں۔ معاشرتی اور اقتصادی درجہ میں ہماری ترقی کا آغاز محض برٹش گورنمنٹ کے سبب سے ہوا۔ اور اب جس قدر ترقی ہو چکی ہے۔ وہ بھی برٹش گورنمنٹ ہی کے وجود سے ہے۔ ہندوستان میں جتنے انگریز ہیں افسران گورنمنٹ۔ تاجر۔ اور سب سے اخیر گو سب سے کم نہیں۔ وہ عیسائی مشنری ہیں۔ جو ہم لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے بدلہ میں ہم بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ ہماری قوم کی حالت ابھی تک بہت پست ہے۔ مگر ہم میں بعض تعلیم یافتہ شخص بھی ہیں۔ ہندوؤں نے ہماری قوم پر عام طور سے جو داغ مذلت لگا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے ان تعلیم یافتہ لوگوں

کو سوسائٹی میں ابھرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔

ہندو لوگ جن ناموں سے ہمیں پکارتے ہیں۔ اس کے تلفظ سے بھی ہماری حقارت ہوتی ہے۔

ہم کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم ہوم رول کے سخت مخالف ہیں۔ اگر اس ملک میں حکومت کو برٹش ہاتھوں سے لیکر اونچی ذات کہلانے والے ہندوؤں کے ہاتھ میں دینے کا کوئی ارادہ کیا جائیگا۔ تو اس ارادہ کی مخالفت میں ہم اپنی جانیں لڑا کر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔ اس لئے کہ گذشتہ زمانہ میں ہندو ہمارے ساتھ بڑی بدسلوکی کر چکے ہیں۔ اور اگر برٹش قوانین کی حفاظت ہمارے لئے نہ ہو۔ تو ہندو ہمارے ساتھ پھر بھی ایسا ہی سلوک کریں گے۔ اب بھی جبکہ برٹش حکومت یہاں موجود ہے۔ ہمارے مطالبات بلکہ ہماری ہستی تک سے ہندو بے پرواہیں۔ اگر نظم و نسق ملک کا اختیار ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ تو پھر وہ ہمارے فوائد کو کس طرح ترقی دے سکتے ہیں؟

پنچ ذات کے نمائندوں نے کہا کہ "ہم ان سے محبت کرتے ہیں"۔ کچھ صدمہ کے ساتھ ان لوگوں کا یہ بیان سیدھا دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ مگر مجبوراً یہ بات قابل یاد داشت ہے کہ واقعی ان عاجزوں کے رنج و غم پر ان کی تاریخ کی تمام تاریک صدیوں میں اس سے پہلے کبھی کسی مخلوق نے نہ تو خیال کیا اور نہ ان کی مصیبت کے دفعیہ کے لئے کوئی امداد کا ہاتھ پھیلایا۔ میں یہاں

ایک قصہ لکھتی ہوں۔ کہ جو مجھ سے بیان کیا گیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ صدیوں کی ذلّت آدمی میں اس بات کا قلع قمع نہیں کر سکتی۔ جو اس کے دل کو اس کے دوست کی طرف اُبھارتی ہے۔

اس قصّہ کا تعلق مدراسی سفرمینا کی ایک پلٹن سے ہے۔ اس سفرمینا کے تمام آدمی بنگلور کے آس پاس کے رہنے والے کوئلہ جیسے سیاہ فام ڈراوید قوم کے لوگ ہیں۔ یہ سب کے سب یا قریبًا سب نیچ ذات ہیں۔ دنیا کے جنگ عظیم میں کوت العمارہ کو لینے کے موقعہ پر یہ واقعہ پیش آیا۔

راوی نے بیان کیا۔ کہ اس جگہ دریائے دجلہ تین سو گز چوڑا ہے اور بڑی تیزی سے بہتا ہے۔ ہمارا کام یہ تھا۔ کہ صبح اندھیرے منہ کشتیوں کے پل کے ذریعہ سے دریا کو عبور کر لیں اس امید میں کہ بے خبری میں ترکوں پر جا پڑیں گے۔ سفرمینا کا کام یہ تھا۔ کہ وہ اندھیرے کے پردہ میں پہلے سے رات کو کشتیاں تیار رکھیں اور خود پیچھے کھڑے ہو جائیں۔ تو فوج کے لڑاکے آدمی خود کشتیوں کو کھے کر دریا کے پار لیجائیں۔

سفرمینا کے لوگوں نے اپنا کام کر لیا۔ مگر جب ہماری فوج کے سپاہیوں کا وقت مقررہ کشتیوں پر سوار ہونے کا آگیا۔ تو ترک جاگ اُٹھے اور انہوں نے آگ برسانی شروع کر دی ہمارا بے خبری میں حملہ کرنے کا ارادہ اکارت گیا۔ مگر خیر ہم بڑھے چلے گئے۔

اب فوج کشتیوں کی تہ میں چپت لیٹ سکتی تھی۔ مگر کشتی کے کھینے والوں کو تو کشتی کے کناروں پر بیٹھکر کشتی کو ٹھیک سو گز تک اس طور سے ترکوں کی رائفلوں گولیوں کی مار کے اندر اندر چلانا لازم تھا۔ مگر ان کو یہ موقعہ ہی نہیں ملا۔

کیا واقعہ پیش آیا۔ ؟ ان پستہ قد مدراسیوں نے بڑے شوق کے ساتھ زبردستی آگے بڑھکر کمانڈر سے عرض کی کہ صاحب آپ کو تو وہاں رائفل چلانے والوں کی ضرورت ہے۔ بند وقچی صاحب بند وقچی۔ ہم تو صرف سفر مینا ہیں۔ ہم کو کشتیوں کو کھے کر لے چلنے کی اجازت دیجئے۔

پس فوج کے آدمی اُچھلکر کشتی میں پہنچے گئے اور کشتی کی فرش پر چپت لیٹ گئے۔ سپیرز کود کر کشتیوں کے کناروں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے کشتیاں چلانی شروع کردیں۔ پھر ترکوں کی مشین گنیں آتشباری میں مصروف ہوگئیں۔

جب کشتیاں واپس آئیں۔ تو ان چلانے والوں میں سے مشکل سے کوئی آدمی ایسا ہوگا۔ جو زخمی نہ ہوا ہو۔ بلکہ بہت سے مر گئے جس قدر باقی پستہ قد سپرز کنارہ پر کھڑے تھے۔ وہ ہجوم کر کے کشتیوں کے پاس آ گئے۔ اور اپنے مقتول بھائیوں کو اٹھا کر کنارہ پر لے گئے۔ اور کود کر کشتی میں مقتول اور مجروح لوگوں کی جگہ پر گئے۔ جب ہر ایک کشتی فوج کے سپاہیوں سے بھر گئی۔ تو اپنے ساتھیوں کا مزہ چکھنے کے لئے کشتی کو چلا کر دوسرے کنارہ پر لے جانے لگے۔ اس طور سے رائفل والے سپاہی کوٹ میں

پہنچے ۔ تم کو معلوم ہے ۔ کہ کوئلہ جیسے سیاہ رنگ کے یہ ڈراوید لوگ نیچ ذات تھے ۔ البتہ جب وہ عیسائی ہوجاتے ہیں ۔ تو پھر وہ نیچ ذات نہیں رہتے ۔ چنانچہ ان میں سے بہت ہو چکے ہیں

جب پرنس آف ویلز ۱۹۲۱ء کے اخیری ایام میں لندن سے ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لئے روانہ ہوئے ۔ تو مسٹر گاندھی نے کہا کہ اس وقت ولیعہد سلطنت کی یہ سیاحت زخم پر نمک چھڑکنے کے مساوی ہے ۔ اس لئے عام طور سے اس سیاحت ولیعہدی کا بائیکاٹ کر دیا جائے ۔

سیاسی کام کرنے والوں کو مسٹر گاندھی کی فرمانبرداری کرنے کے لئے یہ ایک مشغل مل گئی جس کو لیکر انہوں نے بھاگ کر اپنی تمام مجلسوں میں آگ لگا دی ۔ غرضکہ بمبئی میں شہزادہ ویلز کا خاکِ ہند پر قدم رکھنا تا تلا نہ فساد اور تباہی کا اشارہ بن گیا ۔ آبادی کے ذمہ دار حصہ میں کسی قسم کا فساد نہیں ہوا ۔ اور نہ شہزادہ کے جلوس کے راستہ میں کوئی بلوہ یا فساد ہوا کیونکہ اس راستہ کی تو بہت اچھی طرح سے حفاظت کر لی گئی تھی ۔ مگر شہر کے دور دراز رقبہ جات میں غنڈوں نے کئی دن تک شور و شر برپا رکھا ۔ اس بلوہ میں پچاس آدمی مارے گئے اور چار سو زخمی ہوئے ۔ ہندوستانی لوگ ہندوستانیوں پر حملہ کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ آتشزنی اور لوٹ مار نے بہت لوگوں کو تباہ کر دیا ۔

شہزادہ کا ان کی ساری عمر میں یہ سب سے پہلے معاندانہ

استقبال ہوا۔ مگر وہ صحیح اور ظاہراً اس سے کچھ بھی متاثر نہیں ہوئے اور سرکاری طور سے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق شہر میں اور شہر سے باہر اپنے متعلقہ کام کو مکمل کر لئے گئے۔ شہزادہ کا پروگرام یہ قرار پا گیا۔ کہ ۲۲ نومبر کی شام کو وہ بمبئی سے جانب شمالی ہندوستان روانہ ہو جائیں گے۔

بمبئی کے گورنمنٹ ہاؤس سے بمبئی کا ریلوے سٹیشن تین یا چار میل دور ہے۔ جب پرنس آف ویلز اپنی موٹر کار میں گورنمنٹ ہاؤس سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ تو آگے آگے چلنے والی پولیس کی موٹر کار شہر میں پہنچی۔ تو سڑک کے دونوں طرف پولیس کے سپاہی قطار باندھے کھڑے تھے۔ پولیس کی اس حفاظتی لائن کے پیچھے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ یہ دیہات کے عام غریب لوگ تھے۔ جو لاکھوں کی تعداد میں شہزادہ کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ لوگ آگے بڑھے آتے تھے۔ اور پولیس کی قطار کو دباتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ جب ریلوے سٹیشن صرف آدھ میل دور رہ گیا تو ان لوگوں نے اتنی ریل پیل کی۔ کہ پولیس کی لائن جھک گئی۔ اور لوگوں کے دباؤ کے بوجھ سے ٹوٹ گئی۔

فوراً لاکھوں آدمی اندر سڑک پر گھس آئے۔ اور شہزادہ کی موٹر کار کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور موٹر کار کے زیادہ نزدیک پہنچ جانے کے لئے چلاتے تھے۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ یہ لوگ کیا کریں گے؟ ان

کے مزاج کا کیا حال ہے ؟ خدا ہی کو معلوم تھا۔ گاندھی
کے گرم الفاظ ان میں پھیل چکے تھے۔ اور اب صرف تنہا خدا
ہی مدد کر سکتا تھا۔ بعض لوگ تو موٹر کار کے پاوان پر پہونچکر
اس سے چپک گئے۔ دوسرے لوگوں نے دھکا دے کر
ان کو اتار دیا۔ اور آپ پاوان پر چڑھ گئے۔ ایک منٹ تک
وہ اسی پر رہے ہوں گے۔ کہ ان کے پیچھے پہنچنے والوں نے
ان کو کھینچکر نیچے کر دیا۔ اور آپ اس پر چڑھ گئے۔ اب یہ
چلا کر کیا کہہ رہے ہیں ؟ پہلے پہل تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ
یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ شور و غل میں کچھ سنائی نہ دیا۔ جن لوگوں کے
چارج میں حفاظت موٹر کار کا کام تھا۔ انہوں نے بہت کان
لگا کر سنا۔ مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ چونکہ ان الفاظ کو ہزارہا
آدمی مسلسل کہہ رہے تھے۔ اب سمجھ میں آ گئے۔ وہ لفظ یہ تھے۔

یُوراج مہاراج کی جے۔ ولیعہد کی جے۔ مجھکو میرے
شہزادہ کو دیکھنے دو۔ مجھکو میرے شہزادہ کو دیکھنے دو۔ میرے
مرنے سے پہلے ایکبار مجھکو صرف میرے شہزادہ کو دیکھنے دو۔"
پولیس نے پھر بے فائدہ کوشش کی کہ شہزادہ کی موٹر کار کو خود
گھیر لیں۔ مگر نہ گھر سکے۔ شہزادہ کی موٹر کار رینگ کر قدم قدم چل
رہی تھی۔ اس کی حفاظت اب بالکل کچھ نہ تھی۔ اور غل و شور
مچانے والے انسانوں کا ایک ٹھوس مجمع بالکل چاروں طرف
موجزن تھا۔ آخر کار اسی حالت میں یہ موٹر کار ریلوے سٹیشن
تک پہنچ گئی۔

وہاں شاہی ٹرین کی پلیٹ فارم کو اچھی طرح محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اس احاطہ کے اندر شہر اور صوبہ بمبئی کے بڑے بڑے جلیل القدر حکام حسب ضابطہ خدا حافظ کہنے کے لئے موجود تھے۔

ہز رائل ہائینس شہزادہ صاحب نے ان کا خدا حافظ کہنا سنکر ان کو بھی خدا حافظ کہا۔ پھر اپنے آخری الفاظ کو کم کر کے یکایک شہزادہ نے اپنے اڈیکانگ کی طرف مڑ کر جو شہزادہ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ کہا کہ:

ٹرین کے چلنے میں کتنا وقت باقی ہے؟

اڈیکانگ نے جواب دیا کہ حضور تین منٹ۔

شہزادہ نے عوام الناس اور بھیڑ بھاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ رکاوٹیں گرادو۔ اور ان لوگوں کو اندر آنے دو۔

جس آدمی نے مجھ سے یہ قصّہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ شہزادہ کا یہ حکم سنکر مارے ڈر کے ہمارے دل کود کر ہمارے منھ میں آ گئے۔ مگر رکاوٹیں فوراً توڑ دی گئیں۔

جس طرح سیلاب آجانے سے کسی دریا کا پانی بے روک ٹوک بہتا چلا آتا ہے۔ اسی طرح یہ نہ ختم ہونے والا ہجوم پلیٹ فارم پر چلا آتا تھا۔ یہ لوگ چلاتے تھے۔ ڈنڈوت کرتے تھے۔ ہنستے تھے اور روتے تھے۔ جب ٹرین روانہ ہوئی۔ تو یہ لوگ شاہی گاڑی کے برابر برابر تب تک بھاگتے ہوئے چلے گئے۔ جب تک کہ ان سے بھاگا گیا۔

اس کے بعد ایک دوا علیٰ ذمہ دار افسر تو سیدھے لینے

گھر جا کر پلنگ پر بے فکر ہو کر سو گئے۔

پس پرنس آف ویلز اس طرح سے جانب شمال روانہ ہوئے۔ ان کے جاتے ہی ہندوستانی پولیٹکل لیڈر کے عناد کے سبب سے نہایت خوشگوار اثر جو عوام میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بہت کچھ جاتا رہا۔ لیکن اگر مسٹر گاندھی کی اشتعال انگیز تقریر سفر کر کے تمام ملک میں پہنچی۔ تو اس کے ساتھ ہی شہزادہ کے اعلیٰ رویہ کی یہ خبر بھی تمام ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ پہنچ گئی۔ اور انہوں نے قدیم زمانہ کے سادہ دل لوگوں پر وہی اثر کیا۔ جو ایسی باتیں کیا کرتی ہیں۔

جب ہندوستان کے شمالی دروازہ یعنی درہ خیبر کی سیر کر کے شہزادہ ولیعہد واپس ہوئے تو ایک عجیب چیز ان کی منتظر تھی یعنی سے شہزادہ کے محبت آمیز رویہ کی جو خبر آئی تھی۔ اس سے ہمت پا کر اچھوتوں کی ایک بہت بڑی جماعت سڑک کے ایک طرف شہزادہ کو آداب و تسلیمات کرنے کے لئے مجتمع ہو گئی۔

جب شہزادہ کی سواری ان کے قریب پہنچی۔ تو سب نے یک زبان ہو کر بڑے زور سے چلا کر کہا۔ کہ گورنمنٹ کی جے۔ ان کی اس آواز اور تالیوں سے تمام ارد گرد کی بنجر پہاڑیوں میں صدائے بازگشت پیدا ہو گئی۔

جبکہ شہزادہ نے ان کے سلام کا جواب دینے کے لئے

اپنی موٹر کار آہستہ آہستہ کرلی۔ تو وفور جوش اور خوشی میں یہ لوگ کودتے تھے اور ناچتے تھے۔

چونکہ ان کی یاد داشت کے ذخیرہ میں یا سنی سنائی باتوں میں کسی ہندوستانی فرمانروا کی تاریخ میں ان کے لئے کہیں بھی یہ بات موجود نہیں تھی۔ کہ کسی نے ان پر مہربانی بھی آج تک کی ہو۔ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ کہ ان لوگوں کو گھڑک یا جھڑک دیا جاتا تھا۔ اور یہ تو ہندوستان میں سب سے بڑا شخص تھا یعنی ایک عظیم الشان سلطنت کے ملک معظم کا ولیعہد تھا۔ جو کہ ان کے نزدیک بالکل دیوتا کا اوتار تھا۔ کہ جس نے نہ صرف ان کو شرف باریابی عطا کیا۔ بلکہ ان کی اطاعت شعاری کے لئے ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پھر اگر ان کی روحیں بلندی پر چڑھ گئی ہوں۔ اور ان کی آنکھوں نے عجیب و غریب منظر دیکھا ہو۔ اور ان کی زبان سے مجذوبانہ الفاظ نکل گئے ہوں۔ تو کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے سے چلا کر کہا کہ دیکھو! دیکھو! روشنی دیکھو! روشنی! انہوں نے اس واقعہ سے اپنی اس قدر عزت افزائی سمجھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ دہلی میں وارد ہوئے۔ اور ان پچیس ہزار اچھوتوں میں شامل ہو گئے۔ کہ جو دہلی میں ولیعہد سلطنت کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ اور چاروں طرف سے گاؤں کے لوگ آکر ان اچھوتوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ گاؤں کے یہ لوگ بڑے سادہ آدمی ہوتے ہیں

یہ پالٹکس کے معاملات کچھ بھی نہیں جانتے۔ بلکہ دوستی کو بہت
کچھ سمجھتے ہیں۔ جو کہ ان کے لئے فائدہ مند کام کرکے ظاہر کی جاتی
ہے۔ یہ سب لوگ سڑک کے ارد گرد برابر بار بار پھرتے رہے
اور شہزادہ کے آنے کا انتظار اس امید میں کرتے رہے۔ کہ
شہزادہ کے چہرہ کی ایک جھلک دیکھ لیں۔

آخرکار سڑک اعظم کی راہ سے شہزادہ ولیعہد سلطنت دہلی
دروازہ کی طرف تشریف لائے۔ ان اچھوتوں کے گروہ کے
درمیان میں ایک آدمی نے باقی سب آدمیوں سے زیادہ
بلندی پر کھڑے ہوکر ایک جھنڈا کھولا۔

پھر سب نے اکٹھے طور سے گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا "یوراج
مہاراج کی جے" "راجہ کے بیٹے کی جے"۔ یہ سنکر شہزادہ نے اپنی
موٹر کار کو ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ اس وقت اونچی ذات کے
ہندوستانی تماشائی تعجب کرتے تھے۔ اور اپنے دل کے اندر
کہتے تھے۔ کہ شہزادہ میں شہزادوں کے مانند غرور نہیں ہے۔

پھر ان اچھوتوں کا ایک نمایندہ آگے بڑھا۔ اور اپنی
عاجزانہ مختصر تقریر میں شہزادہ سے چھ کروڑ اچھوتوں کی محبت
اور تابعداری کا اظہار کیا۔ اور ولیعہد سلطنت سے یہ عرض کی کہ
ہماری سفارش اپنے والد ملک معظم سے یہ کرنا۔ کہ ہم کو ان لوگوں
کے ہاتھ میں کبھی بھی نہ چھوڑیں۔ کہ جو ہم کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور جو
ہم کو اپنا غلام بنا کر رکھیں گے۔

شہزادہ نے ان کی یہ سب باتیں بڑے غور سے شروع سے

آخر تک سنیں۔ پھر شہزادہ نے جو کچھ کام کیا معلوم نہیں کہ اس کام کی عظمت یا اہمیت کا خیال شہزادہ کو آیا یا نہیں۔ یا یہ کام شہزادہ نے اس عادت کے سبب سے کیا۔ جو موصوف میں طبعًا تمام دنیا کے ساتھ دوستانہ ملنساری کا مادہ ہونے کے سبب سے موجود ہے۔ شہزادہ نے ایسا کام کیا۔ جو کبھی سُنا نہیں گیا تھا۔ شہزادہ کھڑا ہو گیا۔ کتّوں سے زیادہ بدتر لوگوں کی خاطر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے مہربانی اور شفقت کے چند الفاظ کہے اور آہستہ آہستہ ان سب کو خوب غور سے دیکھا۔ اور خوب مسکرا کے شہزادہ نے ان اچھوتوں کو سلام کیا۔ مسکرانے سے شہزادہ صاحب کا رُخ چمک اُٹھا۔

ہندوستان میں جب سے سورج طلوع ہوا ہے۔ اس نے ایسا نظارہ کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب شہزادہ کی موٹر کار آہستہ آہستہ پھر روانہ ہوئی۔ تاکہ وہ لوگ کچلے نہ جائیں۔ تو یہ لوگ وفورِ محبت یا اپنی عزّت افزائی کے خیال سے بالکل دیوانہ ہو گئے اور پھر ان کی مشرقی زبان نے ان کے خیالات کا جامہ پہن لیا بھائی وہ بات سچ نکلی۔ کہ جو ہمارے بھائیوں نے ہم سے آکر کہی۔ دیکھو شہزادہ صاحب کے چہرہ پر واقعی روشنی۔ روشنی اور چمک دمک ہے۔

تیرھویں فصل

مجھکو عہدہ دو یا موت دو!

بعض ہندوستانی سیاست دان زور دیتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے عوام الناس میں جبری تدابیر سے تعلیم رائج کرنی چاہئے تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک طویل مدت سے انگلستان میں جبری تعلیم رائج ہے۔ انگلستان نے یہاں ہندوستان میں جبریہ تعلیم کیوں جاری نہیں کی۔ اس لئے صاف ظاہر ہے۔ کہ اس کا مطلب یہاں کے لوگوں کو جاہل ہی رکھنے سے نکلتا ہے۔

میں نے راجہ صاحب پاناگل کی زبان سے اس سوال کا جواب سنا۔ وہ اس وقت احاطہ مدراس کے برہمنوں کے خلاف تحریک کے لیڈر تھے۔

راجہ پاناگل نے کہا کہ ان کا یہ اعتراض بالکل واہیات ہے۔ برٹش لوگوں کے آنے سے پہلے پانچ ہزار سال کے عرصہ میں برہمنوں نے ہماری تعلیم کے لئے کیا کیا تھا؟ میں تم کو یاد دلاتا ہوں۔ انہوں نے تعلیم کو اپنا ہی حق بنا رکھا تھا۔ اور یہ قانون بنایا ہوا تھا۔ کہ پنچ ذات کا کوئی آدمی اگر کتابوں کا

کا مطالعہ کرنے کی جرات بھی کرے۔ تو گرم سیسہ پگھلا کر اس کے کانوں میں ڈال دیا جائے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر قسم کے علم کا علاقہ صرف ہم سے ہی ہے جب مسلمانوں نے حملہ کر کے ہم پر قبضہ کر لیا تو قدیم ہندوؤں سے تو ان کی حکومت ہی اچھی تھی۔ مگر صرف برطانیہ کی حکومت کے زمانہ میں تعلیم سب لوگوں کا حق بن گئی۔ سرکاری سکول۔ کالج۔ اور یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ جن میں ہر ذات پات اور قوم کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔

ڈوبوئس[1] صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ "برہمنوں نے خوب دیکھ لیا کہ تعلیم ان کو تمام دیگر ذاتوں پر بہت کچھ اخلاقی غلبہ دے دیگی۔ تو انہوں نے ہر ممکن احتیاط کر کے تمام ذاتوں کو حصول تعلیم سے روک دیا۔ تعلیم کو ایک قسم کا طلسم بنا ڈالا۔

برہمن لوگوں نے نہایت قدیم زمانہ میں خواہ کتنی ہی ذہنی ترقی حاصل کر لی تھی۔ مگر بعد کی صدیوں میں اس اعزاز پر بالکل قانع رہے۔ اپنی دنیا کے باقی لوگوں کو علم کی روشنی سے محروم رکھکر ہمارے دھندلے ہو جانے والے زمانۂ گذشتہ کی ہمیشہ پژمردہ ہو جانے والی عقل پر قناعت کر کے بیٹھ گئے۔ ایبے ڈوبوئس نے انیسویں صدی کے شروع میں اس بارہ میں پھر یہ لکھا[2] ہے کہ:-

"میں یقین نہیں کرتا کہ زمانہ موجودہ کے برہمن فیثاغورث اور لائی کرگس کے زمانہ کے اپنے اسلاف (برہمنوں) سے ذرہ

---

[1] و [2] ایبی ڈوبوئس کی کتاب ہندو منیرس کسٹمس اینڈ سیریمنیز صفحات (۲۷۶-۲۷۷)

برابر بھی زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ زمانہ کے اس طویل عرصہ کے دوران میں بہت سی وحشی اقوام جہالت کی تاریکی سے نکل آئیں اور تہذیب و تمدن کی چوٹی پر چڑھ گئیں۔ اور انہوں نے اپنی ذہنی تحقیقات کو وسعت دی .... مگر اس تمام زمانہ میں ہندو قطعیؔ ساکت اور ایک ہی جگہ قائم رہے۔ ہم ہندوؤں میں ذہنی یا اخلاقی ترقی کا کوئی آثار نہیں پاتے۔ علم (آرٹ) اور سائنس (فنون) میں کوئی ترقی کا نشان نہیں دیکھتے حقیقت میں ہر ایک غیر جانبدار شاہد کو یہ بات تسلیم کرنی پڑیگی۔ کہ ہندو اب ان لوگوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ کہ جنہوں نے متمدن اقوام کی فہرست میں ان سے بہت مدت بعد اپنا نام لکھوایا۔

برٹش تاج نے جس وقت حکومت ہندوستان کو اپنے زیر نگین لیا۔ تو مذکورہ بالا رائے اس وقت سے پچاس برس پیشتر لکھی گئی تھی۔ اس پچاس برس کے دوران میں ہندوستان میں ایک نئی تعلیمی تحریک پیدا ہوئی۔ وارن ہیسٹنگز اور اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا ارادہ برٹش پارلیمنٹ کی تحریص اور ترغیب سے ہندوستان کے علوم و فنون کو ترقی دینے کے لئے مکمل ہو گیا۔ تاکہ دیسی لوگ اپنے علم و فن میں کامل ہو جائیں۔ مگر ایک پرائیویٹ شہری ڈیوڈ ہیئر نے جو ایک انگلش تاجر تھا۔ اور جس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ پہیوں کو مخالف سمت میں گردش دینی شروع کی۔

ڈیوڈ ہیئر پادری نہیں تھا بلکہ ایک مادہ پرست شخص تھا۔

مگر تھا بڑے عزم و استقلال والا۔ اپنے خیالات کی دُھن میں اس نے اپنے آپ کو اور اپنے تمام مال و اسباب کو بنگال کے باشندوں کی تعلیم اور اخلاقی ترقی کے لئے وقف کردیا۔ اس کے برابر ہی مشہور ہندو راجہ رام موہن رائے نے کام کیا۔ اور یہ دیکھکر کہ میرے ہموطن ذہنی معاشرتی اور اخلاقی دنیا میں نہایت کم درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے تنہا اس کے دل میں اس کمی کو رفع کرنے کے لئے کام کا شوق پیدا ہوگیا۔ یہ دونوں شخص جن کا مقصد واحد تھا۔ آخرکار ایک بنیادی تعلیم کا ہندو کالج قائم کرنے کے لئے متحد ہوگئے۔ اس کالج کے قیام کے مقصد کا اعلان انہوں نے یہ کیا کہ اس میں شریف ہندوؤں کے لڑکوں کو انگلش اور ہندوستانی زبانوں اور یورپ اور ایشیا کے علم ادب اور سائنس کی تعلیم دی جایا کرے گی۔

مگر اس تجویز پر راسخ العقیدت ہندوؤں کو بہت غصہ آیا۔ اور اس کے اجراء کے مقصد پر ان کو شبہ ہونے لگا۔ یہ ۱۸۱۶ء کا ذکر ہے۔

اس سے ایک سال بعد تین بیپٹسٹ مشنریوں۔ کیری۔ مارشمین اور وارڈ نے کلکتہ کے قریب ایک سکول قائم کیا۔ جو اب تک موجود ہے۔ ۱۸۲۰ء میں انگلیکن چرچ نے ایک کالج کھولا ۱۸۳۰ء میں الیگزینڈر ڈف نے پھر راجہ رام موہن رائے مسلسل برٹش حکام کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کرتا رہتا تھا کہ اگر دیسی آبادی کی ترقی کی تجویز مرکوز خاطر ہے۔ تو تعلیم کے قدیمی طریقہ کو

منسوخ کر کے دیسیوں کو مغربی سائنس اور علوم وفنون سکھلاؤ
اور ان کی یہ تعلیم انگریزی زبان[1] میں ہونی چاہیے۔

برٹش حکام کا بنیادی یقین یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی تعلیم بالکل ہندوستانی طرز پر ہونی چاہیے۔ شروع شروع میں برٹش حکام کا یہی رویہ تھا۔ مذکورہ بالا اثرات انگریزی حکام کے اس رویّے سے ہنوز برسرِ جنگ ہی تھے۔ کہ میدانِ جنگ میں ایک نئی طاقت داخل ہوئی۔ یعنی ٹامس بنگٹن میکالے تعلیم عامہ کی کمیٹی کا صدر نشین مقرر ہوا۔ لارڈ میکالے نے اعلان کر دیا۔ اور نہایت پختہ عزم کے ساتھ کہہ دیا کہ مغربی سائنس کی پوری پوری روشنی دنیائے ہندوستان کو دینی لازم ہے۔ لارڈ ممدوح نے نہایت جوش کے ساتھ اس بات کے جاننے کا مطالبہ[2] کیا کہ کس حق سے جیسکہ:۔

.....'' ہم عمدہ فلاسفی اور سچی سچی تاریخ پڑھا سکتے ہیں۔ تو ہم سرکاری روپے سے ایسی ڈاکٹری تعلیم کیوں دیتے ہیں۔ کہ جس سے انگلش ساوتری کی بھی توہین ہو جائے۔ ہم کیوں ایسا علم ہیئت پڑھاتے ہیں۔ کہ جس پر انگلش بورڈنگ اسکول کی لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔ ہم ایسا علم تواریخ کیوں پڑھاتے ہیں؟ کہ جس میں تیس تیس فٹ قد کے بادشاہوں کی کثرت ہے۔ جو تیس

---

[1] ڈیوڈ ہیر کی سوانح عمری مصنفہ پیارے چند متر کلکتہ ۱۸۷۷ء راجہ رام موہن رائے کے خطوط بنام لارڈ ایمہرسٹ

[2] تعلیم پر لارڈ میکالے کی یادداشت مورخہ ۲ فروری ۱۸۳۵ء

تیس ہزار سال کی مدت تک حکومت کیا کرتے تھے۔ اور علم جغرافیہ ایسا کیوں پڑھاتے ہیں۔ کہ جس میں شیرہ اور مکھن کے سمندر بتلائے جاتے ہیں؟ ۔۔۔ ہم عربی اور سنسکرت کالجوں پر جتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ محض اشد مالی نقصان ہے۔ کہ جس سے سچ بالکل ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایسا بخشش کا روپیہ ہے۔ کہ جس سے غلط تعلیم کے علمبردار پیدا کئے جاتے ہیں "

اس نئے وکیل نے جس کا زمانۂ حال کے خیالات والے چند ہندوؤں سے کہ جنہوں نے اپنی قوم کی مخالفت اور علامت کو لبیک کہہ دیا تھا۔ بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ آخر کار سرکار کے تعلیمی رقم کے خرچ کو مشرقی نہروں سے نکال کر مغربی نہروں میں ڈال دیا۔ اب ہر ایک صوبہ میں تعلیم عامہ کے سررشتے قائم کئے گئے اور سکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے کے لئے پرائیویٹ کوششوں کو تحریک دینے کی عملی تدابیر اختیار کی گئی تھیں۔ سب کارروائی ایک قطعی اظہار کردہ مطلب کے لئے کی گئی۔ وہ مطلب یہی تھا۔ کہ اہل ہندوستان کے ہاتھوں میں صحت اور فراغبالی اور سوشل ترقی کی چابی دیدی جائے۔ اور ان کے ملک کے وسیع ذرائع پیداوار کو نشو ونما دینے کے لئے ان کو بیدار کر دیا جائے ۔۔۔۔ اور بتدریج مگر یقینی طور سے اہل ملک کو وہ تمام فوائد عطا کر دیئے جائیں۔ جو دولت اور تجارت کے عمدہ طور سے بڑھنے کے ساتھ شامل رہتے ہیں[1]۔

---

[1] سر چارلس ووڈ کا مراسلہ ۱۸۵۴ء

مگر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ گورنمنٹ نے مشرقی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اب لوگوں کی کم ہمت بالکل توڑ دی یا یہ کہ اس نے دیسی زبانوں کو تعلیم کے دائرہ سے بالکل خارج کر دیا۔ بلکہ اس کے برخلاف گورنمنٹ نے تمام سکولوں میں دیسی زبان کے مناسب طور سے سکھلانے پر اصرار کیا۔ اور اس دن کا انتظار کرنا شروع کیا جبکہ دیسی زبانوں کو اتنی ترقی حاصل ہو جائے۔ کہ زمانۂ جدید کی سائنس کو سمجھ لینے کی کافی استعداد اہل ہند میں پیدا ہو جائے۔ دریں اثنا گورنمنٹ نے عربی یا سنسکرت کی جگہ آیندہ سے انگریزی زبان میں تعلیم دینا زیادہ پسند کیا۔ اس لئے کہ سوائے چند نہایت فاضل اور لائق طلباء کے باقی سب کو ان تینوں زبانوں میں سے کوئی ایک بطور نئی زبان کے سیکھنی پڑیگی۔ اور یہ کہ ان علوم کی ضروری کتابیں تو عربی یا سنسکرت زبان میں موجود بھی نہیں تھیں۔

اب تعلیم کے مرکز بتدریج بہت بڑھنے شروع ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تیس برس کے عرصہ میں کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس لاہور۔ اور الہ آباد میں پانچ یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ ادبی نصاب کے علاوہ علمی اور غیر ادبی شاخوں کی تعلیم کی ترغیب بھی ان تمام لوگوں کو دی گئی۔ کہ جو ایسی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مگر آجکل کی طرح اس زمانہ میں بھی یہی مشکل پیش آئی۔ کہ

---

[1] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ جلد اول باب تیسرا اور جلد دوم باب اٹھارہواں اور نیز ۱۸۵۴ء کا تعلیمی مراسلہ۔

تجارت۔ سائنٹیفک۔ زراعت۔ جنگلات۔ انجینئرنگ۔ تعلیمی کی سرکاری ملازمت کے راستوں میں داخل ہونے کی طرف اہلِ ہند کی خواہش بہت کم تھی۔ ہندوستان کے لوگ اس بات سے بالکل واقف نہ تھے۔ کہ ہندوستان میں قومیت کی ہستی کا وجود بھی ہے ہندوستانیوں کے اخلاقی سامان میں تمام ملک کے خیال کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

یہ آخر الذکر معاملہ اگرچہ ہم مغربی لوگوں کے نقطۂ خیال سے نقصان دہ ہے۔ مگر اس کو غور کے ساتھ ایک امرِ واقعہ ہی تسلیم کر لینا چاہئے نہ کہ الزام سمجھنا چاہئے۔ یہ لوگ دیانتداری سے قسمت اور تناسخ کے معتقد ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ان کا خود پسندانہ میلان ہے موجودہ مطالب کے لئے زمانۂ حال کے ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی تواریخ نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ اور صرف آجکل کے زمانہ کے شمار و اعداد درج کئے جاتے ہیں۔

۲۴-۱۹۲۳ء میں برٹش انڈیا کی تیرہ یونیورسٹیوں سے گیارہ ہزار دو سو بائیس گریجوایٹ فارغ التحصیل ہو کر ملک میں منتشر ہوگئے ان میں سے ۷۸۲۲ نے آرٹس اور سائنس ۲۰۴۶ نے قانون ۴۴۶ نے ڈاکٹری ۱۴۰ نے انجنیئری۔ ۴۴۵ نے تعلیمی۔ ۳۶ نے تجارتی اور ۸۶ نے زراعتی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسی عرصہ میں ان یونیورسٹیوں میں کل (۴۵۸۵ ۳ ۶) انڈر گریجوایٹ زیرِ تعلیم تھے۔ جن کی تقسیم کا تناسب گریجوایٹوں کی تقسیم کے تناسب سے بہت غیر موافق نہ تھا۔ سب سے زیادہ طلباء

ہمیشہ آرٹس اور قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ایسے ضروری
مضامین جیسے زراعت۔ حفظانِ صحت۔ تندرستی اور صفائی کے
قاعدے جراحی۔ دایہ گری۔ معالجہ حیوانات اور تجارت کی تعلیم۔
خواہ کیسے ہی مربیانہ طور سے دی جائے۔ نہایت ہی کم طلبا
ان مضامین کو پڑھتے ہیں۔

مثلاً الہ آباد کے نزدیک امریکن پرس بیٹیرین مشن نے ایک
زراعتی سکول قائم کر رکھا ہے جس میں اگرچہ دو سو طلبا کے تعلیم
پانے کی گنجایش ہے۔ مگر ۱۹۲۶ء میں اس سکول میں صرف پچاس
آدمی رہتے تھے۔

زراعت کی تعلیم اس بات کی متقاضی ہے۔ کہ زمین کی
اقسام اور طرح طرح کی فصلوں سے جو بوئی جاتی ہیں اچھی طرح
سے طلبا واقف ہوں۔ مگر جب ان کو یہ باتیں سکھلائی جاتی
ہیں۔ تو ان پچاس طلبا کی اکثریت منہ موڑ کر بڑی نفرت
سے یہ کہتی ہے۔ کہ ہم قلی بننا نہیں چاہتے"۔

سکول کے ڈائرکٹر نے مجھ سے کہا کہ اگر ہم اپنے اس سکول
کے گریجوایٹوں کو سرکاری عہدے دلانے کی ضمانت کر سکیں۔
تو اتنی کثرت سے طلبا آ جائیں گے کہ ان کا ہجوم ہو جائیگا۔

کسی کسی جگہ ہندوستان میں چند ٹیکنیکل سکول بھی ہیں۔ اور
وہاں طلبا داخل ہونے کا تقاضا کرتے رہتے ہیں

مثلاً یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اوسط ہندوستانی طالبعلم
آرٹس کی ڈگری حصول تعلیم کے لئے بلکہ محض سرکاری عہدہ کے

حاصل کرنے کے وسیلہ کے طور پر لینا چاہتا ہے۔ اس کار آمد درجہ کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے اوپر ظلم کرکے اور بہت سخت محنت کرکے کچھ تو اپنی خواہش سے اور کچھ اپنے خاندان کی خواہش سے نہایت مشقت کرتا ہے۔ یہانتک کہ آخر کار اکثر اس کا چھوٹا سا جسم برباد ہو جاتا ہے۔ کہ جس کے ساتھ اس نے اور اس کے آباؤ اجداد نے پہلے ہی سے ایسی بدسلوکی کر رکھی ہوتی ہے۔

اس سے پہلے فصلوں میں اس بدسلوکی کی حقیقت کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔ منجملہ دیگر نتائج کے ایک یہ نتیجہ دیکھا جاتا ہے کہ اچانک اس کی ذہنی قابلیت گھٹنے اور مرجھانے لگتی ہے اور یونیورسٹی کے میعاد کے خاتمہ پر تھوڑے ہی عرصہ میں بڑے روشن اور ہونہار ہندوستانی طالبعلم میں اکثر یہی آثار نمایاں ہو جاتے ہیں[1]

اس اثناء میں جبکہ وہ تھکا ہوا اور ہانپتا ہوا اپنی ڈگری کی سند اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ اگر اس کا تمنا کردہ انعام اس کو نہ ملا۔ تو پھر تمام خاندان تلخ مایوس ہو جاتا ہے۔ اور ان کو ناانصافی اور نقصان کا بہت کچھ احساس ہونے لگتا ہے۔

پھر ایسا ہوتا ہے کہ اس نوجوان کو کسی اور کام کو اختیار کرنے کی مشکل پیش آتی ہے۔ اور یہی وقت مادر ہند کی روشنی کے

[1] مسٹر مہتا گرا جیار۔ ہندوستانی اسپرنٹنڈنٹ مردم شماری ملیور رپورٹ مردم شماری ہند۔ جلد اول صفحہ ۱۷۳ تحصیل علم خالصاً ذہنی ترقی کے لئے محض اصول پسندوں کی ایجاد ہے۔

راستہ کو بھی روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک زمین پر منفعت سے معقول سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اس نوجوان کے دماغ اور ہاتھوں کی خدمات کے لئے التجا کرتی ہے۔ مگر خاندانی روایات اور فخر اس نوجوان کو اس زمین کی آواز قبول کرنے سے باز رہنے کے لئے اندھا۔ بہرا اور ناقابل احساس بنا دیتی ہیں۔

سر گورداس بنرجی اس حالت کو نرم الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ کہ:-

"ذات پات کے طریقے نے ... اونچی ذاتوں میں زراعت صنعت و حرفت بلکہ پیشہ تجارتی کی طرف سے بھی تعصب پیدا کر دیا ہے۔

آجکل کے زمانہ میں یونیورسٹی کا گریجوایٹ ممکن ہے کہ اونچی ذات کا آدمی نہ ہو۔ اگر گریجوایٹ اونچی ذات کا آدمی نہیں ہے۔ تو اونچی ذات کے رواج کو اختیار کرنے کے لئے اور بھی زیادہ خواہشمند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تعلیم کا سب سے زیادہ عزیز انعام اس کا اقرار عزت افزائی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ لوگ خواہ کسی نسل کی پیدائش ہوں جب سرکاری عہدہ ملنے سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اپنی علمی یا ذہنی قوتوں کو اور دوسری اطراف میں منہ موڑ دینے سے بالکل انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی اعلیٰ درجہ کی واقفیت اور تربیت ان کے بہت سے تعلیم یافتہ بھائیوں کے واسطے ان کو بے حد فائدہ مند بنا سکتی ہے جس ملازمت کو یہ تعلیم یافتہ لوگ اپنی جدید حاصل کردہ وقار سے کم درجہ کی سمجھتے ہیں۔ اس کے

قبول کرنے کی لعنت وہ ہمیشہ کے لئے بیکار اور بے شرم ہوکر اپنے کنبہ کی آمدنی پر گذارہ کرنا پسند کرتے ہیں۔

دوسروں کی آمدنی پر گذارہ کرنے والے ایک ایسے ہی نوجوان نے کہا کہ میں بی اے پاس ہوں۔ دو برس ہوتے جب میں بی اے ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک مجھے کوئی موزون عہدہ نہیں مل سکا۔ اس لئے میرا بھائی میری پرورش کا کفیل ہے چونکہ وہ بی اے نہیں ہے۔ اس لئے وہ صرف اتنی تنخواہ پر کام کر رہا ہے۔ کہ جس سے تنگی تنخواہ میری پوزیشن قبول کرنے کے لئے مجھے مجبور کرتی ہے۔

مفر کو اس بات میں ذرہ بھی شبہ نہیں تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو کیسے ناگوار روشنی میں پیش کر رہا تھا کسی ڈگری کے حاصل کرنے کے ارادہ کو بھی یہ لوگ اپنی عزت افزائی کا باعث خیال کرتے ہیں۔ ایک آدمی اپنے نام کے بعد بی اے فیل لکھ سکتا ہے اور لکھدیتا ہے۔ اور اس پر پبلک اس کی ہنسی مذاق نہیں اڑاتی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری توجہ میں لایا گیا۔ یونیورسٹی کے ایک نوجوان بی اے کا تھا جب اس کو گورنمنٹ کی ملازمت ملنے سے مایوسی ہوگئی۔ تو اس نے امریکہ کے ایک کاروباری آدمی کو اپنی مدد کے لئے عرضی دی۔

اس امریکن نے امریکن صفائی کے ساتھ جواب دیا کہ "تم لوگ کیوں ہمیشہ اسی جگہ جانے کے لئے اصرار کرتے ہو۔ کہ جہاں لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس طرح اپنی تذلیل اور توہین کرتے

ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم سب کے سب گورنمنٹ کے کلرک بن جاؤ؟ کیا وجہ ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کبھی اپنے گاؤں میں جاکر سکول میں تعلیم دینے یا کاشت کرنے یا حفظان صحت اور صفائی کا کام کرنے نہیں جاتا۔ اور جو کچھ کہ تم نے تعلیم سے حاصل کر لیا ہے اس سے اپنے وطن کے بیچارے غریب لوگوں کی مدد کرکے ان کو نہیں اٹھاتا؟ کیا تم اپنے وطن میں اچھی طرح کام کرکے اپنی معاش حاصل نہیں کر سکتے؟

اس ہندوستانی نے متانت سے جواب دیا۔ بلاشک۔ مگر آپ بھول گئے۔ یہ باتیں اب میرے وقار سے گری ہوئی ہیں۔ میں بی اے ہوں۔ اس لئے اگر آپ میری مدد نہیں کریں گے۔ تو میں خودکشی کر لوں گا۔

چنانچہ اس نے خودکشی کر لی۔

نوّے سال کا عرصہ گذرا۔ لارڈ میکالے نے ان ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں کی حالت میں کہ جو گورنمنٹ کے خرچ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ یہی مشاہدہ کر لیا تھا۔ سنسکرت کالج کے سابق طلباء کی ایک جماعت نے لارڈ مذکور کی کمیٹی کے حضور میں ایک عرضی پیش کی۔ لارڈ میکالے کہتا ہے[1] کہ:۔

عرضی دینے والوں نے بیان کیا کہ ہم نے کالج میں دس یا بارہ سال تک تعلیم حاصل کی۔ ہم نے اپنے آپ کو ہندو علم ادب اور سائنس سے واقف کر لیا۔ ہم نے لیاقت کے سارٹیفکیٹ حاصل

---

[1] ۲ فروری ۱۸۳۵ء کی یادداشت تعلیم پر از لارڈ میکالے۔

کرلئے۔ مگر ان سب باتوں کا پھل کیا ملا؟ .... ہم کو اپنی حالت کے بہتر بنانے کے لئے نہایت ہی کم موقعہ حاصل ہے .... ہمارے اہل وطن عام طور سے ہم کو بڑی بے پروائی سے دیکھتے ہیں۔ ان کی اس بے پروائی سے ہم کو ان سے کسی قسم کی مدد ملنے یا ہمت بندھانے کی امید نہیں ہے۔ اس لئے ہماری یہ التماس ہے کہ ان اسامیوں کے لئے جو گورنمنٹ کے ماتحت ہیں۔ ہماری سفارش کردی جائے .... ہم اعلےٰ مناصب یا بیش قرار تنخواہیں نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ جس سے ہماری گذر اوقات ہو سکے ہم معقول معاش کا ذریعہ چاہتے ہیں۔ کہ جس میں ہماری تبدیج ترقی ہوتی رہے۔ مگر یہ عہدے گورنمنٹ کی امداد کے بغیر ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ کہ جس نے ہم کو تعلیم دلائی ہے۔ اور جو بچپن سے ہماری پرورش کرتی رہی ہے۔ اس عرضی کے آخر میں انہوں نے نہایت رحم آور طریقہ پر لکھا تھا۔ کہ ہم کو یقین ہے کہ گورنمنٹ کی یہ نیت ہرگز کبھی نہ تھی۔ کہ ہماری تعلیم کے دوران میں ہمارے ساتھ ایسی فیاضی کے ساتھ سلوک کرنے کے بعد وہ ہم کو افلاس اور غفلت میں چھوڑ کر ہماری خبر نہ لے گی؟"

یہ عرضی اس گورنمنٹ کے خلاف کہ جس نے آزادانہ تعلیم دے کر ان لوگوں کو نقصان پہنچایا۔ اس نقصان کی تلافی کا مطالبہ ہے۔ لارڈ میکالے نے یوں رائے زنی کی ہے:۔

مجھے کچھ شک نہیں۔ یہ لوگ سچے ہیں .... (کیونکہ یقیناً ان لوگوں کو بیکار اور مصیبت زدہ بنانے کے خرچ کو ہم فائدہ کے

ساتھ بچا سکتے تھے۔ یقیناً آدمیوں کو ایسا بنا دینے پر کہ وہ سیداکش پر بار ہو جائیں۔۔۔۔ خزانہ سلطنت سے کچھ کم خرچ ہونا چاہئے۔

ایک صدی گذری اس وقت کے سنسکرت کے فاضل۔ اور آجکل کے بی اے خواہ وہ بی اے پاس ہوں یا فیل۔ ان سب پر وہی ایک اصول صادق آتا ہے۔ اگرچہ نرم الفاظ میں شکایت کرنے کی جگہ اب لوگ تلخ الفاظ میں شکایت کرنے لگے ہیں۔

تمام ہندوستان میں سیاست دان اور تعلیم یافتہ لوگ گورنمنٹ پر سختی سے حملہ کرتے رہتے ہیں۔ کہ ہر سال یونیورسٹی سے جتنے گریجوایٹ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ ان کے لئے ملازمتیں مہیا کرتے ہیں کیوں قائم رہتی ہے ہندوستانی شرفاء میں جو اعلےٰ درجہ کے پولٹیکل لیڈر ہیں۔ ان کو بھی ظاہرا یہی یقین ہے۔ اور وہ اس مقام سے گورنمنٹ پر الزامات لگایا کرتے ہیں۔

ان کا بار بار یہی قول ہے۔ کہ گورنمنٹ نے یونیورسٹیوں کے قائم رکھنے کا خرچ برداشت کر رکھا ہے۔ اور ان کے وجود میں لانے کی ذمہ دار ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ کہ تعلیم دلانے کے لئے ہماری فیس تو قبول کر لی جاتی ہے۔ اور تنہا جس چیز کے لئے ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہ ہم کو نہیں دی جاتی؟ گورنمنٹ پر لعنت ہو۔ آؤ گورنمنٹ کو ملک سے باہر

بھگا دو۔ اور اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے واسطے جگہیں بنا لو۔

یہاں کہیں بھی رائے عامہ کا وہ بچانے والا ہنسی مذاق نہیں پایا جاتا۔ کہ جس کی ہومر کی سی ہنسی اس امریکن لڑکے کا خیر مقدم کرے گی۔ کہ جو ییٹیل یا ہارورڈ یا لی لینیڈ سٹینفورڈ کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلے۔ اور اپنی چمکتی ہوئی پوستین کو ہنڈی کے طور پر خزانہ سلطنت کو پیش کرے۔ اور اگر اس کی اس ہنڈی کا فوراً از رلفقد نہ دیدیا جائے۔ تو وہ گورنمنٹ کے برخلاف ایجی ٹیشن پھیلانے کے کام کے سوائے اور سب قسم کے کاموں کے کرنے سے رنجیدہ ہوکر انکار کر دے۔
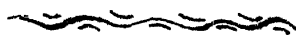
چودھواں باب

ہم دونوں کی نیت نیک تھی

۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان ابتدائی مدارج کی لازمی تعلیم کے قوانین ہندوستان کے سات بڑے بڑے صوبوں میں نافذ کیے گئے یہ زیادہ تر ہندوستانی سیاست دانوں کی رائے کا اثر تھا کہ جن کے خیال میں کم سے کم اصولی طور پر آیندہ جمہوری سلطنت کے لئے تعلیم یافتہ لوگوں کے حلقہ ہائے انتخاب کے بن جانے کی امید تھی۔

یہ قوانین گو بعض حلقوں میں جاری تو ہو گئے۔ مگر چونکہ ان کا عام نفاذ اختیاری تھا۔ لہٰذا ان پر پورا پورا عملدرآمد نہ ہوا[1]۔ اس کی کچھ وجہ تو

---

[1] مثلاً بنگال کی مجلس قانون ساز نے مئی ۱۹۱۹ء میں ابتدائی لازمی تعلیم کے اصول رائج کرنے کا قانون نافذ کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صوبہ بھر کے ایک بھی مقامی حکام نے اس سے مستفید ہونے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ملاحظہ ہو۔ اخبار لندن ٹائمز کا ضمیمہ تعلیم زیر عنوان "بنگال میں ابتدائی تعلیم" مورخہ ۳ نومبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۴۸۴۔

ایک سرکاری رپورٹ سے جو مسٹر گووندبھائی ایچ ڈیسائی نائب دیوان ریاست بڑودہ نے والیٔ ریاست کے حکم سے لکھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ریاست میں لازمی تعلیم بیس سال سے رائج تھی مگر وہاں کے لکھے پڑھوں کا تناسب گرد و نواح کے ان سرکاری اضلاع سے بہت کم تھا جن میں تعلیم تو بڑودہ سے پہلے مروج ہوئی تھی۔ مگر وہاں لازمی تعلیم کا نام و نشان تک نہ تھا۔

ہوئی کہ یہ قوانین اجرائے اصلاحات کے زمانہ میں وضع اور منظور ہوئے تھے کہ ڈائی آرکی (دوعملی) کا دور دورہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی حکومت میں انڈیا نائزیشن (ہندوستانی عنصر بڑھانے) کا شور مچ گیا۔ تعلیم بجائے گورنمنٹ کا ایک شعبہ ہونے کے "منتقلہ مضمون" ہو کر ان ہندوستانی صوبجاتی وزرا کے ہاتھ میں چلی گئی جو منتخب کونسل ہائے واضع آئین و قوانین کے ذمہ وار تھے ...... تعلیم کی ذمہ داری اور اس کے ساتھ ہی غیر ہر دلعزیز قوانین کے اجرا سے جو غیر ہر دلعزیزی عاید ہو سکتی ہے۔ اب اس کا پہلو بدل گیا۔ ہندوستانی وزرا اور ہندوستانی میونسپل بورڈوں نے اس بوجھ کو اٹھانے سے پہلو تہی کرنی شروع کر دی جس کے نہ اٹھانے کی وجہ سے وہ اپنے متقدمین (عہدہ داران سرکاری) پر الزام لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی منتخب شدہ افسر نے کہیں بھی یہ جرات نہ کی کہ وہ بجٹ کا روپیہ پورا کرنے کی ذمہ داری لے۔ یا عذر و حیلہ کرنے والے عوام کے لڑکوں کو ان کی مرضی کے خلاف سکولوں میں کان پکڑ کر لائے

مزید براں لازمی تعلیم درحقیقت مفت تعلیم کی مترادف ہے لہذا سکول قائم کرنے اور تمام ملک کے بچوں کی بغیر کچھ معاوضہ لئے نگہداشت کرنے اور استادوں کی مناسب تعداد ملازم رکھنے کے لئے بیحد روپیہ کی ضرورت ہے۔ جو لوگوں سے بذریعہ ٹیکس وصول کرنے کے سوائے جمع نہیں ہو سکتا۔

ایک صوبہ یعنی پنجاب کی قانونی کونسل کے ہندو عنصر نے اس مصیبت کا ایک حل یہ سوچا کہ لازمی تعلیم کے قانون پر ایک

ایسی ضابطہ کا اضافہ کر دیا کہ "اچھوت جاتی" کے بچوں کو جن کو دوسرے الفاظ میں پنچ جاتی کہتے ہیں سکولوں کی جماعت سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہ خیال گو ان چیدہ لوگوں کے لئے خوشگوار تھا۔ مگر برطانوی حکام کے ہاتھ باندھ دیئے۔ اور مہاراجگان نے بھی انہیں پسند نہ کیا۔ کیونکہ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ عوام کی تعلیم سے کسی خاص جاتی کو مستثنیٰ کیا جائے۔

گورنمنٹ نے اس معاملہ میں آواز اٹھائی۔ مگر ہندوستانیوں کا ایک کارگر حربہ جو وہ ہمیشہ استعمال کرنے کے عادی ہیں اور جو ابھی زنگ آلود نہ ہوا تھا۔ چنانچہ پنجاب کے دو شہروں نے جس طرح اس حربے کا استعمال کیا۔ وہ مندرجہ ذیل الفاظ سے ظاہر ہو گا

"لازمی تعلیم پانے والے عمر کے بچوں کے سکول میں داخلہ کی تعداد لازمی تعلیم کے رائج کرنے سے ملتان میں ۲۷ سے تجاوز کر کے ۴۵ اور لاہور میں ۵۰ سے تجاوز کر کے ۶۲ ہو گئی۔ مگر چونکہ ان دونوں شہروں میں سے کسی میں اچھوت جاتی کے بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ انتظام نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی کسی ایسے والدین کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی ہے جنہوں نے اپنے بچوں کو سکول میں نہیں بھیجا۔ لہذا یہ امید نہیں رہی کہ آئندہ قریب زمانہ میں طلباء کی فیصدی میں کوئی نمایاں اضافہ ہو سکے"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس ایک طریق کے

---

[1] دیکھو حوالہ سابقہ صفحہ (۱۴۳) [2] ملاحظہ ہو "ہندوستان کی تعلیمی ترقی" کے آٹھویں پنجسالہ ریویو کی پہلی جلد کا صفحہ ۱۰۸

سوائے اور طریقے بھی ہیں۔ کہ جن سے مطلب برآری ہو سکتی ہے۔

سب سے آخری رپورٹ کے مطابق تمام برطانوی ہندوستان میں لڑکوں اور لڑکیوں کے ابتدائی سکولوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ اٹھسٹھ ہزار تیرہ (۱۶۸۰۱۳)[1] اور ان کے طلبا کی تعداد تخمیناً ستر لاکھ ہے۔[2] مگر برطانوی ہندوستان میں قریباً ساڑھے چھتیس ملین بچے پرائمری سکولوں میں داخلہ کی عمر کے ہیں[3] جن میں سے ۹ فیصدی یعنی اوسطاً ہر سکول میں ۴۰ بچے حاضری دیتے ہیں۔ ان بچوں کو تعلیم دینے میں وہی تمام مشکلات پیش آرہی ہیں جو ان ملکوں میں پیش آتی ہیں۔ جہاں تعلیم دینی مشکل ہے ان مشکلات کے علاوہ اور مشکلات بھی ہیں۔ جو صرف ہندوستان ہی میں پیش آرہی ہیں۔ اور یہ صرف بچوں کے سکول سے غیر حاضری کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔[4]

ہم امریکہ کے باشندے اپنی ان کوششوں پر پھولے نہیں سماتے جو ہم نے اہل فلپائن کو تعلیم دینے میں صرف کی ہیں۔ مگر ہندوستان میں انہی کوششوں پر عموماً فکر اور تردد کا اظہار کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں فلپائن کی تعلیمی کوششوں کا ہندوستان کی تعلیمی کوششوں کا سے مقابلہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

---

[1] ملاحظہ ہو برطانوی ہندوستان کے شمار و اعداد کا خلاصہ بابت ۱۹۱۴-۱۵ لغایت ۱۹۲۳-۲۴ کا صفحہ ۲۶۳

[2] ایضاً " " " " " ۲۴

[3] ملاحظہ ہو ہندوستان کی تعلیمی ترقی بابت ۱۹۱۷-۲۲ جلد دوئم صفحہ ۱۱۹

[4] ملاحظہ ہو ہندوستان میں دیہاتی تعلیم صفحہ ۱۶۷ - ۱۷۷ -

ہمیں یاد ہے کہ فلپائن میں ہماری تعلیمی کوششوں میں سخت رکاوٹ پیش آئی تھی کہ جزائر فلپائن کے باشندے ۸۷ مختلف[1] زبانیں بولتے ہیں۔ اور کوئی ایک مشترکہ زبان نہیں ہے اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں ۲۲۲ زبانیں بولی جاتی ہیں[2] اور کوئی مشترکہ[3] زبان نہیں۔

علاوہ ازیں جزائر فلپائن میں کوئی خاص ابجد رائج نہیں۔ وہاں کے باشندے ہماری زبان میں ابجد استعمال کرتے ہیں مگر ہندوستان میں پچاس مختلف رسم الخط استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں سے بعض میں دو سو سے پانسو تک حروف مستعمل ہیں اور اس قدر مشکل اور حیران کن ہیں کہ مختلف زبانوں کے درمیان فرق کرنا دشوار ہے۔

جزائر فلپائن اور ہندوستان دونوں میں یکساں کوئی ایسا رائج الوقت لٹریچر (علم ادب) نہیں جس سے عوام کو دلچسپی ہو اور ان دونوں ممالک میں کئی ایسی زبانیں (پراکرتیں) بولی جاتی ہیں جن میں کوئی لٹریچر نہیں۔ اسلئے ان دونوں ممالک میں چونکہ سکول

---

[1] ملاحظہ ہو جزائر فلپائن کی آبادی در ۱۹۲۶ء مصنف ایچ رد ملی بیئر۔ منیلا۔

[2] ملاحظہ ہو مردم شماری ہند ۱۹۲۱ء جلد اول حصہ اول صفحہ ۱۹۳

[3] یہ بہت بڑا مغالطہ ہے بیشک ہندوستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر بڑی زبانیں کہ جنہیں تعلیم دی جا رہی ہے ایک درجن سے زیادہ نہیں اور بعض اردو کی طرح اتنی بڑی ہیں کہ دس کروڑ آدمی اسے بولتے یا سمجھتے ہیں (مترجم) [4] آجکل ہندوستان کی کئی زبانوں اور خطوں مثل اردو بنگالی۔ گجراتی ہندی گورمکھی پنجابی وغیرہ میں بتدریج بڑی کافی مقدار میں ادب اور بعض [illegible] (مترجم)

میں سیکھا ہوا علم گھر میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس سے لکھنے پڑھنے
کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ اور محنت اور روپے کا بھی ناحق
اصراف ہوتا ہے۔

فلپائن میں کوئی معاشرتی رکاوٹ موجود نہیں۔ سوائے امیر
وغریب یا فاتح ومفتوح ہونے کے ایک دوسرے میں
کوئی تخصیص موجود نہیں اس کے مقابلہ میں ہندوستان
میں چوتھائی ہندو آبادی میں کم وبیش ہزار ذاتوں کے
لوگ آباد ہیں جو مخالف گروہوں میں تقسیم ہوئے ہوئے
ہیں۔

جزائر فلپائن میں وہاں کے دیہی استادوں اور خصوصا
انگریزی تعلیم دینے والوں کی لیاقت کی نسبت کچھ بھی
کہا جائے۔ دونوں استاد اور استانیاں نیک نیتی سے
کام کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ٹریننگ سکولوں سے
نکلتے ہی دور دراز اور چھوٹے چھوٹے مواضعات میں تعلیم
دینے چلے جاتے ہیں اور وہیں کم سے کم دو یا تین سال
انہیں عہدوں پر کام کرتے رہتے ہیں اس کے مقابلہ
میں ہندوستان میں کوئی تعلیم یافتہ مواضعات میں نوکری
کرنا پسند نہیں کرتا۔ لہذا یہاں کے دیہاتی سکولوں میں
ہمیشہ استادوں کا کال رہتا ہے۔

جزائر فلپائن کے دیسیوں کو ہر وقت تعلیم حاصل
کرنے کی زبردست خواہش رہتی ہے اور وہ اسکے

حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور
وہاں کے متمول باشندے اکثر اپنی کمائی میں سے
معقول رقم صرف اسلئے دیتے ہیں کہ انکی جائے رہائش
کے قریب سکول جاری کئے جائیں۔ برخلاف اس کے
ہندوستان میں عوام کا رجحان لڑکوں کی تعلیم کی طرف
بہت کم اور لڑکیوں کی طرف بالکل نہیں اور خاص و عام
کی مرضی یہی ہوتی ہے کہ تعلیم پر کچھ خرچ نہ ہو۔
ہندوستان میں برطانوی حکومت نے اپنی تعلیمی
پالیسی میں بلاشبہ سخت غلطیاں کھائی ہیں جنکی نوعیت
کو سمجھنے کے لئے جزائر فلپائین کی تعلیم کے متعلق منرو
سروے بورڈ کی رپورٹ[1] کے ملاحظہ سے بہت سے معلومات
حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ پالیسی جسکو ہندوستان میں برطانیہ
کی غلطیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے وہی اور ویسی ہی پالیسی
ہے جو ہم نے اہل فلپائین کو تعلیم دینے کی کوششوں میں اختیار
کی تھی کسی کے نقائص پر نکتہ چینی کر لینا تو آسان کام ہے مگر
یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ انکے نتائج فائدے کے لحاظ سے
ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔
۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے ہندوستان کی عنان
حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یہ شاہی

---

[1] فلپائین کے تعلیمی نظام کی پیمایش مطبوعہ منیلا بیورو آف
پرنٹنگ ۱۹۲۵ء

اعلان[1] کیا تھا کہ

ہماری رعایا کے ہر فرد کو خواہ وہ کسی قوم یا مذہب کا ہو ہماری ملازمت میں بلا رد و رعایت وہ عہدہ دیا جائیگا جس کے کام کرنے کا وہ اپنی تعلیمی قابلیت اور لیاقت کی وجہ سے اہل ہوگا۔

اسی طرح پریذیڈنٹ میکنلے نے اپنی ہدایات میں جو اُس نے پہلی فلپائین کمیشن[2] کے پریذیڈنٹ آنریبل ولیم ایچ ٹافٹ کے نام روانہ کی تھیں لکھا تھا کہ :۔

"ان جزائر کے باشندوں کو ان مقامی معاملات کے انتظام کرنے کا پورا موقعہ دیا جائیگا جنکے انتظام کرنے کے وہ اہل ہونگے اور جن باشندوں میں اپنے ملک میں قانون امن و امان اور گورنمنٹ کی خیر خواہی قائم رکھنے کی پوری قابلیت ہو گی انکو انکی لیاقت کا امتحان کرنے کے بعد ملک میں حکومت کرنے کا موقعہ دیا جائیگا"

دونوں ممالک کے عام لوگوں پر ان اعلانوں کا یکساں اثر ہوا ان میں جو تھوڑی بہت لیاقت موجود تھی اُس نے اُنکے دلوں میں عہدے حاصل کرنے کی زبردست خواہش پیدا کر دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس قسم کی تعلیم کے حصول کی طرف مائل ہو گئے جو صرف ملازمت حاصل کرنے کے قابل

---

[1] لارڈ ہارڈنگ کے ۱۸۳۳ء کے ریزولیوشن میں اس کا ذکر کر دیا گیا تھا۔ [2] واشنگٹن کے سکرٹری صیغہ جنگ کی چھٹی مورخہ ۷۔ اپریل ۱۹۰۰ء

بنا سکتی ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں برطانیہ نے اسکی ابتدا ایک نظریہ سے کی۔ یعنے یہ کہ اس نے طرز تعلیم کو ہندوستانی اسلوب اور طریق پر قائم کیا۔ لیکن اہل ہند کے دباؤ ڈالنے پر اُس نے فوراً اپنی پہلی پالیسی بدل[۱] لی۔ اس لئے کہ اس نے اہل ہند کے خود ستایانہ ذہنیت کو نظر انداز کرتے ہوئے یقین کر لیا کہ ان لوگوں کو جو پہلے ہی مہذب ہیں۔ تعلیم دینے اور منازل ترقی پر گامزن کراتے ہوئے برطانیہ ایسے "تانتا" کی بنا رکھے گی کہ جس کے ذریعہ سے ہمدردانہ دیسی راستوں سے تعلیم موزون صورت اختیار کرے گی۔ اور سرعت کے ساتھ عوام الناس کو سیراب کردیگی۔

دوسری طرف امریکہ نے فلپائین کے نوجوانوں کو فی الفور ان فرائض کی ادائگی میں تعلیم دینی شروع کردی۔ جو پریذیڈنٹ میکنلے نے انکے ذمہ لگائے تھے ساتھ ہی ہم نے اپنے نوجوان ایشیائیوں کے خالی دماغوں میں اپنی تواریخ اور علم ادب ٹھونسنے شروع کردیئے۔ اور ہمدردی بنی نوع انسان کے اس برگزیدہ جذبہ میں سرشار ہوکر اس دماغی اضطراب کو بالکل بھول گئے جو ایسی ہمدردی کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔

اس ہزار سالہ مشقت طلب ارتقائے قومیت سے جس نے پیٹرک ہنری کو وٹینگ موٹ سے ملا دیا تھا بجبر

---

[۱] ملاحظہ ہو (ہارٹ آف آریہ ورت) مصنفہ ارل رانلڈشے مطبوعہ لنڈن ۱۹۲۵ء کے ابواب ۲ و ۳۔

پڑے ہوئے اور نئے محاورات کے نشہ میں سرشار ہوکر کہ جنکی شوکت اور لمعات ریزی اور جن کے بار بار دہرانے سے وہ لذت اندوز ہوتے تھے (لیکن جن محاورات کی اصل معانی تک اُنکی رسائی نہ تھی) امریکہ کے نوآموزوں نے ایک ہی جست میں صدیوں کی مسافت طے کرلی اور پیٹرک ہنری سے فاتحانہ انداز میں "آزادی یا موت" کے طلب گار ہوگئے۔

پریذیڈنٹ ولسن[۱] نے ایسے حالات کے رونما ہونے پر ناقدانہ حیثیت سے کہا۔ حکومت خود اختیاری ایک چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو دیدیجائے۔ کسی قوم کو بلوغت کا خیال نفس نہیں دیا جا سکتا؛" لیکن یہ تخیل ان دماغوں میں تموج پیدا نہ کرسکا جن میں قومی تجربہ کی پائین گاہ نہ تھی۔ کیونکہ الفاظ اقوام کی تمدنی اور معاشرتی تاریخ کی بنیاد پر بھی وضع ہوتے ہیں۔

باشندگان فلپائین جنکی کوئی تاریخ نہیں۔ اور ہندو جن کا ارتقائی تاریخی زمانہ جیساکہ ہم آگے چلکر بیان کرینگے۔ اُس سے ایسی ہی کوئی مناسبت نہیں رکھتا جیساکہ دور پیریکلز جدید نیویارک کے ایک یونانی کے لئے تو ان دونوں میں حکومت کے نقطۂ نگاہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جذبہ جمہوریت سے سرشار

---

[۱] کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ اضلاع متحدہ امریکہ میں۔ وڈرو ولسن نیویارک ۱۹۰۸ء (صفحہ ۳ - ۵۲)

ہونے کے متعلق کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں ہے۔

جزائر فلپائین اور ہندوستان میں سکولوں اور یونیورسٹیوں نے ایشائی دلوں میں مغربی سیاست مدن کے محاورات ٹھونس دیئے ہیں۔ ایشیائیوں نے ان محاورات کو پردیسی وراثت سمجھکر اپنے ذہنوں میں جگہ تو دیدی مگر انکے عجیب و غریب معنے اپنی ذہنی قابلیت کے مطابق گھڑ لئے جسکا نتیجہ دونوں ممالک میں یکساں نکلا۔ چنانچہ ہندوستانیوں کی نسبت مسٹر گاندھی[ا] نے فرمایا ہے کہ "جو تعلیم ہم نے حاصل کی ہے۔ اس نے ہمیں کلارک اور پلیٹ فارم پر تقریر کرنیوالوں کے سوائے اور کچھ نہیں بنایا"

مزید براں اسکے متعلق مسٹر گاندھی کے خیالات[۲] حسب ذیل ہیں۔

"تعلیم کے معمولی معنے الفاظ کی علمیت حاصل کرنا ہے۔ لڑکوں کو پڑھنا سکھنا اور حساب سکھلانا ابتدائی تعلیم کہلاتی ہے۔ اب ایک دہقان کو لیجئے جو اپنی روزی دیانتداری سے کماتا ہے اس کو دنیا کے معمولی معلومات بھی کافی ہیں۔ اُسکو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اپنے والدین اپنی بیوی اپنے بچوں اور اپنے ہمسایہ گاؤں والوں سے کیا کیا اور کس طرح سلوک کرنا ہے۔ وہ نیکی کرنے کے قواعد کو بھی اچھی طرح سے سمجھتا اور انپر

ا: مسٹر گاندھی کا بیان جو انہوں نے اس کتاب کی مصنف کے سامنے بمقام احمدآباد ۱۷ مارچ ۱۹۲۶ء کو کہا ۲: ملاحظہ ہو انڈین ہوم رول مصنفہ مسٹر ایم۔ کے گاندھی مطبوعہ گنیش اینڈ کمپنی مدراس ۱۹۲۴ء کے صفحات (۹۸۔ ۱۰۰۔ اور ۱۱۳)

عمل کرتا ہے۔ مگر وہ ان سب باتوں کے باوجود اپنا نام نہیں لکھ سکتا۔ تو آپ اسے زبان دانی سکھا کر کیا توقع کرتے ہیں کہ کیا آپ اس تعلیم سے اسکی حقیقی خوشی میں ایک ذرہ بھر بھی اضافہ کر سکتے ہیں؟ تو اس کا ماحاصل کیا ہوا۔ یہی کہ اس تعلیم کو لازمی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدرسوں کے متعلق ہمارا قدیمی دستور العمل کافی ہے۔ اور ہم تمہارے جدید سکولوں کو بیکار سمجھتے ہیں۔"

ایسے خیالات کے متعلق سوراجیہ لیڈر لالہ لاجپت رائے صاحب اپنے دل کے پھپھولے یوں پھوڑتے ہیں[1]۔

"ہندوستان میں بعض نیک پُرش ایسے ہیں جو کبھی کبھی اپنے ملک کی نسبت یہ رائے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ کہ یہاں کے لوگوں کی خواہش تنہائی۔ گوشہ نشینی اور متوکل زندگی بسر کرنے کی ہے انکے دماغ میں گذشتہ زمانے کا سودا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ زمانہ واپس ہو جائے۔ وہ ایسی کتابیں فروخت کرتے ہیں جن میں اس قسم کا کوڑا کرکٹ بھرا پڑا ہے۔ وہ نظمیں اور گیت لکھتے ہیں جن میں اس قسم خرافات بھری ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ لوگ بیوقوف ہیں یا غدار ہیں۔ میں اپنے ہموطنوں کو نیک دلی اور صاف نیتی سے متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ایسے لوگوں اور انکی اس ادبی

---

[1] ملاحظہ ہو پرابلم آف نیشنل ایجوکیشن ان انڈیا مطبوعہ جارج ایلن اینڈ انون لنڈن ۱۹۲۰ء صفحات (۷۹ - ۸۰)

قابلیتوں سے بچتے رہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ملک کو کیا بلحاظ خیالات کے اور کیا بلحاظ زندگی کے دوسرے اصلاح یافتہ ممالک کے ہم پلہ اور ہم پایہ کرنے کی کوشش کریں۔"

مگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون شخص ہے جو برطانوی ہندوستان کی آبادی کے ۹۲ فیصدی افراد کو (یعنے بائیس کروڑ بیس لاکھ دیہاتیوں کو) صرف تعلیم کے بارے میں "دوسرے اصلاح یافتہ ممالک کے ہم پلہ اور ہم پایہ کرنے" کا بوجھ اپنے کندھوں پہ لیتا ہے۔ اور یہ کہ وہ کونسا ہندوستانی سپوت ہے جو ہندوستانی حلقہ ہائے انتخاب کو ابجد کا سبق سکھلانے کا بھاری بوجھ اپنے سرپہ اٹھاکر انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ ایک ذمہ وار حکومت کا بار گراں برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں؟

تھوڑا عرصہ گذرا ہے کہ ایک امریکن مشن بورڈ نے جسے امریکہ کی طرف سے خاصی مالی امداد ملتی تھی اور جو جدید طریقہ تعلیم جاری کرنا چاہتا تھا بہت سے ایسے ہندوستانی شرفا کی مجلس منعقد کی جو ملکی مفاد کا راگ الاپنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اُن سے آئندہ طریقہ تعلیم کے اختیار کرنے کے متعلق مشورہ طلب کیا تو ہندوستانی شرفا نے باہمی سمجھوتہ کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ تمام اعلےٰ تعلیم (جو شہر کا کام ہے) اور تمام سرمایہ کے انتظام کی باگ ڈور فی الفور ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دیدی جائے۔

اسپر امریکن مشن بورڈ نے دریافت کیا کہ کیا انکا مطلب یہ ہے کہ آپ کی رائے میں اہل امریکہ ہندوستان میں کسی مصرف کے نہیں ؟

"ایسا ہرگز نہیں - آپ امریکن لوگ دیہات کے کام میں مصروف رہو" ہندوستانی شرفا نے کہا۔

میں نے ایک انگریز ملازم سول کے سامنے جس کو ہندوستان کی تیس سالہ ملازمت کا تجربہ تھا طریقہ تعلیم کے متعلق اپنے شبہات پیش کئے جن کے جواب میں اس نے کہا کہ شاید تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہو مگر ہمیں جنہوں نے اسی کام میں اپنی عمریں بسر کردی ہیں معلوم ہے کہ اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم ہندوستانیوں کو مزید اور مزید تعلیم اسی سرعت سے دیتے جائیں جس سے کہ وہ اسے حاصل کرسکتے ہوں۔ یہانتک کہ تعلیم اتنی عام ہو جائے کہ لوگوں کو آجکل کے ہندوستانیوں کی طرح صرف معمولی تعلیم پاکر کوئی اہمیت نہ رہے۔ اور صرف نمایاں لیاقت کی وجہ سے ہی کوئی خصوصیت حاصل ہوسکے ؛

———— ॥ ॥ ————

پندرہواں باب

روشنی کو کیوں روکا گیا ہے؟

بعض اوقات ہندوستان کی جہالت کی وجہ یہاں کی مفلسی بتائی جاتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا لغو مغالطہ ہے جسطرح کہ "مرغی اور انڈے دونوں میں سے پہلے کون تھا" یہ جھگڑا مشہور ہے۔ مگر ہندوستانی سیاست دانوں کی عادت میں داخل ہے کہ وہ جہلا میں اعلٰے تعلیم نہ بڑھنے کا الزام سرکار پر تھوپتے ہیں چنانچہ لالہ لاجپت رائے سوراجی پولٹیکل لیڈر وائسرائے کی گورنمنٹ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس نے آجتک ابتدائی تعلیم کی بھی جوکہ لکھنے پڑھنے اور حساب کے متعلق ہے عوام کو اجازت نہیں دی"[1] اور مسٹر[2] محمد علی جناح صاحب

---

[1] ملاحظہ ہو "پرابلم آف نیشنل ایجوکیشن ان انڈیا" صفحہ ۶۰ سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء میں تعلیم پر ہندوستان کے سرکاری روپیہ کا کل خرچ جس میں میونسپل کمیٹیوں۔ مقامی صوبجاتی اور مرکزی گورنمنٹوں کے عطیات بھی شامل تھے ۹ء۱۹ کروڑ روپیہ یا (۱۳۸۲۰۰۰) پونڈ تھا۔ یہ رقم اس کام کو مکمل کرنے کیلئے بالکل ناکافی ہے مگر باوجود اسکے جب اسکا مقابلہ برطانوی ہندوستان کے مالیہ کی مجموعی رقم سے کیا جائے تو یہ دوسری ممالک کے تعلیمی عطیات کے قریبًا برابر ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "ہندوستان سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں" صفحہ (۲۸۰) اور "سٹیٹیکل ابسٹرکٹ فار برٹش انڈیا" صفحہ (۲۹۲)

[2] یہ صاحب کونسل واضع آئین و قوانین کی نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر ہیں۔

الزام دیتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ "روشنی کو کیوں روک دیا گیا ہے"؟

مگر ان دونوں قانونی لیڈروں کے ان خیالات سے اتفاق کرنے۔ یا ہندوستان کی مفلوک الحالی یا برطانیہ کے لالچ کا الزام قبول کرنے سے پہلے ہم اپنے ناظرین کی توجہ ان دو امور کی طرف مبذول کرتے ہیں جن پر حال ہی میں غور کی جا چکی ہے اور ایک تیسرا امر واقعہ ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔

پہلا امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی چوبیس کروڑ ستر لاکھ افراد کی آبادی میں قریبًا پچاس فیصدی عورتیں ہیں۔ ہندوستان کے باشندوں نے جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے۔ تعلیم نسوان کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ سلطنت برطانیہ چند مختلف الخیال ہندوستانیوں اور عیسائی مشنوں کی متفقہ کوششوں سے ابھی تک صرف دو فیصدی سے بھی کم عورتوں کو تعلیم دے سکی ہے ہے۔ تو گویا اس حساب سے برطانوی ہندوستان کی تخمینًا ۱۲ کروڑ دس لاکھ عورتیں ابھی تک نوشت خواند سے بے بہرہ ہیں۔

دوسرا امر یہ ہے کہ برطانوی ہندوستان کی آبادی کے شمار کے لحاظ سے[1] چھ ملین انسان "اچھوت جاتی

---

[1] مردم شماری ہند مطبوعہ ۱۹۲۱ء۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۲۵

کہلاتے ہیں - بنی نوع انسان کی اتنی بڑی تعداد کی تعلیم کے متعلق ہندوؤں کی اکثریت ہمیشہ سے اور ابھی تک سختی سے ـ سینہ سپر - اور پُر اثر مخالفت کرتی رہی ہے - اور کر رہی ہے - اچھوت جاتی کی اس مجموعی تعداد میں سے انکی نصف عورتوں کی تعداد منہا کر لی جائے جیسا کہ مفصل اعداد میں اوپر بتایا جا چکا ہے اور مصدقہ اعداد کی عدم موجودگی میں ان میں سے پانچ فیصدی مرد تعلیم یافتہ مانے جائیں تو ہمیں دو کروڑ پچاس لاکھ فرد اور ایسے ملجاتے ہیں جو اکثریت کی رائے کے زور سے دولت علم سے محروم ہیں -

اب نہ تعلیم نسواں کی مزاحمت نہ اچھوت جاتی کی تعلیم کی مخالفت ہندوستان کے افلاس کی ذمہ وار نہیں - گورنمنٹ نے تو شروع ہی سے دونوں یعنی طبقہ نسواں اور اچھوتوں کی تعلیم کے حق میں انکے اپنے لوگوں کے قول و فعل کی تردید کرتے ہوئے پوری کوشش کی ہے -

بذریعہ اعداد ظاہر کر دینے سے کیفیت زیادہ صاف ہو جاتی ہے :-

برطانوی ہندوستان کی ان پڑھ نسوانی آبادی		۱۲۱۰۰۰۰۰ نفوس
اَن پڑھ اچھوت مرد		۲۸۵۰۰۰۰۰ "
	میزان	۱۴۹۵۰۰۰۰۰ "
برطانوی ہندوستان کی آبادی		۲۴۷۰۰۰۰۰۰ "

برطانوی ہندوستان کی آبادی کی وہ فیصدی تعداد }
جو کٹر ہندوؤں کی ضد کی وجہ سے ان پڑھ رہتی ہے } ۶۰۶۵۳

مگر ان دونوں متذکرہ بالا امور کے علاوہ یاد رکھنے
کے قابل ایک اہم امر یہ ہے کہ برطانوی ہندوستان
کی مجموعی آبادی میں نوّے فیصدی دیہاتی آبادی
ہے۔ ان دو امور کے علاوہ ایک تیسرا امر ہے جو اتنی
بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ جسکو بخوبی سمجھنے کے لئے
یہ بات بخوبی مدنظر رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان کی کل
آبادی کا نوّے فیصدی حصہ دیہاتی ہے گاؤں میں
رہنے والا ہے۔

بس جبتک کہ دیہات جاہل رہیں گے تمام ہندوستان
کی خواندگی کی مقدار فیصدی۔ خواہ اور کچھ ہی ہو جائے
عملاً وہی رہتی چلی جائے گی جو آج ہے یعنے دنیا کی
نہایت ادنےٰ اوسط کے برابر۔

مگر یہ یاد رہے کہ بنی نوع انسان کے اس آٹھویں
حصہ کو جو دس لاکھ چورانوے ہزار تین سو مربعہ میل کے
رقبہ پر پانچ لاکھ مواضعات میں آباد ہے ابتدائی تعلیم
دینے کے لئے یقیناً استادوں کی ایک بہت بڑی فوج
کی ضرورت ہے۔

اب ذرا استادوں کی اس فوج کی بھرتی کے عقدہ
پر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ دیہاتی

سکولوں کے لیئے آپکو ایک بھی استانی دستیاب نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ آجکل کے ہندوستان میں دیہاتی سکولوں کے لیئے ایک بھی استانی موجود نہیں۔

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ اگر ہمارے پاس امریکہ میں عورتیں اور نوجوان لڑکیاں تعلیم دینے والی نہ ہوتیں تو ہمارے اس طریقہ تعلیم پر کیا اثر پڑتا جو ہم نے امریکہ کے دیہاتی علاقہ جات کے بچوں کو کینیڈا سے گلف تک اور بحر اطلانطک سے کیلی فورنیا تک تعلیم دینے میں اختیار کیا۔

کسی مغربی ملک کو اپنے عام لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں اتنی سخت مشکلات پیش نہیں آئیں جتنی کہ امریکہ کو پیش آئیں اور کہ ایسی مشکلات کا خیال تک آنے سے دنیا کی سب سے دولتمند قوم بھی حیران و پریشان رہ جائیگی۔

اس کی وجہ کہ کیوں ہندوستان کی عورتیں ہندوستانی بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتیں چند الفاظ میں بیان ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہندوستانی بالغ عورت بغیر خاص محافظت کے ایک ہندوستانی مرد کے سامنے بے کھٹکے نہیں آسکتی۔

اس طرح سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کل ہی ہندوستان کو سوراج ملجائے اور اگر کل ہی یہ ملک افلاس کی جگہ دولت

سے مالا مال ہو جائے تب بھی یہ ملک اسوقت تک روئے زمین کے تمام غیر تعلیم یافتہ ممالک سے بدترین درجہ پر رہے گا جب تک کہ یہاں کے لوگ اپنی عورتوں اور اچھوت جاتی کی نسبت اپنے خیالات میں نمایاں تبدیلی نہیں کرینگے۔

اس ذکر کے متعلق جو دیہاتی سکولوں کے لئے استانیات نہ ملنے کے متعلق کہا گیا ہے میں نے صوبہ جات متحدہ میں صوبہ پنجاب میں بنگال اور بمبئی پریذیڈنسیوں میں۔ اور مدراس میں دورہ کر کے ہندو اور مسلمان عہدہ داران اور استادوں۔ ہندوستانی عیسائی استادوں اور پادریوں امریکن اور دوسرے مشنوں کے سرکردہ لوگوں۔ اور حکومت کے محکمہ جات تعلیم۔ طب اور پولیس کے ذمہ وار انگریز عہدہ داروں کی زبانی سنا ہے۔ کہ اور جہانتک مجھے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نہ تو کسی سرکاری کاغذات میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی کبھی کونسل ہائے واضع آئین و قوانین میں اسکی نسبت کوئی سرگرم مباحثہ ہوا ہے اور یہ ہندوستانیوں کے لئے ایک بالکل معمولی بات ہے۔

اور لطف یہ ہے کہ ان گورے حکام نے جو ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ ان امور کی طرف سے جان بوجھکر چپ سادھ رکھی ہے کہ یہ ظاہری بیچینی کی تو پرواہ نہیں کرتے۔ مگر معاملہ کے تہ کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔

ایک بڑے صاحب جاہ ہندوستانی نے جو ایک مشہور قوم پرست اور ساری عمر معاشرتی مصلح رہا مجھے بتایا کہ "مجھے اس اہم معاملہ کی نسبت تم سے ذکر کرنے کا کبھی خیال نہ آیا کیونکہ یہ معاملہ ہی ایسا نمایاں ہے جسکی طرف ہم کبھی توجہ نہیں کرتے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارا رویہ ہی اپنی عورتوں کی نسبت ایسا ہے کہ اس کے رو سے ہم ایک نوجوان بالغ نیک چلن عورت کو بھی اسکے کنبے کی محافظت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ وہ عورتیں جنہوں نے دیہاتی سکولوں میں پڑھائی کا کام کرنے کی جرأت کی ہے۔ عموماً عیسائی عورتیں ہیں جنکو اس وقت تک بڑی مشکل سے زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ جبتک کہ وہ مردوں کے زبردست تقاضا کی اطاعت نہ کریں۔ اور ان کی تمام زندگی کا میابی اور آرام و آسائش کا فیصلہ اس طریقہ پر منحصر ہے کہ جس سے وہ ایسے طلب و تقاضا کرنے والوں سے سلوک کرتی ہیں۔ یہی حال نرس عورتوں کا ہے اور اگر محکمہ کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے کہ جن عہدوں پر اب ہندوستانی قائم ہو گئے ہیں اپیل کی جائے تو اس سے سوائے تکلیف کا مقام بدل جانے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

حقیقت دراصل یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ایک آزاد اور دیانت دار عورت کے امکان کا بھی اعتبار نہیں کر سکتے

ہمارے خیال میں تو یہ قانون قدرت کے خلاف ہے کیونکہ دونوں چیزیں (مرد اور عورت) ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔"

ناظرین کو یاد ہوگا کہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن محکمہ تعلیم کے انگریز۔ مسلمان اور ہندو تینوں قسم کے لوگوں سے مرتب کی گئی تھی۔ ان میں آخرالذکر یعنی ہندوؤں نے جو اپنی اپنی جماعتوں کے نمائندے تھے اس معاملہ کی نسبت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ:۔[1]

"امر واقعہ کا ذکر کرنا پڑیگا کہ جب تک بنگالی مرد عام طور پر ان عورتوں کے متعلق جو زنان خانوں سے باہر رہتی ہیں عموماً عزت و حرمت اور شرافت کی ابتدائی مراتب نہ سیکھ لیں گے تب تک استانیوں کی خدمات حاصل کرنا ناممکن ہوگا"

متذکرہ بالا جملے میں سے اگر لفظ "بنگالی" حذف کر دیا جائے تو کمشن کا یہ جملہ تمام ہندوستان پر ٹھیک طور سے اطلاق پذیر ہو جائیگا۔ میسن آسکاٹ[2] تمام ملک کا حوالہ دیتا ہے جب کہ وہ بیان کرتا ہے:۔

"تمدنی خطرات اور رکاوٹوں کی وجہ سے عورتوں کے لئے عملی طور پر ناممکن ہے کہ وہ دیہاتی سکولوں

---

[1] کلکتہ یونیورسٹی رپورٹ۔ جلد دوم۔ حصہ اول۔ صفحہ ۹۔

[2] ویج سکولز ان انڈیا (دیہاتی مدارس ہند) صفحہ ۱۹۶

میں جاکر تعلیم دیں جبتک کہ انکے شوہر انکے ہمراہ نہ ہوں"
استانیوں کی قلت کی وجہ سے دیہاتی سکولوں میں
جاکر عوام کو تعلیم دینے کی نسبت بدترین حالت کا ذکر
کرتے ہوئے صوبہ جات متوسط کے صاحب ڈائرکٹر
تعلیم فرماتے ہیں[1] کہ :-
"دیہاتی زندگی کے عام حالات اور بن بیاہی
استانیوں کی نسبت ہندوستانیوں کا رویہ ایسی چیزیں
ہیں کہ ان استانیوں کی زندگی بھی جو کہیں ملسکتی ہیں
وہاں جان ہو رہی ہے - کوئی ہندوستانی عورت
کسی دیہاتی حلقہ میں تعلیم دینے کے لئے اکیلی نہیں
جاسکتی اگر وہ بفرض محال چلی بھی جائے تو اُس کی
زندگی تباہ ہوجائیگی"
مندرجہ بالا بیان کی تصدیق شمالی ہندوستان کی
ایک بڑے امریکن مشن کالج کی سرگروہ لیڈی نے
بھی کی ہے جو ایک بڑی جہاندیدہ تجربہ کار بے تعصب
اور آزاد خیال خاتون ہے اور اسکا بیان بدین الفاظ ہے۔
"یہ دیکھکر واقعی حوصلہ پست ہو جاتا ہے کہ ان
(ہندوستانی) عورتوں میں سے جو اس کالج کی ایک
جماعت سے دوسری جماعت میں بھرتی ہوئی نظر آرہی

---

[1] دی ایجوکیشن آف انڈیا مصنفہ آر سے ہیو مطبوعہ لنڈن - فیبر اینڈ
دائیر ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۶۸

ہیں ایک بھی ایسی نہیں جو ہندوستان میں واقعی تعلیم دینے کے قابل ہو۔ کیونکہ ان میں سے ایک بھی ملک کی اشد ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی گاؤں میں نہیں جائے گی جہاں اسکی جان پر بن جانے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ ایک ضروری امر ہے۔ اور باوجود اسبات کے ہندوستانی چیخ چلا رہے ہیں کہ انہیں سوراج دیا جائے"[۱]

کلکتہ یونیورسٹی کمشن نے اس مضمون پر طویل بحث ومباحثہ کرنے کے بعد اسطرح ختم کیا ہے:۔[۲]

"جب تک کہ مفصلات میں استانیوں کے لئے رہائشی مکان نہ بہم پونچائے جائینگے اور انکے ہمراہ انکے بڑے بوڑھے اور قریبی رشتہ داروں کے رکھنے کا انتظام نہ کیا جائے گا عورتوں کو استانیاں بننے کی حوصلہ افزائی کرنا بالکل بیکار ہوگا بلکہ یہ اُنسے بے رحمی اور تشدد ہوگا"

برطانوی ہندوستان کی ایک تحقیقاتی کمیٹی کے ممبران نے جنکا ایک ممبر ایک ہندوستانی عیسائی نوجوانوں کی ایک انجمن کا سرگروہ مسٹر کنکارائن لی پال[۳] نامی تھا رپورٹ کی

---

[۱] کتاب ہذا کی مصنف کے سامنے فروری ۱۹۲۶ء کو بیان دیا گیا۔

[۲] کلکتہ یونیورسٹی رپورٹ۔ جلد دوم۔ حصہ اول۔ صفحہ ۹

[۳] ویلیج ایجوکیشنل ان انڈیا کی تحقیقاتی کمشن کی رپورٹ۔ مطبوعہ اکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۹۸

لکھتی :-

"تمدنی مشکلات جن کی وجہ سے قابل استانیاں ملنی ناممکن ہیں اظہر من الشمس ہیں اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے نہایت خطرناک ہیں۔ وہاتوں میں ابتدائی سکولوں کا تمام کام بالکل ہی عورتوں کا کام ہے اور اس کے باوجود تمدنی حالات ایسے ہیں کہ اس کام کے لئے ایک بھی عورت نہیں ملتی۔ استانیوں کی قلت ناقابل تلافی ہے البتہ کوئی تمدنی انقلاب ظہور پذیر ہوجائے تو اور بات ہے"

اندریں حالات اگر کوئی عورت باوجود ان تمدنی رکاوٹوں اور مشکلات کے استانی بننا چاہے تو اس کے نام پر معاشرتی بدنامی کا ٹیکا لگ جائیگا چنانچہ ایک شخص جو ہندوستانی حالات کا پورے طور پر اور دیرینہ واقفکار ہے تحریر کرتا ہے[۱] :-

"بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے خیال کے مطابق استانی گیری کرنا باحیا عورتوں کا کام نہیں گو ظاہر التعجب ہے کہ یہ خیال پیدا ہی کسطرح سے ہوا مگر ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے اس کا جواب صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ :-

---

[۱] مردم شماری ہند مرتبہ ای اے ایچ بلنٹ سی - آئی - ای - اور بی - ای - آئی - سی - ایس مطبوعہ سنہ ۱۹۱۱ جلد یازدہم صفحات ۲۶۰-۲۶۱

"ایک عورت کی زندگی کا مقصد و مدعا صرف شادی کرنا ہے۔ اگر وہ شادی کرلے تو اُس کی خانہ داری کی ذمہ واریاں اسکے استانی بننے میں مزاحم ہوتی ہیں اور اگر وہ استانی گیری کرے تو وہ خانہ داری کی ذمہ واریاں سرانجام نہیں دے سکے گی یا اُنکے سرانجام دینے میں غفلت کرے گی۔ اگر اُسے خانہ داری کی کوئی ذمہ واریاں نہوں تو ضرور ہے کہ وہ بن بیاہی ہوگی اور ایک بن بیاہی عورت اس سے کبھی بہتر نہیں ہو سکتی جیسی کہ اُسے ہونا چاہیئے[۱]۔ اگر وہ خانہ داری کی ذمہ واریوں کو سرانجام نہ دے تو اس صورت میں بھی وہ اس سے بہتر نہیں جیسا کہ اسے ہونا لازمی تھا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلیل ان ہندوستانی بیواؤں کی صف آرائی کے لئے دی گئی ہے جن کی تعداد دو کروڑ اٹھسٹھ لاکھ ہے تاکہ انکو کنج تنہائی سے نکال کر کام کاج میں لگی ہوئی رکھا جائے۔ ان بیواؤں کی نسبت کام کرنے کے امکان پر بحث مباحثہ ہو چکا ہے بلکہ اُن میں سے بعض کچھ بیواؤں کو کام کاج کرنا

---

[۱] مردم شماری مطبوعہ ۱۹۱۱ء جلد پانزدہم صفحہ ۲۲۹۔ جسپر لکھا ہے کہ "یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر سے زیادہ طوائفوں اور ویسی عورتوں کے سوائے جو جسمانی امراض مثلاً جذام یا نابینائی میں مبتلا ہوں کوئی عورت بن بیاہی نہیں۔ بیس سال سے اوپر کی درحقیقت کنواری عورتوں کی تعداد نہایت قلیل ہے اور ایک کنواری بڑھیا تو بالکل ہی مفقود ہے۔"

سکھا بھی دیا گیا ہے۔ مگر اُنکے مفید ثابت ہونے کے راستہ
میں اس قدیم ہندو میدان میں قریب ناممکن
مشکلات ہیں۔ وہ عورت جس کو یہ مذہبی تیقن ذہن نشین
ہو چکا ہو کہ بدقسمتی اور نظر بد ایک بیوہ ہی کی قسمت
میں لکھی جا چکی ہے ایک سکول میں جاکر کیا کام سرانجام
دے سکتی ہے۔ مگر وہی مستند شخص جس کا ذکر اوپر
کیا جا چکا ہے حسب ذیل تحریر کرتا ہے[1]:۔
"ایک اور بھی زیادہ سخت اعتراض اس مشکل کے
متعلق کیا جاتا ہے کہ ان مستورات کی محافظت کے
لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی جو اپنے کنبوں کے
حلقوں سے باہر جاکر کام کرتی ہیں اُن کی ملازمت جس
میں کسی قسم کی خرابی یا فتور واقع نہ ہو صرف اسی
حال میں ممکن معلوم ہو سکتی ہے کہ یہ صرف مشن
سکولوں اور بستیوں میں اُنکی نہایت احتیاط اور سخت
نگہداشت کے نیچے ملازمت کریں۔ ایک عام جنگ
میں صرف (بیوگاں ہی) ایک خفیف سا حصہ لے
سکتی ہیں"۔

اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ
ایک نوجوان بیوہ استانی کو ایک گاؤں میں رہنے
کے لئے باہر سے وہی ترغیبیں پیش کی جائیں گی۔

---

[1] ایجوکیشن آف انڈیا مصنفہ آرتھر مے ھنو۔ صفحہ ۱۹۸

وہی دباؤ ڈالا جائیگا۔ ویسے ہی اس کو جبراً منوایا جائیگا۔ اور بدنامی حاصل ہوگی جیسے کہ ایک کنواری لڑکی کو ہو سکتی ہے۔

تو اس طرح وہ قطعی بندش پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے تعلیم کا پیشہ معاشرتی نظر سے ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ جو ایک ہندوستانی مصنف کی رائے[۱] کے مطابق ایک عورت پر یہ الزام عائد کرتی ہے کہ وہ مرد کی دست نگر ہوتی ہے۔ اور بے گھر اور بے بس ہونے کے علاوہ اور کسی کام کی نہیں رہتی۔

مگر اس قاعدہ کے استثنیٰ بھی ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں برطانوی ہندوستان کی بارہ کروڑ چھبتیس[۲۵] لاکھ عورتوں میں سے چار ہزار تین سو اکانویں عورتیں استادوں کے ٹریننگ سکول میں تعلیم پا رہی تھیں مگر ان چار ہزار تین سو اکانویں عورتوں میں سے قریباً نصف یعنے دو ہزار پچاس ہندوستانی عیسائی عورتیں تھیں[۲] حالانکہ عیسائی عورتوں کی تعداد عورتوں کی مجموعی تعداد کے ۱۰۵ فیصدی کے برابر ہے۔ اسی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم یافتہ عورتوں

---

[۱] ری کنسٹرکٹنگ انڈیا مصنفہ سر ایم وسوس واریا۔ مطبوعہ لنڈن۔ پی۔ ایس کنگ اینڈ سنز ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۴۳ [۲] پروگرس آف ایجوکیشن ان انڈیا بابت سال ۲۲-۱۹۱۷ء۔ جلد دوئم صفحات ۱۴-۱۵

میں سے معدودے چند اپنے ملک کی سخت ضرورت میں خدمت کر رہی ہیں۔

ایک پیشہ ور ماہر تعلیم کا بیان[1] ہے:۔

"عیسائی اور برہمو عورتوں کے ماسوائے ایک متمول گھرانے کی عورت کو اس بات پر مائل کر لینا کہ وہ استانی بننے کے لئے تعلیم حاصل کرے بے حد مشکل ہے۔ اور ان میں سے بھی ایسی بہت سی عورتیں کہ جنہوں نے ایسی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے مگر ایسے مقامات میں جانے سے انکار کر دیتی ہیں جہاں انکی ضرورت پڑتی ہے"۔

میرے اپنے ساتھ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک عورتوں کے ٹریننگ سکول کے ملاحظہ کرنے کا موقعہ ملنے سے پہلے مجھے ہندوستانی دیہاتی زندگی کا بہت کچھ تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ جبکہ دیہاتی حالات میرے خیال میں تازہ تھے اور دیہاتی ضروریات کی بے انتہا اہمیت میرے ذہن نشین تھی۔ میں نے ہندوستان کی بہبود کے خیال سے لڑکیوں سے سوال کیا۔

میں۔ تم کیا تعلیم حاصل کر رہی ہو؟

وہ۔ ہم استانیاں بنیں گی۔

میں۔ کیا تم دیہاتوں میں جا کر پڑھایا کرو گی؟

---

[1] ملاحظہ ہو مشرقی آسام اور بنگال میں تعلیم کا پنج سالہ ریویو۔

(وہ) (حیرت زدہ ہوکر) ہرگز نہیں - گویا کہ سوال جبرتنا طور پر ناقابل فہم تھا -

(مین) تو پھر دیہات میں رہنے والے بچوں کو کون تعلیم دے گا ؟

(وہ) اس کا انتظام کرنا سرکار کا کام ہے -

(مین) اور کیا گورنمنٹ استادوں کے بغیر کسی کو تعلیم دے سکتی ہے ؟

(وہ) - ہم نہیں جانتیں - یہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ کوئی انتظام کرے -

بظاہر وہ نہ تو اپنا فرض سمجھتی تھیں اور نہ انکی دلی خواہش معلوم ہوتی تھی کہ وہ اپنے ہم وطنوں میں جاکر تعلیم دیں - درحقیقت ایسے خیالات کی انکے ذہنی وراثت میں کہیں مثال نہیں ملتی تھی - کیونکہ حفاظت ذاتی سوال عقل انسانی کی خود مختارانہ زندگی کے خیال کو اُنکے دل پر گذرنے سے بلا معلوم طور پر روک دیتا ہے اس معاملہ کے ہر پہلو پر غور کرنے سے معلوم نہ ہوگا کہ مندرجہ بالا تقریبات جو اُن سے صادر ہوئی ہیں - یہ مسٹر جناح اور لالہ لاجپت رائے[۱] کے "خوفناک زہریلے درخت" کا تنہ اور جڑیں ہونے کی بجائے چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کے سوائے کچھ اور ہیں -

---

[۱] مشرقی آسام اور بنگال میں تعلیم کا پنج سالہ ریویو -

اب میں خود اس دیہاتی کا ذکر کرتی ہوں۔ جو کاشتکار یا رعیت کہلاتا ہے۔ اور اس کی طبیعت کا میلان دیہاتی سکول کی طرف بالکل نہیں ہوتا۔ جس وقت بھی اس کا لڑکا اس کو اس قابل معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اس کا کوئی مطلب نکل سکے یعنے وہ مویشی چرلے اور دوسرے متفرق کام کر سکے تو وہ اُسے ہلا تامل سکول کی جماعت سے نکال لیتا ہے جس سے اُس کی حاضری کا ذرہ بھر بھی یقین نہیں ہوتا۔ اکثر یہ "رعیت" اس قدر غریب ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی محنت مشقت اور اس مزدوری کے بغیر جو وہ کماتے ہیں اپنے کنبے کی پرورش نہیں کر سکتا لہذا وہ انہیں سکول میں نہیں بھیج سکتا علاوہ بریں بیماریاں مثلاً ہوک ورم موسمی بخار۔ پیدائشی کمزوری بھی انکی سکول کی حاضری میں بڑی رخنہ انداز ہوتی ہیں۔ یا اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیہاتی نجومی بچے کی جنم پتری سے بتا دیتا ہے کہ فلاں فلاں اوقات یا عمر بچے کے سکول جانے کے لئے نحس ہے۔ اور بہر حال ہندوستانی کسان کی طبیعت تمام ممالک کے کسانوں کی طرح وہم کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ اس کا باوا بھی ان پڑھ تھا وہ خود بھی ان پڑھ رہا پھر کون کہہ سکتا ہے کہ

اس کے لڑکے کے لئے تعلیم مفید ثابت ہوگی یا اس کا ہل چلانا؟

بہت سے انگریز افسروں کی جو تعلیم کے بہتر بنانے کے کام میں مصروف ہیں رائے ہے کہ ان سکولوں کا نصاب کافی طور پر فائدہ مند نہیں ہو سکتا اگر اس دیہاتی کے ذہن نشین کرا دیا جائے کہ اس کا لڑکا اچھی طرح تعلیم پانے کے بعد اپنی اراضی پر زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ تو وہ لڑکے کو سکول میں داخل کرانے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لے گا۔[1]

باوجود اس کے "ابہام و سواس در آیا" جیسے پائے کے ہندو مصنفین گورنمنٹ پر یہ الزام لگانے سے نہیں ہچکچاتے کہ حکومت جان بوجھ کر اقتصادیات کی تعلیم کو ایسا دلکش نہیں بننے دیتی کہ جس سے ہندوستان خود مختار ہو جائے مگر مسٹر کنکارائین نی پال کی کمیٹی کی رپورٹ سے جو ہندوستان بھر کے معائنہ پر مبنی ہے کچھ اور ہی پتہ چلتا ہے۔ اس میں لکھا ہے[2]

"یہ اکثر خیال کر لیا جاتا ہے کہ جو تعلیم دیہاتی سکول میں دی جاتی ہے اس لئے حقیر سمجھی جاتی ہے کہ یہ کافی طور پر عملی نہیں۔ مگر بہت سی صورتوں میں والدین

---

[1] کتاب کانسٹرکٹنگ انڈیا۔ صفحہ (۳۵۸)

[2] ملاحظہ ہو ویلیج ایجوکیشن ان انڈیا صفحہ (۲۰)

کا اعتراض اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ آنکی خواہش یہ نہیں ہوتی کہ انکا لڑکا زراعت کا کام سیکھے جس کی وجہ کچھ تو یہ ہوتی ہے کہ انہیں زعم ہوتا ہے کہ کہ وہ خود زراعت کا کام سکول کے استاد سے بہتر جانتے ہیں اور زیادہ تر یہی وجہ ہوتی ہے کہ انکی طبعیت کا میلان اس طرف ہوتا ہے کہ اُن کا لڑکا سکول میں استاد یا دفتر میں بابو بنئے۔ پھر اگر انہیں یہ شبہہ ہو جائے کہ لڑکے کو سکول میں داخل کرانے سے انکی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تو اسکے دل سے تعلیم دینے کا حوصلہ ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ در اصل یہ لوگ تعلیم کے روحانی اور ذہنی اثرات سے لاعلم ہوتے ہیں"

اسی رپورٹ میں آگے چلکر لکھا ہے" اس اوائل زمانہ ہی میں نصاب میں تبدیلی کر دینے سے نہ تو سکول کی قابلیت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ ہی سکول کی حاضری میں توسیع ہو سکتی ہے بلکہ صرف عملہ معلمین کے قابل اور پُر ہنر بنانے سے یہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں"

سولھواں باب

صائب ترین رائے

ایک نہایت ممتاز ہندوستانی نے میرے سامنے ایک قابل عزت ہندو رئیس کے اس میلان کا جو اسے اپنے جنم بھومی قصبہ کی طرف ہے۔ یوں تشریح کی۔

"اس اپنے شہر کے مکان کی لائبریری میں (جس میں اس کی قانونی کتابوں کی بڑی بڑی الماریاں بھری دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں) بیٹھے ہوئے مجھے کہا کہ "بیماری کوڑا کرکٹ اور جہالت ہمارے ملک کی خصوصیتیں ہیں۔ میرے اپنے ہی گاؤں کو لے لیجئے (جہاں میرے بزرگ صدیوں سے سردار ہوئے چلے آئے ہیں اور جہاں کا سردار آجکل خود میں ہوں) ستر سال ہوئے کہ جب میں نے اُسے چھوڑا تو اس کی آبادی (۱۸۰۰) باشندوں کی تھی مگر اب جبکہ چند ہفتے ہوئے ہیں وہاں پھر گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی آبادی گھٹتے گھٹتے کل (۶۰۰) نفوس کی رہ گئی ہے۔ تو مجھے سنکر سخت صدمہ ہوا اسکول میں گیا جہاں ستر یا اسی لڑکے بظاہر پانچ یا چھ سال

کی عمر کے تعلیم پا رہے تھے۔ میں نے استاد سے سوال
کیا کہ وہ ان ننھے بچوں کو کیوں وہ سبق پڑھا رہا ہے
جو بڑی جماعتوں کے لئے موزوں ہیں۔ استاد نے
جواب دیا کہ یہ لڑکے اتنے ننھے نہیں ہیں جتنا کہ
میں انکو خیال کرتا ہوں۔ سچ سمجھیئے کہ یہ تمام لڑکے
نہایت مریل تھے اور انکے مریل ہونے کی وجہ یہ
تھی کہ انکی اچھی نگہداشت نہ ہوتی تھی یا انہیں ٹھیک
خوراک نہیں ملتی تھی یا وہ بیچارے مچھروں کی وجہ
سے جو صرف بھوکے مرنے والوں کو ہی کھاتے ہیں
موسمی بخار کا شکار ہوتے تھے۔ یہ کچھ میرے ہی
گاؤں کے لوگوں کی حالت نہیں بلکہ ایسے بچے ایسے
مرد اور ایسی ہی عورتیں تمام مغربی بنگال میں پائی جاتی
ہیں۔ نہ اُن میں جان ہے اور نہ پھرتی رہ گئی ہے۔
لہذا میں یہ سوال کرتا ہوں کہ گذشتہ سو سال سے
سرکار انگریزی کیا کر رہی ہے کہ میرے گاؤں کے
لوگوں کا ایسا برا حال ہو گیا ہے۔ اس میں کلام
نہیں کہ سرکار نے پنجاب کو ایک ریگستان سے گلستان
بنا دیا اور وہاں کے لکھوکھہا باشندوں کے لئے بہتات
سے خوراک بہم پہونچائی۔ مگر اس سے مجھے کیا اطمینان
ہو سکتا ہے جبکہ میرے آدمیوں کو ایک کونے میں
بٹھا کر فاقوں سے مار دیا ہے۔ سرکار کا دعوے ہے کہ

"دیگر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے سے پہلے ہمیں ملک میں امن و امان قائم کرنا ہے" اور نیز یہ کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جہاں اس نے بہترین سڑکیں اور نہریں بنائی ہیں، لیکن سرکار یقیناً یہ کام زیادہ اور سرعت سے کر سکتی تھی۔ اسکی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ میرے آدمی بھوکے مرنے دے۔

یہ مرقع اس جنٹلمین کے خیالات کا ہے کہ جس کا گاؤں (جس کی نسبت اُس نے اسقدر سخت افسوس کا اظہار کیا) اس شہر سے جسمیں وہ رہتا ہے صرف چار گھنٹے کی ریل کی مسافت پر واقعہ ہے۔ وہ ایک نہایت امیر کبیر آدمی مانا جاتا ہے اور اُس نے مجھے خود بتایا کہ اس کی وکالت کی آمدنی بہت کافی ہے اور یہ آمدنی اتنی بتائی کہ میرے خیال میں اسے سنکر نیویارک کے ایک کامیاب قابل وکیل کے منہ میں ضرور پانی بھر آئے۔ مگر اپنے گاؤں کا ایک بڑا آدمی ہونے کے باوجود اُس نے وہی گاؤں کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا اور اپنی رعیت کو نہ کبھی نیک مشورہ دیا اور نہ ہی اُنکے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور تو اور اُس کے اپنے بیان کے بموجب سترہ سال کے عرصہ میں اس سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ دوستانہ طور پر ہی وہاں کے لوگوں سے ملنے چلا جائے۔ حالانکہ یہ اُس کی

جائے رہایش سے اتنی دور تھا کہ کسی سہ پہر کو گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کے طور پر ہی وہاں چلا جائے اور آخر کار جب وہ وہاں گیا بھی تو اس کے زوال کو دیکھکر اسے سوائے سرکار کے اور تو کوئی قابل ملامت نظر نہ آیا کہ جس کے ذمہ ایسے پانچ لاکھ گاؤں کی نگہداشت ہے جو وہ انسانی ہاتھوں اور انسانی لیاقت کے ذریعہ سے کرا رہی ہے۔

علاوہ بریں وہ اسباب کا ذکر کرنا بھی بھول گیا کہ اس کی جنم بھومی کی موجودہ آبادی کی کمی کی وجہ یہ بھی ہے۔کہ تھوڑے عرصہ سے اس کے قریب ایک مشین لگ گئی ہے جہاں اس کی رعیت کے بہت سے لوگ اپنی روزی کمانے کے لئے اکھٹے گئے ہیں۔

شاید تہذیب کا یہی اقتضا ہوتا کہ میں اُن صاحب کا نام لے دیتی۔لیکن میں بلا کسی کا دل دکھانے کے ایک اور مقتدر اور ذی عزت شخص یعنے سردار محمد نواز خاں کا نام ظاہر کرتی ہوں جو شمالی پنجاب کے ضلع اٹک میں چھپن گاؤں کا واحد مالک ہے۔

یہ نوجوان مسلمان سردار اپنی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے لئے چیفس کالج لاہور میں داخل ہوا۔اور وہاں سے

رائل ملٹری کالج واقعہ سینڈ ہرسٹ میں ہندوستانی
فوج میں کمشن حاصل کرنے کے لئے گیا۔ انگلستان
کی رہائش کے دوران میں چونکہ یہ اکثر انگریز زمینداروں
کے گھروں میں بطور مہمان جاتا رہا اس کی توجہ اس سلوک
کی طرف مبذول ہوئی جو بڑے بڑے انگریز مالکان اراضی
اپنے کاشتکاروں سے روا رکھتے ہیں۔
چونکہ اُس کے لاہور کے کالج کے انگریز ہیڈ ماسٹر نے
اس کے دل میں پہلے ہی سے یہ بیج بو دیا تھا۔ کہ
ایک مالک اراضی کے اصلی فرایض کیا ہوتے ہیں
انگلستان کے مالکان اراضی کے میل جول سے یہ بیج بارور ہو گیا
اور سردار موصوف کی آنکھیں کھل گئیں۔ اٹھارہ مہینے
تک تو اس نے ایک ھسّر رجمنٹ میں ایک منچلے سپاہی
کی طرح نوکری کی اس عرصہ میں افسروں اور سپاہیوں
میں یکساں ہردلعزیز رہکر اس نے یہ کہتے ہوئے "اب
مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے دنیا میں رہکر کیا کام
کرنا ہے" فوجی کمیشن سے استعفا دیدیا اور اپنی جاگیر
یا محال پر واپس آگیا۔
اب وہ اپنے محال پر اس طرح وقت گذار رہا ہے
کہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک گاؤں سے دوسرے
گاؤں کو جاتا ہے۔ اپنی رعیت کی حالت بہترین
بنانے میں مشغول رہتا ہے۔ زراعت کے بہترین ذرائع

سوچتا اپنے مواضعات میں حفظان صحت کے بہترین اصول رائج کرتا اور اپنی رعیت کی فلاح وبہبود کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اس کی عمر ستائیس سال کی ہے اور قریبًا چار لاکھ سالانہ آمدنی ہے مگر باوجود اس جوان عمری اور معقول آمدنی کے وہ شہریت کا ایک پھرتیلا ڈائیمز اور بھلائی مجسمہ ہے۔ اور اپنے ضلع کے ویسی ہی سرگرم اور محنت کش انگریز ڈپٹی کمشنر کا دایاں ہاتھ ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے کہ وہ گورنمنٹ کی اس پالیسی کا سخت مخالف ہے جس کی رو سے سرکاری بڑے بڑے عہدے اتنی جلدی ہندوستانیوں کو دیئے جا رہے ہیں۔ اُسے سوراجی سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس نے گورنمنٹ کی اس کوشش پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی جو وہ لوگوں کو صاف ستھرا رکھنے تعلیم دینے اور انکو خوشحال بنانے کے متعلق کر رہی ہے۔ اس کا تمام وقت گورنمنٹ کی اصلاحی سکیموں کے ساتھ پورا پورا اور دلی تعاون کرنے اور زبردست ذاتی کوششوں میں صرف ہو جاتا ہے

اگر گورنمنٹ کا منشا لوگوں کی بہتری کرنے کا ہے تو یہ ضروری ہے کہ بجائے خالی خولی باتیں بنانے

والوں کے سردار محمد نواز خان جیسے آدمی جتنے زیادہ میدان میں نکلیں گے اتنی جلدی ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری ہندوستانیوں کے ہاتھوں منتقل ہو جائیگی۔

اندریں اثنا ان لوگوں کی نسبت جو قصبہ جات اور مواضعات میں رہتے ہیں اور جو "اونچی ذات اور طبقہ کے لوگ" شمار کئے جاتے ہیں۔ مسٹر الکاٹ[1] کہتا ہے کہ "یہ صرف بدقسمت دیہاتیوں کو تعلیم دینا ناپسند کرتے ہیں بلکہ یہ اس کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ انکو معلوم ہے کہ وہ کمین لوگ جنکی عمریں بلا عذر و حیلہ اُن کی تابعداری اور خدمت کرتے گذر گئی ہیں اب انکی حکم عدولی کرنا شروع کر دینگے"

تحقیقاتی کمشن کا بیان ہے کہ "ہندوستان کے دیہاتی حلقہ جات میں عوام کی تعلیم کے حق میں کوئی رائے نہیں اور متمول مالکان اراضی اور خوشحال کسانوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ایک کاشتکار کو تعلیم دینے میں جو وہ اُسی (مالک) کی بہتری ہے[2]"

ایک دیہاتی سکول ماسٹر۔ خواہ وہ بڈھا ہو یا جوان۔ عام طور پر ایک بے ہنگم شکل وصورت کا نالائق انسان

---

[1] ویلج سکولز ان انڈیا۔ صفحہ (۹۳)

[2] ویلج ایجوکیشن ان انڈیا۔ صفحہ (۲۶)

ہوتا ہے۔ جس کے بے زور اور پایچ سے بازؤں اور ٹانگوں پر ایک بھاری بھرکم زنبیل کمبل لپٹا ہوا ہوتا ہے اور جس کے بے ڈھنگے جسم کے اوپر ایک خالی خولی ہمیشہ تھکی ماندی کھوپڑی رکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے ایک ہندوستانی دیہاتی سکول سے بڑھکر دنیا میں کوئی بے رونق چیز نہ ہوگی۔ اس پر ہر وقت نحوست چھائی رہتی ہے اور فلاکت منڈلاتی پائی جاتی ہے۔

ہندو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے یقین کیا جاتا ہے کہ ہر انسان لازمی طور پر ہر وقت اوداس اور مغموم رہتا ہے مگر میں ذاتی طور پر کوئی ایسی بات معلوم نہیں کرسکی جس سے ثابت ہو کہ یہ ہندوستانیوں کی ایک ضروری اور پیدائشی صفت ہے۔ بلا شک و شبہ خوشی کی جڑ جوانوں اور بڈھوں دونوں کے دلوں میں یکساں موجود ہوتی ہے۔ کسی کو متبسم دیکھ کر دوسرے کے چہرے پر لازمی طور پر تبسم کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی مذاقیہ بات سے ہنسی پیدا ہوتی ہے۔ اور کسی نئی چیز کو دیکھ کر کسی کے ایک گاؤں کے مجمع کے ہر عمر کے لوگوں کو ضرور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور ان لوگوں کے سامنے بھی اگر فلسفیانہ خیالات کا قابلیت کے ساختہ اظہار کیا جائے تو انکے خیالات میں جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دیہاتی لوگ باوقار۔ دلچسپ۔ لوگوں

کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور محبت اور توجہ کو جذب کرنے والے ہوتے ہیں اور ان خدمات کے لئے ہر طرح سے موزوں ہیں جو گذشتہ ساٹھ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے وہ انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی مستعدانہ اور سمجھدار تعاون کے بغیر آلیگارکی یعنی قدیم طریقۂ حکومت امرا کے سوائے اور کوئی حکومت قایم نہیں رہ سکتی۔

آجکل کے ہندوستانی دیہاتیوں کے لئے برطانیہ کے سوائے اور کوئی نہیں جو ان سے ہمدردانہ مستعدا اور علی دلچسپی لے یا انکی گوناگوں ضروریات میں اُنکی برجستہ اور قابل اعتماد امداد کرے۔ سوائے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کے ان دیہاتیوں کا اور کوئی "مائی باپ" نہیں ہوتا اور اسی ڈپٹی کمشنر کے دل پر دیہاتیوں کی دلچسپیاں اور اُن کی تکلیفیں شب و روز چھائی رہتی ہیں۔

میں اپنے ذاتی تجربہ کے رو سے کہہ سکتی ہوں۔ کہ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک میں سینکڑوں مواضعات بر گئی اور جہاں کہیں بھی گئی وہاں پر دیہاتیوں نے میری نہایت دوستانہ طور پر محبت بھری آؤ بھگت کی۔ شہنشاہ جارج اور نوجوان کرشن بھگوان کی تصاویر یں جو گارے کی دیواروں پر لٹکتی ہوئی نظر آئیں معلوم ہوتا تھا کہ اِن فوائد کے منبعوں کو

متحد کرنے والی ہیں۔

میں ہزار کوشش کرتی تھی کہ میں ایک امریکن عورت ہوں مگر سب رائیگان جاتی تھیں کیونکہ انکے خیال میں سفید چہرہ صرف انگلستان کا ہی ہو سکتا ہے امریکہ والی کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہ تھی اور میں اپنی اس خیر مقدم کا لطف اٹھاتی تھی جو پشتوں کے کام کا نتیجہ تھا۔

تاہم تمام ہندوستان میں انگریز مرد۔ عورتیں اور بچے سب ملا کر کل دو لاکھ سے زیادہ تھیں۔ اور برطانوی ہندوستان میں کل پانچ لاکھ سے زیادہ گاؤں ہیں!

میں نے ایک دفعہ گاندھی سے سوال کیا کہ "کیا آپ کے ہندوستانی تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوانوں کے لئے سیاسی مفاد تمدنی مدارج حصول شہرت کی خاطر لڑتے جھگڑتے رہنے سے یہ بہتر نہیں کہ وہ دیہات میں جاکر اپنی زندگیاں لوگوں کے لئے وقف کر دیں۔ اور اپنی ہستی مٹا دیں؟

اس کے جواب میں مسٹر گاندھی نے فرمایا کہ "واقعی یہ صائب ترین رائے ہے"

کلکتہ کے چار دلچسپ نوجوان ہندوستانی لیڈروں سے بھی جو شہر بھر میں مانے ہوئے آدمی تھے۔ میں نے یہی سوال کیا کہ "کیا آپ خود اور وہ تمام دیگر اصحاب بھی جو آپ کی طرح کام کر رہے ہیں اپنی پیاری بھارت ماتا کی

اس طرح سے بہترین خدمت نہیں کر سکتے کہ اس کی خاطر اپنی ذاتی اور سیاسی خواہشات کو قربان کردیں۔ اپنے ملک کے مواضعات میں جاکر اپنی تمام آرام زندگی پر پانی پھیردیں اور دیہاتیوں کے لئے اسی طرح مفید کام کریں جس طرح آجکل کئی برطانوی مرد اور عورتیں اس ملک میں کر رہے ہیں؟ کیا اس طرح کام کرنے سے بیس سال کے اندر اندر آپ کی کاموں کی اس قدر تکمیل نہ ہو جائے گی کہ وہ سیاسی اختیارات جن کے حصول کے لئے آپ بے فائدہ اور تلخ کامی سے جدوجہد کررہے ہیں آپ کے ہاتھ میں خود بخود اس لئے آجائیں گے کہ آپ نے اپنے آپکو اُنکا پورا پورا اہل ثابت کردیا ہے؟"

ان لیڈروں میں سے تین نے جواب دیا کہ "شور مچانا بھی تو ایک کام ہے۔ اور اس وقت یہ شور بھی کام ہے۔ اس وقت اور کچھ نہیں ہو سکے گا جب تک کہ ہم اس جدبشی سرکار کو ہندوستان سے باہر نہ دھکیل دیں گے"

ایک امریکن نے جو ایک بڑی بھاری امریکن تجارتی کمپنی کا منتظم ہے اور جس کے دل میں ہندوستان میں ایک مدت سے رہنے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے مفاد کی نسبت بڑی گہری

ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ کہا کہ "اگر میرا بس چلے تو میں کل ہی تمام یونیورسٹیاں بند کردوں کیوں کہ ان لوگوں کو اس وقت تک کلارک وکیل اور سیاست دان بنانے کے لئے تعلیم دینا سخت جرم ہے جب تک کہ یہ اپنی خوراک پیدا کرنے کے لائق تعلیم حاصل نہ کر لیں۔"

ایک بڑے کالج کے ایک امریکن پرنسپل نے ایک دفعہ یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "ہندوستان میں پورے بیس سال کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہاں کی تعلیم کا تمام نصاب ہی بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں کے لئے دو پشتوں تک تمام ملک میں ابتدائی سکول ہی رہنے چاہیئے تھے اس کے بعد میں جاکر دو پشتوں تک گرامر سکول (یعنی زبانیں سکھلانے کے مدرسے) قائم ہونے۔ اور پھر دو پشتوں کے بعد پہلا ہائی سکول بنایا جاتا اور بلا مبالغہ سات یا آٹھ پشتوں کے بعد صرف ایک واحد یونیورسٹی اپنے دروازے کھولتی۔"

چوتھا حصہ مسٹر گاندھی

ایک چھوٹا سا پتھر کا مکان جو اگر امریکہ کے کسی چھوٹے سے قصبہ میں ہو تو کوئی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ مکان کا ایک چھوٹا سا بدنما پھاٹک ہے سامنے ایک دھوپ سے جھلسا ہوا باغیچہ ہے اور ایک آرائش کے بغیر صاف ستھرا کمرہ ہے۔ جس کی کھڑکیوں کی قطار سے کمرہ میں خوب روشنی پڑتی ہے۔ اسی کمرے میں ایک شخص زمین کے اوپر ایک گدیلے پر اپنی پیٹھ دیوار کی طرف کئے بیٹھا ہے۔ اس کی داہنی جانب ایک ڈھلوان ڈسک کے پاس جو شاید ڈیڑھ فیٹ اونچا ہوگا دو نوجوان بیٹھے ہیں اس کی بائیں جانب ایک چوبی بنچ بچھی ہے۔ جس کے ساتھ تکیہ لگانے کا تختہ بھی نہیں ہے جو مغربی ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لئے ہے۔ اس کمرے میں اگر کوئی اور چیز ہے تو کسی نووارد کی نگاہ اسپر یوں وجہ نہیں پڑتی کہ اسکو دیوار کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے ہوئے شخص سے ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

اس شخص کا سر بالکل منڈا ہوا ہے اور اس پہ

اگر کوئی بال ہے تو سفید ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھیں
چھوٹی چھوٹی اور تاریک ہیں جو بتا رہی ہیں کہ یہ تھک
چکی ہیں۔ گویا کہ یہ شخص ناکام کوشش کرتا رہا
ہے اور اب بلا قائل ہونے کے اس کوشش سے
کنارہ کش ہو گیا ہے۔ باوجود اس کے جب یہ
شخص کلام کرتا ہے تو ان آنکھوں میں ایک چمک
پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے کان بڑے بڑے
اور بہت کچھ آگے کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔
اس کا لباس صرف ایک تہ بند (شائد لنگوٹ)
ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا بالدار جسم۔ اس کے
پتلے دبلے تھکے ماندے بازو اور ننگی دُبلی پتلی پالتی
ماری ہوئی ٹانگیں نظر آ رہی ہیں۔ جنکو یہ مہاتما
بدھ کی طرح سمیٹ کر بیٹھا ہوا ہے اس
کے پاؤں کے تلوے اوپر کی طرف دکھائی دیتے
ہیں۔ اس کے ہاتھ ایک چرخہ چلانے میں مصروف
ہیں جو اس کے آگے زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس کا
دہنا ہاتھ چرخے کو گھما رہا ہے اور بائیاں روئی
میں سے سوت کی تار نکال رہا ہے۔
اس شخص نے دھیمی سادی آواز میں جس
میں مطلقاً کوئی جذبہ نہ تھا کہا "امریکہ کے لئے میرا
پیغام کیا ہے؟" "امریکہ کے لئے میرا پیغام اس

چرخے کی آواز ہے ۔"

اس کے بعد یہ پھر آہستہ آہستہ بولنے لگتا ہے اور ٹھہر ٹھہر جاتا ہے ۔ جب یہ بولنے لگتا ہے تو اس کے پاس بیٹھے ہوئے دونوں نوجوان اس کے سکریٹری اس ڈسک پر رکھے ہوئے کاغذات پر جو کچھ کہ یہ کہتا جاتا ہے لفظ بلفظ لکھتے جاتے ہیں ۔

چرخے کی سریلی آواز برابر آتی رہتی ہے اور اس سوت کا جو یہ امریکہ کے لئے کات رہا ہے اس کتاب کے صفحات پر بار بار ذکر آتا ہے ۔

سترھواں باب

مکتی فوج کا گناہ

ہندوستانی شورش پسند ہمیشہ یہی دُکھڑا دُہراتا ہُوا سنا جاتا ہے کہ باوجود سالہا سال کی برطانوی حکومت کے ہندوستان ابھی تک اتنا غریب ملک کیوں ہے؟"

اگر وہ دور کی اُفق سے اپنی نظر ہٹا کر اپنے گھر کی باتوں پر غور کرے تو اُسے اس سوال کا جواب ہر طرف اُن چیزوں سے مل جائیگا جو پکار پکار کر اُسے ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور سوچنے پر توجہ دلا رہی ہیں۔

مثلاً مویشیوں کا مسئلہ ہی ایک ایسا سوال ہے جس میں ہندوستان کے افلاس کا راز پوشیدہ ہے۔ ہندوستان کو اس کے اپنے مویشی ہی کھائے جاتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ باوجود اس کے وہ بچارے فاقہ مر رہے ہیں۔

سنہ ۲۰-۱۹۱۹ کے برطانوی ہندوستان کے مویشیوں

کے شمار و اعداد سے معلوم ہوا تھا کہ یہاں
مویشیوں کی مجموعی تعداد چودہ کروڑ ساٹھ لاکھ
پچپن ہزار آٹھ سو انسٹھ تھی۔ جس میں سے بلامبالغہ
تخمینہ کے بموجب بھی بے فائدہ مویشیوں کی
تعداد پچاس فیصدی تھی۔ ہر چند کہ اُن سے
کوئی فائدہ کی صورت نہ تھی مگر جو خوراک وہ
کھاتے تھے اس کا کم سے کم تخمینہ یہ تھا کہ ہندوستان
کو گیارہ کروڑ چھہتر لاکھ پونڈ کا سالانہ نقصان یا بالفاظ
دیگر کل برطانوی ہندوستان کے مالیہ اراضی کی
میزان سے چار گنا زیادہ نقصان ہوا تھا۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے ہندو
رہنماؤں نے ملک کے لئے گائے کی اہمیت کو
محسوس کرتے ہوئے اس کا تقدس قائم کر دیا
تاکہ یہ لوگوں کے لئے محفوظ رہے۔ چنانچہ آجکل کی
ہندو دنیا گائے کو متبرک خیال کر کے اُس کی
تعظیم و تکریم کرتی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی لیجسلیٹو اسمبلی
میں ایک فاضل ہندو ممبر نے اسبات کا نہایت احسن
پیرایہ میں ذکر کیا ہے۔ کیا کوئی ہندو بھی اس

لہ ملاحظہ ہو ہندوستان کے زراعتی بورڈ کی کارروائی جو مورخہ
۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء اور مابعد کے دنوں میں بمقام بنگلور مرتب کیگئی تھی نیز
رسالہ پرفرنڈ ٹیبل نمبر ۵۹ بابت جون ۱۹۲۵ء

کی تردید نہیں کر سکے گا۔

"اس کو تعصب کہو یا جذبہ یا مذہبی بلند خیالی سے تعبیر کرو مگر یہ ایک ایسا امرِ واقعہ ہے کہ اس پر کسی کو شبہہ کی گنجایش نہیں کہ ہندو دلوں میں گائے کے پوتر ہونے سے بڑھکر اور کوئی بات زیادہ گھر کئے ہوئے نہیں ہے"

ایک گائے کو جان سے مار ڈالنے سے بڑھکر اور کوئی مہا پاپ نہیں۔ بلکہ یہ دیوتا کُشی ہے۔ متوفی ہز ہائینس مہاراجہ سندھیا والئے گوالیار ایک دفعہ بدقسمتی سے یہ پاپ کر بیٹھے۔ وہ خود ایک دخانی انجن ایک ریلوے لائین پر جو اُنہوں نے ابھی بنوائی تھی چلا رہے تھے کہ ایک گائے خود بخود اُس کی زد میں آگئی اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اس بدقسمتی سے بچا سکتے انجن نے گائے کو کچل دیا۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کے کئی سال بعد اپنے ایک دوست سے ذکر کیا کہ "میں اس کی سزا بھگت کر اور اس کی تلافی کرکے اور برہمنوں کو دان دیکر بھی کبھی اس مہا پاپ کی

لے لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۲۱ء۔ رائے بہادر پنڈت جے دیل بہار گو جلد اول حصہ اول صفحہ (۵۳۰) نیز دیکھو کمنٹریز (دتشریحات) القانسٹو دا لبو کرک اعظم۔ ترجمہ وائٹر ڈاگرے لنڈن - ہکلوریٹ سوسائٹی ۱۹۷۷ء جلد دوم صفحہ ۷۸۔

تلافی نہیں کر سکوں گا۔"

ایک والئے ریاست ہو یا ایک معمولی دہقان گائے اس کی متبرک ماں ہے۔ اس کی موت کے وقت بھی گائے کا موجود ہونا لازمی ہے۔ تاکہ وہ اپنے دم واپسین کے وقت اُس کی دُم پکڑ سکے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ گائے گھر میں موجود رکھتے ہیں تاکہ وقت پر کام آسکے۔ جب متوفی مہاراجہ صاحب کشمیر کے سرگباش ہونے کا وقت قریب آیا تو اس گائے نے جو انکے آخری وقت پر موجود رہنے کے لئے مقرر کی گئی تھی انکے مکان کی سیڑھیاں چڑھکر اُن کے کمرے میں داخل ہونے سے صاف انکار کر دیا یہ دیکھکر ضرورت پیش آئی کہ خود مہاراجہ صاحب کو گائے کے پاس پونچایا جائے اور اتنی جلدی کہ اُن کی روح کو آرام ملے۔

نیز گائے کی پانچ چیزیں یعنے دودھ۔ گھی۔ دہی گوبر اور پیشاب پانچ مختلف چھوٹے برتنوں میں جمع کرکے گناہوں کی بخشش کے لئے پوجا پاٹ کے وقت ایک قطار میں قریب قریب رکھی جاتی ہیں۔ اور بعد ازاں ان پانچوں کو ملاکر کھا لیا جائے تو روح اور جسم کی پاکیزگی کے لئے اس سے بڑھکر اور کوئی چیز مؤثر نہیں سمجھی جاتی۔ ان پانچ چیزوں کا مجموعہ

جیسے "پنچا گاؤ" کہا جاتا ہے ایسی پوتر چیز خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے وہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں جو جان بوجھکر کیئے جائیں۔ ابی ڈوبائیس نے لکھا ہے[1]:۔

"گائے کا پیشاب ہر ایک قسم کی ناپاک چیز کو پوتر کرنے کے لئے مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ہندو چراگاہوں میں جاتی ہوئی گائیوں کے پیچھے اس انتظاری میں چلے جاتے ہیں کہ انکے پیشاب کرنے کا موقع آئے تو وہ اسے پیتل کے برتنوں میں لیکر گرم گرم اپنے گھروں میں لے آئیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ لوگ گائے کا پیشاب اپنے برتنوں میں لے لینے کے انتظار میں رہتے ہیں جس میں سے تھوڑا سا پی لیتے ہیں اور باقی اپنے چہروں اور سروں پر مل لیتے ہیں پیشاب کی اس طریق سے مالش کر لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمام ظاہرا غلاظت پوتر ہو گئی اور پی لینے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ تمام اندرونی غلاظت دور ہو گئی۔"

آبی یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ بہت سے متبرک لوگ روزانہ پیشاب پیتے ہیں اور راسخ الاعتقاد

---

[1] ملاحظہ ہو "ہندوؤں کے رسم و رواج اور توہمات" کا صفحہ ۳۴۔ نیز ملاحظہ ہوں صفحات ۱۵۲۔ ۱۹۵ اور ۵۲۹۔

ہندوؤں نے ابھی تک بھی آئین کے وقت کی اس کارروائی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

ہم مغرب کے رہنے والوں کو اپنی فرصت کے وقت یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم اپنے راسخ الاعتقاد ہندو دوستوں سے ہندوستان میں یا امریکہ میں ہاتھ ملاکر انہیں انتہائی کام پر مجبور کرتے ہیں جبکہ ہم گاؤخور اُن سے ہاتھ ملانے پر اصرار کرتے ہیں۔ کم سے کم ایک پکا ہندو والئے ریاست یہ احتیاط ضرور کرتا ہے کہ جب یورپین سوسائٹی میں جاتا ہے تو ہر وقت دستانے پہنے رہتا ہے مگر اس کی نسبت بھی یہ کہا جاتا ہے کہ لنڈن میں ایک کھانے کے موقع پر جب اس نے دستانے اتارے تو اس کے پاس بیٹھی ہوئی ایک لیڈی کی نظر اتفاقیہ اس انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی پر پڑ گئی۔ اس پر لیڈی نے تعجب سے کہا "مہاراجہ صاحب آپ کی انگوٹھی میں کیا ہی خوبصورت نگینہ جڑا ہوا ہے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

مہاراجہ صاحب نے "بیشک" کہتے ہوئے انگوٹھی اتار کر لیڈی صاحبہ کی رکابی کے پاس رکھدی۔ لیڈی صاحبہ نے جو خود بھی متمول گھرانے کی خاتون تھیں۔ انگوٹھی کو اٹھا ادھر الٹ پلٹ کر

دیکھا پھر نگینہ کو روشنی میں کرکے اُس کی چمک اور آب و تاب دیکھی اور مناسب تعریف اور شکریہ ادا کرتے ہوئے انگوٹھی مہاراجہ صاحب کی رکابی کے پاس رکھدی۔ مہاراجہ صاحب نے لیڈی صاحبہ کی نظر بچاتے ہوئے اپنے خاص ملازم کو جو اُنکے پیچھے حاضر کھڑا تھا حکم دیا کہ "انگوٹھی کو دھوکر واپس دو" اور وہ خود لیڈی صاحبہ سے بے توقف باتیں کرتے رہے۔

یہ ظاہرا جملہ معترضہ جو اوپر بیان ہوا اتنا ضرور ظاہر کردیگا کہ گائے کی ہندوستان میں کتنی وقعت ہے۔ اور جب آپ گاؤں کو علے الصباح سینکڑوں کی تعداد میں شہروں اور مواضعات سے باہر نکل کر آہستہ آہستہ اور نرمی سے جنگلی چراگاہوں کو جاتا ہوا دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ انکی جو وقعت لوگوں کی نظروں میں ہے اس کو وہ اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ اور اس سے نہال ہیں۔ چمکدار نیلے اور سرخ و سفید سنکے اُن کے گلوں میں پڑے ہونگے اور انکی اور انکے سانڈوں اور بچھڑوں کی نگاہوں میں ایک خمار آمیز و اطمینان اور آسایش نظر آئیگی۔

یہ اطمینان اور آسایش کی نگاہ ایک پاس سے

گذرنے والے مسافر کو اندرونی اعتماد محبت کی نشانی نظر آئیگی۔ مگر ہالینڈ اور انگلستان میں آپ کو یہ غیر معمولی اطمینان آسایش اور آسودگی چراگاہوں میں رہنے والے سانڈوں میں بھی نظر آئیگی۔ جس کی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ یہ مویشی نہایت محتاط پرورش کے عادی ہوتے ہیں۔ انکو اچھی خوراک میسر آتی ہے اور اُنکی اچھی طرح سے نگہداشت کی جاتی ہے۔ اور انکو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ مگر ہندوستان میں تمام اور واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک شخص صرف اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ یہاں کی گایوں کی آنکھوں میں جو رسیلا پن ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہوتی ہے کہ ان میں قوت حیات ہی کم ہوتی ہے اور کچھ یہ کہ یہ انسانوں کے ساتھ تنگ مکانوں میں رکھی جاتی ہیں۔ اور آخری وجہ یہ ہوتی ہے کہ انکی آنکھوں کا اوپر کا پردہ آبری بیئرڈ سلے عورتوں کی طرح نہایت خوبصورت ہوتا ہے۔

ہندوستانی سیاست دانوں کا قول ہے کہ پچاس سال کا عرصہ گذرا ہے ہندوستان میں انکے تمام مویشیوں کے لئے کافی چراگاہیں تھیں مگر اس لفظ "کافی" کی اگر مغربی نقطۂ نگاہ سے

تشریح کی جائے تو آجکل کے حالات کچھ اور ہی نظر آتے ہیں۔ مسٹر گاندھی کا ایک ہندوستانی مصنف مسٹر ڈیسائی اس صورت حالات کی حسب ذیل طور پر تشریح کرتا ہے۔[1]

"زمانہ قدیم میں اور نیز مسلمانوں کے عہد میں بھی مویشی عام چراگاہوں میں چرنے چگتے تھے اور جنگلات میں جاکر پیٹ بھرنے کی بھی انہیں عام اجازت تھی اور اُنکے مالکوں کو انکے گذارہ کے لئے عملی طور پر کچھ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مگر سرکار برطانیہ نے مویشیوں کو جو نہ صرف خود بے زبان تھے بلکہ انکے حق میں آواز نکالنے والا بھی کوئی نہ تھا خدا کی اس دی ہوئی قدیمی نعمت یعنے چراگاہوں کی طرف لالچ بھری نگاہوں سے دیکھا اور بعض صورتوں میں تو مالیہ زمین کے اضافہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اور بعض اوقات اپنے دوستوں مثلاً پادریوں ممنون کرنے کے لئے اُنہیں ضبط کر لیا"

یہی مصنف اپنی مندرجہ بالا تحریر کے آخری جملہ کی تائید میں بیان کرتا ہے۔ کہ گورنمنٹ

---

[1] ملاحظہ ہو اخبار ینگ انڈیا مورخہ جون ۱۹۲۶ء جس کے صفحہ (۲۰۰) پر مسٹر وی جی دیسائی کا مضمون ہے۔

نے ایک دفعہ مکنی فوج کو ایک عام چراگاہ کی پانچسو ساٹھ ایکڑ زمین گجرات میں ایک مزرعہ قائم کرنے کی خاطر عطا کر دی۔ اور اس کے بعد اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

چراگاہوں پر گورنمنٹ کی اس مداخلت بے جا کا نتیجہ یہ ہوا کہ آجکل ہندوستان کی کل زمین کی نسبت سے چراگاہوں کی زمین کی مجموعی وسعت تمام ممالک کی چراگاہوں سے کم رہ گئی ہے۔ لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے مویشیوں کی حالت حکومت برطانیہ کے ماتحت نہایت ناقص ہوتی چلی جا رہی ہے۔"

اور وہ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کے اعداد و شماری کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہی چوٹی کے خوش نصیب لوگ ہیں جن کے قبضہ میں چراگاہوں کے سب سے بڑے رقبہ جات ہیں۔

مگر بد قسمتی سے مسٹر ڈیسائی نے شمار و اعداد کا انتخاب کرنے میں ان اعداد کو نظرانداز کر دیا ہے۔ جو حاجت مند ہندوستان کے لئے زیادہ قیمتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس امریکہ میں چراگاہوں

کے بڑے بڑے رقبہ جات ہیں اُنہیں بدل بدل
کر چارہ کی کاشت کرتے ہیں اور اُن کو مویشیوں
کے دیر تک چرنے چگنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔
کہ جس بات کا ہندوستان والوں کو خیال نہیں
ہے۔ اور جس علاقہ میں ایسا رقبہ بہت وسیع
ہے جیسے ملک کی مغربی اطراف میں جہاں اراضی
نہایت خشک یا نیم خشک ہے ہم اپنے زیرِ کاشت
اراضیات کے کل رقبہ کا ⅗ حصہ صرف مویشیوں
کی خوراک پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔
ہمارے کپاس کا علاقہ اپنے کاشت کے ۳۵ فیصدی
رقبہ میں چارہ مثلاً جو۔ مٹر۔ پھلیاں۔ مونگ پھلی
وغیرہ بوتا ہے۔ جس کے مقابلہ میں انسانی خوراک
دس فیصدی رقبہ میں بوئی جاتی ہے۔ ہمارے
اس علاقہ میں جن میں مکی اور سردیوں میں گندم
بوئی جاتی ہے اپنی زیرِ کاشت رقبہ میں ۵۷ فیصدی
رقبہ پر اور جو کے کھیتوں کے زیرِ کاشت رقبہ میں
سے ۸۴ فیصدی پر مویشیوں کا چارہ بویا جاتا
ہے۔ اور صرف ۱۶ فیصدی پر انسانی خوراک
کاشت کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کے مشرقی
علاقہ جات میں زیرِ کاشت رقبہ میں سے ستر فیصدی
پر چارے کی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ اور ہمارے

کل زیر کاشت رقبہ میں سے ⅙ بارانی چارے کے لئے وقف ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں پچیس کروڑ ستر لاکھ ایکڑ اراضی پر صرف مویشیوں کی خوراک کے لئے فصلیں کاشت کی جاتی ہیں جس کے مقابلہ میں صرف سات کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ اراضی انسانی خوراک کی پیداوار کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ اور ہمارے یہاں ہر پانچ آدمیوں کے ہر کنبہ کے لئے ایک گائے ہوتی ہے[۹]۔

یہ شمار و اعداد اس ہندوستانی کے لئے دئے گئے ہیں جس کو اپنے وسیع زراعتی ملک کی بہبودی کے ساتھ دلچسپی ہے۔ اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہاں انکو تفصیل کے ساتھ اسلئے درج کر دیتی ہوں کہ ایسے شخص کی نظر انپر ضرور پڑے۔

ہندوستان کے مویشی کے سوال کے متعلق مزید غور کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے ایک ایسے اطالیہ کی تربیت یافتہ ماہر سے مشورہ کیا جو ہندوستان میں متوطن ہو گیا تھا۔ اور اس شخص نے ایک آدمی کا سا بے صبرانہ جواب دیا کہ جس کی نظروں میں وہ

---

[۹] ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صیغہ زراعت کے بلیٹین نمبر ۵۹۸ کا مضمون زیر عنوان اور فاریج ریبورسنر (ہمارے چارہ کے ذرائع) مطبوعہ گورنمنٹ پرنٹنگ آفس ۱۹۲۳ء صفحات (۳۱۲ - ۳۲۶)

سرکنڈا اتنا خوبصورت نہیں ہوتا جسے ایک طفل نے نہایت خوبصورت سمجھ کر چھپا رکھا ہو۔ اور قیمتی کھیت کو ضائع کر رہا ہو اگر ہندوستانی اپنے مویشی کی ضروریات سے ایسے سنگدل اور کم سمجھ نہ ہوں تو انہیں بھی اہل اٹلی کی طرح کہ جن کے یہاں ہندوستان سے بہتر حالات نہیں ہیں اپنی فصلوں کو بدل بدل کر بونا اور انہیں کی طرح چارے کی فصلیں کرنی چاہئیں[۵] تو اُن کی مشکلات حل ہو جائیگی یہی اطالوی آگے چلکر لکھتا ہے :-

جو فصلیں بدل بدل کر بوئی جاتی ہیں اُن پر بھی اتنا ہی روپیہ خرچ ہوتا ہے جتنا کہ معمولی فصلوں پر ہوتا ہے۔ ایک صدی کا عرصہ ہوا کہ جاوا میں ڈچ لوگوں نے اپنی رعیت سجبوک (کوڑے) کے ذریعہ مجبور کیا تھا کہ وہ اپنی دھان (مونجی) کی فصل بدل بدل کر کھیتوں میں بویا کریں۔ اور ان ڈچوں کی حکومت میں جاوا کی آبادی دو ملین (بیس لاکھ) سے بڑھکر ملین (تین کروڑ) ہو گئی ہے) اور اسی تناسب سے چاول اور نیشکر کی کاشت میں بھی اضافہ ہوا اور یہ اضافہ سرمایہ کے خرچ سے نہیں ہوا

---

۵ اخبار نیک انڈیا مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء کا مضمون از مسٹر گلبیٹی ڈی کاڈلہاک زیرعنوان "دی کیٹل پرابلم" (مسئلہ مویشی) صفحہ (۱۷۷)

بلکہ اس ہوشیار گورنمنٹ کے زبردستی کرنے کی وجہ سے
ہوا ہے۔ ہندوستان میں سجھوک (کورے) کا کوئی
سوال نہیں۔ یہاں کی سرکار تو لوگوں کو قائل کرا کر
ہر بات کرنا چاہتی ہے نہ کہ مجبوری یا سختی سے"
یہی اطالوی اور آگے کہتا ہے[1]

"جہاں گائے ایک بیش بہا ملکیت خیال کیجاتی
ہے (جیسی کہ اٹلی میں ہے) وہاں اس کو پوری
حفاظت اور نہایت محبت کے ساتھ پالا جاتا ہے
اسکے لئے فصلیں بوئی جاتی ہیں اور اسکے رکھنے
کے لئے مکانات بنائے جاتے ہیں۔ یہاں ہندوستان
میں جہاں یہ صرف ایک ادت کی چیز ہے اسکے
لئے سوائے اسکے اور کچھہ نہیں کیا جاتا کہ بازاروں
اور ایسی جگہوں پر جنہیں ہندوستان میں نہایت
غلط طور پر چراگاہ کہا جاتا ہے کھڑی کھڑی بھوکی
مرجائیں۔ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ وہ ان چرا
گاہوں کو جو اذیت کی جگہیں اور انواع واقسام
کی بیماریاں پیدا ہونے کے گھر کے سوائے اور
کچھہ نہیں ہوتیں۔ یک لخت اڑا دیں اور ہر ایک
ہندوستانی کو چاہئے کہ وہ اپنی اراضی کا ⅕ حصہ
ضروری طور پر اپنے مویشیوں کے چارہ اور گھاس

---

[1] دیکھو اخبار ینگ انڈیا صفحہ (۱۷۸)

کی کاشت کے لئے وقف کردے۔"

کوئی شخص بھی جس نے ہندوستان کی عام چراگاہوں کو دیکھا ہو اس اطالوی کے بیانات کی صحت پر اعتراض کریگا وہ حقیقت عام کھڑا رکھنے اور فاقوں مارنے کی جگہیں ہیں۔ اور باوجود زمانہ گذشتہ کے مداحوں کے ذرا بھی وجوہات یہ ماننے کے موجود نہیں ہیں وہ کبھی بھی حال کی نسبت بہتر تھیں۔ تواریخ شاہد ہے کہ یہ ہمیشہ سے ہی چلی آئی ہیں۔ برنیر جو عہد اسلامی میں ہندوستان کی سیاحت کے لئے آیا تھا لکھتا ہے[1]

ہندوستان میں چراگاہوں کی قلت کی وجہ سے بڑی تعداد میں مویشیوں کا رکھنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ یہاں گرمی اسقدر شدید اور اراضی اسقدر خشک ہے کہ سال کے آٹھ مہینوں میں کھیت کے حیوانوں کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اپنے آپکو فاقوں کی موت سے بچانے کے لئے خنزیر کیطرح سے ہر قسم کی گندگی کھا لیتے ہیں"

ہر دیکھنے والے کی آنکھ اور موٹی عقل اور انکے ساتھ انسانوں اور جنگلات کی تواریخ کا مطالعہ ہر ہر ایک شخص کو صورت حالات کا یقین دلا دیتا ہے

[1] ملاحظہ ہو برنیر صاحب کا سفرنامہ سلطنت مغلیہ صفحہ (۳۲۶)

مزید براں وہ عام حالت کہ جس میں ہندوستان میں مویشی رہتے اور بڑھتے ہیں اسباب کی بہت ذلیل ہیں اور یہ طریقے وضع ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ نہایت ہی ادنیٰ درجہ کے مویشی پیدا ہوں۔

مویشیوں کے ماہرین کا قول ہے کہ اگر ایک سو بیس گائیں صرف چراگاہ کی خوراک پر چھوڑی جاویں اور انہیں کوئی اور خوراک نہ دی جائے تو ان میں سے صرف ایک سو زندہ رہ سکیں گی اور وہ مر جائیں گی جو بہترین دودھ دینے والی گائیں ہونگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اچھی دودھ دینے والی گائے اپنی تمام طاقت دودھ کی پیدائش پر صرف کر دیتی ہے۔ اور اس کا بہت تھوڑا حصّہ اپنے جسم کے لئے محفوظ رکھتی ہے۔ لہذا ہندوستان کا یہ رواج کہ گائے بھوکی رکھ کر منتخب کی جاتی ہے گائے کی نسل کو برباد کر رہا ہے۔ اور صرف ناقص گائیں باقی رہتی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں یہاں ہندوستان میں ہر تین سو گائے کے ریوڑ میں صرف ایک سانڈ ہوتا ہے اسلئے اگر وہ بہتر سے بہتر قسم کا بھی ہو تو بھی اس کی طاقت جلد ضائع ہو جاتی ہے مگر یہاں تو بہتر سے بہتر سانڈ کہاں بلکہ جان بوجھ کر بدترین تلاش کر کے رکھا جاتا ہے۔

جب کسی شخص کو اپنے دیوتاؤں کے خوش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً اس کے باپ کی موت پر تو یہ ایک سانڈ مندر پر چڑھانے کی منت میں لیتا ہے۔ اور چونکہ سانڈ سے یہ مطلب نکل سکتا ہے اسلئے وہ قدرتی طور پر مریل سے مریل اور نکمے سے نکما سانڈ منتخب کرتا ہے۔ اور اگر اسے یہ چڑھاوے کا جانور خرید کر چڑھانا پڑے تو وہ سب سے سستا خرید کرتا ہے جو قدرتی طور پر سب سے بدتر ہوتا ہے۔ مندر کے پوجاری یہ چڑھاوے کا سانڈ لیکر اسپر مندر کے چڑھاوے کی مہر لگا دیتے ہیں۔ اور کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے جہاں اس کا جی چاہے بے مہارا پھرتا رہتا ہے۔ اور قریب کے گاؤں کے کسی ریوڑ میں سانڈ بن جاتا ہے۔ چونکہ مویشی کیا بڈھے کیا جوان کیا اچھے یا برے اکھٹے رہتے اور اکھٹے فاقے کرتے ہیں۔ لہذا یہ غریب آپس کے میل جول سے ایک دوسرے کو اور اپنے بچھڑوں کو اپنی بیماریاں اور طرح طرح کے نقائص منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اگر ہندوستان بھر کے نصف مویشیوں کو وہی خوراک دی جائیگی جو باقی نصف بدترین مویشی کھا جاتے ہیں تو دودھ

اس مقدار سے زیادہ پیدا ہوگا جو اب پیدا ہوتا ہے۔[1]

مشرقی بنگال میں جو دنیا کے سب سے زیادہ زرخیز ملکوں میں سے ایک ہے کوئی چراگاہ نہیں اور اس میں چاول اور سن ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنے مویشیوں کے لئے کسی چارے کی کاشت نہیں کرتے اور تھوڑی سی کے چارے پر مویشی پالتے ہیں۔ مغربی بنگال کے بعض اضلاع کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی کاشت شدہ فصلوں میں سے ۲۵ فیصدی بھوکے مویشیوں کی غارت گری کی سے تباہ ہوجاتی ہیں۔ اس ملک کی اراضیات کے گرد کوئی باڑ یا روک نہیں بنائی جاتی لہٰذا کوئی شخص نہایت آسانی کے ساتھ اپنے سوئے ہوئے ہمسایہ کے کھیت میں اپنی گائیں چھوڑ سکتا ہے کیونکہ کیونکہ اس طرح گائیوں کو چھوڑ دینا کوئی بڑا گناہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ متبرک گائے بھوکی ہوتی ہے۔ جس کی خاطر ہمسایہ اپنے کھیت کی بربادی کو اپنی شومئی قسمت کہکر خاموش ہو جاتا ہے میں نے بھوکی مسرتی ہوئی گائیں دیکھی ہیں

---

[1] سیم ہگن باٹم ڈائرکٹر الہ آباد زرعی کلچرل انسٹی ٹیوٹ کی شہادت انڈین ٹیکسیشن انکوائری کمیٹی کے سامنے ۲۵-۱۹۲۴ء

جس کی قدرتی خوبصورتی اسقدر برباد ہوئی ہوئی
تھی کہ وہ انسان کا براثر کہانی پھرتی تھیں۔ اور
ایسے نظارے یہاں ہندوستان میں عام دیکھنے
میں آتے ہیں۔

اسمیں کوئی کلام نہیں کہ بعض اضلاع میں
سبز چارہ بویا بھی جاتا ہے اور موسم برسات میں
بالکل ہی ریگستانی اضلاع کے علاوہ باقی تمام
اضلاع کی چراگاہوں میں کچھہ کچھہ سبز گھاس
بھی نظر آتی ہے مگر جنوری میں یہ تمام گھاس کھائی
جاکر زمین بالکل صاف رہ جاتی ہے اور مویشیوں
کی فاقہ کشی شروع ہوکر اسوقت تک رہتی ہے
جب تک پھر موسم بہار کی بارشیں نہ شروع ہو
جائیں۔

مسٹر گاندھی کے نامہ نگار نے ہمیں بتایا ہے
کہ گائے کا بھوکوں مرنا بھی سلطنت برطانیہ کے
برے اثرات میں سے ایک اثر ہے۔ اور راج
برطانیہ بڑی حد تک اس حالت کا ذمہ وار ہے

ہندوستان میں برطانوی راج کے آنے
سے چھوٹے چھاپوں کی وارداتوں۔ چوری
ڈاکہ زنی اور بیشمار اندرونی جھگڑوں اور لڑائیوں
کی وجہ سے ملک میں سخت مصیبت برپا رہتی

تھی اور ان سب کی وجہ زیادہ تر ان لوگوں کے مویشی ہوتے تھے جنپر حملے کئے جاتے تھے۔ لہذا بغیر سلسل ترتیب کے ساتھ جس کا فائدہ متذ اثر ان دنوں کی بجائے آجکل واضع نظر آرہا ہے۔ کسی خاص علاقے کے مویشی یا تو ماردیئے جاتے یا انہیں نکالدیا جاتا نتیجہ یہ ہوتا کہ چراگاہوں کو جیسی کچھ بھی کہ وہ تھیں کچھ دن کے لئے آرام مل جاتا۔ مویشیوں کی نسل کشی کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جاتی کیونکہ انکی جگہ جو ماردیئے یا نکالدیئے گئے تھے نئے مویشی کا جمع ہو جانا جلدی کا کام نہ تھا۔

اسی زمانے میں انگریزوں نے یہاں آنے سے نکالا اور انہوں نے پہلے ہی پہل ڈاکہ زنی۔ لڑائی جھگڑے اور تباہی کی روک تھام اور امن وآمان قائم کرنے کے لئے ملزموں کو جیل خانوں میں ٹھونسنا شروع کیا۔ یہ کارروائی بالکل وہی تھی جو امریکہ کو فلپائین میں کرنی پڑی۔ اور جس طرح ہم نے فلپائین میں کامیابی حاصل کرلی تھی اسیطرح برطانیہ نے ہندوستان میں بھی کرلی۔ گو اسکو دیر لگی۔ کیونکہ اس نے بہت بڑے علاقہ میں بہت سے لوگوں کا تدارک کرنا تھا۔ چنانچہ پچاس سال ہوئے کہ برطانیہ

کا یہ کام جو اُسوقت تک بھی نہایت مشکل تھا۔ آخر کار قریبًا مکمل ہو گیا اور برطانیہ کی زیرنگرانی اب لوگوں کے جان و مال ایسے ہی محفوظ ہیں جیسے کہ غالبًا ہو سکتے ہیں۔ وبائی بیماریوں کا بھی تدارک کر دیا گیا ہے اور قحط کی روک تھام بھی بہت کچھ کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اپنے ان دشمنوں سے محفوظ ہو کر جو انکو تباہ اور ہلاک کرتے رہتے تھے نہ صرف انسان بلکہ مویشیوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد روٹی کا سوال پیش ہوا لہذا گورنمنٹ نے ان لوگوں کو اسقدر اراضیات اجارہ پر دیں[^1] جتنی کہ ان کی ضرورت کے لئے کافی سمجھیں۔ تاکہ یہ اُن میں اپنی خوراک پیدا کرے اور موت سے محفوظ رہیں۔

ان اراضیات میں سے یہ اپنے لئے تو خوراک پیدا کر لیتے ہیں مگر اپنی گئو ماتا کے لئے خوراک پیدا نہیں کرتے۔ لہذا وہ بچاری فاقوں مرتی ہے اور اس میں گناہ گورنمنٹ یا مکتی فوج کا سمجھا جاتا ہے۔[^2]

---

[^1]: قدیم قانون کے مطابق تمام اراضیات کی مالک گورنمنٹ ہے ۱۲

[^2]: گورنمنٹ نے مکتی فوج پر اس کی نمایاں کامیابی اور اعلےٰ کارناموں کی وجہ سے جو اُس نے (بقیہ حاشیہ ۳۵۳ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۲ کا ہے)

اور خانہ بدوش اقوام کی اصلاح کے متعلق کئے ہیں۔ بہت کچھ بھروسہ کیا ہے۔ ان اقوام کی اصلاح کے متعلق سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ انہیں ایک خاص جگہ میں آباد کیا جائے۔ جہاں رہ کر وہ زراعت مویشی کی نسل کشی اور دستکاری کے کاموں کے ذریعہ اپنی روزی دیانت داری کے ساتھ پیدا کرنا سیکھیں۔ چنانچہ مکتی فوج نے اس مطلب کے لئے اور اچھوتوں کی بہتری کے اعلےٰ تریں کام کے لئے گورنمنٹ سے ضلع گجرات میں اور دیگر اضلاع میں بعض چھوٹے چھوٹے اور بکھرے ہوئے غیر مزروعہ اراضیات کے ٹکڑے حاصل کئے ہیں۔ مگر مسٹر گاندھی کا اخبار گورنمنٹ کی اسی کارروائی پر اعتراض کرتا ہے ملاحظہ ہو اخبار ینگ انڈیا صفحہ ۲۰۶۔ نیز ملاحظہ ہو مکتی فوج کے کمشنر مسٹر بوتھ ٹکر کی کتاب "مکتی فوج" مطبوعہ سابوشش پبلشنگ اینڈ سپلائیز لنڈن ؛

اٹھارواں باب

مقدس گائی

آدمیوں اور اُن کی گائیوں سے جو انکی ملکیت میں قطع نظر کرتے ہوئے حکومت کا اپنے مزرعہ جات میں تجرباتی کام دیکھنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ان تجربات کی ماہیت بین الاقوامی ہے۔ ایک کمتر درجہ کا خانگی مسئلہ یعنے "ننھے بچوں کے لئے دودھ کی فراہمی کے ذرائع" ان تجربات نے حل کردیا ہے۔

صرف وہی لوگ جو خطوط استوا اور جدی کے نیچے والے ملکوں میں رہتے ہیں اُس کی قدر کرسکیں گے کہ ایک کنبے کی محافظت کی ضمانت کا اس کی صحت اور خوشحالی کے قواعد کے رو سے کیا مطلب ہے۔ جزائر فلپائن میں ہمارا اپنا کام محکمہ زراعت اہل فلپائن کے ہاتھ میں دیدیئے جانے کی وجہ سے شروع ہی میں رک گیا تھا۔ اس دن سے مویشیوں کی نسل کشی کا کام صرف ایک ادنےٰ

قسم کے سوانگ کی طرح ہوگیا۔ جسکو دفتر کی کرسیوں پر بیٹھ کر چند بے ہودہ نوجوان ان الفاظ کے رنگ وروپ سے بھرے تھے جو انہوں نے امریکہ کے کسی نہ کسی کالج میں رہکر رٹے ہوئے تھے۔ اور چند مریل اور بے پروائی کا شکار ہونے ہوئے حیوان ایک احاطہ میں بند بکھاریوں کی زندگی بسر کر رہے تھے اور امریکہ کی نو آباد یات والے وہی پرانا دکھڑا دوہرا رہے تھے کہ ان ممالک میں نہ تو گائے کی نسل کشی ہو سکتی ہے اور نہ ہی گائیاں اچھا دودھ مناسب مقدار میں دے سکتی ہیں۔

بالفاظ دیگر اس پہلو میں ابھی ہمارا کام وہاں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ لیکن ہندوستان میں انگریزوں نے ہمیں اس معاملہ میں بہت کچھ جرأت دلائی اور ہماری ہمت بندھائی ہے۔ امپیریل ڈائری فارم واقعہ بنگلور میں انکے نسل کشی کے تجربات نے پورے طور پر ثابت کر دیا کہ کوشش کرنے احتیاط رکھنے اور ثابت قدمی سے کام شروع رکھنے سے ایک گائے اس قابل ہو سکتی ہے کہ وہ خطوط استوکے زیرین ممالک میں بھی پندرہ دفعہ بچے دینے کے بعد بھی اچھا دودھ دیتی ہے جو انسانی زندگی برقرار رکھنے کے قابل ہوئے۔ لکھنو کی گورنمنٹ

ملٹری ڈائری فارم میں میں نے مونگیا نامی گائے
دیکھی جو مخلوط النسل تھی یعنے امریکہ سے منگوائے
ہوئے ایک سانڈ کو ہریانہ واقع پنجاب کے ایک
گائی پر ڈالنے سے پیدا ہوئی تھی۔ مونگیا کا
آٹھواں بچھڑا تھا اور اُس نے بیاہی ہوئی ہونے
کے زمانے کے تین سو پانچ دنوں میں سولہ ہزار
پونڈ (یعنے آٹھ ہزار سیر) اور ساتویں بار کی بیاہی
ہوئے ہونے کے زمانہ میں (۱۴۸۰۰) پونڈ دودھ
دیا تھا۔ ایک اور گائے ایڈنا نامی نے تین سو پانچ
دنوں میں پندرہ ہزار تین سو چوبیس پونڈ دودھ دیا
ان مخلوط النسل گائیوں کے دودھ میں سخت
گرمیوں کے دنوں میں بھی (۴۶۰۵) فیصدی سے
(۵۶۰۵) فیصدی تک تھا جو ہمارے امریکن گھروں
کی ضروریات سے بھی کہیں بڑھکر تھا۔
پھر ان گائیوں کے دودھ کی پیداوار میں موسم
گرما کے دوران میں بھی بہت تھوڑی کمی واقع
ہوتی ہے ایڈنا اپنے ۱۹۲۵ء کے شیرواری کے
زمانہ میں جو ماہ اگست سے شروع ہوا تھا لگاتار
ستر پونڈ روزانہ دودھ دیتی رہی۔ ایڈنا اور مونگیا
تو بلا شک و شبہہ چوٹی کی گائیں ہیں۔ مگر لکھنو کی
دودھ دینے والی گائیوں کے اس ایک سو پانچ

کے رپورٹ میں جو ہندوستانی مغربی مخلوط النسل گائیں ہیں دودھ کی اوسط فی گائے اکیس پونڈ تھی۔ گو یہ ابھی تک بالکل جوان تھیں۔

بہترین دودھیال خالص النسل ہندوستانی گائے پنجاب کی سانیوال گائے ہوتی ہے جس کے ایک دفعہ کی شیرداری کے دودھ کی اوسط مقدار تین ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ اور یہ قد میں اسقدر چھوٹی ہوتی ہے کہ اسے ہمارے ہاں کی دودھ دینے والی بڑی گائے کے ساتھ مفید طور پر مخلوط النسل نہیں بنایا جا سکتا۔ مگر گورنمنٹ ہند نے گذشتہ دس سال کے عرصہ میں اپنے پوسہ کے مزرعہ میں سانیوال اور منٹگمری کی نسلوں کو مخلوط کیا ہے۔ اس سے سانیوال کی گائیں پہلے سے دوگنی مقدار میں دودھ دینے لگی ہیں۔ گورنمنٹ کے دوسرے نسل کشی کے مزرعہ جات میں دیسی سندھی گائیوں کی نسل کو آئرشائر کی گائیوں کے ساتھ مخلوط کرنے کے دلچسپ تجربات ہو رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے ذکر کرنے کا مدعا صرف اس امر واقعہ کا اظہار کرنا ہے کہ ہندوستان میں نوے فیصدی سے زائد گائیوں کے دودھ دینے

کی اوسط فی گائے چھ سو پونڈ سالانہ باقی یوم ایک کوارٹ (جو ۲ء۱۵ پونڈ کے برابر ہوتا ہے) ہے۔

گورنمنٹ نے ۱۹۱۲ء سے یہ تجربات کرنے شروع کئے۔ اس کے بعد جنگ عظیم شروع ہو گئی جس کی وجہ سے باہر کی گائیں آنی بند ہو گئیں۔ جونہی لڑائی ختم ہوئی تو گورنمنٹ نے لکھنو کے مزرعہ کے لئے امریکہ سے دو اور فریشئین سانڈ "سیکس" اور "المر" نامی منگوائے۔ اسی طرح دوسرے مزرعہ جات کے لئے بھی سانڈ منگوائے گئے اور کام شروع ہو گیا۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اصلی طاقت مخلوط النسل گائیوں ہی میں برابر چلتی ہے بہت کچھ کیا جا چکا ہے اور یہ کہ پچاس پچاس درجہ سے زیادہ غیر ملکی خون نتیجہ کو کمزور کر دیتا ہے جس سے بہت سی ملکی بیماریوں کی قبولیت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر مخلوط گائی لصف خون سے زیادہ والی پھر دیسی سانڈ سے ملوائی جاتی ہے۔

اس طرح چیدہ مویشیوں سے مخلوط النسل کرانے انکو بہترین خوراک دینے اور اچھی جگہوں میں رکھنے سے آہستہ آہستہ مگر مکمل طور پر یہ نتیجہ پیدا ہو گیا ہے کہ صدیوں کی ناقص نسل کشی مویشیوں کا فاقوں مرنا۔ ان میں متعدی بیماروں کا پیدا ہونا

اور ناقص ترین مویشیوں کی پیدایش بند ہو گئی ہے۔ انکے مکمل شجرہ ہائے نسب رکھے جانے لگے ہیں اور خاص خاص قسم کی نسلیں پیدا ہونے لگی ہیں۔ اب گویا بہتری کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ اور اس کے امکانات ظاہر ہوتے چلے جا رہے ہیں جب ہندوستان کے لوگ انکو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جائینگے تو وہ انسے بے حد مفاد حاصل کریں گے۔

مویشی پالنے کے شوقین اس امر سے ضرور دلچسپی لیں گے کہ ہندوستان کو ایسی گائے کی ضرورت ہے جو دو کام دے سکے۔ مگر یہ دو کام ہندوستان میں وہ دو کام نہیں جو امریکہ والوں کو مد نظر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ تو ہمیشہ یہ چاہیں گے کہ ایسی گائے ہو جو دودھ اور گوشت دونوں چیزیں مہیا کرے۔ مگر یہاں صرف دودھ درکار ہے یہاں صرف گوشت کی خاطر مویشیوں کی فروخت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں لکھنو میں گائے کا ایک پونڈ (آدھ سیر) گوشت ایک پنس (۱ آنہ) کو مل جاتا تھا۔ ہندوستانی لوگ گائے سے اس مذہبی مقصد کے پورا کرنے کے علاوہ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ تین اور ضروریات پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ انکے لئے دودھ اور

مکھن مہیا کرے دوئم اُنکے گھروں کے جلانے اور فرش اور دیواروں کی لپائی کے لئے گوبر مہیا کرے اور سوئم اُنکے چھکڑوں اور ہل کے لئے بیل بہم پہنچائے۔ دودھ اور بیلوں کے حصول کے لئے نسل کشی ملک کی غرض ہے۔ اور اس سے گورنمنٹ کا یہ منشا ہے۔ یہ کام چلتا رہے۔ اور خوب نبھتا جائے۔

سرکاری فارموں (مزرعوں) میں پدیشی چارے مثلاً مصری تین پتیہ گھاس کی فصل بھی کی جاتی ہے۔ اور چارے کی ترقی اور اصلاح کے متعلق بہت کچھ کوشش کی جاتی ہے۔ اور سیلیج (رکھنے میں سبز چارہ دبانے کے کام) کو کفایت شعارانہ طور پر رکھنے کے طریق بتائے جاتے ہیں۔ ان مزرعہ جات کے آدمیوں کو تصاویر دکھا کر لکچر دینے کے لئے اور کو بند کر کے رکھنے کے طریق سکھانے کے لئے باہر مواضعات میں بھیجا جاتا ہے۔ اور صحیح النسل سانڈ لوگوں کو عاریتاً یا عطیات کے طور پر یا بذریعہ فروخت دئے جاتے ہیں۔

تمام نہایت اچھے مویشی جو لکھنو۔ پوسہ۔ بنگلور اور گورنمنٹ کے دوسرے مزرعوں میں تیار ہوتے ہیں برطانوی ماہرین بڑی ہوشیاری سے اُنکی

نگرانی کرتے ہیں۔ عام حالت کی عمدگی۔ خوش سلیقگی اور سادہ کارآمدگی کے لحاظ سے ان فارموں کے معائنے کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ باتیں ہندوستانی دہقانوں کے لئے بالکل انوکھی ہیں اور وہ لوگ مثلاً ہندوستانی امرا اور ہندوستانی ماہرین جو دہقانوں کو اچھی طرح جلدی انکے مفاد ذہن نشین کرا سکتے ہیں اسطرف توجہ نہیں کرتے۔

ان چند ہندوستانی والیان ریاست کے سوائے جنہوں نے انگلستان میں جاکر اپنے اچھے مویشیوں کے گلوں پر فخر کرنا سیکھا ہے اور ان چند جاگیرداروں کے سوائے جو ملک میں گنتی کے نفوس ہیں مویشیوں کی نسل کشی صرف ایک خاص جماعت کے آدمی کرتے ہیں جنہیں گوالے کہتے ہیں جو نہ تو اس کام کے کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ نہ انکے پاس سرمایہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کام کے کرنے کی لیاقت ہوتی ہے۔

میں نے کہیں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جس سے میں یہ کہہ سکوں کہ یہ لوگ اس ضروری تبدیلی اور اصلاح کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ البتہ ایسی کئی مثالیں موجود نظر آتی ہیں کہ گورنمنٹ نے ایک صحیح النسل سانڈ گاؤں

والوں کو اچھی نسل کی بڑھانے کے لئے عاریتاً دیا اور وہ ناجائز استعمال کی وجہ سے نکما کرکے واپس دیا گیا۔ چنانچہ اس سانڈ کو میری موجودگی میں سرکاری شفا خانہ حیوانات میں رکھا گیا اور میں نے بچشم خود دیکھا کہ اسے بھوکا مارا گیا تھا اور نہایت بے رحمی کے ساتھ مارکر اسقدر زخمی کیا گیا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ کے زخموں کو جو ظاہرا لٹھوں کی زدوکوب سے ہوئے تھے اور متعفن تھے کہ اچھا کرنا بمشکل تمام ممکن معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ایک انگریز افسر سے جو اس شفاخانہ کا مہتمم تھا دریافت کیا کہ اب تم اس کا کیا تدارک کروگے تو اُس نے جواب دیا کہ "غالباً گاؤں کے نمبردار پر جرمانہ کیا جائیگا۔ مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ انسانی خاصہ ہے کہ وہ اس چیز کی کچھ قدر نہیں کرتا کہ جس پر اس کو کچھ خرچ نہ کرنا پڑے۔ اور وہ مویشیوں کی اصلاح کے لئے کچھ نہیں دیتے"۔

اب سرسری طور پر ایک اور امر کو لیجئے۔ ان لوگوں سے نسل کشی میں معقول انتخاب کرنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے جو ایک کاٹے کے

دودھ تک کی مقدار حساب رکھنے سے اس وجہ
سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی
نعمت کا وزن کرنا یا ناپنا ہی بے ادبی ہے۔
پنجاب کے دودھ دوہنے والے لوگ کہتے ہیں
"ہم ایسا کبھی نہیں کر سکتے اگر ہم ایسا کرینگے تو
ہمارے اپنے بچے مرجائیں گے"
علاوہ بدترین مویشی کے انتخاب۔ فاقہ کشی کے
پست قامت مقدس سانڈوں سے نسل کشی کرنے
کی ایک تیسری وجہ دودھاری گائیوں کے ایسی
ملک سے کہ جس میں دودھ پیدا کرنے کی قابلیت
پہلے ہی بہت کم ہے علیحدہ کرنا ہے کرنال میں
گورنمنٹ نے اس بات کا امکان اچھے طریق سے
کر دیا ہے کہ ملک میں وافر دودھ پیدا کر کے
اس کو ہزاروں میل دور کے شہروں میں بڑی مقدار
میں لے جانے کے کتنے فائدے ہیں۔ کلکتہ کے
دودھ اور مکھن کے ان کارخانوں نے جو گورنمنٹ
کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں اسبات کے امکان
کو بھی ثابت کر دیا ہے کہ دودھ مفصلات سے
بڑے شہروں میں لایا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ہندوستانی
دودھ بیچنے والے کو ان باتوں میں کوئی فائدہ نظر نہیں
آتا۔ اس کو یہی لت پڑی ہوئی ہے وہ دودھ دینے

والی دیسی بہترین گائیں باہر سے خرید لائیگا۔ اور انکو بچھڑوں سمیت شہر میں لاکر اُنکے دودھ دینے کے زمانہ تک رکھے گا بلکہ دودھ دینے کی مدت لمبی کرنے کے لئے اُن کی بچہ ان سے دور کردیگا اور خشک ہونے پر اُنہیں قصاب کے ہاتھ فروخت کریگا - یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر کیا جا رہا ہے۔ جس سے بہترین گائیں ماری جارہی ہیں اور ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جارہا ہے -

ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ وہ دودھ کے خشک ہوجانے کے بعد گائی کی شہر میں پرورش نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی اسے کسی دوسری جگہ بھیجنے کا انتظام کرسکتے ہیں۔ لہذا خشک ہونے کے بعد گائے کو ضائع کردیتے ہیں اس طریق سے انہیں نہ صرف اس کی قیمت خرید میں بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے بلکہ اچھی گائے کے ساتھ ہی اس کی سب خوبیاں بھی فنا ہو جاتی ہیں[1]

گورنمنٹ نے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے خاص تہوار پر جس کا نشان امتیازی گائے

[1] شاہی دودھ مکھن کے کارخانہ کے ماہر مسٹر ڈبلیو سمتھ کا مضمون جو اُس نے جنوری ۱۹۲۲ء کو اگریکلچرل جرنل آف کی جلد ہفت دہم کے پہلے حصہ میں لکھا ہے۔

قربانی ہوتا ہے تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار رہنا
سیکھ لیا ہے۔ ان تیوہاروں کے دنوں میں ہندوؤں
کے دلوں کا اشتعال ایک خاص خطرناک صورت
اختیار کر لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ بلوے۔ خونریزی
اور تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ کیونکہ گائے کی قربانی
کا مطلب سوائے اسکے اور کچھ نہیں سمجھا جاتا کہ
ہندوں کی نہایت قابل پرستش گائے خود اُن
کی آنکھوں کے سامنے بلکہ خود ان کی گود میں
ایک ملیچھ کے ہاتھ سے قربان کر دی جاتی ہے۔
اس قربانی کی یاد تازہ ہوتے ہی ہندو اپنے
سے باہر ہو جاتے ہیں حالانکہ خود مسٹر گاندھی اپنے
اخبار ینگ انڈیا کی اشاعت مورخہ ۵ نومبر ۱۹۲۵ء
میں لکھتے ہیں:۔

"ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ گائیوں کی اُس
تعداد سے کہ جنکی مسلمان قربانی کرتے ہیں سوگنا
زیادہ گائیں تجارت کی غرض سے ذبح کی جاتی
ہیں یہ قریباً سب کی سب گائیں ہندوں کی ملکیت
ہوتی ہیں۔ اور اگر ہندو لوگ گائے کی فروخت سے
قطعی انکار کر دیں تو بوچڑوں کی تجارت مفقود
ہو جائے"

۵۱ بقرعید کے تہوار کے موقعہ کی قربانی۔

مندرجہ بالا افتتاحی مضمون کی اشاعت سے چار ہفتہ بعد مسٹر گاندھی پھر اس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اور "روشنی ڈالنے والے اقتباسات" کے زیرِ عنوان اس انڈین انڈسٹریل کمیٹی کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہ جس کے اجلاس بنگال اور صوبہ جات متوسط میں ہوئے تھے فرماتے ہیں[۵]۔ اس کمیٹی نے ان گائیوں کے ذبح کے متعلق بیانات لئے جو گوشت اور چمڑے کی تجارت کی غرض سے ذبح کی جاتی ہیں۔ کمیٹی سوال کرتی ہے کہ گوشت اور چمڑے کی اس تجارت کی نسبت گرد و نواح کے ہندوؤں کا کیا رویہ ہے؟ اور یہ کہ اُن مذبح خانوں سے مقامی ہندوؤں کے دلوں میں اشتعال پیدا ہونے کی کیا صورت رہتی ہے؟

گواہ جواب دیتا ہے :-

ہندوؤں کے دلوں میں لالچ کے مقامی خیالات پیدا ہوئے اور انہوں نے کسی نفرت کا اظہار نہیں کیا کیونکہ آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے ممبرانِ میونسپل کمیٹی ان مذبح خانوں کے حصہ دار ہیں۔ بلکہ برہمن اور ہندو بھی اسکے پائے جاتے ہیں"

[۵] ملاحظہ ہو اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ (۴۱۲)

اسپر مسٹر گاندھی نکتہ چینی بے فائدہ قائم کرتا ہے:۔
"اگر دنیا میں کوئی اخلاقی گورنمنٹ موجود ہے
تو ہم کسی نہ کسی دن اسکے جواب دہ ہونگے"
یہ ہندو کے ہاتھ سے گائے کو ذبیحہ کے لئے
فروخت کرنے کی مثال دیتے وہی ہندو جو ایک
مسلمان کے مندر کے دروازے کے قریب گائے
کے ذبح کرنے کی خاطر بلوا کھڑا کر کے کشت خون
کی نوبت لے آئے گا) ایک ایسا سوال پیدا کرتی
ہے جس پر سرسری طور پر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل
سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔
ہم مغربی باشندے اس خیال سے کہ ایک
شخص کے دلی خیالات جنکا اظہار اس کے الفاظ
یا خیالات سے ہوتا ہے خود اس پر اور ہم پر یکساں
وقعت اور اثر رکھتے ہیں اور ہم غلط فہمی کے متواتر
خطرہ میں پڑے رہتے ہیں۔ اس غلط فہمی کے
پڑ جانے کا امکان ہندوستانی کی سہولیت انگریزی
بولنے کی قابلیت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم یہ فرض
کر لیتے ہیں کہ اس کی زبان اس کے خیالات
کی پوری ترجمانی کر رہی ہے مثلاً وہ کہتا ہے
کہ وہ ہر زندگی کو متبرک سمجھتا ہے اور تمام جیوانوں
کی ہمدردی اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری

ہوئی ہے۔ امریکہ میں تقریر کرتے ہوئے اس نے اہل ہنود کی لطیف سریع الحسی کا جیو ہیا کے متعلق بھی ذکر کیا۔ اور یہ بھی بیان کیا کہ ہماری بے انتہا مادہ پرستی اور اصول زندگی کے اسرار و عوامض کی فہمیہ سے ہماری بے مایگی اس کے دل میں نفرت پیدا کرتی ہے۔

اگر تم اس کی ظاہرا صریح الفاظ سے یہ فرض کر لو کہ ہندوستان میں ایک اوسط درجہ کے ہندو کا مدعا یہ کہنے کا ہے اس کے دل میں ایک حیوان کی زندگی کی وہی قدر و قیمت ہے جو عام طور پر تمام بنی نوع انسان کے دل میں ہے تو تم نے اس کا مطلب سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔

ایک دن میں نے بنگلور کے سرکاری مزرعہ کے ایک نہایت دانا برہمن فورمین سے کہا کہ:۔

"مجھے نہایت افسوس ہے کہ ہندوستان بھر میں تم لوگ بہت سے بیلوں اور کئی گایوں کی دموں کے مہروں کو توڑ مروڑ کر سخت ظلم کرتے ہو۔ وہ سامنے والے چھکڑے کے ساتھ جُتے ہوئے بیلوں کی طرف دیکھو اُنکی دم کی ہڈیوں کے تمام جوڑ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ انکو اس طرح توڑنے سے بیلوں کو سخت تکلیف

اور درد ہوتی ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان جوڑوں کے ٹوٹنے سے دُم ہی ٹوٹ کر گر جاتی ہے"

اس کے جواب میں نوجوان برہمن نے بے پرواہی سے کہا "بالکل درست ہے کہ ہم اُنپر ظلم کرتے ہیں مگر اس کے سوائے چارہ نہیں۔ کیونکہ اُنکی دُم کو مروڑے بغیر یہ جلدی نہیں چلتے"

آپ کلکتہ میں ہوڑہ کی پر رونق پل پر کھڑے ہو کر گھنٹوں تک اس پر سے گذرنے والے چھکڑوں کو دیکھتے رہیں تو آپ کو اُن کے ساتھ جتے ہوئے درجنوں بیل ایسے نظر آئیں گے جنکی دُمیں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں کا ایک ہار بنی ہوئی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ چھکڑا ہانکنے والا بیل کو لاٹھی سے مارنے کی بجائے نہایت آسانی کے ساتھ اس کی دُم پکڑے ہوئے اور اس کو وقتاً فوقتاً زور سے مروڑتا چلا جاتا ہے۔ اگر تم ایک بیل کے جتے ہوئے چھکڑے میں سوار ہو جاؤ اور ہانکنے والا تمہارے آگے بیٹھا ہوا ہو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنی اس حرکت سے آسانی کے ساتھ بیلوں کو ہانک رہا

ہے۔ اور ساتھ ہی کبھی کبھی اپنے لمبے لمبے سخت ناخن وہ بیل کے خصیوں پر چبھوتا جائیگا۔
نگران جابرانہ حرکات کی روک تھام صرف برد بسی ہی کرتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ ایک نہایت عجیب بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک شخص جسکا بیل ہے اس کا بہترین سرمایہ ہے وہ جان بوجھ کر اس پر زیادہ بوجھ لادتا ہے اور پھر اس نیم فاقہ کش کو اسوقت تک ہانکتا رہتا ہے جب تک کہ وہ مر کر گر نہ جائے۔ مدراس کی عمودی پہاڑی چڑھائیاں نوان بیلوں کے لئے قتل گاہ ہوتی ہیں۔ ایک شخص ہر روز دیکھتا ہے کہ گویہ سر سے دُم تک ان پر داغ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور باوجود تازہ زخموں اور دوڑوں کے ان کو ڈنڈوں کے زور سے پہاڑ پر چڑھنے کے لئے اسوقت تک مجبور کیا جاتا ہے جبتک کہ یہ گر کر مر نہ جائیں۔ اگر کوئی انگریز افسر حیوانوں کے ساتھ اس وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف کارروائی کر دیتا ہے۔ مگر اس ملک میں انگریزوں کی تعداد برائے نام ہے۔ تاہم اُنسے بھی بہت کم تعداد اُن ہندوستانیوں کی ہے کہ جن کو ان سبے

زبانوں کے ساتھ یہ ظالمانہ سختی ہوتی ہوئی دیکھ کر رحم آئے یا جنگلوں بیکس مخلوقات پر ایسی بیجا سختی ہوتے دیکھکر غصہ آئے۔

ہندوستان کے بہت سے حصوں میں "پھوکا" کا عام رواج ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گائے دودھ زیادہ مقدار میں اور زیادہ عرصہ تک دیتی رہے۔ پھوکا کئی طریقوں سے کیا جاتا ہے جن میں بہت عام یہ ہے کہ ایک ڈنڈا جس کے سرے پر کھردرا گھاس لپیٹا ہوتا ہے کھجاوٹ پیدا کرنے کے لئے گائے کی فرج میں داخل کرکے گھمایا جاتا ہے۔ اس سے گائے کو سخت تکلیف ہونے کے علاوہ بانجھ پن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دودھ مکھن کے کارخانہ دار کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ اس لئے تو ہر حال میں اس کے دودھ کے خشک ہو جانے کے بعد اسے ذبیحہ کے لئے بیچ ہی دینا پڑتا ہے مسٹر گاندھی نے اسکی ستند بیش کی[1] ہے کہ کلکتہ کے دودھ مکھن کے کارخانوں کی دس ہزار گائیوں میں سے پانچ ہزار کے ساتھ روزانہ

---

[1] اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۶ مئی ۱۹۲۶ء صفحات ۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸

بچھو کا کا عمل کیا جاتا ہے۔

مسٹر گاندھی نے ایک اور ثبوت اس بات کا پیش کیا ہے کہ گائے کے ذریعہ ایک قسم کا رنگ بنایا جاتا ہے جسے ہندوستانی نہایت پسند کرتے ہیں اور جسے پیوڑی کہتے ہیں[1] مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ "یہ رنگ اسطرح بنایا جاتا ہے کہ گائے کو صرف آم کے پتے کھلائے جاتے ہیں۔ اور کسی قسم کی خوراک تو کیا پینے کے لئے پانی بھی نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ گائے پیشاب کے ذریعہ سے یہی رنگ نکال دیتی ہے جو بازاروں میں بڑی قیمت کو بک جاتا ہے۔ وہ گائے جس سے ایسا سلوک کیا جائے بہت جلدی اور نہایت تکلیف کے ساتھ جان دے دیتی ہے"

ایک دودھ دینے والی نوجوان گائے جب شہر میں لائی جاتی ہے تو اس کا بچھڑا اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ مگر ہندو دودھ مکھن کے کارخانہ دار کو اس بچھڑے کی نہ تو ضرورت ہی ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے مذہبی خیال کے لحاظ سے اسے ہلاک کر سکتا ہے۔ لہذا وہ اس کے رکھنے کے اخراجات اور اسکو مار دینے کے پاپ سے بچنے کی

---

[1] اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۶ مئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۶۷

خاطر اور ترکیب نکالتا ہے۔ یعنے وہ اسے اسکی
ماں کے آغوش محبت سے علیحدہ کر دیتا ہے۔
اور اپنے مذہب کی اس تلقین کے خوف سے
کہ "وہ جو بچھڑے کو گائے سے علیحدہ کرے گا
اپنے دوسرے جنم میں تکلیف بھوگے گا" اسکی
ماں کے دودھ میں سے چوتھا حصہ یا لفصف
پیالی دودھ اس کے لئے روزانہ مقرر کر دیتا ہے
مگر یہ وظیفہ جس کا تقرر مالک کے ضمیر کو موت سے
بچا لیتا ہے مگر بچارے بچھڑے کی جان بچانے
کے لئے بالکل ناکافی ہوتا ہے لہذا وہ دربدر لڑ
کھڑا کر اسوقت تک پھرتا رہتا ہے جب تک کہ اس
کی کانپتی ہوئی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے
کے قابل رہتی ہیں۔ پھر جب اس کا آخری وقت
آجاتا ہے تو مالک اس چھوٹے حیوان کی کھال
کھنچوا لیتا ہے۔ اور اس میں بے ڈھنگے طور پر بھوسہ
بھر کر کھال سی لیتا ہے۔ ٹانگوں کے ساتھ چار
چھڑیاں باندھ دیتا ہے اور جب صبح کو اپنی گائے
دودھ بیچنے کے لئے باہر لیکر جاتا ہے تو اپنی دستکاری
کو اپنے کندھے پر لادکر ساتھ لے جاتا ہے۔ جب
یہ شخص ایک گاہک کے گھر کے دروازہ کے سامنے
اپنی گائے کا دودھ دوھنے کے لئے ٹھہرتا ہے تو

اس ماں کے سامنے اس چیز کا مجسمہ جو کبھی اُس کا بچھڑا تھا اس غرض سے رکھ دیتا ہے کہ وہ اس دیکھ کر محبت مادری سے زیادہ مقدار میں دودھ اتار دے۔ علاوہ ازیں بڑے بڑے شیر خانوں میں نوزائیدہ بچھڑے صبح کے وقت گدڑے کی ان گاڑیوں پر جو اُن کے دروازہ موجود ہوتی ہیں پھینک دیئے جاتے ہیں جہاں وہ کوڑے ڈھیروں پر پھینک دیئے جاتے ہیں کہ جہاں وہ دوسرے بے کسوں کی طرح دم توڑ کر رہ جاتے ہیں۔

دودھ دینے والی بھینس جزائر فلپائین کے "کاراباؤ" کی طرح ہندوستان کی نہایت مفید جانور ہے۔ دہلی کی بہترین نسل کی بھینس سالانہ چھ ہزار سے دس ہزار پونڈ تک دودھ دیتی ہے۔ جس میں ۵ء۷ فیصدی سے ۹ فیصدی تک مکھن ہوتا ہے۔ بھینسا چھکڑوں اور ہل کے لئے ایک مضبوط حیوان ہوتا ہے مگر چونکہ اس کے پالنے کیلئے اس کی ماں کا بہت زیادہ دودھ خرچ کرنا پڑتا ہے لہذا یہ بہت مہنگا پڑتا ہے اسی وجہ سے بھینسوں کا دودھ بیچنے والے بھینس کے بچھڑے کو فاقوں مار دیتے ہیں۔ اخبار "بنیگ انڈیا"[۱] ایسی

[۱] ینگ انڈیا مورخہ ۶ مئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۶۷)

بہت سی مثالیں پیش کرتا ہے جن سے ان بچھڑوں سے انکا مالک خلاصی حاصل کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ :-

"بھینس کے بچوں کو مرنے کے لئے گلیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جب وہ بھوک سے بے دم ہو کر گر جاتے ہیں تو اکثر ٹرمہوے۔ موٹر کاروں اور گاڑیوں کے نیچے کچلے جاتے ہیں ان بچھڑوں کو اکثر رات کے وقت اسطبلوں سے نکال دیا جاتا ہے تاکہ ان کی ماں کا سارے کا سارا دودھ فروخت کر لیا جائے"

علاوہ ازیں ان بچھڑوں کو ان کی ماں کے قریب ہی کسی جگہ ایک کھونٹی سے باندھ دیا جاتا ہے اور وہیں یہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

بھینسوں میں چونکہ پسینہ جذب کرنے کی گلٹیاں نہیں ہوتیں لہذا یہ گرمی کی بہت کم برداشت کر سکتی ہیں اور انہیں کبھی حفاظت کے بغیر نہیں چھوڑا جانا۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اخبار ینگ انڈیا سے ان بچھڑوں کو موت کی گھاٹ اتارنے کے متعلق ایک یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ "ان غریبوں کو اکثر کارخانہ کے اس حصہ میں باندھ دیا جاتا ہے

جہاں دھوپ اور گرمی سخت ہوتی ہے اور اسطرح
کارخانہ وار نہایت بیدردانہ طریق سے بچھڑے کی
جان لے لیتا ہے"
شہروں کے کارخانہ جات میں تو بھینس کے
نر بچھڑے سے اس طرح خلاصی پائی جاتی ہے۔
اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مفصلات میں ان کا
کیا حشر ہوتا ہے۔ اسکے متعلق مسٹر گاندھی فرماتے
ہیں[1]
"گجرات (کاٹھیاواڑ) میں بھینس کے نر بچھڑے
کو مرتے دم تک دودھ نہیں دیا جاتا اسی ملک
کے دوسرے حصوں میں اسے جنگل میں آوارہ
کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ درندوں کا شکار ہو جائے
بنگال میں اسے اکثر جنگل میں باندھ دیا جاتا ہے
تاکہ یا تو یہ بھوکا مرجائے یا کوئی درندہ اسے ہضم
کر جائے اور یہ فعل انہی لوگوں سے سرزد ہوتا
ہے جو حیوانوں کو جان سے کبھی نہیں مارتے
خواہ وہ کیسی ہی شدید تکلیف میں مبتلا ہوں"
اسی مثال سے دیہاتیوں کی اس گائے
کا حشر یاد آجاتا ہے جو اسوقت جبکہ بہت زیادہ
بیمار ہو جائے یا مزید خدمت گذاری کے بالکل

---

[1] اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۶ مئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۶۷

قابل نہ رہے تو اسے گاؤں سے باہر نکال دیا جاتا ہے جہاں وہ کھڑی اسوقت تک فاقہ کشی کرتی رہتی ہے جبتک کہ وہ اپنی ٹانگوں اور سینگوں سے اپنے آپکو دشمنوں کے حملوں سے بچائے رکھنے کے قابل رہتی ہے۔ اس کے بعد وہ گر پڑتی ہے اور گاؤں کے بھوکے کتے اور کوے اسے کھا جاتے ہیں

کوئی مغربی سیاح خواہ وہ بجلی کی تیزی سے سفر کر رہا ہو ہندوستان میں ان کتوں کو دیکھے بغیر نہیں گذر سکتا۔ یہ ریل کے ہر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گاڑیوں کی کھڑکیوں کے آگے تاک لگائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا برزخ کے بھیانک خواب میں اُن کے جسم تمام ہڈیاں اور زخم نہایت بدنما منظر دکھاتی دیتے ہیں۔ یہ اپنی ڈراؤنی آنکھوں سے ہر ایک کو لالچ بھری اور نفرت و مصیبت آمیز نگاہوں سے گھورتے ہیں۔ تمام ملک میں انکے گلوں کے گلے موجود ہیں۔ جن میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ قصبات میں یہ اوارہ گائیوں اور بکریوں سے بازار کی دکانوں اور گندی نالیوں میں گری ہوئی خوراک کے لئے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

بیماریوں سے اور زخموں میں کیڑے پڑ جانے سے یہ اپنی جان سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اکثر جنگلی دیوانے گیدڑوں سے کاٹے جاکر خود دیوانے ہو جاتے ہیں۔ اور اسی دیوانگی کے حال میں راتوں کو آبادی کی گلیوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

مگر ہندو مذہب کے رو سے اُن کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ انکی نسل کشی کو بند کیا جا سکتا ہے اور نہ انکی تعداد کم کی جا سکتی ہے اور چونکہ کتّے کا جسم ناپاک ہوتا ہے اس لئے اُنکی کرم خوردہ اور گندی ہڈیوں یا بہتے ہوئے زخموں کے مداوا کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔

اس بارہ میں حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ مباحثہ اخبار ینگ[1] انڈیا کی اشاعتوں میں درج ہوا ہے۔ اس معاملہ کی اصلیت یہ تھی کہ احمد آباد میں ساٹھ دیوانے کتے مارے گئے۔ جو ایک کارخانہ دار (مالک مِل) کے احاطہ میں جمع ہو گئے تھے۔ کارخانہ دار نے جو ایک ہندو تھا

[1] اخبار ینگ انڈیا بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء۔ ۱۱ نومبر ۱۹۲۶ء کے پرچہ میں مندرجہ ذیل شمار و اعداد ان دیوانے کتوں کے کاٹے ہوئے مریضوں کے علاج کے متعلق شائع ہوئے جنکا علاج احمد آباد کے سول ہسپتال میں ہوتا ہے: جنوری سے دسمبر ۱۹۲۵ء تک (۱۱۱۷) مریض۔ اور جنوری سے ستمبر ۱۹۲۶ء تک (۹۹۰)

خود ان کتوں کے مارنے کا حکم دیا تھا۔اس کی وجہ سے لوگوں میں بڑی شورش پیدا ہو گئی اور ہندو ہیومینی ٹیرین لیگ نے یہ معاملہ مہاتما گاندھی کی خدمت میں اُنکے مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے پیش کیا اور اُن سے دریافت کیا کہ :۔

"جب ہندو مذہب کسی جان دار کی جان لینے کی ممانعت کرتا ہے .... تو کیا آپ کے خیال میں دیوانے کتے کو مار دینا ٹھیک ہے؟.... کیا وہ شخص جو اِن کتوں کو ہلاک کرتا ہے اور وہ جس کے حکم سے یہ ہلاک کئے جاتے ہیں دونوں پاپی نہیں؟ .... احمد آباد کی میونسپل کمیٹی کے سامنے عنقریب دیوانے کتوں کو مار دینے کا ایک ریزولیوشن پیش ہونے والا ہے .... کیا ہندو مذہب کے مطابق ایک حیوان کو اختہ کرنا جائز ہے؟"

مہاتما گاندھی کا مندرجہ ذیل جواب ہندو مذہبی خیالات پر خوب روشنی ڈالتا ہے :۔

"اس امر کے متعلق کبھی اختلاف رائے نہیں ہو سکتا کہ ہندو مذہب کے رو سے ایک جاندار کو مار دینا پاپ ہے .... ہندو دھرم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ قربانی کی خاطر مار دینا "ہمسہ" (تعدی) نہیں ہے۔ مگر اس میں صرف نصف

صداقت ہے ..... جو ناگزیر بات ہو وہ پاپ ہیں خیال کی جاتی تھی یہاں تک کہ روزانہ عمل کے علم نے نہ صرف ناقابل گذیر تعدی کو جو قربانی کے لئے کسی کی جان لینے میں کی جاتی ہے۔ اُس کی اجازت دی ہے۔ بلکہ اسے ایک قابل تعریف کام خیال کیا جاتا ہے .... مگر وہ شخص جو ان جانداروں کی جان کا ذمہ دار ہے جو اس حفاظت میں رکھے گئے ہیں اور جو رشی لوگوں کی سی نیکیاں نہیں کرسکتا اور دیوانے کتوں کو مروا سکتا ہے اس کے ذمہ دو متضاد فرایض عائد ہوتے ہیں۔ یعنے اگر وہ دیوانے کتے کو ہلاک کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ ایک پاپ کرتا ہے۔ اور اگر وہ اسے مار دینے کا حکم نہیں دیتا تو ایک مہا پاپ کرتا ہے لہذا وہ پاپ کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ واقعی کوئی چارہ نہیں کہ آہمسہ (عدم تعدی) کی اس متبرک سرزمین میں دیوانے کتے وغیرہ کو مارنے کا سوال نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ ایک دیوانے کتے کو یا اس کو مار دینا جو اس دیوانے کی زہر سے موثر ہو سکتا ہے گناہ نہ ہوگا مگر ایک دیوانے کتے کی پرورش کرنا بھی پاپ ہے"

آہمسہ کی اس سرزمین کے ایک بھوکے مرتے ہوئے کتے کو ایک روٹی کا ٹکڑا ڈالنا یا اس کو

(مار کر) مصیبت سے نجات دینا ایک عجیب قسم کا پاپ ہے۔ مسٹر گاندھی پر ایک دیوانے کتے تک کو مار دینے کے حق میں رائے دینے سے ہندوؤں کی طرف سے اس قدر بوجھ آن پڑا۔ کہ وہ اس بوجھ سے بمشکل سبکدوش ہوئے ہیں۔

چونکہ اس مشکل کے حل کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنے حیوانوں کو خصّی کر دینے کا باقی رہ جاتا ہے اور اس پر بھی مذہبی ممانعت اطلاق پذیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ کارروائی بھی افزائش نسل و حیات کی مانع ہے۔ لہذا اس دیوانے کتے کے مصائب بھی ہندوستان کی دوسری مصائب کی طرح ایک متوالے چکر میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

انیسواں باب

رحم کی صفت

مسٹر گاندھی کے عملہ کا ایک وفادار الزام لگانے والا کہتا ہے کہ "ہم گائے کے محافظ بنے ہوئے ہیں اور مسلمانوں سے اس کے متبرک نام پر جھگڑتے رہتے ہیں مگر اس کا خالص نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوا کہ گئو ماتا کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہے[1]"

آپ تحریر کرتے ہیں کہ:-

"باوجود اس کے کہ ہم اپنی روحانی حالت کے متعلق ڈینگیں مارتے رہتے ہیں مگر ہم ادنے حیوانوں پر شفقت کرنے اور انسانیت کے نقطہ نگاہ سے بہت ہی پیچھے ہیں[2]۔"

[1] اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۶ مئی ۱۹۲۶ء مضمون منجانب مسٹر وی جی ڈیسائی صفحہ (۱۶۷)

[2] اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۲۶۔ اگست ۱۹۲۶ء صفحہ (۳۰۳)

حیوانوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنے کے
خلاف قانون ہندوستان میں سرکار انگریزی
کے راج کے ابتدائی سالوں میں نافذ کیا گیا تھا۔
مگر ایسا قانون دنیا کے کسی ملک میں صرف اسی
وقت موثر ہو سکتا ہے جبکہ عوام کی رائے اس
کے حق میں ہو۔ مگر اس کے متعلق مسٹر گاندھی کے
اخبار کی رائے اس آواز کی طرح سے ہے جو کسی
ویرانہ میں چلا کر نکالی جائے مگر اس سے وہاں نہایت
خفیف صدا پیدا ہو۔

اگر لوگوں کے دلوں میں رحم نہیں۔ اور اگر پولیس
جو عوام میں سے ہی بھرتی کیجاتی ہے۔ اپنے دل
میں سوائے اس کے اور کوئی خوبی نہ سمجھے کہ
اُسے اپنی جیبیں پر کرنے کا موقعہ ملے۔ اور اگر
اعلےٰ طبقہ کے لوگوں میں اس کے متعلق کسی
اور قسم کا احساس نہ ہو تو اس میں کوئی کلام
نہیں کہ گورنمنٹ کے اس منشا کے پورا ہونے
کی بجائے کہ اس قانون سے فوری فائدہ نہ
ہو اُسے مایوسی ہو گی۔

ہندوستان میں انسداد ظلم حیوانات کے
قوانین گورنمنٹ نے وقتاً فوقتاً وضع کئے ہیں۔
خواہ مرکزی یا صوبجاتی نظم و نسق کو لے لیجیے حیوانات

کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کے روک تھام کے لئے
جو قانون نافذ کئے گئے ہیں وہ ہندوستانی
نمائندگاں کے بے پرواہی نہ کہ اُن کی صریح مخالفت
کے ساتھ منظور کئے گئے ہیں۔

اسی طرح ۱۶ مارچ ۱۹۲۶ء کو بنگال کی کونسل
واضع آئین وقوانین میں ایک مسودہ قانون
اس مطلب کا پیش کیا گیا تھا کہ بھینسوں پر
بھاری بوجھ لاد کر سال کے سب سے زیادہ گرم
موسم میں دن بھر کے سب سے زیادہ گرم اوقات
میں ہانکنے کی ایک خاص حد ہونی چاہیئے۔ کلکتہ
میں انگریز لوگ ایک عرصہ سے محسوس کر رہے
تھے کہ بھینسوں کو اس طرح ہانکنے کی وجہ سے
مغربی احساس میں عوام کے ماتھے پر کلنک کا
ٹیکا لگا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ مسودہ آخر کار قانون
بنکر رہا۔ باوجود اس کے کہ بڑے بڑے ہندوستانی
سوداگروں نے محض اس لئے اس کی مخالفت کی
تھی کہ اس کے قانون بن جانے سے انکے
کاروبار میں محض ایک خیالی تکلیف اور نقصان
کا اندیشہ تھا۔

اس طرح پھوکا کے رواج کی کہ جس سے
کہ بیچاری گائے کو جان بوجھکر اذیت پہنچا کر

چند زیادہ پیسے کمائے جاتے تھے نہ صرف اُسکی قانونی ممانعت ہی ہو گئی ہے بلکہ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے اور مابعد کے صوبجاتی قانون نے اس کے لئے سخت سزا مقرر کردی۔ مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا کے کالموں میں پھوکا کے خلاف ایک انگریز کے اعتراضات کو شائع کرنے کا موقع نکالا۔ اگر اس کے خلاف ہندوؤں کے کسی گروہ کی کثرت رائے موجود ہے تو وہ اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں احاطہ بمبئی کی گورنمنٹ نے بمبئی کونسل واضع آئین وقوانین میں یہ تجویز پیش کی کہ شہر بمبئی کے پولیس ایکٹ میں ایسی ترمیم کردی جائے جس سے افسران پولیس کو ایسے حیوانات مار دینے کے کامل اختیارات دیئے جائیں جو کسی چوٹ یا بیماری کی وجہ سے ایسی حالت میں پائے جائیں کہ انکو شفاخانے میں لیجانے کی کوشش میں سخت ایذا پہنچنے کا احتمال ہو۔ اس معاملہ میں ایسے حیوانوں کے مالکوں کے مفاد کی محافظت کے لئے اس ترمیم میں یہ مزید شرط رکھی گئی تھی

لے اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۱۳ مئی سنہ ۱۹۲۶ء صفحہ (۱۷۴)

ٹ مسودہ قانون نمبری پنجم مصدرہ سنہ ۱۹۲۶ء یعنے "بمبئی شہر کی پولیس کے ایکٹ مصدرہ سنہ ۱۹۰۲ء میں مزید ترمیم کرنے کا قانون"

کہ اگر مالک غیر حاضر ہو یا اگر وہ تکلیف میں مبتلا جوان کو مار دینے کی اجازت نہ دے تو پولیس افسر کو لازم ہوگا کہ وہ اس قانون کی منشا کے مطابق کارروائی کرنے سے پہلے ان کئی ایک مویشی کے ڈاکٹروں میں سے کسی ایک ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ حاصل کرے کہ جنکو گورنر باجلاس کونسل اس مطلب کے لئے مقرر فرماوینگے۔

اگر ہندوستانیوں کی ایسی عادت۔ جسکا ذکر کیا جا چکا ہے۔ نہ ہوتی کہ وہ بیمار اور قریب المرگ گایوں اور بچھڑوں کو جنکو وہ فاقوں سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور گلیوں میں نکالدیتے ہیں تاکہ وہ اس وقت تک ماری ماری پھریں جبتک کہ وہ اپنی موت نہ مرجائیں کہ جس کو یہ "قدرتی موت" سے موسوم کرتے ہیں۔ تو اس قانون کے پاس کردینے کی ذرا بھی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ گائیں جنکو گھر سے نکالدیا جاتا ہے اس اوارگی کی حالت میں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں یہانتک کہ وہ اس قابل نہیں رہ سکتیں کہ کسی گذرنے والی گاڑی کے پہئیے پر گرنے اور گرکر کچلے جانے سے اپنے آپکو بچا سکیں۔

گورنمنٹ بمبئی کی اس جیوانوں کی محافظت کی تجویز پر جو بحث مباحثہ ہوا اس سے ہندوستانیوں

کے خیالات پر اسقدر روشنی پڑتی ہے کہ اس کے کچھ حصہ کا یہاں اعادہ کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ اس تجویز کے پیش ہوتے ہی مسٹر ایس ایس ڈیوڑنامی ایک ہندو ممبر فوراً کھڑا ہو گیا اور بولا[1]

اس مسودہ قانون کا اصول ہی ایک ہندوستانی کے دل کو بے قرار کر دینے والا ہے.... اگر آپ ایک بیماری اور تکلیف میں مبتلا انسان کو گولی سے نہیں مار سکتے تو حیوانوں کو وحشیانہ سلوک سے بچانے کے بہانے سے ایک حیوان کو کیونکر گولی سے مار سکتے ہیں.... مزید براں اگر یہ مسودہ قانون بنا دیا گیا تو شہر کی گلی کوچوں میں لڑائی جھگڑوں کی بنیاد ڈال دے گا۔"

اس کے بعد مغربی سندھ کے مسٹر بی جے۔ بہارا جنی صاحب اٹھے اور فرمایا:[2]

"مسودہ قانون کی اس دفعہ میں کوئی استثنیٰ موجود نہیں کہ مصیبت میں مبتلا، حیوان گائے ہو یا گھوڑا یا کتا ہو۔ ایک پولیس مین ڈاکٹر حیوانات کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے کسی ایک حیوان کو جان سے مار سکتا ہے انگریز افسر ممبران کونسل خصوصاً انکو جو اس ملک میں

---

[1] کونسل واضع آئین و قوانین بمبئی کی کارروائی کی سرکاری رپورٹ مطبوعہ ۱۹۲۶ء جلد ہفدہم حصہ ہفتم صفحات (۷۹ -۴۸۰) [2] کونسل واضع آئین و قوانین بمبئی کی کارروائی کی سرکاری رپورٹ مطبوعہ ۱۹۲۶ء

تیس سال سے زیادہ عرصہ سے رہتے ہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک ہندو کبھی اجازت نہیں دے سکتا کہ گائی کو خواہ وہ کسی حالت میں بھی پڑی ہو مار دیا جائے۔ ملک میں پنجرہ پول[1] موجود ہیں جن میں شدید امراض میں مبتلا حیوانات کا علاج ہوتا ہے اور انہیں پرورش کیا جاتا ہے .... یہ کاروائی ایسی اندھادھند کی جارہی ہے کہ گویا حیوانوں میں روح ہی نہیں اور اگر وہ زندہ رہنے کی لایق حالت میں نہیں ہیں تو انکو گولی سے مار دیا جائے۔ روح کی نسبت ہندوں کا خیال مغربی لوگوں کے خیالات سے بالکل علیحدہ ہے ..... اس قسم کی کارروائی سے ہندؤں کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگے گی"

اس کے جواب میں مسٹر اے منٹگمری سکرٹڑی گورنمنٹ نے شہر کی روزانہ زندگی کی تصویر کھینچتے ہوئے بیان کیا[2]

میں مشکل سے مان سکتا ہوں کہ آنریبل ممبر نے جو کچھ فرمایا ہے وہ درحقیقت انکا منشا ہے کیا یہ ایک خوشگوار نظارہ ہوگا اگر ہم بمبئی کی گلی

---

[1] ان پنجرہ پولوں کا مفصل ذکر چلکر آئیگا۔

[2] کونسل واضع آئین قوانین بمبئی کی کارروائی کا صفحہ (۵۸۱)

کوچوں میں ایک غریب حیوان کی انتڑیاں نکلی ہوئی ٹانگ ٹوٹی ہوئی اور خون بہا ہوا پڑا دیکھیں ؟ ایسے حیوان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انسانی ہمدردی یہی ہو سکتی ہے کہ انہیں مصیبت سے جلدی نجات دلائی جائے ۔ یہ انسانی ہمدردی نہیں ہے کہ اس غریب کو مصیبت میں مبتلا پڑا رہنے دیا جائے اور اس خیال سے نہ اٹھایا جائے کہ کہیں اس کے سب اعضا ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جائیں ۔

باوجود اس جواب کے ایک ہندوستانی کے بعد دوسرا ہندوستانی اٹھا اور اس تجویز کے خلاف صرف ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس لگنے کے بہانے پر شور مچاتا رہا ۔ یہانتک کہ ان میں سے ایک ممبر مسٹر آر ۔ جی ۔ سوماں نے اٹھکر کہا کہ اس تجویز میں اخراجات کا سوال بھی مضمر ہے کیونکہ اس مسودہ کی رو سے گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ چند حیوانات کے ڈاکٹر مقرر کرے جو پولیس کو وقت پر سرٹیفکیٹ دینے کے لئے موجود رہیں مسٹر موصوف نے ظاہر کیا کہ انکے خیال میں ایک مصیبت میں مبتلا حیوان پر کسی کو عوام کے روپے کو اس طرح خرچ کرنے کا کوئی استحقاق

نہیں۔ چنانچہ اُس نے کہا لہ کہ :۔

"اگر کوئی فیاض دل ڈاکٹر پولیس کی مفت امداد کے لئے میدان میں نکلے تو بہتر ہے اور اگر یہ مطلوب ہے کہ نئی آسامیاں نکالکر انکا خرچ عوام کے روپے سے پورا کیا جائے تو میں اس مسودہ قانون کی واقعی مخالفت کرونگا"

اس کے بعد کونسل کی اسدن کی کارروائی غریب حیوانوں کو انکی قسمت پر اس طرح سے چھوڑ کر ختم کی گئی۔ چنانچہ راؤ صاحب ڈی۔ پی ڈوسائی نے جو کیرا کے لوگوں کے نمائندہ ہیں کہا :۔ ۵۲

"یہ تکلیف اس لئے ہوئی ہے کہ رحم کے دو مختلف معیاروں کے خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس مسودہ کے واضعات کا خیال ہے کہ ایک ایسے حیوان کو گولی سے مار دینا ہی بہتر ہے جو کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہو۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ حیوانوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا نے خود ہی انکی قسمت میں لکھ رکھا ہے۔

لہ کونسل واضع آئین و قوانین بمبیئی کی کارروائی کا مباحثہ۔ صفحہ (۵۸۳)

۵۲ کونسل واضع آئین و قوانین بمبئی کی ۲ مارچ ۱۹۲۶ کی کارروائی صفحہ ۵۸۵

اس کے تین ماہ بعد[1] جب اس مسودہ قانون پر پھر بحث مباحثہ شروع ہوا تو آنریبل مسٹر جے۔ ای۔ بی۔ ھوٹسن چیف سکرٹری گورنمنٹ بمبئی نے اس کے متعلق ہندوستانیوں سے موافق رائے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا[2]

"اس مسودہ کا ایک مدعا یہ ہے کہ ان چوٹ کھائے ہوئے اور زخمی حیوانات کا تدارک کیا جائے جو گلیوں میں یا عوام کی گذرگاہوں پر ایسی مصیبت اور درد کی حالت میں پڑے ہوئے ہوں جنکا کوئی علاج نہ ہو سکے۔ ایسے حیوانات کے مالکوں کو اختیار ہوگا کہ وہ انکو وہاں سے اٹھالے جائیں۔ یا خود مخبر لوگوں کو اختیار ہوگا کہ انہیں اٹھوا کر پنجرہ پوسوں یا ایسی دوسری جگہوں پر پہنچا دیں جہاں حیوانوں کو رکھا جاتا ہے اور انکی نگہداشت کی جاتی ہے۔ اس مسودہ میں جس تدارک کا ذکر ہے وہ تو صرف ان حالتوں میں کیا جائیگا جن میں کہ درد و مصیبت میں مبتلا حیوان کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہے یا کہ آجکل صورت ہے۔ یہ غریب گھنٹوں بلکہ اسوقت تک کہ موت

[1] کونسل واضع آئین و قوانین بمبئی کی کارروائی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۲۶ء
[2] ایضاً " " " " " جلد ہشتم حصہ اول صفحات (۷۰-۷۱)

کا فرشتہ پونچکر اس کی خلاصی نہ کرئے۔ بمبئی جیسے شہر کی گلیوں میں پڑا رہے۔ ذرا خیال کرنے کی بات ہے کہ اس مصیبت میں مبتلا حیوان کو ایسی بری حالت میں بمبئی جیسے بڑے شہر کی ایسی جگہ پر پڑا رہنے دیا جائے جہاں سے بیشمار رہرو گزر رہے ہوں تو کیا ان تمام مذاہب اور طبقات کے راہگذروں کو اسے دیکھکر روحانی صدمہ نہ ہوگا۔ لہذا اس مسودہ کا منشا یہ ہے کہ نہ صرف اس حیوان کو مصیبت سے نجات دلائی جائے بلکہ وہاں سے گذرنے والوں کو بھی اس تکلیف سے بچایا جائے جو اُنہیں اس دردناک نظارہ کو دیکھکر ہوگی۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جنکو حاصل کرنے کا اس مسودہ کا منشا ہے۔"

باوجود اس دل ہلا دینے والی تقریر کے ہندو ممبران کا وہی رویہ رہا جو پہلے تھا۔ پہلے ہی سے دلائل اور براہین پیش کئے جاتے رہے۔ یہانتک کہ آنریبل علی محمد خاں دہلوی بمبئی گورنمنٹ کے مسلمان وزیر زراعت اٹھے اور انہوں نے مندرجہ ذیل تقریر اس طرح پر کی کہ گویا وہ زراعت پیشہ لوگوں کے مفاد کے متعلق سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں ۵۲۔

۵۲ کونسل واضع آئین وقوانین بمبئی کی کارروائی جلد ہشت دہم حصہ اول صفحات ۷۲-۲۳

"اس کونسل کے پچھلے اجلاس میں یہ بحث ہوئی تھی کہ جاندار حیوانات نہ مارے جائیں اس کونسل کے ان آنریبل ممبران نے جو سامنے کی بینچوں پر تشریف فرما ہیں مجھے بہت بچھلے دے کی کہ ہمیں نے زراعت پیشہ لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر ہاتھیوں جنگلی سؤروں اور چوہوں کو مروانے کے لئے نہ تو کافی تدابیر اختیار کی ہیں اور نہ ہی اُن کی تباہی پر کافی روپیہ صرف کیا ہے۔ اس وقت بھی ایک ایسا سوال درپیش ہے کہ جس میں روح کو فنا کرنا مدنظر ہے۔ تو میرے خیال میں ایک ہاتھی کی روح ایک سور کی روح سے بہت بڑی ہے اور ایک سور کی روح ایک چوہے کی روح سے بلاشبہ بڑی ہے۔ اگر ایسی روح کے فنا نہ کرنے کے اصول پر محکمہ زراعت میں عملدرآمد کیا جائے تو مجھے ضرور کہنا پڑیگا کہ میں ان حیوانات کو مارنا چھوڑ دوں جنکا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے زراعت پیشہ لوگوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جناب عالی۔ میں یہ کہوں گا کہ بمبئی جیسے شہر کی گلیوں میں پڑے ہوئے ایک حیوان کی جان میں یا ملک کے باہر جنگلوں یا کھیتوں کے حیوانوں کی جان میں مطلقاً

کوئی فرق نہیں"

وزیر زراعت کا زراعت پیشہ لوگوں کا ذکر کرنا جو اس کی حمایت میں ہے۔ اس سے پھر ہندوستانی سیاست دانوں نے حیوانات کو مارنے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے اس سے ہندوستانی سیاست دانوں کے انسانی آبادی کے اس حصہ کی طرف میلان کا مسئلہ چھڑ جاتا ہے جو ہندوستان کے آبادی کا (۷۲) فیصدی ہے۔

راؤ صاحب ڈی۔ پی ڈیسائی نے ان زراعت پیشہ لوگوں کے مسئلہ کو بے لطفی سے نظر انداز کرتے ہوئے کہا:[۱]

"صرف زراعت پیشہ لوگوں کو ہندوستان بھر کی تمام سوسائٹی خیال نہیں کر لینا چاہیے ... اگر ان لوگوں کا یہ خیال ہو کہ ایسے حیوانوں کو جو زراعت کے لئے نقصان دہ ہیں مار دیا جائے تو اس سے یہ خیال نہیں کر لینا چاہیے کہ تمام ہندو سوسائٹی انکے خیال سے اتفاق رائے رکھتی ہے اور میرے خیال میں اس کونسل میں انکے اس خیال کو کچھ وقعت نہیں دینی چاہیے۔"

[۱] کونسل واضع آئین و قوانین کی کارروائی جلد ہشت دہم۔ حصہ اول۔ صفحہ (۷۶)

اس دن کے اجلاس کے باقی حصہ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ گورنمنٹ پر الزامات کی بوچھاڑ کی گئی ہو اور اس کی کوششوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہو۔ اس میں ایک معتبر مسلمان ممبر مولوی رفیع الدین احمد کے سوائے جو وسطی ڈویژن کے نمائندے ہیں کسی نے کسی نئے خیال کا اظہار نہیں کیا۔ مولوی صاحب نے دانشمندانہ طور پر فرمایا :۔ ؎

"گورنمنٹ کا ایک ذرہ بھر بھی منشا نہیں کہ حضور ملک معظم کی ہندوستانی رعایا میں سے کسی کا دل دکھایا جائے۔ یا کسی کے احساسات کو ٹھیس لگائی جائے ..... اگر اس مسودہ کے اغراض و مقاصد کے علاوہ کسی اور طریق سے ان مصیبت زدہ حیوانات کا تدارک ہو سکتا ہے تو گورنمنٹ اس پر کاربند ہو کر خوش ہو گی جہاں تک مجھے علم ہے (اور میں اس کونسل میں ایک عرصہ سے ہوں) جذبات کے متعلق کبھی کوئی ایسا سوال اس کونسل میں پیدا نہیں ہوا جس پر گورنمنٹ نے غور نہ کی ہو اور میں گورنمنٹ کی اس صفت کا معترف ہوں ..... اس اجلاس

؎ مباحثات اجلاس بمبئی لیجسلیٹو کونسل جلد ۱۸ صفحات (۷۷ء ۷)

میں ہندو اور مسلمان دونوں نے متفقہ طور پر گورنمنٹ
کی مخالفت کی ہے لہذا اگر ان سب صاحبان کا
ایک ذرہ بھر بھی یہ خیال ہے کہ گورنمنٹ غلطی پر
ہے تو گورنمنٹ اسی طرح اپنی غلطی کا اعتراف
کرلے گی جسطرح یہ کئی دیگر مواقع پر کرتی رہی
ہے ..... اسجگہ خالی خولی سر ہلاکر چلا آنے سے
کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی نئی تجویز پیش کرنی چاہیئے
اعتراض کر لینا آسان کام ہے مگر اس کے
ساتھ ہی ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم بہترین تجاویز
پیش کریں۔ میں ان تمام صاحبان سے جنہوں
نے اعتراض کئے ہیں اپیل کرتا ہوں کہ وہ بہترین
دلائل پیش کریں کیونکہ گورنمنٹ دلائل کو سننے
کے لئے ہر وقت تیار ہے"

اس موقعہ پر ایک ہندو ممبر نے جوش
کے ساتھ قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا کہ "کیا
آپ کو گورنمنٹ کے حق میں بولنے کی اجازت
دی گئی ہے؟"

اس کے جواب میں مولوی صاحب نے
کہا۔

"مجھے ان تمام آدمیوں کے حق میں بولنے
کی اجازت ہے جنکا اس کونسل کے ساتھ تعلق

ہے میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ یہ اعتراض بالکل نامعقول ہے۔"

نہ صرف مولوی صاحب کی یہ اپیل رائیگاں گئی بلکہ ایک ہندو ممبر نے گھور کر کہا کہ "اگر اتفاق سے کوئی مسلمان ڈاکٹر حیوانات تعینات ہوگیا اور اس نے ایک بیمار گائے کو مار دینے کی منظوری کا سرٹیفکیٹ دیدیا تو شہر کے ہندو مسلمانوں کا امن و امان دھوئیں کی طرح اڑ جائے گا۔"

چنانچہ کونسل کے اس اجلاس کی کارروائی اس نتیجہ پر ختم ہوئی کہ مسودہ زیر بحث کونسل کے ممبروں کی ایک چیدہ کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ جس کے اراکین نو ہندوستانی (ہندو مسلمان اور پارسی) اور دو انگریز ہوں۔

اس مسودہ کے دوسری دفعہ پیش ہونے پر گورنمنٹ کے چیف سکرٹری مسٹر ھوٹسن نے اس منتخب کمیٹی کی رپورٹ یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ کمیٹی نے اس مسئلہ پر اس حد تک غور کی ہے کہ کسی ملکی بھائی کی دلشکنی نہ ہو اور یہ کہ کمیٹی کے خیال میں مسودہ کا تمام مضمون بالکل بے سود اور لایعنی ہے اور یہ کہ اس مسئلہ پر

بالکل بودی ... لغو اور ... مہمل کارروائی کی گئی ہے۔ جس کے بعد کونسل میں جو کچھ کہ ہوا اُس کا لب لباب یہ ہے:۔

گائیوں اور بیلوں پر مجوزہ قانون کا کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ مندروں کے مکانات پر بھی اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ خواہ وہاں کچھ بھی پیش آئے۔ غرض کہ کسی قسم کی معقول تجویز پیش کرنے کے بغیر ہندوں کی مخالفت جاری ہے۔ ممبر اسپر زور دیتے ہیں کہ اگر اس مسودے کو قانونی صورت دینے کا خیال بالکل ترک نہیں کیا جاتا تو اُسکے پاس کرنے میں تاخیر کرنی لازمی ہے گورنمنٹ کا اس پر کوئی کارروائی کرنا خلاف مصلحت ہے۔کہ ان غریب اذیت میں مبتلا حیوانوں کے مصائب ابھی اس حد تک نہیں پہنچے کہ اُنکے متعلق کسی ہمدردی کے اظہار کی ضرورت ہو۔ ہندو اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ کم سے کم یہ کردیا جائے کہ ہندو پولیس میں حیوانوں پر گولی چلانے سے مستثنےٰ کردئے جائیں۔ کیونکہ گولی چلانی اُنکے مذہب کے سخت خلاف ہے مسلمان اسبات پر زور دے رہے ہیں کہ انہیں نکو" نہ بنایا جائے ۔اور اُن کے ساتھ بھی یہی رعایت

کی جائے۔ اور بدیں وجہ بھی چونکہ ہندوستانی ہتھیاروں کے معاملہ میں غلطی کر دیتے ہیں یہ کام انگریز پولیس سارجنٹوں کے سپرد ہی کیا جائے جو نشانہ بازی میں مشاق اور ماہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مسٹر سروے نمائندہ شہر بمبئی نے آخری بات پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

"ایک مصیبت میں مبتلا حیوان کو مارنا جو قریب المرگ ہو ایک قسم کی قصابی ہے ہم تو لایق نہیں ... ہماری بہادری نہیں"

پس گورنمنٹ کی یہ کوشش کہ گائے کو انکے پوجاریوں کے ہاتھ سے بچایا جائے کم سے کم اس دفعہ تو ناکامیاب رہی۔ اس مسودہ کا جو اصلی اور فائدہ بخش حصہ تھا اس کے نکالدئے جانے کے بعد مسودہ پاس ہو گیا البتہ یہ ہو گیا کہ گورنمنٹ کے ان دلائل کی وجہ سے کئی مسلمان تائید کرنے والے پیدا ہو گئے۔ اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ چونکہ اس مسودہ کا اصول جسپر یہ مبنی تھا ان لوگوں کی نظر میں جو روح کی معافی طلب سفر کے قائل ہیں اجنبی ہے۔ جتنی بھی کامیابی اس میں حاصل ہوئی اتنا ہی صلہ حاصل ہو گیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل نے حیوانات پر انسداد بے رحمی کا قانون نافذ کیا۔ جس کی پانچویں دفعہ کے رو سے کسی حیوان کو غیر ضروری بے رحمی کے ساتھ مارنا جرم قرار دیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں یہ ضروری خیال کیا گیا کہ دفعہ پنجم کی تصریح کر کے اسکو صرف ان اشخاص پر اطلاق پذیر کیا جائے جو بکریوں کو بے رحمی کے ساتھ ذبح کریں یا ایسی بے رحمی سے ذبح کی ہوئی بکری کا چمڑا اپنے قبضہ میں رکھیں۔ صوبجاتی گورنمنٹوں نے بھی ایسے ہی قوانین نافذ کیے۔ مگر باوجود اس کے جن جرائم کے لیے یہ قانون نافذ کیے گئے تھے وہ ابھی تک ملک میں بدستور رائج ہیں۔

زندہ بکری کی کھال کھینچ لینا جرم ہے۔

زندہ بکری کی کھال کھینچی ہوئی کھینچ تان کر تھوڑی سی لمبی چوڑی ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی قیمت اس کھال سے بڑھ جاتی ہے جو بکری کو ذبح کرنے کے بعد اتاری جائے۔

اس کی زیادہ توضیح کرنی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں صوبہ بہار و اوڑیسہ کی پولیس نے ایسے چونتیس مقدمات عدالت میں پیش کئے

جن میں ملزمان نے زندہ بکریوں کی کھالیں کھینچ لی تھیں۔ مگر ہندوستانی ججوں نے (جن کے جذبات کو ایسے عام افعال سے ٹھیس نہیں لگتی) تھوڑے تھوڑے جرمانے کر کے کھال اتارنے والوں کو رہا کر دیا تھا۔ کیونکہ انہیں کھالوں کی ذراسی زیادہ قیمت ملنے کی ترغیب سنگ راہ ہوئی تھی۔ اس لئے مقدمات بننے کا زیادہ خطرہ نہیں۔ صوبہ کے انتظام پولیس کی رپورٹ رائے زنی کرتی ہے۔ کہ یہ بات فرض کر لینے کی ہر ایک وجہ موجود ہے کہ جن مقدمات کے چالان نہیں ہوئے۔ ان کی تعداد اس جرم کے ارتکاب کا کوئی معیار نہیں ہے" اور بہت سی اس طرح اتاری ہوئی کھالیں امریکہ کو بھیجی گئی ہیں۔

ایک صدی کی قریباً تین چوتھائی عرصہ سے برطانیہ تمثیل اور تعلیم کے ذریعہ یہ کوشش کر رہا ہے۔ کہ اس پردیسی زمین میں بھی رحم کی وہی تصویر ہو جائے۔ جو اس کے اپنے ملک میں ہے اس معاملہ میں اور اسی قسم کے اور بے شمار معاملات میں اس نے اپنے زور دل سے ان علاقہ جات میں جن میں ان کا براہ راست تعلق ہے بہت کچھ کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ مگر اس کی نظم و نسق کا اصول یہ رہا ہے۔ کہ جس فایدے کا اصلی مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ اس کو بزور بازو لوگوں کے گلے منڈھنے سے اصلی مدعا بہت کم حاصل ہوتا۔ کیونکہ حقیقی اصول لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جبکہ لوگ ایسے ہوں۔ جو اپنی عورتوں تک کے ساتھ سلوک کرنے میں ابھی تک وحشی ہیں۔ تو ان سے یہ

امید کرنا کہ وہ گونگی بہری مخلوق کی فریاد پر توجہ کریں گے عبث ہے۔
حیوانوں کی بدقسمتی سے حیوانوں سے وحشیانہ سلوک کے انسداد کا مضمون گورنمنٹ کا "منتقلہ مضمون" ہو گیا ہے۔ یعنی ہر ایک صوبہ میں جن میں اصلاحات کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اس شعبہ کا نظم و نسق برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستانی وزراء کے سپرد کر دیا ہے۔ اور یہ بے زبان مخلوق اس "تجربہ" پر اپنی جانیں قربان کر رہی ہے
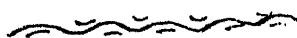
بیسواں باب

گئو ماتا اپنے دوستوں کی تحویل میں

ایک سالخوردہ طبیب جو ہندوستان میں ایک عرصہ سے حیوانات کا معالج رہا ہے۔ بیان کرتا ہے۔ کہ یہ ملک دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ مویشیوں پر ظلم کرنے والا ہے۔ یہ بیان کرنا بےجا نہ ہوگا۔ کہ ہندوستان کے باشندے اپنے اپنے مذاہب کے پابند ہیں۔ مگر سوائے ایک چھوٹے سے فرقہ کے جسے جینی کہتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے ساتھ ان معنوں میں رحم کا برتاؤ نہیں کرتے" جن میں مغربی ممالک میں رحم کیا جاتا ہے۔

مسٹر گاندھی خود تحریر فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو اخبار ینگ انڈیا مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۲۵ء) کہ:۔

ایسے ملک میں جہاں گائے قابل پرستش حیوان ہو۔ وہاں مویشیوں کے متعلق کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ مگر ہماری گائے کی پرستش نے ایک جاہلانہ تعصب کی ہی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ امر کہ ہمارے ہاں اتنے زیادہ مویشی ہیں کہ جن کی ہم پرورش نہیں کرسکتے۔ ایک نہایت قابل غور معاملہ

ہے۔ میں آگے بھی یہ تجویز پیش کر چکا ہوں۔ کہ اس سوال پر گائے کی نگہداشت کرنے والی سوسائٹیاں غور کریں۔"

گائے کی محافظ جماعتوں کے زیرِ اہتمام گئوشالا یا گائیوں کے پناہ خانے ہیں۔ یہ پناہ خانے پنجرہ پول یا ہر قسم کے مویشیوں کے پناہ گاہوں کے طور پر عطیات پر چل رہے ہیں۔ اور ان کو چلانے کے لئے ہندو سوداگر بے شمار روپیہ دیتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے ایک تجربہ کار ہندو عہدیدار نے بتایا تھا۔ کہ اگر گورنمنٹ ہند گائے کا ذبیحہ روکنے کا وعدہ کرے۔ تو اسے جتنا روپیہ درکار ہو۔ اسے مل جائے۔ مگر ساتھ ہی مسلمانوں سے لڑائی بھی چھڑ جائے

ہندوؤں کا دھرم ہے۔ کہ ایک گائے کی جان بچانے سے ان کے دیوتاؤں کی ان پر خاص مہربانی ہو جاتی ہے۔ مگر باوجود اس کے ان کو ان کا ضمیر ملامت نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی اچھی گائے ایک بوچڑ کے حوالے کر دیں۔ کیونکہ اس صورت میں غریب گائے اس کے ہاتھ سے نہیں۔ بلکہ اس بوچڑ کے ہاتھ سے ذبح ہو گئی۔ اور ہندو جو روپیہ بوچڑ سے وصول کرے گا۔ اس میں سے تھوڑی سی رقم ڈالکر ایک نکمی گائے خرید کر ایک گئوشالا کی حفاظت میں دے دیگا۔ اور اس طرح وہ نہ صرف اپنا مذہبی فرض پورا کرے گا۔ بلکہ اس داد و ستد سے اس کا ضمیر بھی خوش ہو جائے گا۔ اور ساتھ ہی اس کی جیب میں روپیہ بھی آ جائے گا۔

میں نے بذات خود کئی گئوشالاؤں اور پنجرہ پولوں کا

ملاحظہ کیا ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ ان لوگوں نے جان کی
نگہداشت کے لیئے فراخدلی سے روپیہ دیتے ہیں۔ اور وہ جو
ان میں مویشی حفاظت کے لیئے بھیجتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے
جو مہاتما گاندھی کی طرح ان کی حفاظت اور ان کی اضافہ کے لیئے
اس قدر زور دیتے ہیں۔ کبھی ان کے اندر گھس کر بھی دیکھا ہے
میں نے پہلے پہل ایک مویشیوں سے محبت کرنے والے اہل
مغرب سے جو مدت سے ہندوستان میں رہتا تھا یہ سنا۔

"ایک ہندو جو کار خیر کے طور پر ایک بوچڑ سے گائے خرید کر
گئو شالہ میں رکھتا ہے ہمیشہ ایک مریل اور بیمار گائے خریدتا
ہے۔ کیونکہ یہ اس کو سستی مل جاتی ہے۔ پھر جب یہ سستی گائے
خرید کر گئو شالہ میں دیتا ہے۔ تو اس کے ساتھ اس کی پرورش
کے لیئے روپیہ نہیں دیتا۔ یا کافی روپیہ نہیں دیتا جس سے وہ
اچھی طرح رکھی جا سکے۔ اور اگر وہ کافی روپیہ دے بھی دیتا ہے
تو اس میں سے بہت سا گئو شالہ کا محافظ اپنی جیب میں ڈال لیتا
ہے۔ اس لیئے حیوانات کو ان جگہوں میں بے حد تکلیف ہوتی ہے
حال ہی میں میں نے ان گئو شالاؤں میں سے ایک میں ایک بوڑھی
گائے دیکھی۔ جو بالکل بے بسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔
کہ جس کو کیڑے کھا رہے تھے۔ جو اس کے جسم کے پچھلے حصہ سے
شروع ہوئے تھے۔ اور انہیں دس دن اور لگتے۔ کہ اس کے کلیجہ
تک اسے کھا جائیں۔ مگر اس وقت تک وہ اسی طرح کس مپرسی
کی حالت میں پڑی رہے گی۔ میں نے محافظ سے پوچھا کہ "کیا

تم اس غریب کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ تو اس نے کافی دیانتداری سے جواب دیا۔ کہ مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ میں کیوں کچھ کروں؟

اس کے بعد مجھے ایک امریکن ماہر مولیشی نے - جو ہندوستان میں رہتا تھا بتایا۔ یہ علم حیوانات کا فاضل اور عملی آدمی ہے۔ "باوجود اس کے کہ جنگ عظیم کے بعد سیاسی شورش کی وجہ سے ہندو انگریز افسروں کی رائے لینا پسند نہ کرتے تھے۔ مجھے کہا گیا تھا۔ کہ میں گئوشالاؤں میں سے بعض میں جا کر حیوانوں کے متعلق مشورہ دوں۔ چنانچہ میں نے ایک امریکن پردیسی ہوتے ہوئے یہ خیال کیا۔ کہ ممکن ہے۔ کہ میں انہیں کچھ نیک مشورہ دے سکوں چنانچہ میں ان گئوشالاؤں میں گیا۔ اور دیکھا۔ کہ یا تو ہر جگہ ارادتاً بددیانتی کی جاتی ہے یا یہاں کا انتظام ہی سخت ردّی ہے ان تمام گئوشالاؤں میں مولیشیوں کو اس طرح قید کیا ہوا تھا۔ کہ گویا کسی کو ان کی فکر ہی نہیں۔ چنانچہ میں نے جو مشورہ دیا۔ اس پر کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ اور جب انہوں نے یہ دیکھا۔ کہ میں ان کی مرضی کے مطابق مشورہ نہیں دیتا۔ تو انہوں نے میرے مشورہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔"

اس کے بعد میں نے ایک مشہور و معروف مذہبی پیشوا یعنی دیال باغ[1] کے گورو صاحب سے اس کے متعلق بات چیت کی۔ جن کے الفاظ حسب ذیل تھے:-

"میں ان گئوشالاؤں میں سے دو میں بلا اطلاع چلا گیا۔ اور

---

[1] آگرہ سے متصل ایک مذہبی گروہ کے گورو ہیں۔

اور میں نے وہاں ایسا ہولناک نظارہ دیکھا کہ میں بعد میں پورے دو دن تک اپنا کھانا نہیں کھا سکا۔"

اخیر میں سنیئے ایک ایسے ہندوستانی کی رائے لی جو مویشیوں کی نسل کشی اور دودھ مکھن کے ایک مغربی سکول کا تعلیم یافتہ تھا۔ اور اب اسی صیغہ میں ایک ذمہ داری کے عہدے پر فائز ہے۔ اس نے پنجرہ پول کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہا کہ "یہ ایک تنگ گلی یا مویشیوں کے باڑوں کا تنگ احاطہ ہوتا ہے" کہا:۔

"مذہبی نقطۂ نگاہ مویشیوں کو وہاں ڈال دینا۔ مگر یہ مذہبی جوش وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ ان بیچارے بے زبانوں کی بالکل پرواہ نہیں کی جاتی۔ اور یہ اسی بے پروائی کی وجہ سے ہر قسم کی مصیبت جھیلتے ہیں۔ امیر سوداگر اور ساہوکار ان کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے سالانہ ڈھیروں روپیہ چندہ دیتے ہیں مگر یہ سب کا سب روپیہ ہضم کر لیا جاتا ہے۔ اور رائیگاں جاتا ہے ان محافظ خانوں میں سے اکثروں میں مویشی اس سے بدترین حالت میں رکھے جاتے ہیں کہ جب وہ بدررؤں میں سے غلاظت صاف کرتے اور گذرنے والی کاروں کے نیچے کچلے جا کر مرنے کا انہیں موقعہ حاصل رہتا تھا۔ یہ مصیبت کے مارے ہوئے موت کے منہ میں آئے ہوئے ڈھانچے ہی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ان محافظوں کو نہ تو ان کی نگہداشت کے طریقہ کا کوئی علم ہوتا اور نہ کوئی واقفیت یا تجربہ اور جو معقول رقوم مویشی خانوں پر درج کی جاتی ہیں درحقیقت

ان پر خرچ نہیں کی جاتیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ہندوستان میں مویشی کے اچھے محافظ خانے ہیں۔ مگر یہ چند گنتی کے ہیں۔ پہلا گئو شالہ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ وسط ہندوستان کے ایک شہر کے گرد و نواح میں تھا۔ اس کے داخلہ کے دروازہ پر کرشن بھگوان کی نیلگوں نہایت دلکش تصویر بنی ہوئی تھی جس میں وہ ایک جنگل میں اپنی سفید گاؤں کے سامنے بنسری بجاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

گئو شالہ کی بلند دیواروں کے اندر بہت سی زمین پر میوہ دار درختوں کا ایک خوش نما باغیچہ اور ترکاری کی کیاریاں محافظ کے شاندار بنگلہ کے گرداگرد بنی ہوئی تھیں۔ باغیچہ کے ادھر کی طرف گائیوں کے لئے جگہ تھی۔ یہ جگہ بے برگ و بے گیاہ اور بغیر کسی سایہ کے تھی۔ یہ چکنی مٹی کا سخت فرش تھا۔ جو برسات کے موسم میں گندے کیچڑ کے دلدل بن جاتا ہوگا۔ اور اس میں ایسے مویشی رہتے ہوں گے۔ جن کی بعض اوقات ننگی ہڈیاں سچ مچ چمڑے سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان میں بعض جانور بالکل دم بخود بیٹھے تھے۔ اور جن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اٹھکر کھڑے ہوسکیں بعض کے بڑے بڑے زخم کھلے ہوتے تھے۔ اور پرندے ان کے کوے اور پسلی کی نکلی ہوئی ہڈیوں پر آ آکر بیٹھتے ہیں۔ اور اپنی خوراک حاصل کرتے تھے۔ بعض کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ جو ان کے ہلنے چلنے سے پھڑک اور کڑکڑا رہی تھیں۔ ان میں سے بہت سے بیمار تھے۔ اور سب کے سب بھوکے مر رہے تھے۔

سانڈ جو اسی طرح مصیبت زدہ تھے۔ جیسی کہ گائیں تھیں
ان میں کھڑے ہوتے تھے۔ اور ایک طرف ایک باڑے میں
قریبًا دو سو بچھڑے بندھے ہوئے تھے۔ جب کسی لشکر کے پاؤں
کی آہٹ ان کے قریب پہنچتی تھی۔ تو یہ ایک دردبھری آواز
نکالتے تھے۔ جب میں نے اس باڑے کی دیوار سے ان کی بڑی
بڑی نیلی آنکھوں۔ ان کے بالکل ساتھ لگے ہوئے پیٹ اور ان کی
کانپتی ہوئی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ تو مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ دریافت
کروں کہ ان کو خوراک کس طرح دی جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے گئوشالہ
کے ملازم نے نہایت صفائی سے بے کھٹکے جواب دیا۔ کہ ہر ایک
بچھڑی اور بچھڑے کو چائے کی ایک چھوٹی پیالی دودھ کی روزانہ
اس وقت تک دی جاتی ہے۔ جب تک کہ یہ مر نہ جائیں۔ اور یہ
موت ان کی خوش قسمتی سے جلدی واقع ہو جاتی ہے۔ باقی جتنا
دودھ دوہا جاتا ہے۔ وہ گئوشالہ کا محافظ بازار میں بیچ لیتا ہے
اس کے بعد جب میں نے یہ دریافت کیا۔ کہ ایک گائے
کو روزانہ کتنا چارہ دیا جاتا ہے۔ تو مجھے ایک مٹی کا برتن دکھایا
گیا۔ جو پانچ فٹ لمبا تین فٹ چوڑا اور دو فٹ اونچا ہوگا جس
میں چھوٹے چھوٹے بیج جن میں چھلکا ملا ہوا تھا۔ بطور چارے کے
تیار رکھے ہوئے تھے۔ اس چارہ میں سے ہر ایک بڑے حیوان کو
نصف پونڈ (پاؤ بھر) چارہ روزانہ ملتا تھا۔ علاوہ اس کے تھوڑے
سے خشک بھوسے کے اور کوئی خوراک نہیں دی جاتی تھی۔ یہ
یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اس بھوسے میں کوئی غذائیت نہیں ہوتی۔ بلکہ

یہ کچھ عرصہ تک مویشی کا پیٹ سکھا کر ساتھ لگا دینے کے بجائے رکھتا ہے۔ ان مویشیوں کے لئے نہ تو کوئی احاطہ تھا۔ اور نہ ہی ان کے لئے کوئی چرنے چگنے کی جگہ تھی۔ یہ مویشی جیسی کہ ان کی حالت تھی۔ اس وقت تک کھڑے یا لیٹے رہتے ہیں۔ جب تک کہ موت ان کو اس مصیبت سے آزاد نہ کر دے۔

ایک گائے کی صرف تین ٹانگیں تھیں۔ کیونکہ اس کی ایک پچھلی ٹانگ گھٹنے سے نیچے بدیں وجہ کاٹ دی گئی تھی۔ کہ وہ دودھ دوہنے کے وقت اس سے مارا کرتی تھی۔

دو ایک گئوشالاؤں میں میں نے ایسے مویشی دیکھے۔ جنہیں عجائب المخلوقات بنانے کی خاطر لنگڑا لولا کر دیا گیا تھا۔ اس مطلب کے لئے لوگ ایک بچھڑے کی ٹانگ کاٹ کر دوسرے کے جسم پر ایسی جگہ لگا دیتے ہیں۔ کہ جسے قدرتی نمونہ سمجھکر لوگ خوب چندہ دیں۔ اپاہج بچھڑے اگر خون ہکر یا بھوک کی مصیبت یا سڑ کر ہلاک نہ ہو جائے۔ تو اسے برائے نام قیمت پر بیچ دیا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی تاریخ پر کوئی بے اطمینانی ظاہر نہیں کیجاتی

شہر احمد آباد کے وسط میں کہ جس سے چند میل کے فاصلے پر مسٹر گاندھی کا خوش نما اور آرام دہ مکان واقع ہے جس میں بیٹھکر وہ گایوں کے رکھنے کے شیڈوں اور پنجراپولوں کے متعلق منقول دلائل لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک بڑے پنجراپول کا ملاحظہ کیا جس کا نقشہ کھینچکر میں ان ناخوشگوار باتوں کا اعادہ کرکے کہ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ناظرین کرام کی طبیعت منغص کرنا نہیں چاہتی

میرے خیال میں اس میں جتنے بھی مویشی میں نے دیکھے تھے۔ وہ اب تک فاقے کی موت مر چکے ہوں گے۔

لیکن ان سب ناخوشگوار باتوں کے بعد ایک ایسے مستثنیٰ کا ذکر کرنا خوشی کی بات ہے۔ کہ جس کے دیکھنے کا مجھے ذاتی تجربہ ہوا۔ یہ اگر دودھ دینے والے مویشی کو بمبئی کے ذبح خانہ میں بھیجے جانے سے محفوظ رکھنے والی ایسوسی ایشن کا گئوشالہ ہے۔ اس محافظ خانہ کی نگراں سوسائٹی زیادہ تر دولتمند ہندوستانی سوداگروں اور دوسرے سوداگروں کی انجمنوں پر مشتمل ہے۔ اس کی سب سے آخری رپورٹ کے پڑھنے سے کچھ دلچسپ مسالہ ملتا ہے۔ یہ رپورٹ اس بیان سے شروع ہوتی ہے۔ کہ جس میں یہ تخمینہ درج ہے۔ کہ یکم اپریل ۱۹۱۹ء سے لیکر اس مارچ ۱۹۲۴ء تک پانچسال کے عرصہ میں دو لاکھ انتیس ہزار پانچسو تراسی بچھڑے اور نوجوان بھینسے اذیت دے کر جان سے مارے گئے۔"

اسی رپورٹ میں آگے چلکر ہر ایک قسم کے ذبیحہ کے خلاف جن میں سانڈ بھیڑیں اور بکریاں بھی شامل ہیں۔ اپیل کی گئی ہے کہ جن کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ اور پھر آگے چلکر اس میں دودھ کی کمی کا سوال اس طرح پر پیش کیا گیا ہے:۔

"ہم ہندو لوگ گئو رکھشا کے دعویدار ہیں۔ اگر ہمارا یہ دعوے ٹھیک ہو۔ تو ہندوستان میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ مگر درحقیقت اس میں کوئی اصلیت نہیں بمبئی میں جہاں گائیوں کی

---

۵ شری گٹھکوپر سر ویلنکا جوادیا کھاتہ نمبر ۵، مہا بیر بلڈنگ بمبئی کی اپیل۔

حفاظت کی جاتی ہے سو دودھ اتنا ہی مہنگا ہے جتنا کہ لندن اور نیویارک میں جہاں گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ کتنی ہی تلاش کی جائے یا کتنا ہی روپیہ خرچ کیا جائے۔ خالص دودھ پھر بھی نہیں مل سکتا جس کا براہِ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ شیرخوار بچوں کی موت بے حد زیادہ اور نوجوانوں کی موت کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

ڈیری (دودھ گھی) کا کارخانہ اس انجمن کا اپنا ہے۔ جو اس نے شہر بمبئی کے نواح میں دیہات میں بنا رکھا ہے جس کے احاطہ میں گائیوں کے لئے معقول شیڈ بنائے گئے ہیں۔ جو مضبوط اور پوری حفاظت اور احتیاط اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ اور خوب صاف ستھرے ہیں۔ یہاں کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا۔ کہ وہ پندرہ پونڈ سوکھا گھاس آٹھ پونڈ اناج اور کھلی ہر ایک گائے کو روزانہ چار ۵ کھلاتا ہے۔ اور یہاں کے مویشی جیسے بھی تھے۔ وہ بھوکے نہیں نظر آتے تھے۔ اس گلہ میں ۲۷۷ گائیں ہیں۔ جو بالاوسط ۱۲ چوتھائی گیلن دودھ روزانہ دیتی تھیں۔ جو ۱۳۰ گھرانوں میں فروخت ہوتا تھا۔ اور جس سے کارخانہ کو ۴ پونڈ ۴ شلنگ روزانہ آمدنی ہوتی تھی۔ گائیوں کی بچھڑیاں گائے بناکر اس شرط پر فروخت کردی جاتی تھیں۔ کہ خریدار ان کو کبھی ذبح کرنے کے لئے فروخت نہیں کرے گا۔

یہاں کا عملہ سارے کا سارا ہندوستانیوں کا تھا۔ ان کے

چلن سے مجھے یاد آیا۔ کہ وہ اپنا کام دیانتداری اور چستی سے انجام دیتے ہیں۔ یہاں کے ایک افسر نے مجھے بتایا کہ:۔

"اگر یہ گئوشالہ محض تجارتی کارخانہ ہوتا۔ تو اس میں اس قدر غیر تجارتی مویشی نہ ہوتے۔ ہم مذبح خانہ سے گائیں خریدتے ہیں۔ مگر جہاں ہم سستی اور نکمی گائیں خریدنے کے عادی تھے۔ اب ہم نہایت اچھی گائیں خریدنا سیکھ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں گئوشالاؤں کے لئے تجارتی قسم کی گائیں خریدنا ہندوستان میں ایک نئی بات ہے۔ ابھی تک نہ تو ہمارے کارخانہ کی وجہ سے کوئی شیر فروش ابھی تک بیکار رہا ہے۔ اور نہ ہی مذبح میں گاؤکشی میں کوئی نمایاں کمی ہوئی ہے۔ مگر ہمیں امید ہے۔ کہ ہم اخیر میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں میرے عملہ میں دو جوان ایسے ہیں۔ جنہوں نے گورنمنٹ کے مویشی کے نسل کشی اور دودھ مکھن کے کارخانہ میں تربیت پائی ہے۔ اور جو مویشیوں کی دیکھ بھال میں پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اور ایسے تعلیمیافتہ تمام ہندوستان کے گئوشالاؤں اور پنجراپولوں میں نہیں مل سکتے ہم یہاں مویشیوں کی نگہداشت سائنس کے اصولوں پر کرتے ہیں"

ایک امریکہ کے کسان کے نقطۂ نگاہ سے یہ باتیں ابھی بحث میں لانے کے لئے بہت ابتدائی تھیں۔ ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے یہ تمام روشن خیالی کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ اور دیکھنے والا خود کو قصوروار محسوس کرتا تھا۔ کہ یہاں کے تمام ملازم سپرنٹنڈنٹ کے بھتیجے بھانجے اور قریبی رشتہ دار معلوم

ما د ر ہتے۔

ہوتے تھے۔

مگر یہ تمام اصلاح ایک انگریزوں سے سیکھے ہوئے ہندوستانی سرکاری عہدہ دار کی طفیل تھی جس نے ایک برطانوی افسر کی ماتحتی میں اس گئو شالہ کو بری ابتدا کرنے سے اس طرح محفوظ رکھا کہ اس نے ایک اعلےٰ درجہ کی سکیم تیار کی۔ اور ایسوسی ایشن کو اس پر عملدرآمد کرنے پر مجبور کیا۔

اندریں اثنا ہندوستانی سیاست دان ہندوستان میں اور اس سے باہر گورنمنٹ کی مجرمانہ غفلت کی شکائتیں کرتے اور باد ہوائی باتیں کرتے ہیں مذراعت اور زراعت پیشہ لوگوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ اور جب شہرت تقاضا کرتی ہے۔ تو دوسرے گئوشالاؤں کو تھوڑے چندے بھیج دیتے ہیں۔

سلہ دیکھو اخبار ینگ انڈیا ۳ مئی ۱۹۲۶ء کا صفحہ ۴۔

اکیسواں باب

دارالمحن

آجکل کے تعلیم یافتہ ہندوستانی "ست جگ" کی شان و شوکت کے متعلق بہت کچھ ڈینگیں مارتے رہتے ہیں۔ یہہ قرن اولے کا وہ زمانہ کہلاتا ہے۔ جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر صحت اور اچھی چیز کی بہتات۔ دانائی۔ خوبصورتی۔ اور امن دامان کا دور دورہ تھا۔ اور جب اس سرزمین پر خدا کی رحمت برستی تھی۔ مگر موجودہ گورنمنٹ کے زہریلے اثر نے اس قدرتی شان وشوکت کا ستیاناس کر دیا۔

اس "ست جگ" کے متعلق جس نمونہ کی دلیلیں دی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ:۔

"تم مانتے ہو کہ کسی زمانہ میں شہنشاہ چندرگپت گذرا ہے اور یہ کہ یہ وہی شہنشاہ تھا۔ جو شاہ سلوکس سے لڑا۔ جس نے سکندر اعظم سے جنگ کی۔ اچھا تو سنئے کہ اس چندرگپت کے عہد میں ایک چودہ سال کی نہایت خوبصورت اور جواہرات سے لدی ہوئی لڑکی بالکل امن دامان کے ساتھ جہاں چاہے۔ پھر سکتی تھی۔ اس زمانہ میں نہ تو کوئی مفلس

تھا۔ نہ کبھی قحط اور پلیگ پڑے تھے۔ مگر اس کم بخت برطانیہ نے ہمارے "ست جگ" کو تباہ و برباد کر دیا۔

برطانیہ پر الزام لگانے والا شخص ایک ایسی خیالی سرزمین کا نقشہ کھینچتا ہے۔ جو سائنس اور فلسفہ کے علوم سے معمور اور سبزہ زار سے بھرپور تھی۔ اس کے بعد یہ اپنے سامعین کو مخاطب کرکے بڑے جوش و خروش سے کہتا ہے:۔

"کیا تم مجھے اس وقت ہندوستان بھر میں اس خوشحالی اور علم و فضل کے ایک ذرّہ بھر آثار بھی دکھا سکتے ہو؟ نہیں اور بالکل نہیں۔ اچھا اگر کچھ آثار نہیں ملتے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ برطانیہ نے یہاں کی ہر ایک چیز کو برباد کر دیا ہے؟

مگر چندر گپت کا زمانہ خواہ اس کی خوبیاں کیسی ہی ہوں انگریزوں کے ہندوستان میں پہلے پہل قدم رکھنے سے پورے انیس سو سال سے زیادہ پہلے تھا۔ چندر گپت کے خاندان کو گردش فلکی نے زمانہ کی رفتار کے ساتھ ملیامیٹ کر دیا تھا۔ جن میں سے باقی صرف اشوک رہ گیا تھا۔ کہ جس کے زمانہ میں قوم سیتھین اور ترکوں نے پہاڑی دروں سے سر نکالکر شمالی ہند پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور وہاں اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ شمالی

لہ چندر گپت ۳۲۲ سے ۲۹۸ قبل مسیح تک حکومت کرتا رہا تھا۔

ہند کے عام ہندوؤں نے ان ترکوں وغیرہ کو اپنے آپ میں جذب کر لیا۔

چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی ہندوؤں کے علم و ہنر اور تواریخ کا سب سے بڑا زمانہ ہے یعنی وہ زمانہ جس میں کہ خاندان گپتا کے بادشاہ اس ملک میں حکمران تھے۔ اس کے بعد اس ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کہ جس کی مٹھی میں شمالی ہند کے پہاڑی درّے تھے۔ اور وسط ایشیا کے وحشی انسانوں کے غول کے غول آنے شروع ہو گئے۔ جو اس قدر ہیبت ناک تھے۔ کہ انہیں وائٹ ھنز (سفید ھن) اور اٹیلا کی افواج کے بھائی کہتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے تو ہندوستان کی دولت پر تاک لگائے سرحد پر بیٹھے موقع اور وقت کا انتظار کرتے رہے جب یہ موقع اور وقت آیا تو ان کا ایک سیلاب عظیم اُمڈ آیا۔ جو ہندوستان کی تمام دولت و حشمت اور شان و شوکت کو بہا کر لے گیا۔

چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں اس ملک کا جسے ہم ہندوستان کہتے ہیں) نصف شمالی حصہ ان ھنوں کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس کے بعد انہی ھنوں کے اور گروہ پہاڑی دیواریں پھاند کر آتے رہے۔ اور ملک ہندوستان کو پامال روندتے اور بے سپر کرتے رہے۔ کہ ان کی غارت گری سے آجکل کے کسی معتبر خاندان یا قوم کو

---

[1] واضح رہے کہ یہ زمانہ حال کے مسلمان ترک نہیں تھے بلکہ زمانہ قدیم کے ترک تھے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ (مترجم)

انکار نہیں۔

یہ ہنز بھی اپنے ماسبق سیتھین اور ترکوں کی طرح آہستہ آہستہ یہاں کے ہندوؤں میں جذب ہو گئے۔ ہندو مذہب نے جس کا کچھ وقت بدھ مذہب سے تنازع رہا تھا۔ پھر زمین پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اور ان کے توڑ نے پھوڑنے والے عقیدوں اور ان کے لاکھوں خوفناک دیوتاؤں نے اپنا کام کر دیا۔ اس وقت سے ماسوائے ساتویں صدی کے چند سالوں کے انہوں نے ملک کے شمالی حصہ میں یا جنوبی میں کوئی کامیاب کوشش سیاسی یکجہتی بنانے یا متفقہ سلطنت قائم کرنے کی نہیں کی۔ بلکہ ہر فوج در فوج اور گروہ در گروہ میں نا اتفاقی بڑھتی اور مضبوط ہوتی گئی۔

شمالی ہند کی تواریخ ساتویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر بعد کے پانچسو سال تک چھوٹی چھوٹی قوموں اور ریاستوں کی باہمی لڑائیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے جن میں اکثر زبردست وہی رہتی تھی۔ اور اسی کی سلطنت میں ہی توسیع ہوتی تھی جس کو ان لڑائیوں اور باہمی سازباز میں فتح نصیب ہوتی تھی۔ اس گورکھ دھندے میں یہی نظر آتا ہے۔ ایک چھوٹا رئیس دوسرے پر چڑھائی کرتا ہے۔ چھاپے اور شبخون مارتا ہے۔ ملک دوسرے سے چھین لیتا ہے۔ یا اپنے ملک کے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ دوسرے کے ملک میں غارتگری

کرتا ہے۔کشت و خون کرتا ہے۔ اور اس کی فوج کو تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے حسد کرتا ہے۔ یا اپنے ملک میں اپنے آپ کو فرعون سمجھنے لگتا ہے۔ اور ملک کے تمام شمالی اور وسطی حصہ کو درہم برہم کر کے اپنا باجگذار بنا لیتا ہے۔

اس عرصہ میں جزیرہ نمائے ہندوستان ہمیشہ شمال کی طرف سے آنے والے سیلابوں سے الگ اور محفوظ رہا اور اس کو اس کا پہاڑی اور جنگلی بند محفوظ رکھتا رہا۔ یہاں ہندوستان کے اصلی سیاہ فام باشندے تامل رہتے تھے۔ جو آرین خون سے مخلوط ہونے کے بغیر اپنی لڑائیاں آپ لڑتے اور اپنے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ پھر جب ہندو مشنری ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھے۔ تو انہوں نے اپنے مذہب کا پرچار اس طرح سے کیا کہ مقامی بتوں کو بھی اپنے دیوتاؤں کے بتوں کی تعداد میں شامل کر لیا۔

تامل لوگوں نے اپنے ملکی ہنر کو خوب ترقی دی ہوئی تھی۔ اور ہمیشہ بدلتے رہنے والی ریاستوں میں سے ایک ریاست میں انہوں نے نہایت دلچسپ اور مکمل دیہاتی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ مگر بارھویں صدی کے اخیر میں یہ خصوصیت بھی بالکل تباہ و برباد ہو گئی۔ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ باوجود اس کے تواریخ کبھی نہ ختم ہونے والی لڑائیوں اور بادشاہ گردی سے بھری پڑی ہے۔ مگر شمالی یا جنوبی ہند

میں نہ تو کوئی میونسپل نظام قائم کیا گیا۔ نہ کوئی شہر آباد ہوا۔ نہ کسی جمہوری سلطنت بنانے کا شور و غل ہوا اور نہ ہی لوگوں کے دلوں میں کسی نے سیاسیات کا بیج بو یا۔ ملک کی ہر ایک ریاست چپ چاپ کان دبا کر ایک خود مختار شخص کے زیر نگین رہی۔ جو اپنے تھوڑے سے عرصہ حکومت میں جو اس کے جی میں آیا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی دوسرے نے اس کو مار گرایا اور تباہ کر دیا۔

ہندوستان کی تواریخ کے آثار و نقوش سے سرسری طور پر گذرنے کے لئے اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہ سر ٹی ڈبلیو ہولڈرنس کی کتاب "پیپلز اینڈ پرابلمز آف انڈیا" کا مطالعہ کیا جائے جس میں لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستان میں پہلے عرب وارد ہوئے جنھوں نے ۸۰۰ء ... کے اوائل میں سندھ اور ملتان میں اپنی حکومتیں قائم کیں ۱۰۰۰ء میں سخت خدشہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت تاتاری قوموں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور ترکوں نے جو ان قوموں میں سب سے زیادہ قابل تھے یورشیں کرنی شروع کیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قسطنطنیہ پر قابض ہو گئے ۱۰۰۱ء میں محمود (جو ترک شہزادہ تھا) غزنی سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس کا لقب "بت شکن" تھا۔ جو اس شخص کی خود ہی تعریف کر رہا ہے۔ یہ ہر سال ہندوستان کے میدانوں میں پہنچکر غارت گری کرتا تھا۔ شہروں اور قلعوں کو فتح کر لیتا تھا۔ بتوں کو توڑتا اور مندروں

کو مسمار کرتا تھا۔ یہاں کے کفار کو قتل کرتا اور محمدؐ صاحب کے
مذہب کا ڈنکہ بجاتا تھا۔ اور ہر سال یہ بے شمار مال و دولت
اور زر و جواہر لے کر اپنے ملک افغانستان کو لوٹ جاتا تھا۔
۱۰۰۰ء سے گن کر پورے پانچسو سال تک تندخو اور
لالچی ترکوں۔ افغانوں اور مغلوں کے گروہ در گروہ یکے بعد
دیگرے ہندوستان میں آتے اور اپنا سکہ بٹھانے کے لیئے
لڑتے رہے۔ اس زمانہ کے اخیر میں بابر نے جو ایک ترک تھا
۱۵۲۶ء میں مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد دوسو
تک ہندوستان میں داخل ہونے کے پہاڑی درے مسدود
اور اس کے قابل جانشینوں کے قبضہ میں رہے۔

سر ہولڈرنس اپنی تواریخ "پیپلز اینڈ پرابلمز آف انڈیا" کے
صفحہ ۵۳ پر لکھتے ہیں:۔

سلطنت مغلیہ..... ایک معمولی قسم کی ایشیائی خود مختار
سلطنت تھی۔ یہ ایک غیر ذمہ دار خود سر حکومت تھی ہندوستان
کے لئے مغل لوگ ان فاتحان کی جگہ جو پہلے ہی یہاں قابض
تھے۔ ایک نئے فاتح بنکر آئے تھے۔ مگر یہ نئے فاتح اپنے ساتھ
شمالی ممالک کا زور و بل لائے تھے۔ یہ دریائے او کسس (جیحوں)
کے میدانوں کے باشندے تھے۔ جو کابل کے پہاڑوں کے
اس پار واقعہ ہیں۔ کیونکہ یہ اپنے ہمراہ ایشیا کی نہایت جنگجو
اور بہادر قوموں سے بے تعداد رنگروٹ بھرتی کر کے لائے تھے۔
جسمانی طاقت اور محنت کشی میں یہ لوگ یورپ کے نارمین

اور نامرد لوگوں کی مانند تھے"!

مسلمانوں کے اس سیلاب کو جنوب کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے تامل لوگوں نے ایک بہت بڑا شاندار شہر آباد کیا۔ جس میں وہ بلا شک وشبہ بڑے عیش وعشرت سے رہتے تھے۔ اس شہر میں یا اس سلطنت کے حدود کے اندر بھی جیسا کہ ہندوستان کی باقی تمام سلطنتوں میں ہو رہا تھا۔ عوام کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے بادشاہ اور امرا مالامال ہوتے تھے۔ اور انہی لوگوں کی فرمانبرداری اور غلامی پر سلطنت کے امن وقیام کا انحصار تھا۔ آخر اس ہندو سلطنت کے اقبال کا ستارہ بھی غروب ہو گیا۔ کیونکہ ۱۵۶۵ء میں مسلمانوں کی ایک ہی کاری ضرب سے جو گرد ونواح کی چھوٹی چھوٹی مسلمان سلطنتوں کے حکمرانوں نے لگائی۔ اس کی رعایا تہ تیغ ہو گئی اور اس کا شاندار شہر نقش ونگار رکھنے ہوئے پتھروں کا ڈھیر بن گیا۔

عظیم الشان مغل سلطانوں میں سے پہلے بادشاہ اس پرانے (ہندو) مذہب سے برابر رواداری کرتے تھے۔ مغلوں کے سب سے بڑے بادشاہ یعنی اکبر نے ایک ہندو لیڈی سے بھی شادی کر لی۔ اور راجپوت رئیسوں اور برہمنوں کو اپنے ہاں عہدے اور اسامیاں دیں۔ مگر مغل بھی ہمیشہ اسی طرح حکومت کرتے رہے جس طرح اجنبی فاتح کیا کرتے ہیں[1]۔

---

[1] کیا وہ بھی اپنے وطن کو کروڑوں روپے بھیجا کرتے تھے یا انہوں نے ہندوستان کو اپنا مستقل وطن نہیں بنایا تھا۔ (مترجم)

اور گو انہوں نے ہندوؤں میں سے بعض اشخاص کی ذہانت اور لیاقت سے فائدہ اٹھایا۔ مگر سلطنت کے خاص کاموں میں مسلمانوں ہی کو برسرِ اقتدار رکھا[1]۔

اس کے بعد ۱۶۵۸ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے پر سلطنت میں پھر وہ اسلامیت آ گئی۔ جو عوام ہندوؤں کی بت پرستی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس شہنشاہ کے زبردست ہاتھوں نے جن سے بت شکنی ہوئی۔ اور مندر مسمار[2] ہوئے وہ اعتبار جو راجپوتوں کو سلطنت پر تھا ضائع کر دیا۔ اور دکن کے نیچ ذات دہقانی ہندوؤں[3] یعنی مرہٹوں کو متفقہ طور پر مشتعل کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب اورنگ زیب نے مزید طاقت اور دولت کے حصول کی دُھن میں دکن کے چھوٹے چھوٹے مسلمان فرمانرواؤں پر حملہ کیا۔ تو مرہٹے گوریلوں[4] کے گروہوں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور عام شورش کے

---

[1] حالانکہ اکبر کے دربار میں راجہ ٹوڈرمل اور بیربل جیسے وزیر اور مدار المہام تھے [2] اس نے ہندوؤں کو جاگیریں دیں اور مندروں کے فرمان جاری کئے [3] راجپوتانہ کی اعلےٰ ذاتوں کے راجپوتوں کی غیرت جوش میں آئی اور بقول مصنف نیچ ذات ہندوؤں کو غیرت آگئی۔ اس کے اسباب بالکل دوسرے ہیں۔ دیکھو مولوی شبلی نعمانی کا مضمون اورنگ زیب عالمگیر (مترجم)

[4] گوریلہ وہ فوج ہوتی ہے۔ جو جم کر کسی فوج کا مقابلہ نہیں کرتی۔ اور لٹیروں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہ بنکر لڑتی پھرتی ہے۔ (مترجم)

بہانے سے جس کو چاہا۔ قتل و غارت اور برباد کر کے ملک کو تباہ کر دیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی نصف صدی کی مسلسل حکومت نے سلطنت مغلیہ کو ایسا کمزور کر دیا کہ اس کی وفات پر یہ پراگندہ ہو گئی۔ اور مرہٹوں کے گروہوں نے جو اس وقت اپنے سرداروں کے ماتحت لوٹ مار اور غارتگری میں مشاق ہو گئے تھے۔ ایک مختصر زمانہ کے لئے زور پکڑ لیا۔

اس کے بعد پھر وہی تاریخی ناگزیر واقعہ پیش آیا۔ جو اب تک ضرور آتا رہا ہے۔ یعنی جب کبھی بھی شمال کی حفاظت کرنے میں غفلت ہو گئی۔ تو وسط ایشیا کی قومیں امڈ آئیں سلطنت مغلیہ میں زوال آ جانے سے وسطی ایشیا کا دروازہ کھل گیا اور اس ملک کے لوگ پھر ہندوستان میں آ دھمکے۔ پہلے ایرانی آئے پھر تند خو افغان جنہوں نے آخری لڑائی میں جو ۱۷۶۱ء میں ہوئی۔ مرہٹوں کو بے دریغ تہ تیغ کر کے ان کی دکنی پہاڑیوں کی طرف پیچھے بھگا دیا۔

ان تمام مصیبت بھری صدیوں کے معدودے چند سرکاری کاغذات میں عام لوگوں کی حالت کا درحقیقت کچھ بھی ذکر نہیں ملتا اس زمانہ کی تاریخیں اس وقت کے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں اور مختلف اقوام کے طائفوں کے سرداروں کی ایسی تاریخیں ہیں۔ جن میں صرف ان کی ذاتی زندگیوں۔ ان کے کارناموں ان کے قتول۔ ان کی سازباز کی کارروائیوں۔ ان کی لڑائیوں اور شکستوں کے حالات مندرج ہیں۔ مگر ان میں بعض اشارے

اور نکات ایسے بھی ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
اس زمانہ کے عوام اپنے حکمرانوں یا سرداروں کے خواہ وہ
ہندو تھے یا مسلمان۔ لالچ کا شکار رہتے تھے۔ یہ بھوکے
ننگے اور افلاس زدہ ہوتے تھے۔ ان پر فوجی تلنگے ظلم و ستم
کرتے اور ان کی تھوڑی سی کمائی ہضم کر جاتے تھے۔ قحط کو
وبائی بیماریاں ان کو تباہ و برباد کرتی تھیں۔ یہ معلومات ہمیں
ان سیاحوں کے سفرناموں سے حاصل ہوتے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً
دیگر ممالک سے اس ملک میں سیر و سیاحت کی غرض سے آتے رہے۔
بہت سے مغربی سیاحوں مثلاً فرانسیسی۔ ڈچ۔ اہل
پرتگال۔ اہل ہسپانیہ نے اکبر کے زمانہ اور اس کے بعد کے
شمالی اور جنوبی ہندوستان کے حالات کی بابت تحریریں چھوڑی
ہیں۔ یہ تمام تصنیفات اصلی مقصد کی نسبت ایک دوسرے
سے پورا اتفاق رکھتی ہیں۔
ان کا بیان ہے۔ کہ اس زمانہ لوگ غریب اور بے حد غریب ہوتے
تھے۔ اس زمانہ کی امرار کی دولت غیر محفوظ رہتی تھی۔
ایک عام ڈاکو اور ایک سلطنت کے رکن کی ثروت کی بابت کوئی
کسی قسم کی رائے زنی کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ ہندو لوگ
گرے ہوئے عوام میں شمار ہوتے تھے۔ خود حاکم اور ان کے برسر
اقتدار اہلکار (جو تعداد میں تھوڑے تھے) خواہ وہ ترک ہوں
یا ایرانی قریباً تمام غیر ملکی ہوتے تھے۔ ان کی عیش و عشرت اور بیجا
نمائش ایک طرف تو خواہشات نفسانی کی کبھی نہ سیر ہونے والی

انتہا اور دوسری طرف دربار میں ہر دوسرے سے سبقت لے جانے کی آرزو سے بہت بڑھ گئی تھیں۔ تمام بڑے بڑے عہدہ دار اور بادشاہ کا منظور نظر بننے کے لئے بڑی بڑی رشوتیں دینے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور ان کی فضول خرچی اس لئے بھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں یہ دستور ہو گیا تھا۔ کہ جب کوئی امیر آدمی مرتا تو اس کا تمام اثاثہ شاہی خزانہ میں داخل کر لیا جاتا۔

اپنے بڑے عہدوں اور اپنے جاہ و جلال کو قائم رکھنے کے ذرائع پیدا کرنے کے لئے بادشاہ کے منہ لگے اہلکار سے لیکر چھوٹے اہلکار تک کا یہی معمول تھا۔ کہ دہقانوں کا خون نچوڑا جائے۔ جو نچوڑا جاتا تھا۔

ایک سیاح وان لنیچوٹن جو ۱۵۸۳ء سے ۱۵۸۹ء تک کی سلطنت کی کمزوری کے زمانے میں اس ملک کی سیر و سیاحت کے لئے آیا۔ لکھتا ہے کہ[1]:-

...... دہقان ایسے گرے ہوئے اور خستہ حال ہیں۔ کہ صرف ایک پیسے (دھیلہ) کے لئے وہ کوڑے کھانے کی تکلیف کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو اس قدر تھوڑی خوراک میسر آتی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ہوا کھا کر جیتے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ وہ بالکل مریل اور کمزور سے ہیں۔"

---

[1] جان ہیگیو وان لنیچوٹن کا بحری سفر مشرقی ہندوستان کی طرف جو ۱۵۹۸ء میں ہکلائٹ سوسائٹی کے لئے مرتب کیا گیا

"جب بارش نہ ہوتی تھی۔ تو ان کو اور بھی سخت مصیبت کا سامنا ہوتا تھا۔ یہ وحشی حیوانوں کی طرح خوراک کی بے سود تلاش میں نکلتے تھے اور اپنے بچوں تک کو ایک روپیہ فی بچہ کے حساب سے بیچ دیتے تھے۔ ان بردہ فروشی کی منڈیوں کے مہتمم وہ اشخاص تھے جنہوں نے خود بھوک کی موت سے بچنے کے لئے جس سے ایک اور صورت بچاؤ کی صرف مردم خوری تھی خود اپنے آپ کو بیچ دیا ہوا تھا۔"

کتاب "بادشاہ نامہ" مصنفہ عبدالحمید لاہوری اس بات کی شاہد ہے کہ ۱۶۳۱ء کے قحط کے دوران میں دکن میں یہ حالت ہوگئی تھی۔ کہ مردوں کی پسی ہوئی ہڈیاں آٹے میں ملا کر فروخت ہوتی تھیں۔ اور آخر اس قحط کی مصیبت کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ انسانوں نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔ اور محبت پدری ایسی مفقود ہو چکی تھی۔ کہ باپ اسے بالائے طاق رکھکر اپنے بیٹے کا گوشت کھا جاتا تھا۔ اس قحط سے اس قدر اموات ہوئی تھیں کہ سڑکیں لاشوں سے پٹ گئیں۔ اور راستے مسدود ہو گئے۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ نے اسی سال میں تحریر کیا ہے[1]۔ کہ سورت میں شرح اموات اتنی زیادہ تھی:۔

اس کے دو سال بعد کرسٹا فریڈ نے برٹش ایسٹ انڈیا

---

[1] یہ اقتباس مصنف نے ڈچ زبان میں ہی نقل کر دیا ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ نہیں دیا جا سکتا۔ (مترجم)

کمیٹی کو یہ رپورٹ ارسال کی کہ:۔

"سولی پٹم اور اتر ناگون قحط سے سخت پریشان حال ہو رہے ہیں۔ جو لوگ کہ زندہ ہیں۔ وہ اپنے مردوں کو کھا رہے ہیں۔ اور لوگوں نے ملک میں اس خوف سے سفر کرنا بند کر دیا ہے کہ انہیں کوئی مار کر کھا نہ جائے۔"

اس زمانہ میں پیٹر منڈی نے گجرات سے یہ لکھا کہ:۔

"قحط سے دس لاکھ سے زیادہ عام لوگ اور غریب مر چکے ہیں۔ اس کے بعد امیر اور متوسط الحال آدمی بھی اسی تعداد میں مر رہے ہیں۔ عورتیں اپنے بچوں کا گوشت کھاتی ہوئی دیکھی گئیں۔ ایک مرد یا عورت اپنی موت کے فوراً بعد ٹکا بوٹی کر کے کھا لیا جاتا ہے۔"

متذکرہ بالا بیانات کی تصدیق اور قحط کے متعلق اور بہت سی باتوں کا ذکر کتاب "سفرنامہ پیٹر منڈی" کے متن اور ضمیمہ میں ملے گا جو ہکلوئٹ سوسائٹی نے ۱۸۸۴ء میں شائع کی ہے دوسری پرانی کتابوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

چونکہ غلاموں کی خرید پر عملی طور پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ لہذا ایک امیر کے گھر میں ان کی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اور وہاں یہ ایسی ردی حالت میں رکھے جاتے تھے۔ کہ دیکھنے والے کو خود ہی معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ یہ مفت کی چیز ہے۔ امراء کے ہاتھی سونے چاندی کے زیورات سے لدے ہوئے ہوتے تھے۔ حالانکہ غریبوں کے بدن پر ڈی لائٹ کے بیان کے

مطابق جو ایک معصر مشاہد تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے ایک لتّہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

سوداگرجن کا نام نہایت اچھا چلا ہوا ہوتا تھا۔ نہ تو آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنے اور نہ ہی اچھا کھانا کھانے کی جرات کر سکتے تھے۔ اور اپنے سیم وزر کو زمین میں دفن کر کے رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کی آسائش سے رہنے کا اگر ذرا بھی شبہ ہو جائے۔ تو ان پر بیحد سختی کر کے ان کے دفینے کے مقامات دریافت کیے جاتے تھے۔

دیہاتیوں کی ساری کمائی عملی طور پر صرف ان کی اراضی کی پیداوار ہوتی تھی۔ اور اس تمام پیداوار میں سے ان غریبوں کو صرف اتنا دیکر جس سے ان کا گذارہ مشکل ہوتا تھا۔ باقی تمام حکومت کے منہ میں چلی جاتی تھی۔ اور حکومت کے ہاتھ آئی ہوئی پیداوار سیدھی محدود سے چند اجنبی حکمرانوں کی جیبوں میں چلی جاتی تھی۔ حکومت کے ہاتھ میں گئی ہوئی اس پیداوار کا لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ کیونکہ عوام کے مفاد کا کوئی کام ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ ملک بھر میں چند پلیں اور ایسی سڑکیں[2]

---

[1] یہ جو عالیشان تعمیرات مثل روضہ ممتاز محل یا دیوان عام دہلی وغیرہ ابتک صدیوں سے زمانہ کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ جو کاریگر اور مزدور انہیں بناتے تھے۔ وہ تو ننگے ہی ہوتے تھے۔ مترجم۔ [2] شیر شاہ سوری کی عظیم الشان سڑک جو بنگال سے لیکر پشاور تک اور اس پر جا بجا پختہ کنوئیں اور سرائیں بنائی گئی تھیں۔ اس سے صرف اجنبی حکمرانوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ (مترجم)

تھیں جنہیں مٹی اور پتھروں پر چلائے ہوئے بیلوں کے کھروں کے
نشانوں سے بھری ہوئی پگ ڈنڈیاں کہنا چاہیے۔ اور یہی حسرت انگیز
ملک کی ذرائع آمد و رفت تھیں۔ کسی سادہ سے سادہ تعلیم دینے کے لئے
یا طبی امداد بہم پہنچانے کا کوئی دستور العمل نہیں تھا۔ اور نہ ہی
معاملات میں اپنا بچاؤ کرنے کے لئے کسی قانونی چارہ جوئی کا
دستور تھا۔ بعض اوقات حکمران یا ان کے وزراء اچھی اچھی تجاویز
کاغذات پر تحریر کرتے تھے۔ مگر ملک کی فلاح و بہبود کے لئے عملی

لہ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صاحب مصنف نے مسٹر نریندر ناتھ لا کی (۲۹۰ صفحہ
کی کتاب پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول بائی محمڈنس (یعنی
ہندوستان میں اہل اسلامی میں مسلمان بادشاہوں نے جو تعلیم کو ترقی دی ہے۔ اس کی
کیفیت جو انگریزی میں لکھی اور لندن کے لونگمینس گرین اینڈ سنز نے ۱۹۱۶ء
میں شائع کی ہے اور تمام مسلمان سلاطین کے مدارس و یونیورسٹیوں کے حالات
سے پر ہے۔ جو ہندوستان میں انہوں نے جاری کی تھیں نہیں دیکھیں۔
ورنہ وہ اتنا بڑا الزام لگانے کی کوشش نہ کرتے۔ اور بھی بہت سے بیانات
مصنف صاحب کے ہیں جن سے ہمیں اتفاق نہیں۔ لیکن ہم ہر ایک بات حاشیہ
میں کس طرح اضافہ کر سکتے ہیں (مترجم)

۲ۓ آئین اکبری میں تمام ہندوستان کا بندوبست اراضی جو اکبر کے زمانہ
میں کیا گیا ہے۔ اور خود انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے بندوبست کی
اسی پر بنیاد رکھی ہے۔ ایک عجیب شاندار اور قابل غور کام ہے۔
(مترجم)

طور پر کچھ نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اگر ایک بادشاہ کوئی عمارت کا
کام شروع کرتا تھا تو اس کا جانشین یا تو اس کی تجویز ہی کو رد
کر دیتا تھا یا اس کام کی تکمیل میں تاخیر ڈال دیتا تھا۔[۱]

اکبر کی وفات کے چند ہی سال بعد ایک شخص [illegible] ہالینڈ
فرانسسکو پیلسارٹ نے ہندوستان میں اپنی سات سالہ
رہائش شروع کی جس کے متعلق اس نے نہایت قیمتی اور عجیب
غریب تحریرات چھوڑی ہیں۔ وہ اپنی سرگزشت بیان کرتا ہوا
لکھتا ہے کہ:[۲]

"اگر یہاں کے دہقانوں پر بے رحمی سے شدید ظلم نہ کیا
جائے۔ تو یہاں کی اراضی میں سے غیر معمولی بہتات کے ساتھ
پیداوار ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ مواضعات جن میں پیداوار اس
قدر کم ہو کہ اس سے سرکاری مالیہ کی پوری رقم نہ ادا ہو سکے
ان کے مالکان یا گورنر ضبط کر لیتے تھے اور دہقانوں کی بیوی

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب "ہندوستان اکبر کی موت کے وقت" مصنفہ ڈبلیو
ایچ مورلینڈ جسے میکملن اینڈ کمپنی لندن نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔
اس کتاب میں اس عام مضمون کے متعلق بہت سے کاغذات کے حوالہ
جات سے نہایت مفصل طور پر لکھا گیا ہے۔ اور معقول ثبوت دیا گیا ہے
(مصنف) [۲] ملاحظہ ہو "ریمانسٹرنٹ آف فرانسسکو پیلسارٹ"
جسے ڈچ زبان سے ڈبلیو ایچ مورلینڈ نے ترجمہ کیا۔ اور پی۔ جی ہفر
کیمبرج نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا (۴۷ لغایت ۴۹)

بچوں کو اس بہانے سے بیچ دیتے ہیں کہ انہوں نے بغاوت کی ہے۔ پس دہقان ان مالکان اور گورنروں کے ظلم و تشدد کے خوف سے بھاگ جاتے ہیں۔ لہٰذا کھیت خالی اور بن بوئے ہوئے پڑے رہ کر جنگل بن جاتے ہیں۔"

"قوانین کا یہ حال ہے کہ ان پر کوئی عملدرآمد نہیں ہوتا کیونکہ خودمختار حکومت ہے ..... ان لوگوں کے قانون کا منشا یہ ہے کہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹ دیا جائے آنکھ کے بدلے آنکھ نکال دی جائے۔ اور دانت کے بدلے دانت توڑ دیا جائے اور ایسے قانون کے واضعان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اور اگر کوئی یہ سوال کر ہی بیٹھے کہ ہم پر اس طرح حکومت کیوں کی جا رہی ہے تو جواب ملتا ہے کہ ہمارے قانون کا منشا ہی یہی ہے۔ ہر ایک شہر میں انصاف کی ایک شاہی عدالت تو ضرور ہے مگر اس شخص پر ضرور رحم آتا ہے جس کا فیصلہ ان عدالتوں کے ناخداترس اور بے انصاف ججوں کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ان ججوں کی آنکھیں لالچ سے چندھیائی ہوتی ہیں۔ اور ان کے منہ حرص و طمع کے بھیڑیوں کی طرح کھلے ہوتے ہیں۔ ان کے تنور شکم غریبوں کی روٹی ہڑپ کر جانے کے لئے ہر وقت گرم رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت کے لئے ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے۔ کیونکہ نقدی ادا کئے بغیر رحم اور ترس کی کسی پر امید ہی نہیں ہوتی۔ رشوت ستانی کا عیب صرف ججوں اور افسروں ہی میں نہیں پایا جاتا

تک لالچ کے پتلے بنے ہوئے ہیں ؛

" یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کو صرف میدانوں اور سڑکوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ مگر اس کے عہد میں بہت سے مقامات ایسے ملتے ہیں جن میں سے سفر کرنا ایک مضبوط آدمیوں کا گروہ ساتھ لیکر یا ڈاکوؤں کو بہت سی راہداری دینے کے بغیر ناممکن ہے۔ اس زمانہ میں ڈاکوؤں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ جتنی کہ رعایا کی۔ بڑے بڑے شہر بھی غیر محفوظ ہیں۔ راجہ بھیل کی فوجیں غارتگری کرتیں اور لوگوں کو تہ تیغ کرتی ہوئیں سورت کے شہر تک پہنچ جاتی ہیں۔ بلکہ اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح احمد آباد۔ برہان پور آگرہ۔ دہلی۔ لاہور۔ اور بہت سے بڑے بڑے شہروں میں رات اور دن کو ڈاکو چور اور رہزن کھلے بندوں دشمنوں کی طرح آجاتے ہیں۔ یہ لوگ گورنروں کو عام طور پر رشوت دے دیتے ہیں۔ کہ وہ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ کیونکہ طمع عزت مردمی پر غالب آجاتا ہے۔ اور بجائے فوج بھرتی کرنے کے وہ اپنے محلوں میں خوبصورت عورتوں کی بھرمار کر لیتے ہیں جیسا کہ ان کے محل کی چار دیواری کے اندر دنیا بھر کا عیش خانہ بن جاتا ہے "

یہ عود مین ٹرنچ اپنی سرگذشت میں اس وقت کی طرز زندگی کا متاثر ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

ایک امیر کی نہایت شان دار اور پر از حکومت و اقتدار زندگی اور عام لوگوں کی ذلیل اور مفلوک الحال زندگی میں زمین و آسمان کا

لہ ریماؤنٹنگ آف فرانسسکو پلسائیرٹ صفحہ ۶۰

فرق ہے۔ یہ مفلوک الحالی اس قدر دکھ سے بھری ہوئی ہے۔ کہ
ہم ان لوگوں کی زندگی کی تصویر اپنی الفاظ میں کھینچ سکتے ہیں۔ یہ لوگ
ایسے ملک میں رہتے ہیں۔ جو قلیا حزاں اور دارالمحن کے سوائے
اور کچھ نہیں۔"

یہی ڈچ سیاح لکھتا ہے۔ کہ ان لوگوں پر اپنے مذہب
اور قسمت کے عقیدے سن سن کر ایسا گہرا اثر پڑا ہوا ہے
کہ جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔

"یہ لوگ اس خیال سے کہ یہ اس سے بہتر سلوک کے مستحق
ہی نہیں۔ جو کچھ کہ ان پر نازل ہو۔ صبر کے ساتھ برداشت کر لیتے
ہیں۔ اور ایسا کوئی شخص بمشکل نظر آیا ہے۔ جو کوئی ایسی سیڑھی
تلاش کرے۔ کہ جس کے ذریعہ سے وہ ذلت کے اس گڑھے سے
نکل باہر اس کے کہ جس میں وہ گرا ہوا ہے۔ وہاں کے دستکاروں
اور کاریگروں کا ایمان ہے۔ کہ ان کے بچے ان کے اپنے خاندانی
پیشے کے سوائے اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی
وہ ان کی قوم کے علاوہ کسی اور قوم میں شادی کریں گے۔ وہاں
کے دستکاروں کے لئے دو قسم کے تازیانے ہیں۔ یعنی پہلا تو
"تھوڑی اجرت" اور دوسرا گورنر۔ امرا دیوان اور دوسرے شاہی
افسروں کا ظلم" اگر ان گورنر وغیرہ میں سے کسی کو کسی کاریگر کی خدمات
کی ضرورت ہوا۔ تو کاریگر سے بالکل نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کام
پر لگے گا یا نہیں۔ بلکہ اس کو اس کے گھر میں یا گلی میں پکڑ لیا جاتا
ہے۔ اور اگر وہ پکڑا جانے کے بعد چلنے پر کوئی اعتراض کرنے کی

جرات کرے۔ تو اس کی خوب مرمت کی جاتی ہے۔ اور شام کے وقت اسے نصف مزدوری دی جاتی ہے۔ یا بالکل ہی کچھ نہیں دیا جاتا"۔

پلساتیرٹ کی ہندوستان سے روانگی کے چالیس سال بعد ایک فرانسیسی سیاح فرانسس برنیر نامی یہاں آیا اور ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء تک مقیم رہا۔ اس کی سرگذشت دوسرے غیر ملکی سیاحوں سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ اس نے خاندان مغلیہ کے چوٹی کے بادشاہوں یعنی شاہجہان اورنگ زیب کے عہد حکومت کے آدمیوں، عورتوں اور چیزوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت اراضی اور ٹیکسوں کی بابت بیان کرتا ہوا لکھتا ہے کہ:[1]

"بادشاہ تمام ملک کی اراضیات کا مالک ہونے کی حیثیت سے کچھ اراضی فوجیوں کو ان کی تنخواہ کے معاوضہ میں دیدیتا ہے ..... اسی طرح کی عطیات گورنروں کو ان کی تنخواہوں کے عوضانہ میں اور خرچ رکھنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ اور شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص رقم سالانہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں گے..... وہ اراضیات جو اس طرح دینے سے بچ رہتی ہیں وہ خود بادشاہ محل شاہی کے اخراجات کے لئے رکھ لیتا ہے۔ جن پر ٹھیکہ دار رکھے جاتے ہیں جنہیں ایک سالانہ مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے"۔

---

[1] کتاب "سلطنت مغلیہ کی سیاحت" مصنفہ فرانسس برنیر مطبوعہ ۱۹۱۶ء اکسفورڈ یونیورسٹی پریس صفحہ ۲۲۴۔

یہی سیاح فرانسس برخیز بنگال کو دنیا کے تمام ممالک سے بہترین اور زرخیز ملک خیال کرتا ہے۔ مگر ہندوستان کے دوسرے علاقہ جات کی بابت لکھتا ہے کہ:-

"چونکہ اراضیات پر جبر کے سوائے شاذ و نادر ہی کلیہ رائی کی جاتی ہے۔ اور چونکہ کوئی شخص نہ تو اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے قابل ہوتا ہے۔ کہ اراضیات کے گڑھوں کو پُر کر دے۔ یا پانی کے نکاس کی نالیاں بنائے لہذا تمام اراضیات پر نہایت بری کاشت ہوتی ہے۔ اور ان کا بہت سا حصہ آبپاشی کے نہ ہونے کی وجہ سے ناقابل کاشت رہ جاتا ہے۔ ایک کسان اپنے آپ سے یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "میں ایسے ظالم کے لئے کیوں تکلیف اٹھاؤں جو کل ہی یہاں پہنچکر ان تمام چیزوں کو لے جائے گا۔ جو اس وقت میری ہیں۔ جن کو دیکھکر میں پھولا نہیں سماتا۔"

گورنر اور اراضیات کے ٹھیکہ دار اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں۔ کہ "اراضی کو اس طرح غفلت سے ویران ہوتا ہوا دیکھکر ہم اپنی طبیعت کو کیوں منغص کریں؟ اور ہم اس کو زرخیز کرنے کے لئے اپنا وقت اور روپیہ کیوں صرف کریں۔ ممکن ہے کہ ہم ان تمام اراضیات سے ایک منٹ میں محروم کر دیئے جائیں۔ اور ہماری کوششوں سے نہ ہم خود اور نہ ہماری اولاد مستفید ہو سکے۔ ہمارے لئے یہی مناسب ہے۔ کہ ہم ان اراضیات میں سے اتنا روپیہ پیدا کریں۔ جتنا کہ ہم کر سکتے ہیں۔ اس میں کسان

فاقے مرے یا بھاگ گئے۔ اور جب ہمیں ان اراضیات کے یک لخت چھوڑ دینے کا حکم ملے۔ تو ہم ان کو ایک غیر آباد ویرانہ چھوڑ کر چلدیں۔ گورنمنٹ کے اسی ناقص ترین طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایسا شہر یا قصبہ نہیں۔ جو اگر ابھی تک ویران اور تباہ نہیں ہو چکا۔ تو اس کی تباہی و بربادی کے آثار ضرور نظر آنے لگے ہیں

"ملک اس لئے تباہ ہو رہا ہے۔ کہ حکومت باقاعدہ عدالتوں کے قائم کرنے اور لوگوں کو مطیع کرنے کے لئے ایک بڑی فوج کے رکھنے کے بھاری اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

اب ہم اس قدر اختصار کے ساتھ جس قدر کہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں یورپین حکومتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اکبر کی تخت نشینی کے زمانہ یعنی ۱۵۵۶ء میں اہل پرتگال گوا میں جو برِاعظم ہند کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اپنے قدم جما چکے تھے۔ اور انہوں نے یہاں اپنے آپ کو ہر طرح سے محفوظ کر لیا ہوا تھا۔ یہ ملک گوا اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ان لوگوں نے دکن کے چھوٹے چھوٹے مسلمان بادشاہوں سے لیا تھا۔ یہیں سے وہ بحیرہ عرب اور خلیج فارس کی تجارتی آمد و رفت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کسی اور یورپین طاقت نے ابھی تک ہندوستان میں آنے کا عزم نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی کسی انگریز نے ابھی تک اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔[۹]

[۹] آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ (۴۴۸)

اہل پرتگال کی طاقت ہندوستان میں عیاشی اور ظلم و ستم کی وجہ سے جلد ہی کمزور ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولھویں صدی کے شروع میں گوا کے سوائے تمام علاقہ ان لوگوں کے ہاتھ سے نکلکر ڈچ لوگوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

ڈچ اور انگریز سوداگر ان دنوں مشرق میں تجارت کرنے کے خاص طور پر شائق تھے۔ مگر بعد میں چونکہ ڈچوں کا نصب العین جاوا اور سپائیس آئی لینڈ (جزائر گرم مسالہ) ہو گئے۔ لہذا ان کے انگریز حریف ہندوستان میں عملی طور پر اکیلے رہ گئے۔

ان برطانوی یا انگریز سوداگروں کو ملکہ الزبتھ اور مغل شہنشاہ کی طرف سے شاہی سندات اور مراعات عطا ہو گئیں لہذا انہوں نے اب مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً تجارتی کوٹھیاں بھی قائم کرنی شروع کر دیں۔ ان کے خلیج بنگال میں وارد ہونے کے پانچسال بعد انگلستان کے پیوریٹن تارکان وطن (امریکہ) میں آباد ہوئے۔ اس کے نوسال بعد انگریزوں کو سب سے پہلا حق مالکانہ ہندوستان میں اس معاہدہ کے ذریعہ سے ملا۔ جو مقامی ہندو حکمران اور لنڈن کے سوداگروں کی اس تجارتی کمپنی اور گورنر کے مابین ہوا۔ جو مشرقی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتی تھی۔ اس معاہدہ کی رو سے اس کمپنی کو یہ اجازت ہوگئی کہ وہ ساحل سمندر کے اس شور قطعہ زمین پر قبضہ کرلے۔ اور اسے تجارتی نقطہ نگاہ سے محفوظ کرلے۔ کہ جس پر اب شہر مدراس واقع ہے۔ یہاں اس وقت وہ الیہو ییل نامی شخص

کمپنی کی طرف سے گورنر ہو کر آیا۔ یہ کبھی بوسٹن واقع ماسوچوسٹس (اضلاع متحدہ امریکہ) میں رہا کرتا تھا۔ الیہو ییل نے یہیں تجارت سے وہ روپیہ کمایا جس سے آج کا کنکٹیکٹ یونیورسٹی بنائی گئی ہے۔ جو اب تک الیہو ییل ہی کے نام سے مشہور ہے۔ چنانچہ اب تک اسی جگہ وہ کوٹھی واقع ہے جس میں مدراس کے گورنر ابھی تک رہتے ہیں۔ اور جس میں الیہو ییل کی تصویر لٹکی ہوئی اپنے محبت کے میدان میں خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔

فرانسیسی سوداگر؛ ان نے بھی جو ہندوستانی تجارت کے خواہشمند تھے۔ سترھویں صدی کے آخری نصف زمانہ میں ہندوستان میں جنوبی سواحل کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت حاصل کی۔ ان کی تجارت کو وہ فروغ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ جو انگریز سوداگروں کی تجارت کو ہوا۔ چونکہ یورپ میں بھی ان لوگوں کی برطانیہ والوں کے ساتھ ٹھنتی تھی۔ اور یہ ان کے خلاف وہاں سازباز جاری رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہاں ہندوستان میں بھی چھوٹے چھوٹے ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ ملکر انگریزوں کے خلاف یہی سازباز اور لاگ ڈانٹ شروع کردی جس کا نتیجہ باہمی کشمکش ہو گیا اور اس کا خمیازہ دونوں کو اٹھانا پڑا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جبکہ نیو انگلینڈ اور نیو یارک کے نوآبادیات والے انگریز اپنے (امریکن) انڈین رفیقوں کی مدد سے دنیا کے ایک دوسرے حصہ میں نوآبادیات میں آئندہ حکومت کے لئے "فرنیچ اینڈ انڈین" لڑائیاں لڑ رہے

تھے۔ اسی زمانہ میں نوآبادیات کے انگریز اسی غرض کے لئے اپنے انڈین (ہندوستانی) معاونین کی مدد سے "فرینچ اینڈ انڈین" لڑائیاں لڑ رہے تھے۔ جن دونوں کا نتیجہ قریباً یکساں ہی رہا۔

۱۷۴۶ء میں یہ جدوجہد کھلے طور پر شروع ہو گئی۔ اور فرانسیسیوں نے مدراس لے لیا۔ اور ۱۷۶۱ء میں ختم بھی ہو گئی جب ان لوگوں نے اپنا صدر مقام یعنی پانڈی چری کو بغیر کسی شرط کے انگریزوں کے حوالہ کر دیا اور اس طرح ہندوستان کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔

لہ بحیثیت ایک امریکن ہونے کے یہ نہیں ہو گا۔ کہ اس موقعہ پر ہم اپنے نکتہ چینی کرنے والوں کی توجہ خود ہی یہ تسلیم کرنے سے مبذول کریں۔ کہ ہم نے تو اپنے انڈین کی قریباً جڑ کاٹ دی ہے۔ اور ان کو کبھی حق انتخاب بھی نہیں دیا۔ مگر ہمارے برطانوی بھائیوں نے اپنے انڈین کی تعداد کے اضافہ کی نسبت بہت کچھ کیا ہے۔ اور جمہوری حکومت حاصل کرنے کی بہت کچھ ہمت دلادی ہے (مصنف) اگر مس صاحبہ نے یہ کیا فضول مقابلہ کیا ہے۔ کہاں ہندوستان کی وسیع اور آباد سرزمین اور شاندار ماضی اور اس کا مقابلہ امریکہ کے خانماں ویران تھوڑے سے جاہل اور غیر مہذب انڈین سے کیا ہے۔ مگر شکر ہے کہ امریکہ کے اس وحشیانہ سلوک کو مان لیا ہے۔ جو اس نے ان انڈین لوگوں سے کیا ہے۔ کہ جن کا ملک ان سے چھینا ہے۔ (مترجم)

اٹھارہیں صدی کے بہت سے ابتدائی زمانہ تک انگریزوں
کے ہندوستانی مقبوضات مدراس میں صرف چند مربع میل اراضی
تک بمبئی میں اور تین یا چار اور مقامات تک محدود رہے۔ اس
عرصہ میں ہندوستان میں انگریزی نمائندوں نے اپنے آپ کو صرف
تجارت میں مشغول رکھا۔ اور مقامی لڑائیوں یا سیاسیات میں کوئی
حصہ نہیں لیا۔ مگر شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات سلطنت مغلیہ
کے زوال اور ان غارت گرانہ لڑائیوں اور لوٹ مار کی وجہ سے
جو ملک بھر میں شروع ہوگئی تھیں۔ کمپنی بہادر نے اپنے مقبوضات
کی حفاظت کے لئے یورپین سپاہیوں کی ایک فوج بھرتی کی
اور بعد ازاں ہندوستانی امدادی فوجیں بھی رکھیں۔

اس زمانہ سے یہ کمپنی ایک برسر اقتدار اور حکومت کرنے
والی جماعت بن گئی۔ سنہ ۱۷۷۳ء میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے
رو سے سلطنت برطانیہ نے اس کمپنی کے دستور العمل پر کچھ
اختیارات حاصل کر لئے۔ چنانچہ اس سلطنت کے زور دلیل پر کمپنی
کچھ ہاتھ پیر مارنے کے قابل ہوگئی۔ اور اس نے ہندوستان
جیسے ملک میں جہاں تمام شورش پھیل رہی تھی۔ امن و امان قائم
کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس امن و امان قائم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکوؤں کے
بے شمار گروہوں۔ غارت گری کرنے والے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں
اور پرانی سلطنت مغلیہ کے ان فوجی افسروں کو جو اپنے عہدوں
سے برطرف ہو کر ملک میں اس طرح لوٹ مار کرتے پھرتے تھے جس طرح

جنگلی شہد کی مکھیاں ملک کے اطراف واکناف میں نئے چھتے لگانے کی جگہیں تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ بزور بازو مطیع کیا جائے نیز اس کا مطلب یہ تھا کہ ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو راہ راست پہ لایا جائے جن کا آبائی پیشہ یہ ہو گیا تھا۔ کہ بدمعاشوں کے گروہ بھرتی کر کے اپنے ہمسایوں پر لوٹ مار کرتے تھے۔ متذکرہ بالا کارروائیوں کے کرنے میں جو یہ حکمران خود چاہتے تھے کہ کی جائیں۔ عام طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا مزید علاقہ برطانوی اقتدار اور حکومت میں شامل ہو گیا۔ اور اس طرح سے ملک میں اتفاق کی صورت پیدا ہو گئی۔

پھر جبکہ بہت کچھ امن و امان ہو گیا۔ تو یہ کوشش شروع کی گئی کہ سول انسٹی ٹیوشنیں قائم کی جائیں۔ عوام کو مراعات دی جائیں۔ اور ایسے ملک میں قانون انصاف اور باقاعدگی کو رواج دیا جائے جس میں ہزاروں سالوں سے ان کا نام و نشان تک نہ[1] تھا۔ اس وقت بھی کمپنی ایک تجارتی کمپنی تھی۔ اور اس کا شغل تجارت کے سوائے اور کچھ نہیں تھا مگر اس نے محض لوگوں کی خیر خواہی کی خاطر اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔

کمپنی بہادر نے جو کچھ کیا۔ وہ آخر انسانی ہاتھوں سے دو سو سال میں ہوا تھا۔ لہذا غلط فہمی کی وجہ سے یا کمپنی کے

---

[1] یہ کتنا بڑا مبالغہ بلکہ جھوٹ ہے۔ خود انگریز مورخین نے ایسا بڑا قطعی الزام سب پچھلے حکمرانوں پر نہیں لگایا۔ (مترجم)

نالائق کارندوں کی وجہ سے جن میں سے بعض متکبر بعض بے سمجھ اور بعض بودے ایک یا دو کمینے اور چند دوسروں کی بات پر لگ جانے والے تھے۔ اس پر کچھ الزام عاید نہ ہوئے۔ اور اس کے کچھ نقص نکالے گئے۔ مگر ان نقایص سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

مجموعی طور پر کمپنی کی اس کے لائق افسروں کی وجہ سے تعریف کی جاتی تھی۔ زمانہ گذرنے پر انگلستان میں ایسے آدمی پیدا ہو گئے جن کے دل میں عوام کی نسبت بہت ہمدردی تھی۔ لہذا انہوں نے کمپنی کی کارروائیوں پر زیادہ زور سے نکتہ چینی شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ نے ان کارروائیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور دنیا کی سلطنتوں کے نظم ونسق میں اصلاحات ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے نظم ونسق میں بھی اصلاحات ہونی شروع ہوئیں۔ ان میں جو کچھ بھی نقائص تھے۔ مگر انہوں نے ہندوستان کی زمین کو ترقی کے لئے صاف اور توڑ ضرور کر دیا۔ اور ہندوستانیوں کے دلوں میں وہ امیدیں پیدا کر دیں۔ جو پہلے کبھی بھی پیدا نہ ہوئی تھیں۔

قدیمی ہولناک اور مہیب نظاروں مثلاً پیشہ ور خونخوار اقوام کی ٹھگی و ڈکیتی۔ ستی ہونے اور چند امیروں کو زندہ دفن کر دینے کی رسم کے انسداد کا سہرا اسی کمپنی کے سر پر ہی ہے۔ اور اسی کمپنی کا سب سے بڑھکر کارنامہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کے لئے وہ خوش کن ایکٹ پاس ہوا جس کی دفعہ ۸۷ کا منشاء

حسب ذیل الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔

ان علاقہ جات کا کوئی دیسی اور ملک معظم کی رعایا کا کوئی بسیا فرد جو ان علاقوں میں رہتا ہو صرف اپنے مذہب۔ جائے پیدائش اپنی نسل اور رنگ کی وجہ سے یا ان میں سے کسی ایک وجہ سے کمپنی کے ماتحت کسی نوکری کرلنے۔ اس کے کسی عہدے پر فائز ہوتے یا اس کا کوئی درجہ حاصل کرنے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔"

اس سے اور نتیجہ تو جو ہونا تھا ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ مغربی خیالات کا اثر۔ ذات پات کے پابند۔ جھگڑوں سے بھرے ہوئے اور ظالموں کے پیسے ہوئے ہندوستانیوں پر ضرور پڑا۔ اور آزاد مغربی خیالات کا صدمہ بغیر اس کے متزلزل کرنے والے اثر کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسی اثر کا نتیجہ ۱۸۴۵ء کی سکھوں کی بغاوت اور ۱۸۵۷ء کا ہندوستان کا غدر ہوا۔ آخرالذکر شورش کے فرد ہو جانے پر انگریزوں نے محسوس کیا۔ کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ کہ "کمپنی پارلیمنٹ" قسم کی گورنمنٹ ہندوستان سے اٹھالی جائے۔ اور اس بڑے وسیع ملک کی باگ ڈور تجارتی مفاد کو مدنظر رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ سے لیکر شاہ انگلستان کے ہاتھ میں سپرد کر دی جائے۔

یہ کارروائی ۱۸۵۸ء میں کی گئی اور ذلیل اور دریدہ لباس بیمار اور غریب بھارت ماتا آخرکار ایک اور دنیا میں آگئی۔ اس نے اپنی نابینا آنکھیں اس عجیب وغریب نئے

جھنڈے کی طرف اٹھائیں۔ جو اس کے سر پر لہرا رہا تھا جس پر وہ کفالت نامہ درج تھا۔ اور ابھی تک درج ہے کہ جس پر اسے کوئی اعتبار نہیں۔ اور وہ بھارت ماتا جو زمانہ قدیم سے غلام اور مظلوم رہی ہے کس طرح امید اور یقین کر سکتی ہے کہ اس کا نیا آقا اس کے لئے منظم خدمت گذاری جمہوری سلطنت اور اس کے بچوں کی بہبودی اور خوش حالی کا تحفہ لا رہا ہے۔

بائیسواں باب

اصلاحات

اس قسم کی حکومت کا پودا جو گذشتہ صدیوں سے برطانوی ہندوستان میں لگایا گیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہا ہے اس کتاب کے مقصد کے لئے ہم ہندوستانی حکومت کی داستان کے پچھلے اوراق نہ کئے دیتے ہیں۔ اور اس کے اس صفحہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو حال میں پلٹا گیا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں اعلےٰ اختیارات حکومت برطانیہ عظمےٰ کے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جو برطانوی تاجدار اور پارلیمنٹ کے نمائندے ہیں۔ اور ہندوستان پر اس وزیر ہند با جلاس کونسل کی وساطت سے حکمرانی کر رہے ہیں۔ جو انڈیا آفس لندن میں بیٹھکر کام کرتا ہے۔ ہندوستان میں اعلےٰ ترین سرکار گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل کی ہے۔ جو عام طور پر گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ آف انڈیا کہلاتی ہے۔ گورنر جنرل یا وائیسرائے کی تعیناتی خود ملک معظم فرماتے ہیں۔ اور وائیسرائے کی کونسل میں جس کا تقرر اس طریق سے ہوتا ہے۔ سر اس میں سات محکمہ جات کے افسر ہوتے ہیں۔ یعنی افواج

کا سپہ سالار۔ ہوم ممبر۔ ممبر خزانہ۔ ریلوں اور تجارت کا ممبر اور ممبران تعلیم صحت واراضیات۔ انڈسٹری ومصنوعات ومزدوری اور قانون تعمیری یا وزارت کے ان سات ممبروں میں سے تین موخرالذکر ممبر ہندوستانی ہوتے ہیں۔ اور چار مقدم الذکر انگریز اس سے نیچے اتر کر مرکزی گورنمنٹ کی ترتیب میں ہندوستانی محکمہ قانون شامل ہے۔ اس کے اعلیٰ دیوان کو "کونسل آف سیٹٹ" اور ادنےٰ دیوان کو "لیجسلیٹو اسمبلی" کہتے ہیں۔

کونسل آف سیٹٹ کے ساٹھ ممبر ہوتے ہیں جن میں سے چونتیس منتخب شدہ اور چھبیس کو وائسرائے نامزد کرتا ہے۔ جن میں بیس سے زیادہ سرکاری عہدہ دار نہیں ہوسکتے۔

لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک سو چوالیس (۱۴۴) ممبر ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک سو تین (۱۰۳) منتخب شدہ ہوتے ہیں۔ باقی اکتالیس ممبر وائسرائے بہادر نامزد کرتے ہیں۔ جن میں سے چھبیس ضرور سرکاری عہدہ دار ہوتے ہیں۔ اور باقیوں کو چھوٹے چھوٹے فرقوں مثل ہندوستانی عیسائی آبادی وغیرہ کی نمائیدگی کیلئے نامزد کیا جاتا ہے۔ دونوں دیوانوں میں ہندوستانیوں کی تعداد غالب ہوتی ہے۔ اور دونوں دیوان اس غرض سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ کہ کئی صوبجات کی جن میں نظم ونسق کی غرض سے ملک تقسیم ہوا ہوا ہے۔ پورے طور پر نمائیدگی ہو جائے۔

اس طرح پر برطانوی ہندوستان پندرہ صوبجات پر منقسم ہے۔ اور ہر ایک کا نظم ونسق علیحدہ علیحدہ ہے۔ نو بڑے صوبجات

میں سے ہر ایک یعنی مدراس، بنگال اور بمبئی کی پریزیڈنسیاں ۔ صوبجات متحدہ پنجاب ۔ بہار و اڑلیسہ ۔ صوبہ جات وسطی برما اور آسام گورنروں اور ان کی انتظامی کونسلوں کے زیر حکومت ہے ۔ یہ گورنر اور ان کی انتظامی کونسلیں صوبوں کی کونسل ہائے واضع آئین و قوانین کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ اور ان کونسلوں کے ممبروں کی نشستوں میں سے کم از کم ستر فیصدی (برما میں ساٹھ فیصدی) نشستیں عوام کے انتخاب کے ذریعہ سے پُر کی جاتی ہیں ۔

حلقہ ہائے انتخاب اس غرض سے ہوتے ہیں کہ مختلف اقوام فرقہ جات اور خاص خاص کاموں کی نمائندگی الگ الگ اور پورے پیمانہ پر ہو جائے۔ اس کا معیار ہر ایک صوبے میں اس کی مقامی ضروریات کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے مثلاً مدراس میں یہ معیار حسب ذیل ہے :-

حلقہ ہائے انتخاب کی قسم	ممبروں کی تعداد
غیر مسلم (جس کے معنی ہندو جینی۔ بدھ وغیرہ مذاہب کے لوگ) ہیں	۶۵
مسلم " " " " "	۱۳
ہندوستانی عیسائی	۵
یورپین (بشمول انگریزوں کے)	۱
اینگلو انڈین (ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوئے انگریز)	۱
مالکان اراضی (زمیندار)	۶
یونیورسٹی (کا نمائندہ)	۱

تجارت، صنعت و حرفت

صوبجات کے انتخاب کنندگان کی تعریفیں بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مگر عام طور پر حق انتخاب کا انحصار جایداد کی کم از کم مالیت پر ہوتا ہے۔ اب تک قانونی طور پر قریباً ساڑھے سات ملین آدمیوں[1] کو حق انتخاب حاصل ہو چکا ہے۔ اور تمام بڑے صوبجات میں قرار پا چکا ہے۔ کہ عورتوں کو حق انتخاب دیا جائے[2]

اس سکیم میں سب سے بڑی بات نظم و نسق کو مرکزی بنانے کی کوشش ہے۔ تاکہ ہندوستانیوں کو اپنے کاموں کو خود چلانے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس تجویز کی وجہ سے جس کا تھوڑا سا حصہ جو نو بڑے بڑے صوبجات میں رائج کر دیا گیا ہے۔ صوبجاتی گورنمنٹوں کا کام دو شاخوں میں تقسیم ہو کر گورنر کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔ گورنر اور اس کی انتظامی کونسل جن کی تقرریاں ملک معظم کی منظوری سے ہوتی ہیں۔ ایک شاخ میں کام کرتے ہیں۔ اور اس کونسل کے ممبر ہندوستانی اور انگریز دونوں ہوتے ہیں۔ گورنر اور محکمہ جات کے وزراء دوسری شاخ میں کام کرتے ہیں۔ ان وزراء کا تقرر کونسل کے ممبران میں سے انتخاب کر کے گورنر کرتا ہے۔ اور یہ تمام کونسل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ تمام وزراء ہندوستانی ہیں۔ وہ تمام مختلف کام جو پہلے ایک ہی عملہ کیا کرتا ہے۔ اب ان دو

---

[1] انڈیا آفس کی رپورٹ مرتبہ سر ملکم سی سی سیٹن ہیٹامز مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۶ء صفحہ ۵۹

[2] ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم کتاب ہذا

شاخوں میں تقسیم ہو کر "امور محفوظ" اور "امور غیر محفوظ یا منتقلہ" بھی کہلاتے ہیں۔

امور محفوظہ کا انفصال سوائے ان امور کے جن پر مرکزی گورنمنٹ کی آخری منظوری لینی پڑتی ہے۔ صوبجاتی گورنر باجلاس کونسل کے اختیار میں ہے۔ اور امور منتقلہ کا انفصال صوبجاتی کونسلوں کے سپرد ہے۔ اور ان کی نگرانی وزرا کرتے ہیں۔

امور منتقلہ کا انتظام برطانوی حکام نے ہندوستانیوں کی خاطر چھوڑ دیا ہے۔ اس تجویز کا مدعا یہ ہے کہ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا۔ تو امور منتقلہ کی فہرست میں اور مضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس کے مقابلہ میں یہ بھی حکم ہے۔ کہ اگر کسی امر منتقلہ کا کام وزرا سے نہ چلا۔ تو اس امر کا فیصلہ گورنر باجلاس کونسل خود کرے گا۔ مضامین منتقلہ میں فی الحال تعلیم صحت عامہ انتظام محکمہ جات سرکاری (ریلوے اور آبپاشی کے ماسوائے) صنعت وحرفت۔ آبکاری۔ زراعت۔ لوکل سلف گورنمنٹ (حکومت خود اختیاری) اور دوسرے امور شامل ہیں۔ امور یا مضامین محفوظہ میں قانون اور امن کا نفاذ۔ ہندوستان کی حفاظت و مدافعت۔ خزانہ۔ نظام مالیہ زمین وغیرہ شامل ہیں۔

صوبجاتی محکمہ قانون کی بابت کہ جسے کونسل واضع آئین و قوانین کہتے ہیں۔ ایک اعلیٰ محکمہ[1] نے حال ہی میں یہ کہا ہے کہ۔

"کونسلوں کو قوانین سازی سے متعلق بڑے وسیع اختیارات

---

[1] انڈیا آفس مصنفہ سمتھ صفحات (۵۹-۶۰)

حاصل ہیں۔ اور سالانہ صوبجاتی بجٹ (موازنہ) بھی انہیں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ ملتقدہ مضامین میں انہیں گورنمنٹ کے خزانہ کے اخراجات کے اختیارات ہوتے ہیں۔ مگر اس صورت میں کہ کونسل امور محفوظ میں سے کسی امر پر خرچ کرنے کے لئے روپیہ دینے سے انکار کر دے۔ تو گورنر اگر اس کے خیال میں ضروری ہو۔ تو یہ روپیہ اس خرچ کے لئے منظور کر سکتا ہے۔ گورنر کسی قانون کو منظور ہونے سے بھی روک سکتا ہے۔ یا اسے گورنر جنرل با جلاس کونسل غور و خوض کے لئے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس کو خاص اختیارات یہ بھی حاصل ہوتے ہیں۔ کہ محض اپنے اختیار سے کسی امر کے متعلق (مگر شرط یہ ہے کہ یہ امر صرف امور محفوظ سے متعلق ہو) قانون وضع کر سکتا ہے۔ مگر اسے یہ بتانا پڑیگا۔ اس قانون کی توضیح اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ضروری اور لابدی تھی۔ یہ خاص اختیارات آجتک صرف ایک دفعہ برتے گئے ہیں۔

یہ حال تو صوبجاتی محکمہ قانون کا ہے۔ مرکزی گورنمنٹ کی نسبت وہی اعلےٰ محکمہ یہ کہتا ہے۔ کہ[۱]

"ہندوستانی محکمہ قانون کو (پارلیمنٹ کے اختیارات کا لحاظ رکھتے ہوئے) اختیار حاصل ہے کہ وہ برطانوی ہندوستان کے حدود کے اندر تمام اشخاص۔ تمام عدالتوں تمام جگہوں اور چیزوں کے لئے ہندوستانی ریاستوں میں رہنے والے برطانوی رعایا اور افسروں کے لئے برطانوی ہندوستان سے باہر گئی ہوئی

---

[۱] انڈیا آفس سیشن صفحات ۶۰ تا ۶۲)

"ملک معظم کی دیسی ہندوستانی رعایا" کے لئے اور ہندوستانی افواج کے افسروں سپاہیوں اور دوسرے ملازموں کے لئے خواہ وہ کہیں بھی ملازمت کر رہے ہوں۔ قوانین وضع کرے۔ مگر ان ذرائع کے پیش کرنے کے لئے جو سرکاری قرضہ جات یا مالیات یا مذہب یا فوجی قواعد کی پابندی۔ بیرونی گورنمنٹوں سے تعلقات کے متعلق ہوں یا ان معاملات کے متعلق ہوں۔ جن کے اختیارات صوبجاتی گورنمنٹوں کو حاصل ہیں۔ گورنر جنرل کی منظوری لینی ضروری ہوتی ہے لیجسلیٹو اسمبلی کو سرکاری خزانہ کے خرچ کرنے کے اختیارات ایک بہت بڑے وسیع پیمانہ پر حاصل ہیں۔ سالانہ بجٹ دونوں دیوانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اور لیجسلیٹو اسمبلی کی منظوری ان عطیات کے لئے حاصل کی جاتی ہے۔ جو بہت سے امور کے لئے مطلوب ہوں۔ گو بعض خرچ کی بعض مدات "نان ووٹ ایبل" کہلاتی ہیں۔"

وائیسرائے اور ملک معظم کو منسوخی کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اور وائیسرائے دونوں دیوانوں کی مرضی حاصل کئے بغیر کسی مسودہ قانون کی صورت میں دے سکتا ہے۔ مگر یہ ملک معظم کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ لیکن یہ سخت ضرورت کی صورتوں میں ہی کیا جاتا ہے۔ جبکہ معاملہ غیر معمولی طور پر ضروری ہو۔

اس جگہ برطانوی ہند کے موجودہ گورنمنٹ کے نظام عمل کی نسبت کچھ مزید لکھنا غیر ضروری ہے۔

جس چیز کو عام طور پر "ڈائی آرکی" (دو عملی) یا "اصلاحات"

کہتے ہیں۔ درحقیقت اپنے معنوں کے لحاظ سے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ صرف برطانیہ کے اس اصلی مدعا کی مفصل تشریح ہے جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اس ملک کی سلطنت میں حصہ لینے کی دعوت دی جائے۔ ماسوائے بنگال کے ہندوستان کے تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں نے جنگ عظیم میں فراخ دلی سے آدمی اور دیگر ذرائع بہم پہنچا کر جس خیرخواہی کا ثبوت دیا تھا اس سے برطانیہ کے دل میں ایک خاص احساس پیدا ہو گیا تھا اور اس کی یہ خواہش تھی کہ اپنے ہمجنسوں کے ساتھ ہمدردی کے اظہار اور ان پر اعتبار کا ایک بیّن ثبوت دے۔ مگر پارلیمنٹ درحقیقت اسی اصول کا الٹ پھیر کر رہی تھی جس کا ذکر ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان میں کیا گیا تھا۔ اور انڈین کونسل ایکٹ مصدرہ ۱۹۰۹ء کی منشاء کو پورا کر رہی تھی۔ کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ سے اس ایکٹ کی منشا پوری ہو گئی۔ لہٰذا پارلیمنٹ نے اس پالیسی[1] سے کہ:-

"ہندوستان کی نظم و نسق کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کو زیادہ تعداد میں شامل کرنے کی غرض سے اور حکومت خود مختاری سے انسٹی ٹیوشنوں کو آہستہ آہستہ بدریجہ ترقی دینے کی خاطر کہ برٹش انڈیا میں جو سلطنت برطانیہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اس میں ایک ذمہ داری حکومت خود مختاری کا احساس پیدا ہو۔" موجودہ اصلاحات کا نفاذ کیا گیا۔

---

[1] انڈیا آفس سسٹم صفحات ۷۹، ۲۵۸)

اصلاحات کی موجودہ سکیم نہتیزن کے اس درخت سے زیادہ طاقتور نہیں۔ جس کی نہ تو جڑیں ابھی تک قائم ہوئی ہیں۔ اور نہ ہی اس کی شاخوں میں طاقت آئی ہے۔ اس کو ابھی تک زمین نے قبول نہیں کیا اور بہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا کے جھونکوں سے ڈول رہا ہے۔ گویا گرمی کی خاص شدت نے وقت سے پہلے اس کی کونپلوں کو زمین سے نکال باہر کیا ہے۔ اگر ایک غیر ملک کے رہنے والا آج ہندوستانی کونسلوں میں خواہ وہ مرکزی ہوں یا صوبجاتی بیٹھکر دیکھتا تو اسے محسوس ہونے لگیگا کہ وہ ایسے چھوٹے شریر لڑکوں سے بھری ہوئی ایک جماعت میں بیٹھا ہے۔ جن کو اتفاق سے ایک خوبصورت جیبی گھڑی مل گئی ہے۔ وہ بے تاب ہو رہے ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح اس میں ہاتھ ڈال کر اس سے ایک دو پرزے نکال لیں۔ یا اس کے فنر کے ساتھ کھیلیں۔ یا اس میں جڑے ہوئے جواہرات نکال لیں۔ ان کی نظروں میں وقت کی قدر وقیمت بجائے خود اس کاریگر کی قدر وقیمت کا بھی احساس نہیں جس نے اس گھڑی کو بنایا ہے اور جب ان کا استاد ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ اس کھلونے کو اس طرح سے کونسا چاہیے تو یہ نہایت بے صبری سے چیخنے چلاتے ہیں۔ اور اس کی چال کو بگاڑتے ہیں۔

ان لوگوں کے کونسلوں کے مجوزہ کام سے تعلق کی نسبت یہی کہنا کافی ہے۔ کہ ان کی نہایت نمایاں خصوصیت ان کی بناوٹی صورت ہے۔ یہ "جمہوری نمائندگی" کی اصطلاح کے معنے ہی معنے

جانتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کے پردہ میں جو اصلی مطلب اور خیالات نہاں ہیں۔ ان کا انہیں بالکل علم نہیں۔ مطلق العنان حکومت شہریت کی روح کو ترقی نہیں دیتی۔ اور ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے یہاں آنے تک مطلق العنان حکومت کے سوائے اور کسی حکومت کو جانتے ہی نہ تھے۔ برطانیہ نے اپنی تعلیمی کوششوں سے آہستہ آہستہ ان میں ایک ایسی جماعت یعنی متوسط طبقہ کے لوگ پیدا کر دی ہے۔ کہ جس کا پہلے ہندوستان میں نام ونشان بھی نہ تھا۔ مگر یہ متوسط درجہ کے لوگوں کی جماعت یعنی وکلاء اور پیشہ ور لوگ آجکل ایسے ہی مطیع ہیں۔ جیسے کہ پانچسو سال کا عرصہ گذرا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد ذاتوں اور برادریوں کے قانون کے مطیع ومنقاد تھے۔ جو جمہوریت کے بالکل برعکس تھا۔ یہ "عوام الناس" کا لفظ صرف اسی لئے استعمال کرتے ہیں۔ کہ ان کی مغرب میں پیدا ہوئی ہوئی سرکار کی زبان میں جس کو اب یہ سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ ایسا کوئی لفظ موجود رہے۔

ایک گاؤں کا نمبردار گورنمنٹ کے فرائض اور ذمہ داریوں کو ان منتخب شدہ "نمائندگان" سے بہتر طور پر جانتا اور محسوس کرتا ہے۔ اور ایک ہندوستانی والئے ریاست میں حکمرانی کرنے کی عادت ورثہ میں پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ لہذا ان کی ذات میں چاہے کتنے ہی نقائص موجود ہوں۔ اور اس کے دل کا رحجان چاہے کسی طرف ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی اس کے دل کے کسی نہ کسی کونے میں اپنی رعایا کا خیال ضرور ر

عود ہوگا۔
ایک امریکن جو لپنے روحانی اور جدّی بزرگوں کے احسانات
ے پلیتھ راک سے سیکرری میڈ تک لاپرواہ کیوں نہ ہو جب
چند روز تک ان ہندوستان کے بے لگام قانون سازوں کی
اردائیوں کو دیکھتا رہے گا۔ تو وہ کافی حلیمی اختیار کرلیگا۔
یں دہلی میں ۱۹۲۶ء کے موسم سرما کے اجلاسوں کے زمانہ کے
ں دیش میں آسمبلی کے بحث و مباحثات برابر سنتی رہی۔ اور
وراجی ممبر گھنٹوں اور دنوں تک اپنا سارا زور ریل مفضول
ریعے نیچہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے والے چالوں میں
رف کرتے رہے اور باقی ممبروں میں سے بہت سے چپ چاپ
یچھے ان کا منہ تکتے رہے۔ ماسوائے اس کے کہ بعض اوقات
وئی شمالی ہندوستان کا سیدھی سادی لڑائی لڑنے والا باشندہ
ن پر کوئی حقارت آمیز فقرہ کس دیتا۔ ان ممبروں نے کوئی
کام کی بات نہیں کی۔ البتہ گورنمنٹ جب کسی ضروری سے
ضروری امر کو بھی نہایت سادگی سے پیش کرتی۔ تو سوراجی
مقرر اس کو مضحکہ انگیز معنے پہنا کر سرکار کی بدنیتی پر محمول کرتے۔
دران کے منہ سے ایسے دیوانہ وار پُرجوش الفاظ نکلتے کہ "ہمیں
تم پر کوئی اعتبار نہیں"۔ اور دانت پیس پیس کر کہتے کہ "ہم جانتے
ہیں کہ تمہاری نیت میں فتور ہے" یا "ہمیں کامل یقین ہے
د یہ بدلیشی گورنمنٹ۔ اس پر تین حرف۔ یہ ہماری کوئی بہتری
نہیں کرے گی"۔ مگر جب کوئی ضروری معاملہ پیش ہوتا ہے تو

یہی لوگ گورنمنٹ کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں اور ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس طرح کہ عدالت عالیہ ممالک متحدہ امریکہ اپنے فیصلوں کے دوران برٹش تاج کی خواہشات کا لحاظ کرتی ہے۔

ان فقرات کا جواب سرکاری ممبران نہایت سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ دیتے اور باوجود اس کے سوراجی انہیں سخت سست کہتے تھے۔ ان میں نہ تو کوئی تلملاہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اور نہ ہی کیسی گھبراہٹ یا بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

ایک دن اسمبلی کے ایک نہایت برگزیدہ ممبر سے جو ایک اعلیٰ قابلیت کا ہندوستانی تھا۔ جو گورنمنٹ سے غالباً اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی نفرت کہ سوراجی ممبر کرتے ہیں۔ جو اس مجلس میں اس کو طعن و تشنیع کرتے تھے میں نے اسے اس مضمون کے متعلق کہا۔

"آپ کے ساتھی سوراجی ممبران کونسل اسمبلی گورنمنٹ کی نیک نیتی پر بڑے سخت الزام لگاتے ہیں۔ وہ اس کی دیانتداری پر شبہ کرتے ہیں۔ اور اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑاتی رہتی ہے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ ہندوستان کے مفاد کو اپنے پاؤں تلے کچل رہی ہے۔ اور خود ہندوستانیوں کو بیعزتی کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اور یہ کہ اپنے خود غرضانہ مفاد کی خاطر ملک کے ذرائع کو ہضم اور بیکار کرتی جاتی ہے"

اس نے جواب دیا کہ ہاں یہ لوگ بھی بلکہ اس سے زیادہ کہتے ہیں" میں نے پوچھا" کیا واقعی وہ جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں"

اس نے جواب دیا " وہ ایسا کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسمبلی میں کوئی بھی آدمی ایسا نہیں جس کے دل میں اس قسم کا یقین ہو"

ایک ایسے امریکن کے لیے جس کے دل میں اس تجربہ کی یاد تازہ ہو۔ جو امریکہ نے فلپائن سے حاصل کیا تھا۔ یہ تاریخ کا دہرایا جانا واقعی نہایت مغموم کرنے والا ہے۔ ہر ایک شخص کو ملک معظم کے اس پیغام کے مندرجہ ذیل الفاظ یاد ہیں۔ جو شہنشاہ مذکور نے ایکٹ اصلاحات کے تابع قائم شدہ ہندوستانی کونسل ہائے واضع آئین وقوانین کے نام بھیجا تھا۔ اور جو ان کے سب سے پہلے اجلاسوں میں پڑھا گیا تھا۔

" تم لوگوں پر جو نئی کونسلوں میں لوگوں کے نمائندے ہو کر پہلی مرتبہ آئے ہو ایک خاص الخاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ تم ہی لوگوں نے اپنی کارروائیوں اور اپنے رویہ کی درستی سے دنیا پر اس بڑے بھاری نظامی انقلاب کی اہمیت ثابت کرنی ہے۔ اور تم ہی لوگوں کو یہ یاد رکھنا ہوگا۔ تم نے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کو کہ جنہوں نے ابھی تک سیاسی زندگی میں حصہ لینے کی قابلیت حاصل نہیں کی۔ ترقی کے مدارج پر پہنچانا ہے۔ اور ان کے مفاد کا ویسا ہی خیال رکھنا ہے۔ جیسا کہ تم اپنے مفاد کا رکھتے ہو"

ان لوگوں کے ذہنوں میں اس پیغام کے الفاظ کے کیا معنے آئے ہوں گے۔ کہ جن کو یہ پیغام بھیجا گیا تھا۔ وہ اپنے اور غریب بوڑھی بھارت ماتا کے درمیان کس تعلق اور رشتہ کا احساس کرتے ہیں، اور اپنے مفاد کی خاطر انہوں نے کونسے فرض کی ادائیگی کی جس

سے ان کی یہ قابلیت ظاہر ہوتی ہو۔ کہ انہوں نے اپنے آپ کو مزید
مراعات کے حاصل کرنے کا اہل بنا لیا ہے۔

ہندوستان کی برطانوی نظم و نسق کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ
ان کوششوں کے بعد جو فوری ترقی کے لئے کی گئیں۔ مدافعتی بدامنی
پیدا ہوئی ہے۔ تو گویا متفرق اصلاحات کے زمانہ میں بھی ترقی
کی ہنگ و دیں مزاحمت کرتا ہے۔ غالباً یہ بدقسمتی کی بات تھی۔
کہ ڈائی آرکی (ردِ عمل) کا ظہور مسٹر گاندھی کے سیاسیات میں خلل
در معقولات کے زمانہ میں ہوا۔ جبکہ وہ اس پر اپنے عدم تعاون کا
حملہ پورے زور سے کر سکتے تھے۔ اس زمانہ میں ان کا اثر بنگال اور
صوبہ جات متوسط میں اس قدر کافی تھا۔ کہ وہ اصلاحات کا تجربہ
بالکل نہ ہونے دیتے۔ اور چونکہ اب یہ اثر بطور سیاسی عنصر کے
ہر جگہ مفقود ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے بڑے نتائج ترقی کے پہیہ
میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔

ریفارم ایکٹ پر کسی قسم کی نکتہ چینی کرنے کے خیال سے
بغیر ہی یہ معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اس میں ترقی نہ ہونے کی سب سے
اصلی رکاوٹ کسی کی دشمنی کی وجہ سے نہیں ہو رہی۔ بلکہ یہاں
کے حالات ہی میں یہ گہرے طور پر جڑ پکڑ گئی ہے۔ اصلاحات کا
سارے کے سارے ڈھانچہ کی بنیاد ایک عام حلقہ انتخاب پر
رکھی گئی تھی۔ جو ہر ایک صوبہ میں براہ راست منتخب شدہ ممبروں
کی معرفت ایک ایسے وزیر کی زیر نگرانی میں ہے جس کے ذمہ عوام کے
سب کام ہیں۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی ہے۔ کہ گو اصلاحات کا

ڈھانچہ ابھی برائے نام ہی ہے۔ مگر اس کی بنیاد جس نے لئے اٹھائے رکھنا تھا ایک موہوم سی چیز تو کیا بلکہ درحقیقت اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں صحیح معنوں میں کوئی حلقہ انتخاب ہی نہیں۔ اور نہ ہی موجودہ صورت حالات میں اس کی کسی ہستی کے لیڈروں تک موجود ہونے کی امید ہے اور اس ملک کے منتخب شدہ نمائندے ابھی تک یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کو کیا کیا فرائض انجام دینے ہیں۔

ایک حلقہ انتخاب کے نہ ہونے کے وجوہات اس کتاب کے پہلے اوراق میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ انہیں وجوہات میں سے ایک سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ تعلیم زیادہ تر بڑے بڑے شہروں اور قصبات ہی میں دی جا رہی ہے۔ اور عوام کے اس بہت بڑے مجموعہ تک جو ملک کے دور دراز حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ابھی کوئی چھپی ہوئی کتاب نہیں پہنچی۔ اور نہ پہنچنے کے قابل ہے۔

ان ان پڑھ دہقانوں اور ان پڑھ مالکان اراضی کو نہ تو کوئی اس سیاسی دوڑ میں شامل ہونے دیتا ہے۔ اور نہ ہی ان کو اس سے دلچسپی ہے۔ اور نہ ہی سوائے اس چیز کے کہ جسے وہ ہر روز دیکھتے ہیں۔ کوئی اور ایسی چیز ہے۔ کہ جس کی وجہ سے ان لوگوں کی توجہ اس دوڑ کی طرف مبذول ہو۔ قصباتی سیاسیات اور قانونی نکات کی خواہ اصلی ہوں یا خیالی۔ ان کو مشکل تمام خبر تک پہنچتی ہے۔ اگر یہ خبر پہنچتی بھی ہے۔ تو انتخاب کے دنوں

میں یا عدم تعاون کی شورش کے زمانہ میں۔ اور وہ خبر بھی اس لئے
پہنچائی جاتی ہے کہ یہ لوگ بری خبروں کے سننے سے یک لخت
اور اندھا دھند شورش برپا کردیں۔ جب پچھلے دنوں کونسل ہائے
واضع آئین و قوانین کے سوراجی ممبروں نے یہ فیصلہ کیا کہ کونسلوں
سے باہر نکلکر گورنمنٹ کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکائیں۔ تو جہاں
تک مجھے معلوم ہو سکا ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ
نہیں کیا کہ ایسی حرکت کرنے سے پہلے اپنے حلقہ ہائے نیابت
کے لوگوں سے مشورہ کرلے۔ اور یہ حلقہ ہائے نیابت سوائے
اس کے اور کوئی چیز نہیں کہ اس میں جہل سادہ لوح اور جاہل
لوگ ہوں جن کا کوئی بھی لحاظ ان ممبروں کے دلوں میں نہیں ہوتا
وہ شخص جو گذشتہ چھ سال سے اس پر غور کر تا رہا ہو کہ یہ
مرکزی اور صوبجاتی گورنمنٹ کس شغل میں لگی ہوئی ہیں۔ اس نتیجہ
پر پہنچے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتا۔ کہ سرکاری انگریز افسر جن کے ہاتھ
میں نئے قانون کی نظم ونسق دی گئی ہے ہمیشہ دیانتداری۔
دلی تمنا اور پورے غور سے اس کو کامیاب بنانے کی کوشش
کرتے رہے ہیں۔ وہ سخت مشکلات پیش آجانے کے باوجود
کام کرتے رہے ہیں۔ اور نیک نیتی سے اپنی طاقت اور استقلال
اس بات پر خرچ کرتے رہے ہیں۔ کہ کسی طرح اس بہت بڑے
اختلاف رائے کو دور کردیں۔ جو پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی
کوششیں بعض اوقات موہوم اور نہایت کم معلوم ہوتی ہیں۔
مگر ان کی اصلیت اور واقعیت ایک انتظامی افسر کے مندرجہ

ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

"میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنے کام میں لگا رہنا چاہیئے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ باربار بال کی کھال اتاریں اور جڑ کو دیکھنے کی خاطر ایک پودے کو اکھاڑ دیں۔ ہر سال جو گذر جاتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی فایدہ پہنچ جاتا ہے۔ رعایا کے لئے ایک اور اس کا سال گذر جاتا ہے سرکاری کام محفوظ ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان میں ترقی ہو رہی ہے۔ اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم جتنا زیادہ عرصہ شور و شر کئے بغیر کام کرتے جائیں گے اس بات کا زیادہ بہتر موقعہ ملتا جائیگا۔ کہ کونسلیں اور وزرا یہ معلوم کر لیں۔ کہ جب ہم ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ تو محض اس لئے کرتے ہیں۔ کہ ہمارے دلوں میں قانون کی پابندی اور اس پر عمل پیرا ہونے کا زیادہ احساس ہے۔ اور ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنی ذاتی غرض یا اپنے لوگوں کے مفاد کے لئے نہیں کرتے۔"

اس فقرہ کے آخری جملہ میں اس بڑی رکاوٹ کا راز پنہاں ہے۔ جو اہل مغرب اور ہندوستانیوں کے درمیان ہمدردی اور ایک دوسرے پر پورا بھروسہ پیدا ہونے میں حائل ہو رہی ہے۔ اہل مغرب کو تو پورا یقین ہے کہ ایک انگریز سرکاری افسر کبھی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر یا اپنے عزیز و اقارب کو فایدہ پہنچانے کی خاطر کوئی کام نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس سے اسے ساری دنیا یہی کہے گی۔ کہ اس نے بے عزتی کا اور شرمناک کام کیا ہے۔ لہذا جب ہم اس بات کی وجہ سوچنے کے لئے غور کرتے ہیں۔ کہ کیوں ہندوستانی

ہمارے اس خیال کی تائید نہیں کرتے۔ تو ہمارے ذہن میں سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں آتی۔ کہ ان افسروں کے دل تو واقعی صاف ہیں۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان پر بے اعتباری کی وجہ کوئی خاص ہی ہوگی۔

اگر ہم اس وجہ کے معلوم کرنے کے لئے اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی بجائے ہندوستانیوں کے دلوں کو کریدیں۔ تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ایک انگریز کو ان معاملات میں کسی خود غرضی کے اظہار کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ البتہ سرکاری ملازمت کے حصول کے لئے ہندوستانیوں کو ہے۔

اس معاملہ میں ہندوؤں پر نظر ڈالئے۔ ملازمت کے بارے میں ایک ہندو کی نظر پہلے تو اپنے مذہب کی ہدایات پر پڑے گی جو اسے اپنے کنبہ کی پرورش کی تلقین کرتی ہیں۔ اگر ایک سرکاری عہدہ دار ہندو اپنے کنبے اور رشتے کے لوگوں کی پرورش نہیں کرتا۔ تو اس کی ساری دنیا اسے بیوقوف بلکہ ڈھگوڑا سمجھنے لگے گی۔ اور اسے نہ تو اپنے گھر میں چین و آرام سے رہنا ملے گا۔ اور نہ باہر ہی اس کی عزت ہوگی۔ گویا اور کوئی رائے عامہ اس کی مدد کرے گی۔

دوم یہ کہ کنبے اور رشتے کے بعد پھر اس کے سامنے ذات کا سوال آئے گا۔ اگر ایک ہندو عہدہ دار اپنے ذات کے لوگوں کو نظر انداز کر کے کسی اور ذات کے لوگوں کی پرورش کریگا۔ تو اس کی ذات برادری کے کٹر ہندو طعن و تشنیع سے اس کا ناک میں دم کر دیں گے۔ اور یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اس کو صرف

ہندوؤں کے طعن و تشنیع کا خوف ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی روح اگلے جنم کی سختیوں سے بھی کانپتی رہتی ہے۔ جو اسے ایک غیر قوم کے لوگوں سے مروت کرنے کے عوض جھیلنی پڑینگی

تیسرا اس کو اس سیاسی جد و جہد کا خیال ہوگا جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ اور جس کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔ اس جد و جہد کی وجہ سے ہندو لوگ اس عہدہ دار پر اپنے ذات برادری والوں کا خیال رکھنے کی نسبت خاص زور ڈالیں گے جس کی وجہ سے وہ مجبور ہو جائے گا کہ جو کچھ کر وہ کر سکتا ہے۔ اپنی ہی ذات برادری والوں کیلئے کرے

ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے زیادہ خیاضی اور معقولیت سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کہ کیوں مضبوط ترین ہندوستانی افسروں کی بھی اپنے انگریز حکام سے مغربی خیالات میں متابعت قائم نہیں رہتی۔ خواہ موخر الذکر نے ہمیشہ پبلک بہتری کے سرکاری کام کی مشکلات میں اس کی حمایت کی ہو جبکہ اس کا جانشین ایک ہندوستانی ہو جاتا ہے۔ جو خود پرانے دستور کا مطیع ہوتا ہے

اس کام کا قائم رکھنا بڑا مشکل ہے۔ تنہا اور ملعون بنکر ایک اجنبی معیار کا اپنے لوگوں کے درمیان رہکر قائم رکھنا۔

تاہم بیشمار اخراجات اور قلت خوبی کے باوجود نئی اصلاحات بتدریج ایک اچھی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ جن میں سے سب سے اونچی بات یہ ہوئی ہے کہ سرکاری ملازمت میں ہندوستانیوں کی حالت بہت بہتر ہو گئی ہے۔ انہیں بہت سے شعبوں میں بڑے

بڑے جلیل القدر عہدے ملنے لگے ہیں گورنمنٹ اب ناطق ہندوستان کے مطالبات کی یہاں تک عزت کرنے لگی ہے کہ دیکھنے والے حیران ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں۔ کہ یا تو اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ یا اس نے اپنی قوت سامع کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا ہے۔ یا اس نے بے تعداد گونگے بہرے بیکس اور بے حد ضرورت مند کنبہ کا خیال چھوڑ کر ایک بگڑے ہوئے بچے کی ضد کو زیادہ توجہ دینی شروع کر دی ہے جو ایک دیا سلائی کی ڈبیا لینے کے لیے چیخ چلا رہا ہے۔

ایک کور مغز امریکن نے جو مدت سے ہندوستان میں رہتا تھا اور بڑے پایہ کا آدمی تھا۔ مجھے سنایا کہ ایک دفعہ ایک سوراجی سیاست دان کے ساتھ جنہے وائسرائے کے خلاف زہر اگلا تھا۔ اس کی مندرجہ ذیل پرائیویٹ گفتگو ہوئی +

امریکن کہو پنڈت جی آپ ایسے وائسرائے کیخلاف اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ کس طرح ایسی چیخ پکار کر سکتے ہیں کہ اس وائسرائے نے ابھی چند ہی ہفتے گذرے ہیں اپنی عادت کے خلاف آپ کی بڑی خاطر و مدارت کی اور آپ نے جو مانگا سو دیا

پنڈت (حیران ہو کر) میں نے کس طرح ایسی چیخ پکار کی! (ہنسکر) اور کیوں چیخ پکار نہ کروں جب کبھی میں۔ یہ چیخ

و پکار مچاتا ہوں تو مجھے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔
پس ہندوستانیوں کی کسی بات کی بابت (ہندوستان کے اندر یا کہیں باہر) اطلاع حاصل کرکے پہلی ضروری بات یہ ہو ہمیشہ اِس بات کو مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ اِن لوگوں کی نظروں میں سچائی کی کیا تعریف اور کس قدر قدر و قیمت ہے۔
علم مابعد الطبیعت کی نقطہ نظر سے ہندوستانی عقائد سچے دل سے "سچائی کے جویاں" ہوں گے۔ وہ جن معاملات پر مغربی لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ اُن کے مختلف پہلوؤں پر نہایت صاف گوئی اور سچائی سے بحث کرتے ہوں گے مگر اِس پر بھی وہ اپنی سچی تقریروں اور بیانات میں ایسی باتیں کہ جاتے ہیں۔ جن کے ثبوت پر آسانی سے شبہ ہو سکتا ہے اور جن میں واقعات سے بالکل اختلاف پایا جاتا ہے۔
ہندوستانیوں کی اِس عادت کے بار بار دیکھنے کے بعد بنظر تفتیش میں نے ایک ممتاز بنگالی جنٹلمین سے جو ہندوستانی پبلک آدمیوں میں بڑا فراخ دل تھا۔ پوچھا تو اس نے یہ جواب دیا۔
ہماری مہابھارت سب سے زیادہ سچائی کی تلقین کرتی ہے۔ گر ہم نے اِس سے انحراف کیا تو اس کی وجہ محض وہ بُرے حالات ہیں جن میں ہم مدت سے گھرے ہوئے ہیں اگر ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ تو صرف اس لئے کہ ہم نتایج سے

ڈرتے ہوئے بول دیتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے یہی
سوال ایک بڑے روشن ضمیر مہاتما سے جو بہت سے لوگوں کا
روحانی گرو تھا پوچھا۔ اور اس نے ایک ادنیٰ اور اعلےٰ
درجہ کے فلسفیانہ تقریر میں جواب دیا۔ ٹھیک اور غلط دونسبتی
الفاظ ہیں اور تمہارا ایک معیار مقرر ہے۔ اگر کوئی چیز تمہاری
مرضی کے مطابق ہو تو تم اسے اچھا کہو گے۔ جو چیز اچھا نتیجہ
پیدا کرنے کیلئے کہی جائے۔ اسے تم جھوٹ نہیں کہو گے
مجھے نیکیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں دیکھتا کوئی چیز بذات
خود بری نہیں ہر چیز نیک ہے۔ نیت نیک ہونی چاہیئے
فعل چاہیے کچھ ہو۔

آخر کار میں نے یہی سوال ایک یورپین سے کیا جو مدت
سے ہندوستان میں رہتا تھا اور جسے ہندوستان کے ساتھ
بہت ہمدردی تھی۔

میں نے اس سے سوال کیا کہ کیوں بڑے بڑے لوگ جھوٹے
بیان کر دیتے ہیں۔ اور پھر ان بیانات کی سچائی کے ثبوت کے لیے
بعض کا غذات کا حوالہ دیتے ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم پڑتا ہے
کہ یا تو ان میں اس مضمون کا ذکر ہی نہیں۔ یا یہ کہ ان کی تحریر
کے بموجب ان بڑے لوگوں کا بیان بالکل غلط ہے۔

اس نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ۔ ایک ہندو کے
لئے وہ بات کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ جس پر وہ یقین کرنا چاہے
یا بالفاظ دیگر ہندو کے خیال کے مطابق تمام مادہ ہیچ ہے۔

اِس لئے اِس کے متعلق تمام بیانات جھوٹے ہیں۔ اِس لئے وہ بغیر اِس خیال کے کہ اِس پر کوئی حرف آئے گا وہ اِس جھوٹ کو بول جاتا ہے۔ کہ جس سے اِس کی مطلب براری ہوتی ہے مزید برآں جب وہ آپ کی خدمت میں ایک تصویر پیش کرتا ہے جو پیش کرنی مناسب سمجھتا ہے تو یہ بات اُسے کبھی سوجھتی ہی نہیں۔ کہ تم اصل بنیاد سے ہی اِس کے الفاظ کے بیچ جھوٹ پڑتا لنے کی کوشش کرو گے۔

اِسی پیرایہ میں ایک نیویارک کے اچھے معلومات رکھنے والے اخبار نویس نے ۲۷-۱۹۲۶ء کے موسم سرما میں چند ہندوستانیوں سے جو کہ تمام شہر میں تقریر کر رہے تھے۔ یہ سوال کیا:-

"کہ تم ہندوستان کے حالات کی نسبت ایسی مبالغہ آمیز جھوٹی تقریریں کیوں کرتے ہو ان میں سے ایک نے باقیوں کی طرف سے یہ جواب دیا کہ تم اہل امریکہ کو ہندوستانیوں کے متعلق کوئی علم نہیں اور تمہارے مشنری جب یہاں تم سے روپیہ لینے کے لئے آتے ہیں۔ تو تم کو نہایت بیہودہ باتیں بتا دیتے ہیں۔ جن سے ہمارے دل دکھتے ہیں پس ہم اِن کے مقابلہ میں جھوٹی باتیں بناتے ہیں۔ تاکہ دونوں پلّے برابر ہو جائیں"

جب اِس قسم کا فلسفہ کام دیتا ہے۔ تو ایک ہندو کے لئے جھوٹ بولتے ہوئے پکڑا جانا کوئی شرم کی بات نہیں۔ اگر تم اِس کو اِس حالت میں پکڑ لو گے تو وہ اِس سے نہ تو کوئی اپنی سبکی خیال کرے

اِس کتاب کے مخالف بیان پر حواشی میں احتجاج کرنا یا رائے زنی کرنا ممکن ہی نہیں ہم بعض ایسے بیانات یا الزامات ہیں۔ جن کو ناچار نہایت جھوٹ بے بنیاد اور مبالغہ آمیز کہنا پڑتا ہے۔ (مترجم)

گا اور نہ ہی غصہ کا اظہار کرے گا۔ اِس کی پاک بازی پر اُسی طرح کوئی اثر نہیں پڑتا جس طرح شطرنج کی چال بدلنے سے نہیں پڑتا۔

اب انصاف یہ ہے کہ اِس پر بہت زور نہیں دیا جا سکتا ہندوؤں کا یہ رویہ اور یہ مختلف اندازہ قیمت ضروری نہیں کہ انہیں گھٹیا قرار دے۔ بلکہ یقیناً اُسی قسم کا ایک فرق جیسا کہ اُن کے جسم کے رنگ کا فرق ہے۔ تاہم جس قدر انسانی میل ملاپ میں فرق پایا جاتا ہے۔ اِسے ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے۔ ورنہ وہ میل ملاپ بلا ضرورت ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

تیئسواں باب

ہندوستانی والیانِ ریاست

ابھی تک ہم صرف برطانوی ہندوستان کا ذکر کرتے رہے ہیں جو سلطنتِ ہند سے جس میں برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستیں شامل ہیں۔ ایک علیحدہ چیز ہے۔ کل سلطنتِ ہند کا مجموعی رقبہ اٹھارہ لاکھ پانچ ہزار تین سو تیئیس مربع میل ہے جس میں سے انتالیس فیصدی رقبہ ہندوستانی ریاستوں کا ہے۔ کل سلطنتِ ہند کی آبادی اکتیس کروڑ نواسی لاکھ بیالیس ہزار چار سو اسی افراد کی ہے۔ جن میں سے ۲۳ فیصدی

بالکل سات کروڑ بیس لاکھ نفوس دیسی ریاستوں میں رہتے ہیں[1]۔ ان ریاستوں میں سے ہر ایک کی وسعت مختلف ہے بعض کا رقبہ بیس مربع میل ہے اور بعض اس قدر وسیع ہیں کہ جس قدر یورپ میں اٹلی کی سلطنت ہے ہر ایک ریاست میں اُن کے اپنے والیان ریاست حکمران ہیں۔ اور اگر حکمران نابالغ ہیں تو اُن کی جگہ اُن کا کوئی نہ کوئی نائب یا منتظم انتظام ریاست کرتا ہے۔ ان حکمرانوں میں سے بعض ہندو ہیں۔ بعض مسلمان اور بعض سکھ اپنی اپنی تاریخوں کے مطابق قابض ہیں۔

ان ریاستوں کی ملکی حد بندی اور اُن کے حکمرانوں کے اختیارات حکمرانی جو ان کو اپنی اپنی ریاستوں کے حدود کے اندر حاصل ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان کے ذریعے اس وقت قائم اور عطا کئے گئے تھے۔ جب کہ ملکہ صاحبہ نے ہندوستان کی عنان حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اس اعلان میں یہ اصول قائم کیا گیا تھا کہ برطانیہ کی یہ خواہش نہیں کہ وہ اپنے ملک کی حدود کی توسیع کرے بلکہ وہ ان ہندوستانی ریاستوں میں کسی کو کسی قسم کا دخل نہ دینے دے گی۔ اور نیز یہ کہ :۔

"کہ ہم ان دیسی حکمرانوں کے حقوق مرتبہ اور عزت وحرمت

---

[1] ملاحظہ ہو سٹیٹسٹیکل ایبسٹریکٹ فار برٹش انڈیا بابت ۱۹۱۴-۱۵ء لغایت ۱۹۲۳ء صفحات (۲ لغایت ۵)

کی ہر طرح سے نگہداشت کریں گے اور ہماری خواہش یہ ہے کہ اِن ریاستوں کے باشندوں اور ہماری اپنی رعایا کو فلاح و بہبود اور تمدنی ترقی حاصل ہو جو صرف اندرونی امن و امان اور اچھی گورنمنٹ کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

سلطنت برطانیہ اور اِن والیان ریاست میں معاہدے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے باہمی فاتح و مفتوح کے تعلقات ہیں۔ اِن معاہدوں کی وجہ سے اِن حکمرانوں کو اختیارات حاصل ہیں۔ کہ وہ اپنی رعایا پر جس طرح کی حکومت کرنی چاہیں کریں اپنے ٹیکس وغیرہ اِن سے وصول کریں اور اپنے حدود کے اندر انہیں پھانسی وغیرہ تک کی سزائیں دیں اور اِن باہمی تعلقات کی بنیاد برطانیہ کی طرف سے اِس پر ہے۔ کہ (الف) یہ ریاستوں کے اندرونی حالات میں دخل اندازی نہیں کر سکتی ماسوائے ایسے حالات کے جب کہ اِس کی دخل اندازی کی اہم ترین ضرورت در پیش ہو۔ اور اِس صورت میں بھی یہ ایسا دخل دے گی جو نہایت ہی خوبی کے ساتھ ممکن ہو اور (ب) یہ کہ بحیثیت شہنشاہ ہونیکے برطانیہ ملک کی مجموعی طور پر فلاح و بہبود کی نگہداشت کرے گی۔ اِن ریاستوں کے غیر ممالک کے ساتھ تعلقات اور ایک ریاست کے دوسری ریاست کے ساتھ خط و کتابت اور لین دین برطانیہ کی وساطت سے ہوتا ہے

برطانوی سیاسی افسر جنہیں ریزیڈنٹ کہتے ہیں۔ ہر ایک بڑی ریاست میں حکمران کے صلاح و مشورے کے لئے موجود رہتے ہیں۔ اِسی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ایک مجموعہ کے لئے عام طور پر مشورہ دینے والے برطانی افسر ہیں جو اکثر وائسرائے کی گورنمنٹ کے شعبہ کے اراکین ہوتے ہیں۔

سال بھر میں ایک دفعہ یہ حکمران دہلی میں جمع ہوتے ہیں۔ اور وائسرائے کی زیر صدارت اِن کا ایک اجلاس عام سیاسیات پر غور کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ اجلاس نہایت شاندار اور پرشوکت ہوتا ہے۔ جسمیں بڑے بڑے اہم سوالات پیش ہوتے ہیں۔ اور اگر معمولی اوقات میں ذاتیات کی نسبت کوئی خاص اہم سوال درپیش نہ ہو جائے۔ تو اِس اجلاس سے نہایت اچھے نتیجے نکلتے ہیں۔ اور بڑے بڑے مطالب حل ہوتے ہیں۔ کیونکہ اِن اجلاسوں میں حکمرانوں کے ذاتی طور پر ایک ہی صدارت کے ماتحت ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے سے اِن کے گھرانوں کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اِن میں کوئی باہمی کشیدگی ہو تو اِس کی جلدی اور بہترین طور پر صفائی ہو جاتی ہے۔ اِن اجلاسوں میں ابھی تک دو یا تین بڑی ریاستوں کے حکمران شامل نہیں ہوئے۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ اُنکی نشستیں اِن کے اجلاس میں ایک دوسرے سے نیچے اوپر ہو جاتی ہیں

کہ جیسے ان کے ایک دوسرے سے نیچے اوپر بیٹھ جانے سے اِن کی خاندانی عزت وقار کے کم یا بٹہ لگ جانے کا اندیشہ تھا۔

ہندوستانی ریاستوں میں دورہ کرنے سے اِن کے نظم و نسق اور طرزِ حکومت کو معلوم کرتا اور اِس کی نسبت کوئی رائے قایم کرنا بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ باہر سے گیا ہوا شخص والئے ریاست کا مہمان ہوتا ہے جس کی بے حد خاطر و مدارت کی جاتی ہے۔ ایک معمولی راجہ کے میزبان کی طرح سے یہ والئے ریاست اپنی ریاست کے وہ وہ حالات بیان کرتا ہے۔ اور وہاں کی وہ وہ چیزیں دکھاتا ہے جو اُس کی اپنی نگاہ میں نہایت اعلےٰ اور قابلِ تعریف ہوں چنانچہ مہمان کو پرانے شاہی محلات کی خوبصورت عمارتیں اور اُن میں جدید اصلاحات سے ایسی دلچسپی ہوتی جاتی ہے کہ وہ اُن کی طرف ہی دیکھتا اور اُن پر غور کرتا جاتا ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ مشرق ہو یا مغرب کوئی بھی اپنے میزبان

یہ بات تو اِس لئے فضول ہے۔ کہ کئی شاہی درباروں میں حضور نظام دکن سے لے کر چھوٹی چھوٹی والیان ریاست ایک وقت بیٹھے ہیں اور اُن کی نشستیں پہلے ہی مقرر ہو چکی ہیں۔ ملک معظم کنگ جارج کے سامنے دہلی کے دربار میں سب سے پہلے اعلیٰحضرت نظام جنکو اس کے بعد سب والیان ریاست سے ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کا امتیازی خطاب دیکر بڑا تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اُٹھے تھے اور اُس کے بعد مہاراجہ گائیکوار وغیرہ درجہ بدرجہ تسلیم کیلئے جھک جاتے اور آتے رہے پھر اِس کے بعد اور کئی راجہ درجہ نشستات مقرر ہونے والا ہے۔

کو یہ نہیں سکیے گا کہ اِس کی فلاں بات یا فلاں چیز میں کوئی نقص ہے۔

"تاہم ہمیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی ریاستوں میں نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے حکومت کیجا رہی ہے بہت سی ایسی ہیں۔ جن میں خاص طرح سے حکومت ہو رہی ہو بعض اسباب میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ اور چند ایک میں نہایت بُری طرح سے حکومت کیجا رہی ہے۔ اِن موخرالذکر ریاستوں میں ابھی تک دہی "ست جگ" کا دور دورہ ہے اور اُن کی پرانی طرز حکومت پر جدید ترقیات کی کوئی روشنی نہیں پڑتی اُن کی شاہی زندگی اور یہاں کی رعایا کی زندگی الف لیلہ کے حکمرانوں اور رعایا کی زندگی ہے یعنی شاہی محل میں تو وہی غصے کا دریا امڈا رہتا ہے۔ حسد اور کینے اور انتہائی سختی کا چاروں طرف دور دورہ ہے۔ اِسی طرح بادشاہ سلامت کا منظور نظر وزیر راتوں رات ہی ایسا غایب ہو جاتا ہے کہ کہیں اُس کا پتہ نہیں چلتا۔ کسی پر ذرا سا عتاب وارد ہو جانے پر وہ وہ سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ کہ اُن کو سن کلیجہ منہ کو آتا ہے اور زنان خانہ میں وہ چالیں چلی جاتی ہیں۔ کہ اُن کو دیکھ اور سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ رعایا کا یہ حال ہے۔ کہ اُسے ایسا مردہ خیال کرنا چاہیئے۔ کہ اُس کو اُس بوجھ کا احساس تک نہیں کہ جس سے یہ کچلی جا رہی ہے۔

اِن والیان ریاست کے اپنی رعایا کے ساتھ ایسے ہی تعلقات

ہیں۔ جس طرح ایک بڑا بھاری درخت نہایت بودی۔ کمزور اور
کھوکھلی جڑوں پر کھڑا ہو۔ اسی طرح والئے ریاست اپنی رعایا کو
چوس کر خشک کر دیتا ہے۔ اور انہیں اس کے معاوضہ میں کچھ
نہیں دیتا ایسے والئے ریاست کے ماتحت جب تک کہ وہ نہایت
ظالم نہ ہو رعایا کے لوگ خلوص سے اطمینان میں رہ سکتے ہیں کیونکہ انکی
تمام تاریخ یہی ان کو بتا رہی ہے کہ ان کیلئے اس سے بہتر اور
کوئی زندگی ہو ہی نہیں سکتی اور یہ لوگ اپنے رئیس کی نمائشوں
اس کی سالگرہوں کے جشنوں اس کی شادیوں اور اس کے
مذہبی رسومات کی ادائیگی میں حصہ لیتے اور ان موقعوں کے
کھیل تماشوں کو دیکھکر نہایت خوش ہوتے ہیں۔ اور ان کو
یہ خبر تک نہیں ہوتی کہ ان سب کے اخراجات محض انہیں
سے وصول کئے ہوئے ٹکسوں سے پورے کئے جاتے ہیں۔ مگر وہ
انگریزی علاقہ میں شاذ و نادر لگائے جاتے ہیں۔ تاہم بحیثیت
مجموعی ظاہر ہے کہ ریاستوں کی حکومت کا میلان سب کو ایک
سطح پر لانے کا ہے۔

جسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان والیان ریاست کے دل
میں اپنی جایدادوں میں ترقی کرنے کی روز افزوں خواہش
پیدا ہو گئی ہے۔ یا اس اصلاح کی ایک دوسری وجہ یہ
ہوتی ہے۔ کہ ایک نالائق والئے ریاست کو گدی سے اتار کر
اُس کا انتظام ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے کیونکہ
اِس طرح ریزیڈنٹ یا منتظم کی مقابلتہً اچھی حکومت کا اندازہ

ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر بری حکومت آئے۔ تو ناراضگی پڑھ جاتی ہے۔ اور پھر اصلاح انتظامی کو ٹھیک طور پر از سر نو شروع کرنا پڑتا ہے مثال کے طور پر ایک ایسے والئے ریاست کی ریاست کو لیجئے۔ جس کی نابالغی کا زمانہ یورپ میں بیس سال تک رہا ہو اس عرصہ میں ریاست کا کل انتظام ایک ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں رہا اور اس ریاست کی تاریخ میں پہلی دفعہ ریاست کا مالیہ صحیح طور پر لوگوں کی بہتری کے لئے خرچ ہوا۔ چنانچہ اچھی سڑکیں اور ریل بن گئے۔ سکول کھل گئے ایک جدید قسم کا ہسپتال قائم کر کے اس میں لائق ملازموں کا عملہ رکھا گیا۔ امن وامان قائم کیا گیا تجارت اور مصنوعات کو فروغ دیا گیا۔ خزانہ میں روپیہ کی ریل پیل ہو گئی۔ کیونکہ روپیہ ریزرو فنڈ میں جمع ہونے لگا اور انصاف ہر کس وناکس کو ملنے لگا۔ مگر باوجود ان تمام دل خوش کن جدت کے لوگ اس دن کے لئے ٹھنڈی سانس بھرتے رہتے ہیں۔ کہ کب ان کا شاہزادہ جسے وہ نہ صرف دل سے نہایت محبت کرتے ہیں۔ بلکہ بطور رسم قدیم اس کی پرستش کرتے ہیں۔ بڑا ہو گا اور ان پر اسی طرح حکومت کرے جس طرح اس کے آباؤ اجداد ان لوگوں کے آباؤ اجداد پر حکومت کرتے آئے ہیں۔

آخر یہ دن بھی آجاتا ہے شہزادہ اپنے بزرگوں کے تخت حکومت پر بیٹھتا ہے۔ اس کی بیگمات لونڈیاں پرانے اہل کار ناچ کرنے والی طوائفیں اور خوشامدی رشتہ دار فی الفور

اِس پر پورا قابو حاصل کر لیتے ہیں۔ خوشامد و درآمد سے اور طرح طرح کی رام کہانیاں سنا سنا کر عیش و عشرت پر مائل کر لیتے ہیں۔ جس سے اِس کی عقل تک ماری جاتی ہے۔ اِس کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ اُس کی مردانہ قوتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ اور صرف تین ہی سال کے عرصہ میں اِن تمام اصلاحات اور ترقیات کا ستیاناس ہو جاتا ہے جو بیس سال کی متواتر کوششوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ خزانے میں جو رقوم جمع ہو چکی ہوتی ہیں اُن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ پھر ٹھگوں کی بھرمار کر دی جاتی ہے۔ ریاست کے اچھے اچھے ملازم برطرف کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس نہایت قابل ڈاکٹر کی جگہ جو سو پونڈ ماہوار لیتا تھا ایک ساٹھ شلنگ ماہوار کا نیم حکیم ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ ہسپتال کے قابل ترین عملے کی جگہ گھٹیا اور نالائق کمپونڈر رکھ لیتے ہیں۔ اور خود ہسپتال ایک سنڈاس بن جاتا ہے اور یہی حال باقی تمام محکموں کا ہو جاتا ہے۔ جن پر نحوست اور افلاس و ادبار کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ کسی کو کسی انصاف کی توقع نہیں رہتی اور نہ ہی ایسے مقدمات کی کوئی اپیل سنتا ہے۔ جن میں رشوت لے کر فیصلے دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسی مقدمہ میں اس وقت تک کوئی حکم نہیں ہوتا جب تک کسی نہ کسی فریق سے رشوت نہ لے لی جائے۔ گویا کہ کوئی بات بھی پیسے کے بغیر

نہیں بھاتی۔ اور لوگوں کا خون اپنے فرمانروا کی فضول خرچیوں اور عیاشی کے لئے نچوڑا جاتا ہے۔

آخر یہ لوگ تنگ آ کر پھر اپنے پرانے دوست یعنے ریزیڈنٹ کے پاس یہ فریاد لے کر آتے ہیں۔ کہ:۔

"ہماری دلی خواہش تھی کہ ہمارا اپنا فرمانروا جوان ہو کر ہمارے پاس آئے اور ہم پر حکومت کرے۔ مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا یہ کیا کر کے دکھائے گا۔ اب ہم اس کے ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔ خدا کے لئے صاحب بہادر آپ ریاست میں واپس آئیں وہاں امن و امان قائم کر کے ہمارے ساتھ انصاف کریں۔ تاکہ ہم وہی خوشحالی کی زندگی بسر کریں جو ہم آپ کے زمانہ میں کرتے تھے۔"

بعض والیاں ریاست کے ظلم و ستم کی کارروائیوں اور اُن کے وحشیانہ افعال کی نہایت شرمناک کہانیاں مشہور ہیں۔ اور ان میں سے بہت سی کہانیوں کی تہ میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے مگر ان کو کسی خاص ثبوت کے بغیر مان لینا درست نہیں کیونکہ وہ ہندوستانی اخبارات جو گورنمنٹ کی مخالفت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اس قسم کی کہانیوں کی اصلیت پر غور کئے بغیر بڑے زور سے مبالغہ آمیز بیانات کی اشاعت کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مدعا ایسی اشاعتوں سے اِن صورت حالات کا سارا الزام گورنمنٹ کے سر تھوپنے کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور

اگر گورنمنٹ ایسے حالات کو دیکھتے ہوئے کسی ریاست کے معاملہ میں دخل دے بھی دے تو پھر بھی اخبارات اِس کو پردیسی گورنمنٹ کہہ کر اِس دخل دہی پر کوسنے لگتے ہیں۔

ایک تخت وتاج کا وارث لڑکا دنیا میں بہت سے نقائص لے کروارد ہوتا ہے۔ تمام لوگ اِس کے منظور نظر ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہر ایک یہی کوشش کرتا ہے کہ اسے عیش پرستی اور فضول خرچی میں لگائے رکھے تا کہ اُسکا اُلو سیدھا ہو۔ مگر بعض ریاستوں میں اِس لڑکے کی رانی ماں نہایت سلیقہ شعار اور فہیم ہوتی ہے جو اپنے لڑکے کو اِن مصائب سے بچائے رکھتی ہے۔ اور بعض اوقات اِس لڑکے کیلئے اِن خوشامدیوں کے زہریلے اثرات سے بچنے کی یہ صورت ہو جاتی ہے۔ کہ وہ انگلستان کے کسی اچھے سکول میں بھیج دیا جاتا ہے یا اِسے چند سال ہندوستان کے چار چیفس کالجوں میں سے کسی کالج میں بسر کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ جنہیں اِس کی اچھی خاصی نگہداشت ہوتی ہو کہ وہ زمانہ حکومت کو سنبھالتے ہی کسی اہلکار پر الطاف اور کسی پر عتاب نازل کرنے لگتا ہے۔

ان کالجوں کے اثرات میں سے ایک تو یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے برابر والوں میں زندگی کا دادو ستد کر سکتا ہے۔ یا اپنے گھر میں

نظر نہیں آتا۔ اِس لئے اِس کا میل اول یا تو کمتر درجہ اور یا اپنے آپ سے بڑی عمر کے آدمیوں سے ہی رہتا ہے۔ دوسرا اثر اس کو کاہلی اور ذہنی سستی سے اُٹھا کر کھڑا کرنے کا ہوتا ہے۔ اِسے کام کاج میں لگا رہنے اور مردانہ کھیلوں میں شامل ہونے کی عادت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً ٹا ئینس جیسی کھیلوں کی کہ جسے وہ اپنے ساتھ اپنے گھر پر بھی لے جاتا ہے۔ ایک بہت بڑا فایدہ پہونچتا ہے۔ کہ وہاں کے انگریز ہیڈ ماسٹر کے ساتھ اُس کے اچھے تعلقات ہو جاتے ہیں۔ جو اُس کی آیندہ اور موجودہ مشکلات کو محسوس کرتا ہے۔ اور خاموشی سے اِس نوجوان کے دماغ میں تنہا نہ وقار کا اثر بیٹھاتا ہے جو اُسے عمر بھر مفید ثابت ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایک والئے ریاست کی بعد کی زندگی میں اِس ابتدائی تعلیم کا اثر بالکل زائل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر دوسری صورتوں میں اِس کے کیریکٹر ذاتی (چال چلن) کی ترقی پذیر ہو جانے سے دیسی ریاستوں میں معیار حکومت بلند ہو رہا ہے۔

ایک نمایاں مثال میسور کی ریاست کی ہے۔ اِس ریاست کا رقبہ سکاٹ لینڈ کے رقبہ کے برابر ہے اور آبادی چھ ملین (ساٹھ لاکھ) نفوس کی ہے۔ موجودہ رئیس کے والد کو برطانوی استادوں کی زیر نگرانی اپنی ریاست میں حکمرانی کرنے کی خوبی کے ساتھ تربیت کیگئی تھی اِس کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کی نگرانی برطانوی ہاتھوں میں رہی چنانچہ ریاست

اِس وقت نہایت ہی اچھی عالت میں تھی جبکہ اُس نے اِس
کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی ایک نہایت قابل دیوان
یا وزیر کی امداد سے اِس نے اپنی رعایا پر اُن کے مفاد کی پوری
نگہداشت کرتے ہوئے حکومت شروع کی سنہ ۱۸۹۴ء میں اِس کا انتقال
ہو گیا اور اِس نے بھی ایک نا بالغ وارث چھوڑا چنانچہ اِس کی
والدہ نے اِس کا سربراہ بن کر انگریزی افسروں کی زیر نگرانی
ریاست کی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور ایک نوعمر شہزادے
اپنی رعایا کی فلاح وبہبود کی ذمہ داری محسوس کرنے کا موقعہ مل گیا
سنہ ۱۹۰۲ء سے اِس شہزادے کو اختیارات حکمرانی عطا ہوئے۔ او
اِس وقت سے یہ نہایت عقل اور قابلیت کے ساتھ حکومت کر
رہا ہے۔ اور اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے ہر وقت کوشاں ہے
گو خود ایک راسخ الخیال ہندو ہے۔ اور اِس نے حال ہی
ایک قابل ایرانی مسلمان مرزا۔ اسمٰعیل۔ سی۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔
کو صرف اپنی ریاست کی بہبودی مدنظر رکھکر اپنا دیوان مقرر کیا
ہے۔ اور اب میسور کا شہر اپنی فراخ سایہ دار بازاروں اپنے جدید
عمدہ سرکاری عمارتوں اپنے باغات اور پارکوں سے اپنی آنکھوں
میں چکاچوندھ پیدا کر دینے والی بجلی کی روشنی سے ایک صاف اور
ستھرا نمونہ کا شہر بنا ہوا ہے۔ دستکاری کا ایک بڑا کالج ایک
یونیورسٹی کی ایک عالیشان عمارت ہے جس کے ساتھ اِس کا
علیحدہ کتب خانہ ہے اور ایک بڑا بھاری ہسپتال اِس شہر کی

خوبصورت اور قابل دید مناظر ہیں۔ آب پاشی کی ایک بڑی بھاری
سکیم پایۂ تکمیل کو پہونچنے والی ہے۔ ریاست کے بیش قیمت معدنی
وسایل اِس کی زراعت اور دستکاری صنعت وحرفت اور مصنوعات
میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے گذشتہ سالوں
میں کاریگروں اور عام مزدوروں کی مزدوریوں میں دوگنی ترقی
ہوگئی ہے۔ منتخب شدہ نمایندگان کے ذریعے سے جو والئے
ریاست کو وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں ریاست سے متعلق عام لوگوں کی
ضروریات سے مہاراجہ کو ہر وقت خبر رہتی ہے آخر کار ایسے
دلچسپ مضمون کو ایسے اختصار کے ساتھ ختم کرنے سے تصویر
کے دو دھبے دور کئے جا رہے ہیں۔

اول یہ کہ ایک فرمان شایع کیا گیا ہے کہ ایک انتظامی عہدہ
کے لئے دو امیدواروں میں سے۔ اس کو منتخب کیا جاوے گا
جو دونوں میں سے بہتر قابلیت کا آدمی ہو نہ کہ دوسرے سے
اعلیٰ ذات کا ہے۔ دوسری یہ کہ یہاں کی رعایا صحت کے
لحاظ سے بہت کمزور تھی لہذا اسلئے ریاست نے اپنے دیوان
کی معرفت اُن کو دنیا بھر کے لوگوں سے زیادہ تندرست بنانے
کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ چنانچہ راک فیلر
فاؤنڈیشن کے انٹرنیشنل ہیلتھ بورڈ کو کہا گیا۔ کہ میسور کے
لوگوں کو تمام ہندوستان سے زیادہ تندرست بنانے کے متعلق
ہدایات دے۔ اور یہ ہندوستان سے بورڈ مذکور کو دوسری[ع]

ع پہلے اِس قسم کی ہدایات دینے کیلئے ہندوستانی گورنمنٹوں میں سے صرف مدراس پریزیڈنسی
کی گورنمنٹ نے درخواست کی تھی چنانچہ اِس فاؤنڈیشن کا ایک افسر آجکل مدراس میں موجود ہے

اس قسم کی درخواست پہونچی ہے۔ جسے بورڈ مذکور نے بخوشی منظور کیا اور اس کا نتیجہ غیر معمولی طور پر نہایت ہی فایدہ بخش ہو گا ہندوستان کے تمام والیان ریاست اپنی اپنی بساطوں کی ضرورتوں کے مطابق فوج رکھتے ہیں۔ چنانچہ نظام حیدر آباد نے اپنی ریاست میں جس کا رقبہ بیاسی ہزار مربع میل ہے قریباً بیس ہزار فوج رکھی ہوئی ہے مہاراجہ دتیا نے جس کی ریاست کا رقبہ صرف ۹۱۱ مربع میل ہے۔ اپنے ہاں ایک پوری پیادہ فوج اور ایک پورا رسالہ اور سات توپوں کا ایک توپ خانہ رکھا ہوا ہے۔ اس پیادہ فوج رسالہ توپ خانہ اور دیگر افواج کے لئے بہت سے افسر ملازم رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں میں ایک ایسے شخص کی زبانی سنا ہوا ایک حصہ نقل کرتی ہوں کہ جس کے سچائی پر میرے یقین میں کبھی شبہ نہیں کیا گیا یہ قصہ ۱۹۲۰ء کے اس شورش کے زمانہ کا ہے جب کہ ایکٹ اصلاحات کے نفاذ سے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ اور بہت سے حلقوں میں یہ خبر گشت لگا رہی تھی کہ اب حکومت برطانیہ ہندوستان کو چھوڑ کر چلی جانے والی ہے۔ مجھے یہ باتیں سنانے والا ایک امریکن تھا۔ جسے ہندوستان کا دیرینہ تجربہ تھا۔ اور جو ایک بڑے والیٔ ریاست سے جو اعلےٰ پایہ کا حکمران تھا ملنے کیلئے گیا ہوا تھا اس ملاقات کے دوران میں اس فرمان روا کا دیوان بھی موجود

تھا اور تینوں دیرینہ دوستوں کی طرح سے باتیں کر رہے تھے
کہ دیوان نے کہا:۔
"ہمارے مہاراج صاحب اِس بات پر یقین نہیں کرتے
کہ انگریز ہندوستان سے چلے جانے والے ہیں۔ مگر چونکہ انگلستان
میں نئے خیالات کے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن ہے
کہ یہاں کے انگریزوں کو کوئی برا مشورہ دیا جا رہا ہو۔ چنانچہ
ہمارے مہاراج صاحب نے اپنی فوج کی درستی شروع
کر دی ہے۔ دارو سکہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور وہ روپیہ
کی فراہمی کے لئے ہر ممکن کوشش فرما رہے ہیں۔ اگر انگریز
ہندوستان سے چلے گئے تو آج سے تین ماہ بعد تمام بنگال
میں نہ تو کوئی روپیہ رہے گا اور نہ ہی کوئی کنواری لڑکی رہ
جائے گی۔"
دیوان صاحب کے اِس بیان کی خود مہاراجہ صاحب نے
بھی تائید کی جو اپنی راجدھانی میں بنگال سے ہندوستان
کی نصف عرض کے مسافت پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کے
آباؤ اجداد بہت پرانے زمانے کے مرہٹہ سردار تھے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ سوراجی لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اِس وقت جب
کہ گورنمنٹ اُن کے ہاتھ میں آ جائیگی تو ہندوستانی والیان ریاست
اِس طرح اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کہ گویا یہ ملک اُن ہی کی
ملکیت ہے۔ اور اُن کا رویہ وہی ہو جائے گا جو ایک سو سال
پہلے تھا۔ اور یہ نہ ہندوستانی افواج اگر اِس وقت اِن کا کوئی وجود

رہا تو یہ لیجیلیٹو اسمبلی جس میں اس قسم کے لوگ شامل ہیں۔ جن کی نہ تو ہندوستان کو کوئی خبر ہے۔ اور نہ ہی اُنکی ہندوستانیوں نے کبھی فرمانبرداری کی ہے۔ اُن کا ساتھ دینے کی بجائے کسی ایسے رئیس کی تابع فرمان ہو جائیں گی جس میں اس وقت کوئی جان باقی ہو گی۔

ہندوستانیوں کے قلوب خودمختار امرا اور رئیسوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ایک ہندوستانی لڑائی کا سوائے اس کے کچھ مطلب نہیں ہے کہ یہ کسی والئے ریاست کی سرکردگی میں ہو۔ اور جس کی غرض و غایت سوائے عام لوٹ مار کے اور کچھ نہ ہو۔ اگر یہ مہاراجہ صاحب جن کا ذکر اوپر ہوا منہ اٹھا کر بنگال میں چلے آئیں جہاں سے اگر انگریز اپنا لوریا بستر ہ اٹھا لیں تو بنگال کے جوان انہیں مہاراجہ کے گرد جمع ہو جائینگے مگر ان والیان ریاست کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو ان میں سے ہر والئے ریاست اپنی ریاست میں اور علاقہ شامل کرنے کی فکر میں لگ جائے گا۔ اور یہ کہ ہر ایک لڑائی کے ہتھیاروں سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنی حدود کی حفاظت اور نگہداشت میں مصروف ہو جائے گا۔ اور یہ کہ یہاں کی سیاسی شورش اس طرح ناپید ہو جائے گی جس طرح ایک گھاس کا تنکہ جلتے ہوئے شعلوں میں پڑ کر ناپید ہو جاتا ہے۔

مگر ان والیان ریاست کا منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ انگریز

ہندوستان سے چلے جائیں۔ وہ تو صاف کہتے ہیں۔ کہ
برطانیہ کی حفاظت میں آرام سے بیٹھے بے فکری کی زندگی
بسر کر رہے ہیں۔ ان کو اپنی اور اپنی ریاست کی حفاظت
کے لئے کوئی بڑی وسیع فوج نہیں رکھنی پڑتی جس کے
علاوہ ان کو بہت سی سہولتیں اور نعمتیں مثلاً سواری کے
لئے ریلیں آمد و رفت کے لئے اعلےٰ درجہ کی سڑکیں۔ ہندوستانی
منڈیاں ڈاک اور تار حاصل ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر
یہ کہ یہ لوگ بے کھٹکے امن و امان سے بیٹھے اپنے خزانے
مال و دولت اور زر و جواہر سے بسر رہے ہیں۔ جنگ عظیم کے
دوران میں ان کا رویہ نہایت اچھا اور خیراندیشانہ رہا۔ اور
انہوں نے اپنے بادشاہ سلامت کی روپیہ اور آدمیوں اور
اسباب سے امداد کی۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ لوگ ایک اعلےٰ
پایہ کے جنگجو آدمیوں کی جماعت ہے جس کا دلی منشا اور
سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں
کی حکومت برقرار رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ گورنمنٹ کو
خوش کرنے کے لئے ان سیاسی لیڈروں کو اپنے دربار میں
میں باریاب ہونے کا موقعہ نہیں دیتے۔

ان لیڈروں سے ان کی نفرت اس قدر بڑھی ہوئی
ہے کہ اگر گورنمنٹ کسی صورت میں ان سے سمجھوتہ کرنے
کا فیصلہ بھی کر لے تو والیان ریاست جو ہر وقت گورنمنٹ
کا دم بھرتے ہیں۔ دل ہی دل میں اس کا مذاق اڑانے لگ

جاتے ہیں۔

ان والیان ریاست میں سے ایک نے مجھے نہایت متانت سے کہا کہ:-

ہمارے معاہدات کو جو خود انگلستان کے شہنشاہ سے ہیں۔ ہندوستان کے والیان ریاست نے گورنمنٹ سے کوئی ایسا معاہدہ نہیں کیا جس میں بنگالی بابو بھی شامل کر لیے گئے ہوں ہم اِس نئے سیم پڑھے دفتروں میں نوکری کرنے والوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب تک کہ انگریز اِس ملک میں ہمارے پاس انگریزوں کے شہنشاہ کا پیغام پہنچاتے رہیں گے۔ اور تمام کارروائی اِس طرح ہوتی رہے گی جس طرح دو دوستوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر انگریز یہاں سے چلے جائیں گے تو ہم والیان ریاست ہندوستانیوں کو اِس طرح سیدھا کر لیں گے۔ جس طرح سیدھا کرنے کا حق ہوتا ہے۔ مجھے اِس وقت ایک بات یاد آگئی۔ جو اِس پارٹی میں ہوئی تھی جو مجھے ایک ہندوستانی دوست نے دہلی میں اِس غرض کیلئے دی تھی کہ میں پرائیویٹ طور پر سوراج اور سیاسیات کے متعلق چند باتیں سن سکوں اِس پارٹی میں زیادہ تر مہمان میر میزبان کی طرح ایسے بنگالی ہندو مغربی تعلیم یافتہ پیشہ ور کلاس کے تھے۔ یہ لوگ ہندوستان سے انگریزوں کے نکل جانے کا ذکر کرتے رہے جو وہ خود اُن کے چلے جانے کے بعد اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوال کیا کہ تم

لوگ ہندوستانی والیان ریاست کے متعلق کیا طریقہ اختیار کرو گے۔!

اِس پر ایک نے یقین کے ساتھ جواب دیا کہ ہم اِن سب کو ملیا میٹ کر دیں اور باقی سب نے سر ہلا کر رضا مندی ظاہر کی

پانچواں حصہ

شمال میں

شہر کوہاٹ درہ کوہاٹ کے عین منہ میں واقعہ ہونے کی وجہ سے لمبی شمال مغربی سرحد کی حفاظت کی ایک چھوٹی سی جگہ ہے یہ ایک تنگ اور سکڑا ہوا چھوٹا سا مقام عین اِس مطلب کے موزوں ہے۔ جس کے لئے قدرت نے اِسے بنایا۔ گل نیلوفر اور گل بنفشہ کے تختے کے تختے اِسکی گلیوں میں اِس کے باغات میں اِس لئے موجود ہیں۔ کہ برطانیہ والے پھولوں کے بے حد شایق ہیں۔ اور انہیں ملک کے خواہ کسی گوشے میں ڈال دیا جائے۔ وہاں بھی قدرت اُن کے لئے پھول مہیا کر دیگی۔ خاردار تار کی باڑیں شہر کی چاروں طرف لگائی گئی ہیں ہر سو قدم پر روشنی موجود ہے۔ اور خوب مسلح سنتری کھڑے پہرے دے رہے ہیں۔ ہر ایک مکان کے ہر کونے پر روشنی ڈالنے کی بڑی بڑی سرچ لائیٹ ہوتی ہیں

جو شام ہوتے ہی جلا دی جاتی ہیں۔ چھپ کر چھاپے مارنے والوں کی روک تھام کے لئے کسی گھر کے قریب کوئی جھاڑی کوئی درخت اور کوئی چھپنے کی جگہ نہیں رہنے دی گئی۔ کسی انگریز عورت کو خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ جو حادثات رونما ہو چکے ہیں۔ دن کی روشنی کم ہو جانے کے بعد ان تاریک بازاروں سے آگے نکل جانے کی اجازت نہیں۔ یہ انگریز عورتیں جو کوہاٹ میں گنتی کی ہیں۔ فوجی افسروں کی بیویاں ہیں۔ اور یہ چپ چاپ ایک دوسری سے مل کر عقبا وقت وہاں گذارنا ہوتا ہے گذار لیتی ہیں۔

اس شہر میں اور سرحد کے دوسرے شہروں میں دن اور رات میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ جب بھیانک خطرے کا اندیشہ نہ ہوتا ہو۔

چوکی کی حفاظت میں یہ ہندوستانی چھوٹا سا شہر ہے جس کے گرداگرد گارے کی اونچی فصیل ہے۔ اس میں بازار مسجدیں اور مندر ہیں۔ تنگ و تاریک بازاروں اور گلیوں میں ایسے مکانات ہیں۔ جن کی کوئی کھڑکیاں دکھائی نہیں دیتی۔ ان میں باز کی طرح مڑے ہوئے ناکوں والے آدمی پوستین پہنے۔ اور اپنی بغلوں میں بندوقیں دبائے اپنے گدھوں اور بیلوں کو ہانکتے ہوئے۔ دکھائی دیتے ہیں۔

سینکڑوں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ان دیہاتی میلوں کی دوکانوں کی طرح افغانی سرحد کا پتہ دے رہی ہیں۔ مسلمان

عورتوں کے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں پہننے کے عجیب و غریب چمکدار سلیپر جن کی ایڑیاں نہیں ہوتیں اور جن کی نوکیں اوپر کی طرف مڑی ہوتی ہیں۔ ایرانی چارپائیوں کے پائے۔ منقوش رنگ کے خوبصورت کانچ کے کپڑے ریشمی اور سوتی گلکاری کے کپڑے ٹین تانبے اور پیتل کے برتن نقش و نگار شدہ مٹی سے ظروف پہاڑی علاقہ کی لومڑیوں کی نفیس کھالیں اور بخارا کے سرخ قالین بک رہے ہیں۔ جا بجا گوشت بک رہا ہے۔ کیونکہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے۔ چاول کڑاہی اور قند بھی موجود ہے۔ کیونکہ یہاں ہندو بھی آ بسے ہیں۔ جو پٹھانوں کو مال کے بدلہ میں روپیہ قرضہ پر دیتے ہیں اور اس لین دین سے دن بدن متمول ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کے تمول میں گو اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر ان کو ان سرحدوں پر زیادہ اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ یہ باز کی طرح مڑی ہوئی چونچ جیسے ناکوں والے۔ جنہوں نے پوستینیں پہنی ہوتی ہیں۔ ان ہندوؤں کے مقابلہ میں سا ہوکارہ نہیں کر سکتے۔ مگر ان کی دولت ان کی نظروں میں اس طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ کہ بہادر سے بہادر بھی ان کی للچائی ہوئی نظروں کی طرف دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ان باز کی چونچوں کی طرح مڑے ہوئے ناکوں اور باز کی طرح تیز نظر والے شہریوں کے۔ جو اپنے ملک میں رہتے ہیں۔ ایک بندوق کی گولی کے پلہ پر جھوسلی اور جھکی ہوئی

سرحدی پٹھانوں کی اوٹ ہیں اِن کے مسلمان بھائی۔ اِن وحشی قوموں کے لوگ گھات میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو کسی کو اپنا بادشاہ یا آقا نہیں سمجھتے جو لوٹ مار کرنے کی سوائے اور کوئی کام نہیں جانتے اور جن کا مرغوب شغل سال بھر میں یہی ہوتا ہے۔ کہ ہندو ساہوکاروں کو بھگا کرلے جائیں۔ اور اِن کے معاوضہ میں وہ روپیہ لیں جن کی جھنجھناہٹ وہ بعد میں ہونے والے سودا کے درمیان سنتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کا کام سالہا سال سے دن رات ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کرنا ہے۔ اُن کا یہ قول ہے کہ اِن سرحدی پٹھانوں سے بہتر دنیا بھر میں کوئی لڑنے والی قوم نہیں اِن لوگوں کی پشت پر افغانستان ہے۔ جو ایک لیٹے ہوئے چیتے کی طرح ہر وقت اپنی سبز آنکھیں ہندوستان کی طعمہ پر جمائے رہتا ہے۔ اور اِس افغانستان کی پشت پر نہیں بلکہ خاص کابل میں وہ آدمی موجود ہے۔ جو ریچھ کی طرح چلتا تھا جو ہاتھوں میں سونا سکہ اچھالتا ہے۔ اور اِس سرحد[1] کے اُس پار کے حملہ کی کامیابیوں کا ہر وقت ذکر ورد زبان رکھتا ہے۔ جو اسلام کا جھنڈا مضبوط مسلماناں پنجاب میں لے کر گذرے گا۔ اور مسلمان سب اس کے ساتھ جمع ہو جائیں گے۔ جو جنوب کے مسلمانوں میں بھی جنبش پیدا کردیں گے۔ اور اِس طرح

---

[1] ہم میں سے کسی نے اِس بیان کو سن لیا ہے جو ہندو ہما سبھا اور خصوصاً لالہ لاجپت رائے سرحد پار کے مسلمانوں کا خطرہ کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ (مترجم)

دونوں طرف سے ایک دائمی طوفان کی طرح ہندوؤں کے سروں پر آ کر ل جائیں گے۔ یہاں (روس سے مراد ہے) سوال کرتا ہے۔ کہ کیوں نہیں بجائم اپنے باپ داداؤں سے کمزور ہو گئے ہو؟ اگر نہیں تو پھر تم میں کون سی روکاوٹ ہے۔ کیا انگریز تمہاری مزاحمت کرتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو سنو کہ میں شمال اور جنوب کے ہندوؤں کو انگریزوں کے خلاف کر کے تنگ کر دوں گا۔ اور دوسرے محاذ پر انہیں دق کر دوں گا۔ یہ انگریز تو پہلے ہی اپنے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر رہے ہیں کیونکہ ان کے اپنے ملک نے صلاح کار کمزوری کا اظہار کرتے جاتے ہیں۔ اور میں تمہاری پشت پر ہوں اس لوٹ مار اور اس کشت و خون کا خیال کرو جو تمہیں کرنی ہے۔ اپنا خانہ ٹھونک دو خوب مارو۔

چوبیسواں باب

امن سوز افعال

موٹے حساب سے اگرچھ کروڑ اچھوتوں کو ہندوؤں میں شمار کیا جاوے تو ہندو برطانوی ہندوستان کی کل آبادی کا تین چوتھائی ۳/۴ حصہ ہیں۔ اسی طرح موٹے حساب سے برطانوی ہندوستان کی ایک چوتھائی آبادی مسلمانوں اور ان دونوں قوموں کے مابین مفارقت کی اس قدر وسیع خلیج حائل

ہے کہ جس سے شورو شغب پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً فتنہ وفساد کے شعلے اور تباہ کرنے والی کوہ آتش فشاں نمودار ہو جاتی ہے یہ خلیج موجودہ ہندوستان کے (سیاسی) حالات میں ایک عظیم الشان عنصر ہے۔

اِس کے اجزا اِس عقدہ کے اہم حصے ہیں۔ جو ۱۸۵۸ء میں سلطنت کی عنان حکومت براہ راست شہنشاہ کے ہاتھ آ جانے سے رونما ہوا اور اگر ان حالات نے شاہی سلطنت کی پہلی نصف صدی میں زیادہ بری صورت اختیار نہیں کی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اِس عرصہ میں سلطنت کے انتظام اور عدالت گستری دونوں شعبوں کی باگ ڈور سول سروس کے انگریز افسروں کے ہاتھ میں رہی یہ افسر اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہندو مسلمانوں میں کوئی تفاوت نہیں کرتے اور اِن دونوں قوموں کے مفاد کا یکساں خیال رکھتے ہیں۔

اس سے انصاف سے متمتع ہونے اور ایک بیرونی طاقت کے جو نہ ہندوؤں کی مدِ مقابل تھی اور نہ مسلمانوں کے زیر تسلط ہونے کیوجہ سے فریقین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر حسد نہ کرتا تھا۔ اور نہ ہی مذہبی فرقہ بندی کے

ملے ہندوستان کی سلسلہ ۱۹۲۱ کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً سوا تین ملین سکھوں اور تقریباً ۱/۲ ملین جینیوں کے کہ جن دونوں فرقوں کے بہت سے افراد اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں بدھ مذہب کے لوگ جنکی تعداد ساڑھے گیارہ ملین ہے۔ زیادہ تر صوبہ برہما میں بستے ہیں۔ جو جزیرہ نما ہندوستان سے علیحدہ صوبہ ہے۔

اتنے سوالات پیدا ہوتے تھے۔

مگر ۱۹۰۹ء میں ایک طوفان خیز حلقہ سے آندھی کا جھونکا آیا یعنے پارلیمنٹ نے منٹو مارلے سکیم ہندوستانی کونسلوں کے ایکٹ کی صورت میں منظور کر لی۔ اس کارروائی کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے خیالات فوراً مشتعل ہو گئے اور انہیں ہوش آ گیا اور ان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو گیا۔ کہ ان میں نہ تو کوئی تنظیم ہے اور نہ ہی اُن کے حقوق ہی محفوظ ہیں۔ کیونکہ ان کو صاف طور پر نظر آنے لگا کہ ہر ایک منتخب شدہ قانونی مجلس سے ہندو انہیں نکال باہر پھینکیں گے۔ اور خود ہی ان مجالس سے ہر ایک فایدہ اٹھا لیں گے۔

اب اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ یہ صورت حالات کس طرح ظہور پذیر ہوئے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اسلام پہلے پہل ہندوستانیوں میں فاتح حکمرانوں کے مذہب کی شکل میں آیا۔ جن کی حکومت پورے پانچ سو سال تک اس ملک کے بہت سے حصوں پر مستولی رہی اس زمانے میں عدالتی زبان فارسی رہی بلکہ ملک کے تمام ادب اور شاعری کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اور قانون بھی اس زبان میں وضع کئے جاتے تھے مگر مسلمان زیادہ تر قرآن حفظ کرتے یا فارسی اشعار پڑھ لینے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ اور اس قدر سہل انگار ہوتے تھے۔ کہ ان کی جگہ اگر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام کر دیتا تو یہ خود نہ تو قلم اٹھاتے اور نہ ہی کتاب کے مطالعہ کی محنت گوارا

کرتے۔ لہٰذا جب کوئی ذہین اور ہوشیار برہمن فارسی زبان میں اِس قدر کافی دسترس حاصل کر لیتا کہ اِس کے آقا کو اِس کے متعلق کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ تو اُسے سرکاری ملازمت میں ایک معقول عہدہ مل جاتا۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ صدیوں تک برہمن ہی تحریر وغیرہ کا زیادہ کام کرتے رہے۔ اور مسلمان ملک پر حکومت کرتے رہے۔

اسلام کے ہندوستان میں برسرِ اقتدار رہنے اور تاج برطانیہ کے عنانِ حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لینے کے درمیانی عرصہ کی تاریخ کا خاکہ اس کتاب کے پہلے صفحات میں پورے طور پر دیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کی حکومت براہ راست ملک معظم کے ہاتھوں میں جانے سے اکیس سال پہلے یعنی اِس زمانہ میں جب کہ ملک کی حکومت ابھی تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بیج بویا گیا۔ جس کا خمیازہ ہم آج بھگت رہے ہیں یعنے انصاف کی عدالتوں کی زبان فارسی سے انگریزی میں کر دی گئی۔

زبان کی تبدیلی کی منطق یہ تھی کہ ہندوستانی تعلیم کو مغربی رنگ دینا تھا۔ یہ ایک سادی سی بات تھی۔ اور اِس کے نتائج بھی اسی طرح سادے اور صاف ظاہر ہوتے تھے جس طرح ایک کلہاڑی کی ایک سادہ ضرب اور جس کی کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے

اِس طرح تشریح[1] کی ہے

"۱۸۳۵ء کے ایکٹ اور ۱۸۴۴ء کے ریزولیوشن کا جن کے
رو سے سرکاری عہدے اِن ہندوستانیوں کو دیئے جانے
کی تجویز تھی۔ کہ جنہوں نے مغربی تعلیم حاصل کر لی ہے) اس کا اثر
ہندو "بھدرا لوک"[2] پر جن کو چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدے
دیئے جاتے تھے۔ فیصلہ کن ہونا ضروری تھا۔ یہ لوگ عرصہ
دراز سے ایک غیر ملکی زبان یعنی فارسی پڑھنے کے عادی ہو
گئے ہوئے تھے۔ کہ اس تعلیم کی شرط پر انہیں سرکاری ملازمت
ملتی تھی۔ مگر اب انہوں نے اس کی بجائے۔ انگریزی پڑھنی
شروع کر دی۔ اور یہ صرف ہندو ہی تھے۔ جنہوں نے انگریزی
زبان کی تعلیم میں زیادہ حصہ لے کر اس نئے مواقع سے
زیادہ فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں نے اِس تبدیلی زبان کے خلاف
صدائے احتجاج بلند کی جو اُن کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی
کیونکہ یہ اب تک فارسی زبان کی ہی تعلیم سے بہت کچھ فائدہ
اٹھاتے چلے آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی تعلیم کو
ترک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اِن کے لئے فارسی
زبان تہذیب سکھانے اور تربیت کرنے والی زبان تھی۔ لہذا
اِس کے ساتھ ہی انگریزی تعلیم کو حاصل کرنا انہیں بوجھ معلوم
ہوا۔ مزید برآں مشنریوں کی کوششوں کو دیکھ کر اِن کے دلوں

۱؎ رپورٹ کی جلد اول حصہ اول صفحات ۳۷-۳۸
۲؎ پیشہ ور لوگ

میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزی زبان میں عیسائیت کی تعلیم شامل ہے۔ لہذا یہ ہندوؤں کی طرح اپنے بچوں کو عیسائی مشنروں کے اثر میں دینے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ الغرض اُن کا مذہبی جوش اور قومی وقار اور تمکنت میں ایسی بغاوت رونما ہوئی۔ کہ انھوں نے انگریزی پڑھنے کی تحریک سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ مسلمان ہمیشہ ایک پکا موحد ہوتا ہے اُس کا ایمان ہوتا ہے کہ خدا کی ذات واحد ہے اسکی مسجد میں کبھی بت نہیں رکھا جاتا اس کی روزانہ نماز صرف براہ راست نظر نہ آنے والے قادر مطلق کے سامنے ہی ادا ہوتی ہے گو اس کی نظروں میں مذہب عیسوی کی عزت اس کے آسمانی مذہب ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور مسیح کی عزت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ ایک برگزیدہ نبی ہو کر آئے تھے تاہم تثلیث کا مسلہ اِن کی نظروں میں بالکل ایک ناممکن کفر و الحاد ہے۔ اِس کے ایمان سے بڑھ کر اس کی نظروں میں کوئی پیاری چیز نہیں۔ اور حتی الوسع انگریزی زبان سیکھنا ایک غیر مصفا عقیدہ سیکھنے کا ذریعہ ہے۔

اِن صورت حالات کو پیش نظر رکھکر مسلمان انگریزی پڑھنے سے نفرت کرتے رہے اور انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اِس کے نتیجے کیسے بُرے نکلیں گے۔

جتنا عرصہ شہروں میں اور مضافات میں حکومت انگریزی مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی تو کوئی جھگڑا فساد پیدا

نہیں ہوا۔ مگر اصلاحات منٹو مارلے سے ان پر ایک ایسی ضرب کاری لگی۔ کہ پردہ اٹھ گیا اور مسلمان لیڈر اپنی زنگ آلود تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھے خواب پریشان دیکھتے ہوئے اور نیند بھری آنکھوں کو ملتے ہوئے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس طرح مسلمان اس مشکل میں مبتلا ہو کر سیاسی دوڑ میں پس افتادہ رہ گئے ہوئے پھر میدان میں نکل آئے تاہم اس وسیع ملک میں اور خصوصاً دیہات اور قصبہ جات میں ان کی اس بیداری کی خبر مشکل سے پہونچی کیونکہ وہاں کا نظم ونسق انگریز افسران کے ہی ماتحت تھا۔ جو ہندو مسلمان دونوں کو یکساں نظر سے دیکھتے ہوئے انصاف کرتے تھے۔ اور جہاں ہندو مسلمان اسی وجہ سے امن وامان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء آگیا جب کہ سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کی توسیع کا زمانہ تھا۔ جبکہ بہت سے اختیارات اور بہت سے مقتدر عہدے ۔۔۔ انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آگئے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی امید دلائی گئی۔ کہ تیسرے دسویں سال کے گذر جانے پر اس میں اور بھی بہت کچھ توسیع کی جائے گی۔

اس زمانے سے سوائے ان دیہاتی حلقہ جات کے جن میں شورش بپا کرنے والے نہ پہونچ سکے تھے ان دو قوموں میں آشتی امن اور صلح صرف اسی قدر رہ گئے

تھا۔ انگریزوں کی موجودگی برائے نام طور پر قائم رکھ سکتی
تھی۔ اب چونکہ ۱۹۲۵ء کا سال قریب آ رہا ہے۔ ان
دونوں قوموں[1] کا فساد ترقی کر رہا ہے۔ یہ دونوں حریف
قومیں ایک دوسرے سے [illegible] جھگڑ رہی ہیں۔ مارا ماری
پھر بھی اور [illegible] نہ کسی چیز پر ہے کس کا دانت
پڑتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد کی سیاسی شورش میں
تھوڑے سے وقت کے لئے اس زمانے کے لیڈروں نے
باہمی اتفاق کا ایک سوانگ بھر کر دکھایا۔ مسٹر گاندھی نے
خلافت کے مسئلہ کی تائید کی اور اس شورش میں حصہ لیا
تھا جو اُن خوشنما [illegible] علی برادران نے بپا کی تھی۔ اس تائید
سے مسٹر گاندھی کا مطلب صرف یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو ساتھ
ملا کر انگریزوں کے نظم و نسق میں رخنہ اندازی کی جائے۔ مگر
خلافت کی تحریک کا جلد ہی خاتمہ ہو گیا۔ اور گاندھی اور علی
کے اتفاق کا پول صرف مندرجہ ذیل ایک مثال سے کھل جاتا
ہے۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس اتفاق میں کس حد تک
برادرانہ سچائی تھی۔

---

[1] ممکن ہے کہ اصلاحات بھی ایک حد تک ان دونوں بڑی قوموں کی رقابت کا باعث
ہوں لیکن اس سے بھی اہم وجہ سرکاری عہدے اور آسامیاں ہیں جن پر ہندو بوجہ تعلیم یافتہ
ہونے اور میدان میں موجود ہونے کے بہت کچھ قابض ہیں۔ اور مسلمانوں کو بعد میں ہوش
آئی ہے۔ اور وہ بھی اس کے متمنی ہونے لگے ہیں۔ اور جیسا کہ دستور ہے ہاتھ
میں آئی ہوئی چیز کا ہندوؤں کو چھوڑنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ دوسری وجہ شدھی و
تبلیغ کا کام ہے۔ کہ جسے ہندو مہاسبھا کی قیام اور جد و جہد اور فرقہ دار اخبارات کی بیجا طرف
داری نے بہت بڑھا دیا۔

ساحل مالابار کے اوپر نیچے ہوئے پہاڑوں میں تقریباً بیس لاکھ ہندو وحشی آبادی میں ایک قوم آباد ہے جسے موپلا کہتے ہیں۔ یہ لوگ پرانے زمانے کے عرب تاجروں اور ہندوستان کی مخلوط النسل اولاد ہیں۔ موپلے جن کی اپنی تعداد تقریباً دس لاکھ کی ہے حیرت انگیز صاف ستھرے اور نہایت اچھی طرح رکھے ہوئے گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کے کھردرے چہروں سے اکثر ذہانت ٹپکتی ہے اور ان کی نسبت میرا اپنا تجربہ ہے کہ یہ دلچسپ در مائل بہ دوستی ابتدائی زمانہ کے لوگ ہیں۔

یہ لوگ سرگرم اور جوشیلے مسلمان ہیں جن سے ہمیشہ مذہبی جذبات پھوٹ کر نکلتے رہے ہیں۔ اور ان کی ایک مذہبی خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ پہلے اپنے ہاتھ سے بہت سے کافروں کو مار گرانے کے بعد اگر کوئی انہیں گولی یا چھری سے ہلاک کرے تو وہ سیدھے بہشت روانہ ہو جائیں۔

۱۹۲۱ء کی شورش کے زمانے میں ان سادہ لوح لوگوں کے پاس مندرجہ بالا قسم کے سیاسی اتحاد کی ایک سفارت اس قسم کے عقائد کا خاص طور پر وعظ کرنے کے لئے بھیجی گئی جنہوں نے جا کر یہ تلقین شروع کی کہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کے مقدس مقامات پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اور یہ شیطانی گورنمنٹ اسلام کی دشمن ہے۔ اسے فی الفور ہندوستان سے باہر نکال دینا چاہیئے۔ تاکہ ملک میں فی الفور سوراج قائم ہو جائے۔

یہ ایک آگ لگا دینے والا پیغام ایک مسجد سے دوسری مسجد

تک ایک آبادی سے دوسری آبادی تک اور ایک ناریل کے درختوں کے جھنڈ سے دوسرے جھنڈ تک پہونچا دیا گیا۔ جس کا مطلب سادہ لوح موپلوں نے ایک فلسفہ دان کی طرح تو اس کم بخت زمانہ میں کیا سمجھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں بچارے لاکھوں ہندوؤں کی شامت آگئی اور ان کے خلاف ایک عام لڑائی چھڑ گئی۔ مگر مسٹر گاندھی سے یہ ایک غلطی ضرور ہوئی خواہ مذاق پسند علی برادران اپنے دلوں میں اس کے کچھ ہی معنے نکالتے ہوں" - کہ انہوں نے خیال نہیں کیا۔ موپلوں کے لئے سوراج سوائے ایک اسلامی سلطنت کے قیام کے اور کوئی معنے نہیں رکھتا تھا۔ جس میں اور چاہے کچھ ہو یا نہ ہو یہ ضرور ہو کر رہے گا۔ ایک مسلمان کبھی ہندو کو بہت پوچھتا ہوا دیکھکر زندہ نہ رہنے دے گا۔ پس موپلوں نے خفیہ طور پر جتنے ہتھیار (یعنے چاقو۔ نیزے۔ اور چھریاں) جمع کر سکتے تھے۔ کر لئے اور ۲۰ اگست ۱۹۲۱ء کو کھیل کھلنے سے پہلے ہی پہل انہوں نے گویا ان لوگوں کو خوش کرنے کے لئے جنہوں نے انہیں وعظ تلقین کے پیغام بھیجے تھے ایک انگریز پلانٹر (کاشتکار) کو قتل کر دیا۔ مگر فوراً بعد ہی ان کا جوش و خروش ایک فرقہ وارانہ لڑائی کی صورت اختیار کر گیا۔ انہوں نے سڑکیں روک دیں تاریں کاٹ دیں اور ضروری مقامات پر ریلوے کا سلسلہ توڑ کر ان پولیس کے تھانوں کی آمد و رفت منقطع کر دی جو پہاڑی علاقہ میں دور دور فاصلوں پر قایم تھے

الغرض انہوں نے نہایت سعید گی اور تدبیر کے ساتھ ایک
اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھکر اپنے من مانے سوراج کے
قایم کر لینے کا اعلان کر دیا۔ اِن کے ہندو ہمسایوں کی تعداد
گو اُن سے دو گنی (یعنے ایک کے مقابلہ میں دو) تھی مگر وہ اُن
سے ذرا عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ ہندو عورتوں کو جیسا کہ ایسے مواقع
پر قاعدہ ہے پہلے جبراً مسلمان کیا گیا۔ اور پھر ہو پلا گھرانوں میں
داخل کر لی گئیں بعض صورتوں میں ہندو مردوں کو اختیار دیا۔
گیا کہ یا تو وہ مذہب تبدیل کریں یا مرنے کے لئے تیار ہو جائیں
بعض صورتوں میں زندوں کی کھال ادھیڑ دی گئی۔ اور بعض
میں انہیں یک لخت مار دیا گیا۔ صرف ایک ضلع یعنے تعلقہ ارناڈ
میں نو سو سے زیادہ ہندوؤں کو مسلمان کر لیا گیا اور یہی حالت
پہاڑی ڈھلوانوں میں رہنے والے باشندوں کی کی گئی

جتنی جلدی کہ ممکن ہو سکا اس علاقہ میں پلٹنیں اور فوج
پہونچائی گئی جن کی چھ ماہ کی لگاتار اور ان تھک کوششوں سے
یہ شورش اس وقت رفع ہوئی۔ جب کہ قریباً تین ہزار مو پلا
اور اُن کے مقابلہ میں بے شمار ہندو مارے جا چکے اور بہت سی
جائداد کا نقصان ہو چکا بہت سے خاندان برباد و تباہ ہو چکے۔
اور بے شمار آدمی کیفر کردار کو پہونچنے کے لئے گرفتار
ہو چکے تھے +

اِس عرصہ میں مصیبت زدہ ہندو مرد (جو مسلمان بنائے
گئے تھے ملک کے مختلف حصوں میں آوارہ پھرتے ہوئے

اپنی حالت سے اپنے مذہبی بھائیوں کو عبرت دلاتے رہے گورنمنٹ اضلاع متحدہ (امریکہ) کا ایک ایجنٹ جو تبلیغ عیسائیت یا [illegible] کے لئے ان دنوں اتفاق سے الہ آباد میں آیا ہوا تھا۔ حسب ذیل بیان کرتا ہے۔

میں نے انہیں مدراس پریزیڈنسی کے جنوبی اور مشرقی حصص کے مواضعات میں پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کا نہایت دردناک طریقہ سے ختنہ کیا گیا تھا اور اب بہت سی صورتوں میں انکے خون میں زہر سرایت کر چکا تھا یہ لوگ اپنی مصیبتوں سے فریاد کرتے ہوئے اپنے تمام دیوتاؤں کو پکار پکار کر سوراج کو صلواتیں سناتے تھے۔ اور انگریزوں کے اس ملک میں ہمیشہ رہنے کی دعائیں مانگتے تھے۔" یہ لوگ کہتے تھے کہ ہمارا دھرم بھرشٹ ہو گیا ہم ذات برادری سے خارج ہو گئے اور یہ تمام مصائب ہم پر صرف اس لئے ٹوٹ پڑے ہیں کہ ہمارے پاس سانپ سوراج کا زہر لیکر آ گئے اگر انگریز ہندوستان سے چلے گئے۔ تو جو شرمناک حالت ہماری ہوئی ہے وہی تمام ہندو زن و مرد کی ہوگی۔

ان لوگوں پر دوزخ کے عذاب نازل تھے۔ اور ان پروہت لوگوں سے تقاضا کرتے تھے کہ وہ نہیں کم سے کم پچاس پچاس روپیہ دان کریں تاکہ وہ انہیں مذہبی رسومات ادا کر کے پھر پوتر کر سکیں اس رسم میں ان لوگوں کے پوتر کرنے کی خاطر ان کی آنکھوں کانوں اور منہ نیز ناک میں گائے کا تازہ گوبر بھرنا پڑتا

ہے۔ اور پھر اِس گوبر کو گائے کے پیشاب سے دھویا جاتا جس کے بعد گھی دودھ دہی انہیں اعضا میں داخل کرتے تھے گو ان چیزوں کا استعمال ایک آسان کام معلوم ہوتا ہے پوتر کرنے کی اِس رسم کو صرف برہمن ہی مذہبی منتر اور شلوک پڑھنے کے ساتھ ساتھ ادا کر سکتے تھے۔ اور جو نرخ برہمنوں نے اِس خدمت کا لیا تھا۔ وہ بہت سے محتاج لوگوں کے لیے نہایت گراں تھا۔ چنانچہ لوگوں کی اِس سخت مصیبت کو دیکھکر دو ایک دفعہ انگریز افسروں نے اس مذہبی رسم میں اس قدر دخل دیا۔ کہ ان برہمن لوگوں کو ترغیب دی۔ چونکہ ہندوؤں کی بہت سی تعداد پوتر ہونے والی ہے لہذا برہمنوں کو چاہیئے کہ اِس رسم کو پورا کرنے کے لئے وہ اتنی رعایت کریں کہ ہر شخص سے بارہ روپے چارج کریں +

میں نے متذکرہ بالا بیان کے آخری حصہ کی خود تصدیق نہیں کی مگر مجھے اطلاع دینے والا ایسا ثقہ اور محتاط آدمی تھا اور وہ خود موقعہ پر موجود تھا۔ اسکی پوری تصدیق کے بعد اس بیان میں کوئی شبہ نہیں رہتا + اس شورش میں اگر کوئی بات خصوصیت سے اسلام کیساتھ تعلق رکھتی تھی تو وہ جبراً لوگوں کو مسلمان بنانیکی تھی۔ بجائے اِس کے کہ وہ لوگ بے تمیز قتل عام اور دہشت ظاہر کرتے۔ موپلوں کی اِس شورش سے چھ ماہ سے کم عرصہ پہلے صوبجات متحدہ میں "چورا چوری" کا حادثہ واقع ہوا تھا جو مالابار سے بہت دور فاصلے پر واقع ہے۔

یہاں کچھ عرصہ گذرا ہے کہ ایک جماعت نیشنل والنیٹر کے نام سے مرتب کی گئی تھی - اِن والنیٹروں میں جو لوگ شامل تھے۔ اُن کو انڈین نیشنل کانگریس کے فیصلہ جات پر عمل درآمد کرانے کے لئے کم وبیش تنخواہیں ملتی تھیں - یہ کانگریس خالصتہً ایک سیاسی انجمن ہے جو ان دنوں مسٹر گاندھی کے ماتحت تھی۔

۴ فروری ۱۹۲۱ء کو ان نیشنل والنیٹروں کی ایک جماعت نے جس کے ساتھ ایسے لوگ شامل ہو گئے تھے جنہیں ان کے گورنمنٹ کے خلاف شورش نے جوش دلایا تھا - اور انہوں نے چورا چوری کے تھانہ پر اُس وقت حملہ کر دیا تھا - جب کہ اِس میں صرف اکیس پولیس کنسٹیبل اور گاؤں کے چوکی دار یعنے دیہاتی امن و امان کو قائم رکھنے کے محافظ تھے - اِن حملہ آوروں کی جماعت نے جس میں عام لوگ اور والنیٹروں کی تعداد تین ہزار آدمیوں کے قریب تھی - تھانے کو گھیر لیا - اور چند آدمیوں کو گولی سے مار دیا باقیوں کو زخمی کر دیا اور پھر اِن زخمیوں کا ایک ڈھیر لگا کر ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور سب کو زندہ جلا دیا۔

یہ فعل ہندوؤں کا تھا جو کہ ہندوؤں کے ساتھ کیا گیا۔

اِس کے بعد پنجاب میں ۱۹۱۹ء کی شورش کے دوران میں گورنمنٹ کے مخالفین نے انگریز عورتوں کو بے حرمت کرنے کا ایک خاص پراپیگنڈا کیا۔

اور اِس کے پبلک اعلان نے شارع عام میں مندرجہ ذیل مضامین کے پوسٹر چسپاں کرنے کا طریقہ رائج کر دیا۔

"مہاتما گاندھی کی جے! ہم بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔......
مہاتما جی ہم ہندوستانی آپ کے لئے اخیر دم تک لڑیں گے
اور آپ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہاں بہت سی لیڈیاں
ایسی ہیں جن کو بے حرمت کرنا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ تمام ہند
کا دورہ کریں اور اس ملک کو ان لیڈیوں سے پاک و صاف
کریں۔ وغیرہ وغیرہ"
ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ یہ سلوک کرنا چاہتے تھے۔
ایسے اشتہارات کا یہ لوگ نہ تمثیلی اور نہ ہی دوسرا مطلب سمجھے
اگر ان لوگوں کو کوئی ناشائستہ حرکت کرنے کا موقع دیا جاتا
اور اگر اس وقت پنجاب کی عنان حکومت کسی کمزور آدمی کے ہاتھ
میں ہوتی، تو ہندوستان کی تاریخ میں ایک ناقابل برداشت صفحہ
لکھا جا چکتا۔

اور اگر ان تین مندرجہ بالا مثالوں کے ساتھ جو بیسیوں درد
ناک ہمسرانہ واقعات سے اخذ کی گئی ہیں۔ اسی قسم کی اور
بعض کمینہ حرکات کا بھی ذکر کیا جائے۔ جو ہندوستانیوں سے
سرزد ہوئی ہیں تو یہ اس غرض سے نہیں کیا جائے گا۔ کہ
عام ہندوستانیوں کو شرم دلائی جائے۔ بلکہ اس سے ان
سیاستدان لیڈروں کی حرکات کا اظہار مقصود ہوگا۔ جو
اُن سے اس پرآشوب زمانہ میں عوام الناس کے شورش
برپا کرنے سے سرزد ہوئیں۔

مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی باہمی کشیدگی نہیں ہے اور یہ دونوں قومیں ہمسایوں کی طرح امن وامان سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ جب تک کہ کوئی باہر کا سیاسی ایجنٹ ان کے امن میں خلل انداز نہ ہو۔

اس کے برعکس مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً ۱۹۲۴ء میں دہلی کے قریب ضلع بلند شہر میں دریائے گنگا کی سخت طغیانی سے مصیبت پیش آئی۔ یہ ایک نہایت تباہ کن طغیانی تھی جو اس ضلع کے تمام مواضعات کے باشندوں یعنے انسانوں اور حیوانوں کو بہا لے گئی۔ چند ہندو ملاحوں اور کشتی بانوں نے جن کے پاس اپنی کشتیاں تھیں کئی ڈوبتے لوگوں کو بچایا تھا۔ مگر ان ہندو ملاحوں نے ایک بھی ڈوبتے ہوئے مسلمان کو پانی سے نہ نکالا۔

برخلاف اس کے مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے ایک دیہاتی تبلیغی سکول میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جو مسلمانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کی خاطر جاری کیا ہوا تھا۔ مگر زیادہ تر ہندو ہمسایوں کے چندوں پر چل رہا تھا۔ یہ سکول بنگال کے ضلع ندیا میں قائم تھا جہاں دونوں قوموں کے دیہاتیوں میں بظاہر کوئی دشمنی معلوم نہیں دیتی تھی۔ اور جہاں ایک نہایت ہوشیار ڈپٹی کمشنر ان لوگوں کا سچا خیرخواہ اور ہر بات میں انہیں نیک صلاح ومشورہ دینے والا موجود تھا۔

ایک اور قابل ذکر بات شہر لکھنؤ کے ایک پارک کی سادہ تاریخ ہے۔ جب کہ اس پارک بنانے کے لئے زمین پیمائش کی گئی۔ تو معلوم ہوا کہ اس رقبہ میں ایک چھوٹا سا ہندو مندر بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ انگریز افسروں نے اپنی قدیم روایات اور عادات کے مطابق اس مندر کی عمارت کو اسی طرح چھوڑ دیا۔ جس طرح کہ وہ بنی ہوئی تھی

اس شہر کے مسلمان حکام کے پاس یہ درخواست لے کر پہونچے کہ اس شاندار پارک میں مسلمانوں کی بھی نماز پڑھنے کے لئے ضرور کوئی جگہ ملنی چاہیئے۔

چنانچہ وہاں کی میونسپلٹی نے پارک کے دوسرے کونے پر مسلمانوں کی عبادت گاہ بنانے کے لئے بھی تھوڑی سی کھلی زمین کا بندوبست کر دیا۔ اور اس طرح ہندو اپنے مندر میں اور مسلمان اس کھلی زمین پر اپنی اپنی عبادت پورے آٹھ سال تک امن وامان اور چین کے ساتھ کرتے رہے۔

اس زمانہ میں "اصلاحات" کا دور دورہ آ گیا۔ جس کے ساتھ ہی "اصلاحات" کے نتائج بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے پہلے ہی دن ہندو اور مسلمانوں میں کشیدگی ہو گئی جو دن بدن ترقی کرتی گئی۔

لکھنؤ زیادہ تر مسلمانوں کا شہر ہے۔

تمام بڑے بڑے لوگ تمام قدیم خاندان تمام بڑی بڑی

عمارات و یادگاریں اودھ کی مسلمان سلطنت کا بقیہ ہیں - لہذا مسلمانوں کا یہ خیال ہے - کہ اگر ہندوستان کی سلطنت پھر ہندوستانی ہاتھوں میں واپس آنے والی ہے تو لکھنؤ کا شہر ان کو واپس ملنا ضروری ہے۔

لکھنؤ کی تمام تاریخ وان اور تمام امرا مسلمان ہیں تاہم وہاں کی ہندو آبادی ان سے تین گنا زیادہ ہے - اس واسطے ہندوؤں کو بھی آیندہ زمانہ کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے سے یہ سوال کرنے شروع کر دیئے -

اگر ہندوستان کو واقعی سوراجیہ ملنے والا ہے تو ہم لکھنؤ کے ہندو کہاں جائیں گے!

کیا ہمیں مسلمانوں کے زیر حکومت رہنا پڑے گا - اگر یہ بات ہے تو ہمارا مر جانا بہتر ہے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ ہندو مجتمع ہونے شروع ہو گئے اور انہوں نے اپنا دکھڑا رونے کے لیئے ایک مجلس منعقد کی اور خاص طور پر سورج غروب ہوتے جبکہ مسلمانوں کی شام کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے اس مسجد میں عبادت کرنے جمع ہو جاتے ہیں یہاں گذشتہ آٹھ سال سے سورج غروب ہونے سے پانچ منٹ پہلے نماز کے لیئے صفیں بچھ جایا کرتی تھیں اور مسلمان ایک جماعت میں کھڑے ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے خدا کے آگے سجدہ کیا کرتے تھے - اعتراض ہونے شروع ہوئے - آخر

اس میں ہندوؤں کی طرف سے روکاوٹیں ڈالی جانی لگیں جنہیں برداشت کرنے کے لئے مسلمان تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے اعلان کردیا کہ ہندوؤں سے کہہ دیا جائے۔ کہ وہ اب سے مندر میں جمع ہونے کا ایسا وقت مقرر کرلیں کہ جو مسلمانوں کی شام کی نماز کے وقت سے ذرا آگے یا پیچھے ہو۔

مگر ہندو مسلمانوں کے اس فتویٰ کو کب ماننے والے تھے انہوں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کردی جس پر مسلمان بھی بگڑ گئے اور جھگڑے کی آگ میں سے شعلے نکلنے شروع ہوگئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے بڑے بڑے جتھے پارک میں ایک ہی وقت میں جمع ہوگئے۔ جو اس بات پر تلے ہوئے تھے۔ کہ لڑائی کرکے اس معاملہ کا آخری فیصلہ کرلیں چنانچہ لڑائی شروع ہوگئی۔ جس میں مسلمان زیادہ ماہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے تمام ہندوؤں کو بھگا کر فی الفور میدان صاف کرالیا۔ اور قریب تھا کہ اس جھگڑنے والے مندر کا ہی صفایا کردیں کہ پولیس کی ایک گارد اور گورہ فوج موقع پر پہنچ گئی۔ جس کی وجہ سے مندر بچ گیا۔

اس طرح یہ خاص واقع تو گذر گیا۔ اور لڑنے والے ہندو جو میدان چھوڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ گئے تھے۔ پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ اور ان کے دلوں میں سخت ولولے اٹھ رہے تھے اور خطرناک جوش پیدا ہو رہے تھے۔ اور مسلمانوں کے

دلوں کی بھڑاس پورے طور پر نہ نکلی تھی لہٰذا دونوں فریق
ایک دوسرے کو خون آشام نگاہوں سے دیکھتے تھے اور جب کبھی
کوئی ہندو یا مسلمان اکیلا دکیلا مل جاتا تو ان دونوں کے
جوش سے بھرے ہوئے جتھے ایک دوسرے فریق کے آدمیوں
پر پل پڑتے اور اس کی خوب مرمت کر دیتے الغرض امن
و امان قائم کرنے کی خاطر یہ ضروری معلوم ہوا کہ گورہ فوج
دو تین دن تک شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتی
رہے۔

اب انگریز ڈسٹرکٹ کمشنر (شہروں اور دیہاتوں[1] میں اپنے
اپنے کمشنر ہوتے ہیں) کی اس معاملہ میں مداخلت ہو گئی۔ کیونکہ
اس فساد سے شہر تباہ ہوا جاتا تھا تجارت کو نقصان پہونچ رہا
تھا چھوٹی چھوٹی دکانوں کا کاروبار بند ہو چلا تھا۔ ہندو مسلمانوں
کو اور مسلمان ہندوؤں کو بائیکاٹ کر رہے تھے نئے فساد اور
جدید جھگڑے کے برپا ہونے کا سخت اندیشہ تھا۔

چنانچہ کمشنر صاحب نے دونوں قوموں کے لیڈروں کو اپنی
کوٹھی پر (جس کے سوائے اور کہیں یہ لوگ امن و امان سے
اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے) مدعو کیا تاکہ اس معاملہ کی نسبت بات
و چیت کر کے غور کریں۔ یہ لوگ وہاں پہونچے اکٹھے بیٹھے اور
پھر دیر تک اس معاملہ کی نسبت بے شمار باتیں کرتے رہے
اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی ہٹ سے باز نہیں آیا

---

[1] اصل کتاب میں یہ لفظ غلطی سے لکھا گیا ہے۔ دیہات میں کب کمشنر ہوتے ہیں۔

اور اپنی اپنی ہٹ پر اڑے اور جمے رہے۔

ہندو اِس بات پر زور دیتے تھے کہ وہ ضروری طور پر سورج غروب ہونے سے پانچ منٹ پہلے اپنے مندر میں ناقوس اور نوبت بجائیں گے۔ اور مسلمان اِس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ہم یقیناً اپنی نماز سورج غروب ہونے سے پانچ منٹ پہلے[؎] شروع کر دیں گے۔ اور کوئی ہندو اس میں مزاحم ہونے کا مجاز نہیں ہوگا۔

آخر کار کمشنر صاحب ہی آڑے آئے۔ اور انہوں نے ہندوؤں سے پانچ منٹ کی رعایت لی اور اِس طرح مسلمانوں نے بھی پانچ منٹ کی رعایت دینی منظور کر لی اور ہندوؤں نے صاحب موصوف سے وعدہ کیا کہ سورج غروب ہونے سے ٹھیک دس منٹ کے اندر وہ اپنے مندر میں کسی قسم کا باجہ نہیں بجائیں گے۔ اور مسلمانوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ خاموشی سے جیسے منٹ پر گھڑی کی سوئی آتے ہی اپنی نماز پوری کر لیا کریں گے کیونکہ کمشنر صاحب کی کوٹھی کے گول کمرہ میں یہ کانفرنس ہوئی اِس میں یہ صاف ہو گیا۔ کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی عبادت پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر انہیں اِس شور و غل پر اعتراض ہے جو عبادت کے وقت ناقوس اور نوبت بجا کر پیدا کرتے ہیں چنانچہ متحدہ کانفرنسیں کمشنر صاحب کے ملاقات کے کمرے میں کُل پندرہ گھنٹوں تک ہوتی رہیں۔ اور مندروں میں گھنٹے کے

؎ یہاں پہلے کی بجائے بعد لفظ چاہیئے

تک ہوتی رہی اور بند رہو ہیں گھنٹے کے ختم ہوتے ہی کھانے
کا وقت ہو جانے کی وجہ سے کمشنر صاحب کے حال میں کھانے کی
گھنٹی سنائی دی ایک ہندو بلند آواز سے بول اٹھا!

بس بس ہمارے مندر کی گھنٹی کی آواز بھی اس سے اونچی
نہیں نکلا کرے گی۔ اس کے جواب میں کمشنر صاحب نے جلدی
سے کہا۔

"اگر تم اسی طرح ہلکے سُروں میں مندر کی گھنٹی بجاؤ گے تو
پھر کوئی فساد نہیں ہوگا۔"

چنانچہ آج تک لکھنؤ کے ہندوؤں کے اس مندر میں کمشنر
صاحب کی کھانے کی گھنٹی کی تقلید ہوتی ہے۔

باوجود اس کے باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔ مگر اب بھی وہ تجربہ کار
افسر غافل نہیں ہوتا۔

پچیسویں فصل

آل رسول

دسمبر سنہ ۱۹۱۶ میں ایک پولیٹیکل جماعت جس کو آل انڈیا مسلم لیگ
کہتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس سے ساتھ جس کا ذکر اوپر آ چکا
ہے مل گئی۔ اور ہندو مسلم فوائد یکجائی کا اعلان کرکے سوراج کے
کے لئے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ تمنا کو پیش کرنے کی ٹھان لی۔

مویلوں نے ہنوز کھلم کھلا بغاوت کا اظہار نہیں کیا تھا مگر ان دونوں جماعتوں کے مشترک طرزِ عمل نے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لئے خوف کردیا۔ بلکہ ۱۹۱۷ء کے ترمیم عزائم میں جب مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے دہلی میں اپنی مجوزہ اصلاحات کے مسئلہ کے متعلق ہندوستانی سیاسی جماعتوں سے اُن کے خیالات کو معلوم کرنا چاہا۔ تو سینکڑوں مجلسوں کے نمایندے پیش ہوئے جنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے طریقِ عمل پر یا تو افسوس کا اظہار کیا .... صوبہ یو پی کی مسلم ڈیفنس ایسوسی ایشن نے کہا ...... حکومت خود اختیاری کے متعلق کوئی وسیع تجویز جو برٹش حکومت کے معتدل۔ اور ٹھیک ٹھاک کرنے والے اقتدار کو ختم کردے تباہی و بربادی کا موجب ہوگی۔

بنگال کی انڈین مسلم ایسوسی ایشن نے اپنے ایڈریس میں کہا ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت کی موجودگی میں اُن کے مذہبی احکامات اور ذات پات کی تفریق اُن کی مختلف مجالس اور متصادم فوائد کے اختلافات جو انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اُن کے باہمی برتاؤ اور تعلقات کا عکس احتیاط اور حزم سے دیکھنے والا کوئی شخص نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے فریب کارانہ اتحاد سے دھوکہ نہیں کھا سکتا۔

انڈین مسلم ایسوسی ایشن ..... اس سے متفق نہیں کہ کوئی فوری تغیرات جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دوام اور مضبوطی کو کمزور کرنے والے ہوں عمل میں لائے جائیں۔ کیونکہ

حکومت کی وسیع بنیادوں پر ہماری سیاسی اور انتظامی ترقی کی تمام امیدیں مبنی ہیں

صوبہ بہار اور اڑیسہ کی مجلس محافظ فوائد اسلامی نے بیان کیا کہ ہم اس ناعاقبت اندیشی پر جو ہمارے ہم مذہب لوگوں نے کانگریس کے خیالات اور مطالبات کو اپنی خیالات اور مطالبات کی صورت میں ظاہر کی ہے جس قدر افسوس کا اظہار کریں کم ہے۔ ابھی سے بعض حلقوں میں مسلمانوں پر جبر کرنے اور ڈرانے اور اُن کے مفاد کو پائمال کرنے کی طرف سخت رجحان نظر آرہا ہے۔ انگریزی حکومت کا طریق عمل اب تک یہ رہا کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور قومیتوں کے آباد ہونیکے باوجود سلطنت ہندوستان کے معاملات انتظام ہمیشہ غیر طرفدارانہ طرز سے چلایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔

جنوبی ہندوستان کی اسلامیہ لیگ نے یہ دلیل پیش کی جس میں مسٹر مانٹیگو کو یاد دلایا گیا کہ احاطہ مدراس میں بحیثیت ایک قلیل التعداد جماعت ہونے کے وہ انگریزی حکومت کی قدر کو پہچانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کس طرح سے اس ملک کی مختلف جماعتوں میں اس حکومت کی طرف سے عدل و انصاف قائم رکھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور سیاسی ردّ و بدل کی ہر ایسی تجویز کے مخالف ہیں۔ جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کمزور کرنے کا موجب ہو بلکہ ہم سیاسی اقتدار نشو و نما کی تدریجی ترقی کے پورے طور پر حامی ہیں۔

مسٹر پیپٹ مسلم انجمن نے جو مدارس کی ایک تعلیمی مسلمان انجمن ہے۔ مسٹر مانٹیگو سے عرض کی کہ وہ ابھی انتظامی اصلاحات کا دینا معرض التوا میں ڈال دیں اس لیئے کہ صرف انگریز مختلف جماعتوں میں عدل وانصاف کے ترازو سے ٹھیک طرح پر کام لیتے ہیں۔ کبھی ہمارے فوائد دوسری اقوام کے فوائد سے ٹکراتے ہیں۔ تو ہم لوگ انگریزی حکام سے انصاف اور عدل کی امید رکھتے ہیں۔ جو کچھ بھی اصلاحات نافذ ہیں۔ ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ کوئی ایسی بات نہ کیجائے گی جس سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جڑھ کھوکھلی ہو جائے۔

احاطہ بمبئی کے مسلمانوں نے ایک متفکرانہ درخواست پیش کی جس میں یہ لکھا گیا یہ عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ مستقبل قریب انگریز دفتر داروں کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ اور کونسلوں میں اُس کی جگہ اکثریت ہندوستانی قائم ہو جائے گی۔ انگریز دفتر داروں کی حکومت میں اس سے پہلے خواہ کتنے ہی نقائص کیوں نہ موجود ہوں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ کہ ایک خوبی اُن میں ضرور پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی اقوام میں وہ عدل وانصاف کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اس طرح سے زبردست کے بالمقابل کمزور کی حفاظت کر رہی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر کی اہمیت ایک اور صاف اعلان کے اندر پنہاں ہے علماء کی جماعت مسلمانوں میں قرآن کی مفسر

اور شرعی فیصلے بتانے والی جماعت ہے جو کسی امر میں شک پیدا ہو جانے پر وہ ایسے فیصلے صادر کرتی ہے۔ جو تمام اسلامی دنیا کے لئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ مدراس کے علما نے جناب وزیر ہند کے سامنے اصلاحات کے بارہ میں جو فیصلہ پیش کیا۔ وہ تین اعلانات پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے بالکل متشابہ اور ملتے جلتے تھے۔ ان میں سے ایک اعلان حسب ذیل ہے[1]

تحقیق مشرک ناپاک ہیں اگر انگریزی حکومت ہندوستان میں تمام نظم و نسق ہندوؤں کے سپرد کرنے والی ہے جیسا کہ ہندوؤں کی خواہش ہے۔ تو شریعت اسلام کے یہ قطعاً مخالف ہے کہ ان مشرکین کے ماتحت زندگی بسر کی جائے

سید محی الدین عفی عنہ
متولی وقف مسجد امیر النسا بیگم صاحبہ

برٹش ہندوستان کے بڑے بڑے صوبوں میں ہندو اور مسلمانوں کی بالمناسبہ آبادی فیصدی کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔[2]

نام صوبہ	ہندو	مسلمان
مدراس	۸۸٫۶۴	۶٫۷۱
بمبئی	۷۶٫۵۸	۱۹٫۷۴
بنگال	۴۳٫۲۷	۵۳٫۹۹

۱؎ دیکھو ایڈریس صفحہ ۱۲ مطبوعہ [illegible]

۲؎ برٹش ہندوستان کے اعداد و شمار از ۱۹۱۲-۱۳ لغایت ۱۹۲۱-۲۲ صفحہ ۱۵۰۱

صوبجات متحدہ	٨٥٫٠٩	١٤٫٢٨
بہار و اڑیسہ	٨٢٫٨٤	١٠٫٨٥
صوبجات متوسط و برار	٨٣٫٥٤	٤٫٠٥
آسام	٥٤٫٣٤	٢٨٫٩٦
پنجاب	٣١٫٨٠	٥٥٫٣٣
شمال مغربی سرحدی صوبہ	٦٫٧٦	٩١٫٦٢

اب اُس جنگی جذبہ کا خیال کرتے ہوئے جو اسلام نے لوگوں کے اندر پیدا کیا ہے یہ ایک ظاہر بات ہے۔ کہ ہندوستان کا اسلامی عنصر اُن مقامات پر بھی جہاں وہ حد سے زیادہ کمزور ہے تکلیف پیدا کرنے کے لئے کافی طاقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان ہمیشہ ایک ملکی نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے یہ کہتے ہیں کہ ہم بیرون ہند کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ایک فاتح اور غالب قوم ہیں ہماری تعداد اگر کم ہے تو کیا ہرج ہے اعداد و شمار نہیں بلکہ مردانہ طاقت ہے۔ جس کو شمار میں لانا چاہیئے۔ جب انگریز چلے جائیں گے اس وقت ہم ہی ہندوستان پر حکمران ہوں گے اس لئے ہم پر واجب ہے کہ جس قدر جلدی ممکن ہو سیاسی حقوق حاصل کرلیں دوسری طرف ہندو اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں کوئی ہندوستانی ہاتھوں میں آجائے۔ وہیں ہر عہدہ مذہبی فرقہ بندی کے خیال کو ملحوظ رکھتے ہوئے پر کیا جاتا ہے۔ ہر فرقہ میں فرقہ وارانہ امتیازی خصوصیات

کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور ہر خرچ کے موقعہ پر فرقہ وارانہ اختلافات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ دوسرا فریق اس کے بالمقابل ناخون تک کا زور لگاتا ہے اور اِسی طرح معاملہ متعلقہ کا اصلی حالت صفحۂ شہود سے غایب ہو جاتی ہے۔

سرکاری ملازمتوں کے ملنے میں ہر طرف سے یہی رکاوٹ پیش آتی ہے۔ اِس بات کا بڑا اثر جس قدر عدالت ہائے انصاف میں ظاہر ہوتا ہے اتنا کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہندوستانیوں کو جو ہمیشہ مقدمہ بازی کے شوق میں رہتے ہیں۔ اپنے مذہبی جھگڑوں میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے بے شمار موقع ملتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا مقدمہ کسی ہندوستانی جج کی عدالت میں زیر سماعت ہو تو ایک یا دوسرا فریق پہلے ہی سے مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ اگرچہ وہ جج حق و انصاف اور راستی کا پتلا ہی کیوں نہ ہو یہی اُمید اِس سے رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں ضرور اپنے ہی مذہب والوں کی طرف جھکے گا اور کوئی ایسی چیز نہیں جو دوسرے مذہب والے فریق کو یہ یقین دلا سکے کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔

ہندوستان کی عدالتوں میں بعض ایسے دیسی جج بھی ہیں جن کی دیانت اور امانت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ تاہم ہندوستانی ایسے جج سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ جو مقدمہ سے پیشتر ہی فریقین سے فیس لے لیتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ اگر فیصلہ کے بعد مقدمہ ہارنے والے کو اس کی فیس

واپس کردیجائے۔ تو ان کی دیانت اور امانت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ مقدمات میں پیسہ کی لالچ سے جھوٹے گواہ پیش کرنے کا بھی عام رواج ہے۔ ایسے گواہوں کو آپ عدالتوں کے سامنے اس انتظار میں آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھے دیکھیں گے کہ انہیں معاوضہ دے کر گواہی دلائی جائے۔ مدراس کے ایک مغربی تعلیم یافتہ بیرسٹر نے مجھ سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ قیاسی طور پر یہ ایک بے قاعدہ بات ہے لیکن عملاً میں اس فایدہ کو اپنے مخالف کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا یہ ہمارا رواج ہے۔

لیکن جب ہندو مسلم کشمکش کا سوال پیدا ہوتا ہے تو تمام دوسری باتیں نظرانداز ہو جاتی ہیں۔ بدقسمت انسان جو گرفتار کیا ہو کہتا ہے۔ کہ کوئی جج کیونکر اپنے دیوتاؤں کے برخلاف فیصلہ دے سکتا ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے۔ کہ کیا میرے دشمنوں میں بیٹھ کر وہ عدالت نہیں کرتا۔ اِس لئے مجھے کسی انگریزی جج کے پاس لے جائیے۔ جو اِن باتوں کی پرواہ نہیں کرتا وہ میرا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے خواہ میں حق پر ہوں یا ناراستی پر۔

ایک مقدمہ میں جو گذشتہ سال ایک پرانے تجربہ کار مسلمان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا محض وہم کی بنا پر فیصلہ کیا گیا۔ اِس مسلمان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے اس کے ضلع کے بعض پولیس افسروں کو پیش کیا گیا۔ اِن پر یہ الزام تھا۔ کہ بعض مذہبی بلووں میں وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بے حد قاصر رہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے لوگ موت کی گھاٹ اتر گئے

یہ لوگ سخت ترین سزاؤں کے مستحق تھے۔ لیکن وہ ہندو تھے اس لئے جج نے اس خوف سے کہ اس پر مذہبی تعصب کا الزام عائد ہو جائے گا انہیں ایسی ہلکی سزائیں دے کر چھوڑ دیا اس سخت ترین جرم کے قطعاً نا مناسب تھی اور یہ بات خدمت عامہ کے خلاف بھی ایک جرم تھا۔

اگر اس سے بھی زیادہ عام کیفیت کا ملاحظہ کرنا ہو۔ تو ایک اور واقعہ ہے اس کا پتہ چلتا ہے جو فروری سنہ ۱۹۲۶ء میں ظہور پذیر ہوا ایک بوڑھے مسلمان اسسٹنٹ انجینیر کو جو کہ سررشتہ آب پاشی میں ایک انگریز افسر کے ماتحت مدتوں کام کرتا رہا اچانک ایک ہندو کے احکام کے نیچے کام کرنا پڑا اس نوجوان ہندو نے جو ابھی نیا نیا کالج سے نکل کر آیا تھا اور اس کے دماغ میں نئے خیالات بھرے ہوئے تھے اپنے سینئیر مسلمان کو ستانا اور دکھ دینا شروع کر دیا وہ اس کو برا بھلا کہتا اور نوک جھوک اس پر کرتا رہتا یہاں تک کہ وہ بیچارہ مسلمان تنگ آ گیا۔ اور اس کی ایذا رسانی کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکا وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر ایک بڑے انگریز افسر کے پاس پہونچا اور اس نے مشورہ چاہا اس افسر کو تمام قصہ سنانے کے بعد بیٹے نے اس سے کہا صاحب! کیا آپ میرے باپ کی مدد نہیں کر سکتے یہ فی الحقیقت بہت ہی شرم کی بات ہے۔ کہ اتنے برس تک کام لینے کے بعد اب اس سے یہ سلوک روا رکھا جائے۔ لیکن اس انگریز افسر

نے موقعہ سے پورا فایدہ اٹھایا۔ اور صاف کہا، محمود!
ہمیشہ تم لوگ سوراج طلب کرتے ہو اس واقعہ سے تمہیں نظر
آسکتا ہے۔ کہ سوراج سے تمہیں کیا فایدہ ہوگا اِس کے
متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

نوجوان نے فوراً جواب دیا خیر کوئی ہرج نہیں میں بھی
ڈپٹی کلکٹر بننے والا ہوں اور جلدی ہی اِس عہدہ پر تعینات
ہو جاؤں گا میرے ہاتھوں سے بھی ہندوؤں کو پھر خدا ہی بچائے گا
مسلمانوں کی آبادی برٹش ہندوستان کی تمام آبادی کا ۱/۴
حصہ ہے لیکن یہ نسبت فیصدی روز افزوں ترقی پر ہے اُن
کے اولاد بڑی کثرت سے ہوتی ہے۔ اور جسمانی طاقت میں وہ
بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اِن کا دماغ زیادہ تیز نہیں۔
لیکن ذکی الحس ضرور ہیں اب یہ بات اُن کی سمجھ میں آنے
لگ گئی ہے کہ تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے انہیں اگر
وقت موقع اور اپنی حفاظت کا احساس معلوم ہونے دیا
جائے۔ اِس کے بعد اِن کی تمام رکاوٹیں رفع ہو جائیں
گی اور ملک کے انتظام میں وہ اپنا پورا حصہ لینے کے اہل
ہو جائیں گے اگر انہیں آج چھوڑ دیا جائے۔ تو وہ جھٹ
تلوار لے کر میدان میں اتر آئیں گے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی
یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ جس وقت ہندوستانی مسلمان
تلوار کو نیام سے کھینچیں گے۔ تو اس مقابلہ میں وہ اکیلے ہی
نہ ہونگے بلکہ وہ اُس عظیم قوت کا مقدمۃ الجیش ہوں گے۔

جس کی روایتی کو آج کل سرحدی محافظ افواج نے تھام رکھا ہے ہندوستان کے نقشہ پر ایک نظر ڈالئے پنجاب کی شمالی سرحد پر ایک بالکل علیحدہ سرزمین نظر آئے گی جو ۳۰۰ میل لمبی اور بیس سے لے کر ۵۰ میل تک چوڑی ہے۔ یہ سرزمین شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ اس سے پرے ایک اور متوازی خطہ ہے جو اتنے ہی رقبہ پر مشتمل ہے۔ یہ قبائلی لوگوں کا علاقہ ہے جہاں خود مختار اسلامی قبائل رہتے ہیں۔ جو نہایت سخت جنگجو لوگ ہیں۔ یہ لوگ ابتدا ہی سے لوٹ مار کو اپنا شغل بنائے ہوئے ہیں اس سے آگے افغانستان کا اسلامی ملک ہے اور اس سے اوپر اسلامی ایشیا جو گویا ایک دقیانوسی انجن ہے جو ایک لوٹ کی آواز اور اعلان جہاد پر زور اس طرح سر پر آ پڑے گا جیسے کوئی بہت بڑا ہتھوڑا انسانی سر پر آ گرے۔

ہر ایک وقت اس عظیم الشان طاقت کو ابھارنے کے لئے صرف ایک لفظ کی ضرورت ہے۔ سرحد کی باریک مگر آہنی روک پر اس کا مسلسل دباؤ۔ اس کی سختی اس کی گرفت اور شعلہ افگن برقی رو ایسی چیزیں ہیں جو اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کوئی شخص اپنی آنکھوں سے اس ملک کو دیکھکر حالات کا موازنہ نہ کرے

بہت تھوڑے ہندو سیاست دان اس حقیقت سے پورے طور پر واقف ہیں۔ وہ اپنی سست آنکھوں سے دیکھتے ہوئے۔ گویا کہ اپنی عمر بھر کی محفوظ حالت کی وجہ سے انہیں کچھ

بھی معلوم نہیں۔ یہ کہ دیتے ہیں۔ کہ افغان اتنے لمبے عرصہ سے
ہم سے علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ اب انہیں کیا ضرورت پڑی
ہے کہ وہ ہم پر چڑھ آئیں۔ واہ یہ تو محض بچوں کے ڈرانے
کی باتیں ہیں۔ اِس امر کو اُن کے دماغوں میں لایا بھی کیونکر
جا سکتا ہے۔ اِن کی حالت تو ایسی ہے۔ جیسے کہ کسی صدف
کو سمندر کی تہ پر پڑی ہوئی ہو۔ بالکل اِس بات کا علم نہیں ہوتا
کہ سطح سمندر پر ہوا کے طوفان نے کیا شور مچا رکھا ہے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ جس میں ۹۵ فیصدی مسلمانوں
کی آبادی ہے آج بالکل خاموش اور مطمئین اپنی گورنمنٹ کی
طرف سے اِس کی حالت سندھ و حصہ پنجاب کے ساتھ وسیع
جنوبی میدانی سندو سرزمین اور بھوکے مسلمان قبائل کے
درمیان جن کا پنجہ ہر وقت ہندوؤں کا گلا پکڑنے کے لئے ...
... تیار ہے۔ اور جن کے منہ میں ہندوستان کا زرخیز علاقہ
دیکھ کر پانی بھرتا ہے ایک درمیانی عمارت کی مانند حائل ہے
اِن حالات میں تمام ہندوستان کے امن واماں کے لئے
نہایت بیش قیمت چیز ہے۔

میں نے اِس صوبہ کے بہت بڑے بڑے لیڈروں سے
بات چیت کی اِس بارہ میں اِن سب کی ایک ہی رائے تھی
یہاں اُن کے نمایندوں کے اصل الفاظ نقل کرتی ہوں۔
اِس شخص نے پہاڑی علاقہ میں پرورش پائی ہے۔ اِس کے
آباؤ اجداد فارسی النسل تھے وہ ایک طویل القامت پتلا دبلا

آدمی ہے باز کی سی ناک اور آنکھیں رکھتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کی زیرِ سیادت ہیں۔ یہ کم گو ہے۔ لیکن اگر اسے کسی معاملہ پر گفتگو کرنے کا موقعہ آجائے۔ تو ایک ایک بات کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اس نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ :۔

اس وقت تمام صوبہ نہایت امن و اطمینان کی حالت میں ہے اور کسی تبدیلی کا خواہاں نہیں ہمارے جنوب میں جو چھوٹے چھوٹے آدمی بستے ہیں۔ ہم تو انہیں انسان کبھی نہیں سمجھتے اُن میں اور ہمارے درمیان اس سے بہت زیادہ فرق ہے جتنا فرق کہ انگریزوں کے اور ہمارے درمیان ہے۔ اگر انگریز چلے جائیں۔ تو فوراً دوزخ کا نظارہ قائم ہو جائے گا۔ اور سب سے پہلے بنگالیوں اور اُن کی اقوام کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ میں خود اُن میں سے بعض کو نہایت خوشی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ انگریزوں اور ہمارے درمیان اشتراک عمل ایک ضروری امر ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے سڑکیں بنائیں۔ ٹیلیفون لگائے۔ جہاں پہلے کبھی پانی نہ دیکھا گیا تھا وہاں اچھا پانی ہمارے لئے نکالا امن قائم کیا۔ انصاف سے کام لیا محاصل تجارت سے صرف انہوں نے ہی یہ فائدہ ہمیں پہونچایا۔ کہ ہمارے عیال و اطفال امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے اور ہمارے بیماروں کی خبر گیری ہونے لگی اور ہمارے بچوں کے لئے سکول کھل گئے۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ان کی آمد سے پہلے ہمیں میسر نہ تھی۔ میں آپ

سے پوچھتا ہوں۔ کہ کیا پتہ ہو سکتا ہے کہ ہم اِن تمام فوائد کو صرف اِس لئے نظر انداز کر دیں کہ ایک بزدل اور ذلیل اور ذلیل قوم جو نسلاً بعد نسل ہماری دشمن چلی آتی ہے مقاطعہ اور عدم تعاون کی دعوت ہمیں دیتی ہے۔ عدم تعاون کی احمقانہ تحریک سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ بے حد نقصان ہوا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ اور ہم سب کی متحدہ طاقت ہی اِس کے لئے فائدہ کا موجب ہو سکتی ہے۔ یعنی مسلمان اور انگریز اور ہندو بھی لیکن انگریزوں کی عدم موجودگی میں کوئی ہندو یہاں ہندوستان میں نہیں رہ سکتا سوائے اِن کے جنہیں ہم غلام بنا کر رکھیں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو یعنی انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اُس متحدہ اعلان کے آٹھ سال بعد جس میں حکومت خود اختیاری کا مطالبہ مشترکہ طور پر کیا گیا تھا کانگریس یا یوں کہئے۔ کہ ہندوؤں کی سیاسی مجلس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اِس موقعہ پر اِس کی صدارت ایک عورت کے حصہ میں آئی۔ جو یورپین زندگی اور تعلیم سے فیض یاب ہوئی ہے۔ اِس نے اپنے خطبۂ صدارت کے شروع ہی میں اِس امر پر اظہار افسوس کیا کہ :۔

...... میرے مسلمان بھائیوں نے نمایاں اور بے موقعہ علیحدگی اختیار کی ہے۔ جس سے ہندوؤں کو بہت بڑا خطرہ اور ناراضگی پیدا ہوئی ہے۔ کہ تعلیمی سرکاری۔ ملکی اور سیاسی شعبہ ہائے

زندگی میں اُن کا علیحدہ اور ترجیحی حقوق کا مطالبہ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اِس کے چند دن بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہوا اُس کے صدر سر عبدالرحیم نے اِس کا نہایت مسکت جواب دیا۔ جو اِس قدر صاف اور واضح ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں جلی حروف میں لکھا جانا چاہیئے۔ اِس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔

ہندو اور مسلمان دو ایسے مذہبی فرقے ہیں جیسے کہ انگلستان میں پراٹسٹنٹ اور کیتھولک ہیں بلکہ دو الگ الگ قومیں ہیں۔ زندگی کے متعلق ان کے امتیازی رجحانات انکی ممیز تہذیب و شائستگی اور مجلسی عادات کا اختلاف اُن کی روایات اور تاریخ نے جو مذہب سے کم اہمیت نہیں رکھتی اِن دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے مکمل طور سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ اور باوجود اِس کے کہ انہیں ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے ایک ہزار سال کا عرصہ ہو گیا ہے مگر اب تک وہ ایک قوم کی صورت اختیار نہیں کر سکے اُن جدید ہندو تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے جن میں مسلمانوں کو شدھ کرنے اور ہندوؤں کو حفاظت خود اختیاری کا مشتاق بنانے کی کوشش کیجاتی۔ سر عبدالرحیم نے کہا:۔

مسلمان اِن تحریکات کو ...... اپنے مذہب کے لئے نہایت ہی خطرناک چیلنج سمجھتے ہیں۔ جو اِن تمام مقابلوں سے بڑھ کر ہے۔ جو آج تک انہیں پیش آئے یہاں تک کہ مسیحی صلیبی

جنگ بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ چونکہ صلیبی جنگ کا منشا یہ تھا۔ کہ مسلمانوں سے بعض ایسے شہر لے لئے جائیں جو ان دونوں قوموں کے نزدیک مقدس سمجھے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض ہندو لیڈر مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دینے کا اسی طرح علی علان ذکر کرتے ہیں جیسے ہسپانیہ والوں نے قوم مور کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ ہم یقیناً ایسا منہ بھرا ہوا لقمہ ہونگے جن کو ہمارے دوست آسانی کے ساتھ نگل نہیں سکیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔

ہم ہندوستانی مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی افغانستان ایران اور وسط ایشیا میں سفر کرے جیتنی مسلمانوں عربوں اور ترکوں کے اندر جائے۔۔۔۔۔ تو ان مقامات پر ہر جگہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوگا گویا کہ وہ ان کے گھر کے آدمی ہیں۔ اور کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جن کے ہم عادی نہ ہوں اس کے برخلاف ہندوستان میں۔۔۔۔۔۔ جب ہم اپنے ہی شہر کی ایک سڑک عبور کرکے اس حصہ میں جاتے ہیں۔ جہاں ہمارے ہندو ہم وطن رہتے ہیں۔ تو ہمارے ساتھ تمام مجلسی معاملات میں بالکل اجنبیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ صحیح نہیں، کہ ہم مسلمان ہندوستان میں خود اختیاری حکومت نہیں چاہتے ہاں شرط یہ ہے۔ کہ اس خود اختیاری حکومت کی گورنمنٹ مسلمانوں کے سامنے بھی ایسی ہی ذمہ دار ہو جیسے کہ ہندوؤں کو ذمہ دار ہوگی ورنہ اس کے بغیر تمام معمولی باتیں

جو سوراج یا کامن ویلتھ آف انڈیا یا ہوم رول فار انڈیا کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ ہمارے لئے کوئی جذب و کشش نہیں رکھتیں ۔۔۔۔۔ ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے ۔۔۔۔۔ کہ ہم ان سیاسی ہندوؤں کی بربادی بخش حرکات کو قطعی طور پر روک دیں۔ جو انگریزی سنگینوں کی پناہ اور انگریزوں کے صبر و تحمل سے ناجائز فائدہ اٹھا کر حصول سوراج کے نام سے اس ملک میں فساد کی تخم ریزی کر رہے ہیں لیکن اس کے عواقب و نتائج سے وہ خود واقف نہیں اور نہ ان نتائج کا وہ کبھی مقابلہ کر سکتے ہیں ۔۔۔۔۔

معاملہ کا اصل حل یہ ہے ۔۔۔۔۔ کہ ایسی حالت پیدا کی جائے جس سے ملک کی تمام آبادی۔ ہندو مسلمان سکھ۔ پارسی۔ عیسائی دہقان مزدور اور ہندو اچھوت قومیں اقتصادی اور ذہنی شعبوں میں ایسی ترقی حاصل کر لیں اور سیاسی قوت کو عام آبادی میں اس طریق سے تقسیم کیا جائے۔ کہ کسی ایک اجارہ دار اور تیز فہم جماعت کا اقتدار قائم نہ رہے۔ اور اس طرح مختلف جماعتوں میں جو جھگڑے اور فساد پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ بھی ختم ہو جائیں۔

مجھے بحیثیت ایک بیرسٹر کے پھر بحیثیت ایک جج کے ۔۔۔۔۔ اور آخر ایگزیکیوٹو کونسل آف بنگال کا ایک ممبر ہونے کی حیثیت میں انگریزوں سے میل و ملاقات کرتے ہوئے ۵۰ سال کے قریب عرصہ ہو گیا ہے میں اس بات کا کھلے طور پر اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کی ہر منزل پر مجھے اپنے انگریز ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھنا پڑا ۔۔۔۔۔۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مجھے

بہت سے قابل ہم وطنوں کی معیت میں بھی کام کرنا پڑا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کریں گے۔ کہ بہت سی ایسی تدابیر جو ترقی کی شاہراہ پر لے جانے والی تھیں انگریزوں نے ہی کی ہیں حکومت کے معاملات میں مجھے ایک بھی ایسا مرقعہ یاد نہیں۔ جب ہم ہندوستانیوں کے مابین کسی مسئلہ پر اتحاد ہوا۔ ہو تو ہماری اس رائے کو بے قدری کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہو۔ میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں جس نے صدق دل سے یہ رائے دی ہو کہ اس ملک کے لوگوں کو اکیلے چھوڑ دیا جائے۔ تو بحالت موجودہ وہ اس قابل ہیں کہ اپنی حکومت قائم کرلیں اور بیرونی حملوں کے بالمقابل اسے قائم رکھ سکیں...... ہمارے لئے یہ بہتر ہے کہ نہایت کشادہ دلی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرلیں کہ ضرورت اس بات کی متقاضی ہے۔ کہ انگریز یہاں موجود رہیں۔ انگلستان کے سر پر ہندوستان کا بہت سا اخلاقی قرضہ ہے۔ اور وہ قرضہ یوں ہی ادا ہوسکتا ہے۔ کہ ہر ممکن تدبیر سے کام لے کر ہندوستان کو انگلستان مضبوط اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل بنادے۔ انگلستان کے بہتر دل ودماغ رکھنے والے لوگ اپنے اس فرض کو پہچانتے ہیں۔...... مجھے معلوم نہیں کہ انقلاب پسندوں کے ہاتھوں میں کوئی سیاسی لائحہ عمل ہے یا نہیں اگر کوئی لائحہ عمل انہوں نے بنایا تو اس کی اشاعت انہوں نے نہیں کی۔ ان کا فوری مقصد یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انگریزی حکومت کو درہم برہم کردیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام موجودہ طریق حکومت کو بھی بدل دیا جائے۔ لیکن ان انقلاب پسندوں سے

ہمیں منہ موڑ لینا چاہیئے۔ کیونکہ اِن کی کامیابی کی رتی بھر گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہم مسلمان جن کی گذشتہ تیرہ سو سال بلکہ اس سے زیادہ عرصہ کی تاریخ اِن متواتر جنگوں اور معرکہ آرائیوں سے لبریز ہے۔ جو ایشیا افریقہ اور یورپ کے اندر پیش آئیں۔ اِن لوگوں کو پرلے درجے کے بے وقوف اور نادان سمجھتے ہیں۔ جن کا خیال یہ ہے کہ کبھی کبھی چند بم پھینکنے یا ایک دو انگریزوں کو پیچھے سے گولی مارنے یا بے گناہ اور غیر محفوظ دیہاتیوں کے گھروں کو مسمار کرنے یا لوٹ لینے اور انہیں قتل و غارت کرنے اور طرح طرح کے ظلم و ستم اِن پر کرنے اِن کو اذیت جسمانی پہنچانے سے برطانی طاقت کی بنیادوں کو وہ ہندوستان سے اکھاڑ دیں گے۔

ہم مسلمان اُن لڑکوں اور بڑی عمر کے مردوں کو جو خفقان کے مرض میں مبتلا ہیں لائق خالی سیاسی مدبر قرار نہیں دے سکتے اور یہ حقیقت اس امر واقع سے واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ایک بھی مسلمان اِن کے ساتھ شامل نہیں ہوا۔ صرف سیاسی تدابیر ہی کسی قوم کی تعمیر کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ سرِ دست الحال ہندوستانی قوم کے لئے۔ ہمارے پاس کوئی نام ایسا نہیں جو ہماری اپنی زبان میں رکھا گیا ہو۔ اور ہندو مسلمان اور تمام دوسری اقوام پر حاوی ہو۔ نہ ہی ہماری ایک مشترک زبان ہے ...... ہندوستان کی بتیس کروڑ آبادی کو معراج ترقی پر پہنچانے کے لئے نہ تو صرف انگریز ہی کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہندو یا مسلمان علیحدہ ہو کر فائدہ مند ہو سکتے ہیں بلکہ اس کے

لیے سب کی متحدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

مسٹر عبدالرحیم کی اِس صاف بیانی پر ہندو لیڈروں اور ہندو اخبارات نے طعن طعن کی بوچھاڑ شروع کر دی اور دونوں قوموں کے درمیان دشمنی اور منافرت زیادہ بڑھ گئی۔ اسی اثنا میں ہیبت ناک خیالی توتوں کا آہستہ آہستہ اظہار ہونا شروع ہوا کلکتہ میں فسادات ہوئے۔ ۱۹۲۶ء کے موسم گرما کے وسط تک شروع سال سے لے کر اکتیس ۳۱ قاتلانہ بم کے گولے اور دھمک سے اڑجانے والے گولے استعمال ہو چکے تھے جن میں سے بعض کثیر اموات کا موجب ہوئے۔ اس کے بعد دونوں اطراف یعنی ہندو اور مسلمانوں کا جوش اس صورت حالات کی وجہ سے جو ان کی باہمی ڈر اور خوف نے پیدا کر دی تھی۔ ایک حد تک ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ گاندھی کا پرانا الزام کہ اِن کے باہمی جھگڑوں اور فسادات کی تہ میں انگریزوں کا ہاتھ کام کر رہا ہے اب تک لوگوں کی زبان پر تھا لیکن اس الزام کو دوہرانے والے عموماً وہ غیر ذمہ دار اور مفسد پرواز تھے جن کا ملک میں سوائے اس کے اور کوئی مفاد نہ تھا کہ آتش زنی کے بعد دھوئیں کی آڑ میں اپنا کام کریں۔ اس کے خلاف دونوں جماعتوں کے علم و عقل والے لوگ اِس خیال کی غلطی کو سمجھ چکے تھے لیکن انہوں نے ڈرتے ڈرتے اِس ضرورت کا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ ایک مضبوط اور غیر طرف دار طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ جو اُن حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری لے سکے جو اِس وقت بھی انہیں حاصل ہیں۔ اور یہ وہ فوائد ہیں۔ جن کے متعلق وہ اب صاف طور پر دیکھ رہے ہیں۔ کہ صرف انگریزوں ہی

کی موجودگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور جس وقت انگریز یہاں سے
چلے گئے وہ تمام حقوق و فوائد خون کی ندیوں میں ڈبو دیئے جائیں گے
انڈین لیجیلیٹو اسمبلی کے موسم گرما کے سیشن میں ارکین نے زشتہ
عقل سمجھا لا ایک مسلمان ممبر مولوی محمد یعقوب نے ۲۴ راگست کو
تقریر کرتے ہوئے بیان کیا :-
ہم ان لوگوں سے متفق نہیں جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ فرقہ وارانہ اختلافات
اور بلوؤں کی تہ میں حکومت کا ہاتھ ہے۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ
حکومت ہند نے فرقہ وارانہ معاملات کی سرانجام دہی میں کبھی بھی کسی کی
طرف داری کو روا رکھا ہے۔ اور جناب من! میں اس موقعہ سے
فائدہ اٹھا کر لارڈ آلیور کے اس اعلان کے خلاف صدائے احتجاج
بلند کرتا ہوں انہوں نے حال ہی میں ہوس آف لارڈ میں کہا
ہے۔ یہ نہایت افسوسناک بات ہے کہ ایک سابق وزیر ہند اس
ملک کے انتظامی طریقوں سے اس درجہ ناواقف ہو۔ مجھے یقین
ہے کہ لارڈ موصوف نے اپنے اعلان کے نتائج کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہوگا
ایک طرف حکومت ہند کے ساتھ انہوں نے غیر منصفانہ برتاؤ کیا ہے
اور دوسری طرف اس ملک کے مسلمانوں کے ساتھ نہایت بے انصافی
سے کام لیا ہے جو پہلے ہی بہت سے غیر مفید ملکہ مضر حالات میں
زندگی کمشقت تمام بسر کر رہے ہیں۔
کوئی شخص اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ فرقہ دار
کشیدگی اور منافرت نے .... اب تمام ہندوستان میں
ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔

جناب من! ہم ان فرقہ وارانہ اختلافات سے تنگ آ چکے ہیں اور حالت یہاں تک مشکل بن چکی ہے کہ ہم اپنی خانگی زندگی بھی خوشی اور آرام سے بسر نہیں کر سکتے۔ نہ ہی ہمارا تہوار ہمارے لئے خوشی کا موجب ہوتا ہے ..... کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ ہماری امداد کے لئے آگے بڑھے کیونکہ ہم خود اِس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے۔

اِس سے چند ماہ پیشتر اسی ایوان کے فرش پر اِس قسم کے الفاظ منہ سے نکلنے ایک تردیدی طوفان برپا کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لیکن آج اِس تقریر کے خلاف ایک بھی آواز نہ اٹھی۔ بجائے اِس کے راسخ العقیدہ ہندو مذہب کا وہ ستون یعنی ہمارا پیارا مدراسی دوست دیوان بہادر ٹی رنگا چاریہ اٹھا اِس لئے نہیں کہ ایک اجنبی حکومت کو مورد طعن و تشنیع بنائے اِس لئے نہیں کہ اِسے ہندوستانی معاملات میں مغرورانہ دخل اندازی کا ملزم ٹھیرائے بلکہ اِس بات کا اعتراف کرنے کے لئے اٹھا کہ

..... واقعات آخر واقعات ہیں۔ اور اِن کا مقابلہ ہمیں مردوں کی طرح کرنا چاہیئے ..... میں اِس مخلصانہ سپرٹ کی قدر کرتا ہوں جس کو لے کر میرے آنریبل دوست محمد یعقوب آگے بڑھے ہیں۔ وہ اِس ذلیل حالت کے ناسور کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور ایسا ہی میں بھی محسوس کرتا ہوں میں خوش ہوں اور ایسا ہی تمام ملک اِس بات پر شاداں ہے کہ ہز ایکسیلینسی لارڈ اروِن نے اِس معاملہ میں پوری سرگرمی کے ساتھ قدم اٹھایا ہے ..... ہم اِن فوائد کو جن کی

سلہ لیجسلیٹو اسمبلی کی بحثیں صفحہ ۲۸۳ و ۲۸۴، ۲۴ اگست سنہ ۱۹۲۵ء

حصول کی تمنا ہم کو دل سے لگی ہوئی ہے تمام سرکاری و غیر سرکاری لوگوں کی امداد و اعانت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے ہیں چاہتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی کثیر تعداد پیدا ہو جائے۔ جن کے دل فی الحقیقت اِس حالت کو بدلنے کے خواہاں ہوں؎

عدم تعاون کی تعلیم جیسا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ اپنی قائم شدہ طاقت کے باوجود کسی منزل مقصود پر نہ لے گئی روحانی جنگ و جدل کی متصوفانہ تعلیم جس کو روحانی طاقت کی جنگ کہا جا سکتا ہے اور جس میں محبت کے نظریہ پیش ہونے کے باوجود نفرت و حقارت کے الفاظ سے کام لیا گیا ہے میدان عمل میں انسانی قتل و غارت کا موجب ثابت ہوئی۔ یہ ظاہر ہو گیا کہ لوگ انفرادی طور پر اپنے ذاتی اور خاندانی فوائد کو نظر انداز کر کے مشترکہ کاموں کے لئے اکٹھے ہونے کے ناقابل ہیں۔ اور یہ حقیقت نفس الامری پورے طور پر آشکار ہو گئی۔ کہ نہ تو ہندو اور نہ ہی مسلمان تمام لوگوں کے فوائد کا خیال رکھ سکتے ہیں۔

فی الحال اِن میں معدودے چند لوگ اِس کا خیال کرتے ہیں۔ لیکن کیا اِس منظر کو وہ قائم رکھ سکتے ہیں! اگر وہ ایسا کریں تو اِن کی بہت بڑی کامیابی ہو گی۔

چھبیسواں باب

ہندوؤں کا مقدس شہر بنارس

ایڈون ارنلڈ نے بنارس کا حال نہایت خوبصورت الفاظ میں لکھا ہے ہزاروں لوگوں کے سوا بھی بنارس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے سیاحوں نے اِس کے دریائی نظارہ

سے مسحور ہو کر تعریف و توصیف کے تمام الفاظ اِس پر ختم کر دیئے ہیں۔
اور کوئی تعجب انگیز امر نہیں کیونکہ وہاں کا نظارہ بہت ہی خوبصورت ہے
اِس میں ایسی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ کہ جس سے روحانی بلند پروازی حاصل
ہوتی ہے۔

بنارس ہندوؤں کا ایک مقدس شہر ہے مقدس گنگا کے کنارے بلند سیڑھیوں
پر لاتعداد مندر اِس طرح کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے مختلف تاج قطاروں
میں رکھے ہوئے ہوں یہ تمام مندر اِس شہر کی عظمت و عزت کو دوبالا کر رہے ہیں
زرد گنبدوں سے گیندوں کے پھولوں کے ہار دریائے گنگا کی آمد پر اِس کا خیر مقدم کرنے
کیلئے دریا کے آر پار لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور جس وقت پوجا پاٹ کرنے
والے ملکے اور شوخ رنگ کے لمبے چغوں میں اپنے سروں یا کندھوں پر
پانی کے برتن اٹھائے ہوئے۔ اِس کی بڑی بڑی سیڑھیوں پر اوپر نیچے
آنے جاتے ہیں۔ تو وہ بالکل ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں کہ جس طرح وہ شکلیں
جو بنی اسرائیل کو خواب میں نظر آتی تھیں اور وہی گیت سنائی دیتا تھا جو
داؤد کے شہر کی سیڑھیوں پر دیوار کے اوپر چڑھتے ہوئے انہوں نے گایا تھا
لیکن بنارس کو میں نے ایک میونسپل ہیلتھ افسر کے ساتھ جا کر دیکھا یہ ہیلتھ
افسر ایسا شخص تھا کہ جسے کوئی مصور بھی عالمِ خیال میں نہیں لا سکتا

یہ ایک ہندوستانی تھا اِس نے اپنے فرائض کی ذمہ داری لینے سے
پیشتر امریکہ میں صحت عامہ کی تعلیم کے لئے راک فیلر کے ایک مقرر کردہ
وظیفہ سے فائدہ اٹھا کر تعلیم حاصل کی تھی۔ اِس کے تمام خیالات کا
لب لباب پیش کرنے کے بجائے چند باتوں کا بیان کر دینا کافی
ہے۔

بنارس شہر کی آبادی دو لاکھ نفوس کی ہے۔ جن میں سے قریبًا تیس ہزار برہمن ہیں۔ اور ان کا تعلق زیادہ تر مندروں سے ہے اس کے علاوہ دو اور تین لاکھ کے درمیان ہر سال زائرین وہاں آتے ہیں جو تھوڑے عرصہ کے لئے وہاں ٹھیرتے ہیں۔ اور بعض خاص موقعوں پر مثلاً سورج گرہن کے موقع پر صرف اس دن کے لئے تین چار لاکھ زائرین بیرونجات سے بنارس پہونچ جاتے ہیں۔ جو چند دن بعد اسی تیزی سے واپس بھی چلے جاتے ہیں۔

ان تمام انسانوں کی حفاظت کے لئے بنارس میونسپل کمیٹی نے اپنے چیف ہیلتھ افسر کو دو ہزار پونڈ سالانہ خرچ کر لینے کی اجازت دے رکھی ہے۔ افسر مذکور۔ یہ روپیہ چیچک کے ٹیکے۔ پیدائش و اموات کے اندراج اور وباؤں اور متعدی بیماریوں کے انسداد کے کام میں لاتے ہیں۔

اس ہیلتھ افسر صاحب کا سب سے بڑا کام تو ان زائرین کی غور و پرداخت پر مشتمل ہے۔ جو ریل گاڑیوں سے اترتے ہیں۔ تاکہ ہیضہ کے بیماروں کو پیشتر اس کے کہ وہ شہر کے تنگ و تاریک مکانوں میں جا کر گم ہو جائیں قابو کر لیا جائے۔ اگر ایک دفعہ بھی کوئی ایسا بیمار گم ہو جائے۔ اور اس کی بیماری چھپی رہے تو اسی وقت پتہ لگتا ہے۔ جب اچانک وبا پھوٹ پڑتی اور بیماری کی موجودگی کا اعلان کر دیتی ہے۔ میونسپل کمیٹی کے افسروں اور محکمہ حفظان صحت کے کارکنوں کو اچھی اچھی تنخواہیں دی جاتی

ہیں۔ ادنی ملازمین کو صرف گزارہ دیا جاتا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کسی متعدی مرض کی رپورٹ اور اس کے اثر کو زائل کرنیکا حکم ہو جائے۔ تو ماتحت عملہ لوگوں کو تکالیف میں ڈال کر جہاں تک ممکن ہو فائدہ حاصل کر لیتا ہے ٭

بنارس ایک پرانا شہر ہے۔ اس کی بعض نالیاں سولھویں یا سترھویں صدی میں تعمیر کی گئیں تھیں۔ کوئی شخص اُن کے ٹھیک رستہ سے واقف نہیں۔ سوائے اس کے کہ جہاں سے وہ نالیاں بہتی ہیں۔ یہ عام نالیاں آخر دریا میں جا گرتی ہیں۔ وہ پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ اور بعض وقت کسی عمارت یا بازار کے نیچے سے ان کی اینٹیں اکھڑنے پر ان کا پتہ چلتا ہے۔ بعض وقت ان کے دہانے پر کیچڑ جمع ہو جانے سے بند ہو جاتی ہیں۔ ان نالیوں میں سے بہت سی ایسی ہیں۔ جو اب تک گھروں کے غلیظ اور کثیف[1] پانی کو اُس مقام سے جہاں لوگوں کی کثرت ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی جگہ لے کر ڈال دیتی ہیں۔ لیکن کثرت سے یہ نالیاں بند تالابوں کی طرح ہو گئی ہیں۔ اور صرف برسات کے موقعہ پر وہ اپنا تمام پانی جو ان کے اندر جمع ہوتا ہے۔ روزافزوں قوت سے شہر کی تہ زمین میں پہونچا دیتی ہیں ٭

شہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اُس کے بازار سطح دریا سے ۷۵ فٹ اونچے ہیں۔ پہاڑی کے اگلے حصہ پر تین میل

---

[1] کثیف اس لئے کہ ہندوستانی گھروں میں پانی بہت کم استعمال کیا جاتا ہے ٭

یا اس سے زیادہ فاصلہ تک سیڑھیاں اور پتھر کی بڑی بڑی اونچی
دیواریں بنی ہوئی ہیں - یہ دیواریں تہ زمین کے پانی کو روکتی ہیں
جو وقتاً فوقتاً اُن کی اینٹوں میں سے نکلتا ہے - اور مندر کی مشہور
دیوار پر سے دریا میں ٹپکتا رہتا ہے - اس جگہ پوجا پاٹ کے اندر
پانی پینے اور غسل کرنے والے لوگوں اور اعلیٰ خاندانوں کی زائر
عورتوں نقش ونگار کئے ہوئے مقدس انسانوں اور راکھ
ملے ہوئے سادھوؤں اور لڑکیوں کے مابین آپ اس پانی کو
ان لمبی لمبی بل دار دراڑوں میں سے ٹپکتا ہوا دکھائی دیتا ہے
یہ پانی ان مقدس پتھروں کی خوبصورتی کو کم کر دیتا ہے *

سخت مذہبی مخالفت کے باوجود ۱۹۰۶ء میں انگریزوں نے
پانی کی نالیوں کا ایک علیحدہ راستہ بنا لیا اور شہر میں پانی کے نل کا
سب سے بڑا مقام شہر کے جنوبی کنارہ پر واقع ہے - جہاں آبادی
کی قلت ہے - یہاں پانی کو ایک تالاب میں جمع کر کے فلٹر کرنے
کے بعد شہر میں بھیجا جاتا ہے - میونسپل کمیٹی کا ہیلتھ افسر خود ہر ہفتہ
صاف شدہ پانی کو کیمیاوی طریق پر تحلیل کر کے دیکھتا ہے - کہ کہیں
اس میں فاسد جراثیم تو پیدا نہیں ہو گئے *

پرہیزگار ہندو اس فلٹر شدہ پانی کو نہیں پیتے - وہ اس کی
بجائے روزانہ دریا پہ جاتے - اور کسی نہانے والی گھاٹ سے
اُتر کر ٹپکنے والی ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے نہانے والوں کے
درمیان ہی سے پانی کے برتن بھر لیتے ہیں - اور گھر والوں کی
پیاس بجھانے کے لئے انہیں اٹھا لاتے ہیں - افسر حفظانِ صحت

کی تمام تنبیہات اور احتجاجی اعلانات کو وہ سخت نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ انسانی طاقت سے ممکن نہیں کہ وہ گنگا کے پانی کو ناپاک کرے۔ اگر گنگا کے پانی کو فلٹر کیا جائے تو اس پانی کا تمام تقدس جاتا رہتا ہے۔

ان لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ جو کوئی بنارس کے مقام پر گنگا کے پانی میں نہائے اور اسے ایک دفعہ پی لے۔ اور ساتھ ہی وہاں کے مندروں کے پجاریوں کی ضروریات کا بھی پورا خیال رکھے۔ تو وہ بدترین بیماریوں سے جو انسانی جلد میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ نجات پا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنارس میں ہزاروں ہندو ایسے نظر آتے ہیں۔ جو ہر قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ان کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جو شخص بنارس میں آکر مرے وہ سیدھا سورگ کو جائے گا۔ اس لئے بے شمار بیمار جو علاج معالجہ سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ بنارس میں چلے آتے ہیں تاکہ یہیں ان کا دم نکلے۔ اور اگر ممکن ہو تو مرتے وقت ان کی ٹانگیں دریا کے پانی میں پڑی ہوئی ہوں۔

اس بارہ میں بہت سے واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ جو نہایت عجیب و غریب اور بلند پایہ ہیں صحت عامہ کا نقصان ان لوگوں کے نزدیک کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ حد سے زیادہ بھرے ہوئے

مرگھٹ سے علاقہ رکھتا ہے - سب سے بڑا مرگھٹ شہر اور دریا کے سب سے آباد حصہ کے درمیان واقع ہے میرے ہمراہی ہیلتھ افسر نے مجھے بتایا کہ روئے زمین کی کوئی طاقت اس مرگھٹ کو یہاں سے تبدیل نہیں کر سکتی - کیونکہ یہ ایک خاص تقدس کا مقام ہے - اس لئے میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اس بات کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہوں - کہ تمام لاشیں پورے طور پر جل کر راکھ ہو جائیں ۔

لیکن پورے طور پر جلنے کے لئے بہت سی لکڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے - اور ہر ایک مردہ کے لواحقین ایسے نہیں ہوتے کہ اسقدر زیادہ خرچ کے بوجھ کو برداشت کر سکیں اور ہندوستانیوں کے زیر اثر میونسپل کمیٹی کے افسروں نے آج تک یہ بھی نہیں کیا - کہ ایسے مُردوں کو جلانے کے لئے جتنی مزید لکڑیاں درکار ہوں مہیا کر دیا کرے ۔

میں نے ڈاکٹر سے جب میں وہاں کھڑی دیکھ رہی تھی - کہا دیکھو وہ کتے راکھ کے ڈھیر میں منہ مار رہے ہیں - اور ایک کتے نے جلی ہوئی لاش کا ایک ٹکڑا نکال لیا ہے ۔

جواب میں اس نے کہا - ہاں ایسا عموماً ہوتا ہے - کیونکہ لوگ یہاں مُردوں کو رات دن میں ہر وقت جلاتے رہتے ہیں اور بعض وقت مُردہ پورے طور پر جلنے بھی نہیں پاتا کہ اسے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے - یہ ٹکڑا ابھی اگر کتے کو نہ ملتا تو وہ دریا میں اسی طرح بہہ جاتا - جس طرح کہ دریا میں جا کر نہانے والوں کے

درمیان چھوٹے چھوٹے بچے بہتے رہتے ہیں۔ کیونکہ کوئی ہندو کسی معصوم بچہ کو نہیں جلاتا۔ بلکہ اسے دریا میں پھینک دیتے ہیں ؛

دریا کے سامنے کوئی پیشاب پاخانہ کرنے کے لئے کوئی ٹٹیاں بنی ہوئی نہیں ہیں۔ لوگ ان ریتلے مقامات پر پاخانہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چونکہ وہ پانی کے کنارے نہانیوالی سیڑھیوں کے پاس واقعہ ہیں۔ اس طرح تپ محرقہ یا ہیضہ کا ایک مریض وہاں آکر دس ہزار انسانوں کو اسی بیماری میں مبتلا کرسکتا ہے۔ دریا کے کناروں پر خشک۔ گندی کیچڑ کی تہ جمی ہوئی ہے۔ اور کناروں کے ساتھ ساتھ جو دریا کا پانی ہے وہ سیال گندگی ہے۔ لکھوکھا معتقدین اس گندگی کو نہانے دھونے اور پینے کے کام میں لاتے ہیں۔ اور دوسری پر اپنے کپڑے سکھاتے ہیں۔ اس طریق سے جراثیم کو جمع کرکے وہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اور اس طرح سے ان جراثیم کو آگے پھیلاتے ہیں اور ساتھ ہی اس قیمتی پانی سے برتن بھی بھر کر لے جاتے ہیں۔ تاکہ سال بھر کے لئے انہیں کام دے ؛

یہی کام ان خوبصورت اور پاک مندروں میں بھی ہوتا ہے۔ مندروں کی حالت بیان کرنے کے لئے ایک برہمن طبیب کا بیان نقل کردینا کافی ہے۔ جس نے یورپین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اور جو لنڈن اور پیرس میں ہر سال

آتا ہے - اس شخص نے نہایت افسوسناک لہجہ میں کہا - کہ

بنارس کے مندر ویسی ہی گندی حالت میں ہیں - جیسے دریا کے کنارہ کی کیچڑ - میں خود اُن کے اندر گیا - اور میں نے وہاں اس مقام کو دیکھا - جہاں تقدس کے سبب سے جوتیاں اُتارنی ضروری ہیں - اس سے آگے بڑھ کر وہ مقدس جگہیں ہیں - جن کی پوجا کی جاتی ہے - اور ان کے اردگرد تمام کیچڑ ہی کیچڑ اور روٹیوں کے ٹکڑے اور انسانی غلاظت پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے - میں ایسے مقام پر کبھی نہ جاؤں - لیکن ہزارہا لوگ اپنی جوتیاں وہاں اُتار کر اندر جاتے اور پوجا پاٹ کرتے ہیں - پھر باہر آتے ہیں - اور غلیظ پاؤں میں جوتیاں پہن لیتے ہیں - میں ایک ہندو اور بطور ایک ڈاکٹر ہونے کے اس تمام ماجرے کا چشم دید گواہ ہوں *

بنارس جو ہندوستان کی صحت کی گویا ایک کنجی ہے - اُس کے ہیلتھ افسر کی پوزیشن اس قدر ممتاز ہے - کہ اس شخص کو جسے اس منصب پر کھڑا کیا جائے - گویا بہت بڑی عزت و عظمت کی جگہ پر بٹھایا گیا ہے - موجودہ ڈاکٹر اپنے فرائض کو نہایت عمدگی سے ادا کر رہا ہے - اور ان معمولی وسایل سے جو اس کے ہاتھ میں ہیں - پورے طور پر کام لیتا ہے - لیکن ایک ہندوستانی ڈاکٹر نے بالکل مختلف نکتہ نگاہ کا اظہار کیا - اس شخص نے بھی راک فیلر کے وظیفہ سے تعلیم حاصل کی ہے - اس نے کہا کہ افسر حفظان کی جگہ بہت ہی خراب ہے - میں نے حیرانی سے دریافت

کیا۔ کیوں خراب ہے؟ اس نے کہا کہ یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور زیادہ اس لئے خراب ہے کہ ایسے شخص کو جو راک فیلر کا وظیفہ خوار ہوتا ہے۔ ایک انگریز کے نیچے کام کرنا پڑتا ہے۔ وزیر تو بیشک ہندوستانی ہے۔ لیکن درمیانی افسر یعنی ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ انگریز ہے۔ یہ نہایت ہی شرمناک بات ہے۔

تعجب یہ ہے۔ کہ یہ ریمارک اس وقت کیا گیا۔ جب میں اسی ڈاکٹر کے ساتھ صفائی کے متعلق ہندوستانیوں کی اپنی کوششوں کو ملاحظہ کر رہی تھی۔ یہ کوشش چنداں قابلِ تحسین نہ تھی۔ لیکن ابھی ابتدائی حالت میں تھی۔ اور سادہ لوح کارکن شوق اور بےغرضی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اور صرف حوصلہ افزائی کو ترستے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر ہمارے راک فیلر کے فاضل دوست نے جو ایک سرکاری افسر کی حیثیت میں اپنے ماتحتوں کے نزدیک بہت بڑی شخصیت رکھتا تھا۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی ظاہر کئے بغیر ان کی باتوں کو تنفر آمیز ہنسی سے اُڑا دیا۔

بعض اور بھی مقدس شہر ہندوستان میں ہیں۔ جو زائرین کے تیرتھ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بیماریوں کا گھر بنا ہُوا ہے جہاں سے تمام ہندوستان میں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ جن کے انسداد کے لئے پوری کوشش اور ہنرمندی بکار ہے۔

لیکن ایک معمولی ہندوستانی شہر میں صحتِ عامہ کا سوال بہت ہی مشکل سوال ہے۔ مثال کے طور پر لاہور کو لیجئے شہر کا

یورو پین حصہ کسی قدر مغربی امریکہ سے ملتا جلتا ہے ۔ تمام عمارات نئی اور ایک ہی وقت کی بنی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ ان میں وسیع ہوادار کمرے ہیں بعض ان میں جدید طرز کی بہتر عمارات بھی ہیں ۔ جو سر گنگا رام جیسے قابل قدر پنجابی کی پبلک سپرٹ کا نتیجہ ہیں ۔ لیکن لاہور کا وہ حصہ جو عامتہ الناس کی جائے رہائش ہے ۔ بالخصوص بازار جہاں لوگوں کی آمد و رفت ہے ۔ ایک نہایت خطرناک جگہ ہے ۔ یہ جگہ ڈائریکٹر آف پبلک ہیلتھ کو رات کو بھی آرام کی نیند سونے نہیں دیتی ۔

لاہور میں قریباً آٹھ فٹ چوڑے پیچ در پیچ بازار ہیں ان کے دونوں طرف پختہ رہائشی مکانوں کی قطاریں ہیں جو بعض وقت بلندی میں کئی کئی منزلوں تک چلے گئے ہیں ۔ مکانوں کے نیچے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں جن کے سامنے کا حصہ کھلا ہے ۔ ان دوکانوں میں روٹی ۔ تانبے کے برتن مذہبی مقدس تصاویر ۔ بیل بوٹوں والے کپڑے ۔ ریشم ۔ غلوں کے ڈھیر اور زیورات فرش کے اوپر یا دیواروں پر نمایاں کر کے رکھے ہوئے ہیں بہت سے بوسیدہ لکڑی کے تھڑے ہیں ۔ جو دوکانوں کی سطح سے آگے بازار کی طرف بڑھے ہوئے ہیں ۔ ان تھڑوں کے نیچے سڑک کے دونوں طرف ایک نالی بنی ہوئی ہے جو قریباً ایک فٹ چوڑی ہے ۔ یہ نالی عام لوگوں کے پیشاب

کرنے کے لئے ہے۔ اس گندی نالی سے کچھ ہی اوپر ان تھڑونپر تلی ہوئی مچھلی۔ ابلے ہوئے چاول۔ پکی ہوئی دال اور چپچپی مٹھائیاں اور دوسری کھانے کی چیزیں فروخت کے لئے قدموں ہی میں رکھی جاتی ہیں۔ جہاں ان کو ٹھوکر لگنے اور نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ مکھیاں۔ گندے ہاتھ انہیں لگتے۔ اور کتے۔ گائے۔ بیل اور بھیڑیں اور چوہے ان پر منہ مارتے ہیں۔ ایسے ہی چھوٹے بچے بیمار آنکھوں اور جلدی بیماریوں والے ان تمام چیزوں کے درمیان پھرتے رہتے ہیں۔ راکھ اور جلے ہوئے تمباکو کے ذرے۔ ان اشیا پر شب و روز پڑتے ہیں ؞

بازاروں میں چلتے ہوئے محتاط رہنا چاہئے۔ کہ کسی مکان کی دیوار سے نہ لگ جائیں۔ کیونکہ اوپر کی منزلوں اور چھتوں پر جو پاخانے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا پانی ان چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں سے جو دیواروں میں اسی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ ٹپکنے والے نلوں میں سے۔ یا ویسے ہی نیچے ان نالیوں میں گرتا رہتا ہے۔ جہاں تلی ہوئی مچھلی اور مٹھائیاں تھڑوں پر پڑی ہوئی ہوتی ہیں ؞

مسٹر گاندھی کا سفر انگلستان اس کے علم سے بڑھ کر اس کے لئے مؤثر ثابت ہوا ہے۔ کہ اس نے اس مسئلہ پر بارہا لکھا[1]۔ چنانچہ اس کا ایک مضمون حسب ذیل ہے ؞

---

[1] ینگ انڈیا ۲۹ اکتوبر ۲۵ء صفحہ ۳۷۱

ہندوستان کی بعض قومی عادات ایسی بُری ہیں۔ کہ اُن کا تذکرہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسی پختہ اور راسخ ہو چکی ہیں کہ کوئی انسانی کوشش ان کو دور نہیں کر سکتی۔ جہاں میں جاتا ہوں۔ یہی گندی عادات ایک یا دوسرے رنگ میں مجھے نظر آتی ہیں۔ پنجاب اور سندھ میں صحت کے ابتدائی اصولوں کو قطعاً نظر انداز کر کے اپنے مکانوں کو بہت گندی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں کروڑھا بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم پلتے رہتے ہیں۔ اور مکھیوں کی تو بستیاں آباد ہیں۔ نیچے جنوبی علاقوں میں ہم اپنے بازاروں کو بھی گندا کرنے سے نہیں ٹلتے۔ اور صبح کے وقت کوئی شخص جس کے اندر تہذیب و شائستگی کا مادہ رکھا گیا ہے۔ ان بازاروں میں چل پھر نہیں سکتا کیونکہ وہاں لوگ قضائے حاجت کے لئے قطار در قطار بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام پردہ میں اور ایسی جگہوں پر ہونا چاہئے تھا۔ جہاں لوگوں کا آنا جانا نہ ہوتا۔ بنگال میں یہی منظر مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے۔ وہی تالاب جہاں لوگ اپنے میل کچیل کو صاف کرتے۔ اپنے برتنوں کو دھوتے اور جہاں مویشی پانی پیتے ہیں۔ انسانوں کے پینے کے لئے بھی وہیں سے پانی لیا جاتا ہے ...... یہ لوگ جو ایسا کام کرتے ہیں۔ جاہل نہیں وہ ناخواندہ نہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں۔ جو ہندوستان سے باہر بھی ہو آئے ہیں ...... سررشتہ میونسپل سے بڑھ کر کوئی جماعت بھی اس مسئلہ کو بہتر طور پر اور جلدی حل نہیں کر سکتی

وہ تمام اختیارات انہیں حاصل ہیں۔ جن کی اس بارہ میں ضرورت ہے۔ اور اگر زیادہ اختیارات کی ضرورت ہو۔ تو وہ حاصل کر سکتی ہیں۔ صرف اصلاح کی خواہش دلوں میں ہونی چاہئیے؛ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ[1]

جہاں بہت سی باتوں کی جوابدہی حکومت پر عاید ہوتی ہے وہیں میں یہ بھی جانتا ہوں۔ کہ صفائی کے متعلق ہماری گندی عادات کے ذمہ دار انگریز افسر نہیں۔ اگر ہم انہیں اس بارہ میں آزادی دیدیں۔ تو وہ ہماری عادات کو تلوار کے زور سے بھی درست کر دیں گے؛

مسٹر گاندھی نے ہندوستانی طرز کی میونسپلٹیوں کی حکومت کے متعلق جو خیال ظاہر کیا۔ اس کی صحت کو میں نے ہندوستان کے بہت سے چھوٹے بڑے حصص میں پھر کر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مثلاً مدراس جیسے شہر میں جو اس ملک میں تیسرا بڑا شہر سمجھا جاتا ہے۔ پانی کی بہم رسانی کا موجودہ طریق ۱۹۱۴ء میں مکمل ہوا۔ پہاڑوں کے اندر پانی کے جمع کرنے کے لئے جو مقام تجویز کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سے دیہات بھی آ گئے ہیں۔ جس وقت پانی شہر کے انجن کے پاس پہنچتا ہے۔ تو نہایت گندا ہوتا ہے۔ یہاں مجوزہ ترکیب کے مطابق اس کو صاف

---

[1] ینگ انڈیا ۱۹ر نومبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۹۹ - ۲۱ جنوری ۱۹۲۶ء کے ینگ انڈیا میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کہ ہندوؤں کے سیاسی نمایندوں کی ایک جماعت کی عادات جو کانپور میں انڈین نیشنل کانگریس کے موقعہ پر دیکھی گئیں ان بدترین عادات سے ملتی جلتی ہیں۔ جنکا ذکر مسٹر گاندھی نے دوسری جگہ کیا ہے

کرنے والی مشینوں میں سے آہستگی سے گذار کر صاف پانی کے تالاب میں ایک کروڑ گیلن روزانہ کے حساب سے پہنچایا جاتا ہے ٭
لیکن مدراس کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور انجن کی طاقت میں شہر کی موجودہ ضروریات سے چالیس لاکھ گیلن کی روزانہ کمی ہے۔ ضرورت کے مطابق نئے آلات لگانے کے لئے انگریز ماہرین کی مدد سے مفصل تجاویز بلدیہ کی کونسل کے سامنے رکھی گئی ہیں۔ لیکن ان سالٹھ لیڈروں اور مفاد عامہ کے محافظوں نے جو سب کے سب ہندوستانی ہیں۔ ایک بالکل سادہ سکیم بنائی ہے۔ میں نے خود موقع پر جا کر ہندوستانی سپرنٹنڈنٹ سے سنا۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ اب وہ ایک کروڑ گیلن پانی کو صاف کر کے صاف پانی کے تالاب میں پہنچا دیتے ہیں اور پھر اس میں چالیس لاکھ گیلن غیر صاف شدہ پانی ملا کر نالیوں کے ذریعہ سے شہر میں پہنچا دیتے ہیں ٭

اس تمام طریق عمل کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ خیال کرنا بیجا نہیں۔ کہ انگریزی پڑھ لینا آسان ہے۔ لیکن ایک قوم بننا اور زندگی کی اچھی عادات کو اختیار کرنا بہت مشکل امر ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک خوش لباس شخص جو آکسفورڈ کے لب و لہجہ میں آسانی سے انگریزی بول لیتا ہے۔ ایک ایسے گاؤں کا رہنے والا ہو۔ جہاں اگر کسی نئے کنوئیں کی ضرورت ہو۔ تو وہ اسی طریق کو اختیار کریں گے۔ جو آج سے ایک ہزار سال پہلے اُن کے آبا و اجداد نے اختیار کیا تھا۔ کنوؤں کے لئے

جگہ تجویز کرتے ہوئے وہ زمین کی ڈھلوان کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ اس کے لئے بکرے کے اوپر پانی کا بھرا ہوا ڈول رکھ دیتے ہیں۔ بکرا بھاگتا ہے۔ اور لوگ اس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور جہاں وہ پہلے جا کر کھڑا ہو۔ اور پانی کو اپنے جسم سے اچھالے بس اسی جگہ نیا کنواں بننا چاہئے۔ خواہ کسی بڑی سڑک کے وسط میں ہی کیوں نہ ہو۔

ستائیسواں باب

دُنیا کے لئے خطرہ

برٹش ہندوستان میں پانچ لاکھ گاؤں ہیں۔ جن کے کچے مکانات گارے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے گاؤں کے تمام تر مکانات ایک ہی جگہ سے مٹی کھود کر اور اس کا گارا لے لے کر بنائے گئے ہیں۔ اس وجہ سے زمین میں بڑے بڑے گڑھے ہو گئے۔ انہیں گڑھوں کے کنارے لوگوں نے اپنے مکان بنا لئے ہیں۔ یہ گڑھے پہلی ہی بارش میں پانی سے بھر جاتے ہیں۔ اور گاؤں کے لئے تالاب کا کام دینے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ہمیشہ انہی تالابوں سے نہانے۔ کپڑے اور برتن دھونے۔ مویشی کو پانی پلانے۔ کھانا پکانے۔ پینے اور حوائج ضروری کے واسطے پانی لیا جاتا ہے۔ اس پانی کے

ٹھیرے رہنے کی وجہ سے وہ گڑھے مچھروں کی پرورش گاہ بنجاتے ہیں۔ ایک بارش سے دوسری بارش تک پانی انجرات کی صورت میں اڑتے رہنے کی وجہ سے گندا اور غلیظ ہوجاتا ہے بعض اوقات اس کا منظر اگے ہوئے کنول اور کھجوروں کے پتوں کے سایہ کی وجہ سے بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں میں نئے جراثیم اس تالاب اور اس کے گوناگوں استعمال سے بڑھتے رہتے ہیں۔ ان گڑھوں کے مچھر اکثر ملیریا پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ اگرچہ اور بھی اسباب ہوتے ہیں۔

وہ دیکھو۔ تالاب کے کنارے کے پاس چھوٹے چھوٹے بنگالی بچے بھنبھناتے ہوئے مچھروں کے جھنڈ میں گھاس پر لیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اے ماؤں تم اپنے بچوں کو مچھروں کا شکار بننے کے لئے یہاں کیوں چھوڑ دیتی ہو؟ مائیں اس کا یہ جواب دیتی ہیں کہ:۔

اگر ہم اپنے بچوں کو ان سے بچا کر رکھیں۔ تو دیوتا ناراض ہوجائیں گے۔ اور ہم پر مصیبت کی بارش کردیں گے۔

ایک نہایت عام پسند اور شاندار خیرات کا کام جو کوئی فیاض دولتمند اپنے گاؤں والوں کے لئے کرسکتا ہے۔ وہ ایک نئے تالاب کا بنانا ہے۔ بخلاف اس کے کسی انگریز افسر صحت عامہ کی سب سے اعلےٰ تجویز یہ ہوتی ہے۔ کہ ایسے تمام تالابوں کو مٹی سے بھر دیا جائے۔

ہندوستان میں ملیریا کی وجہ سے صحیح اموات انسانی کا حال

کسی کو نہیں معلوم اس لئے۔ کہ گاؤں میں اندراج اموات
و پیدائش کا کام ضرورتاً قدیم زمانہ کے جاہل چوکیداروں کے
ہی سپرد کیا جاتا ہے۔ جو اُن تمام موتوں کو جو مار گزیدگی
طاعون۔ سر کے ٹوٹنے یا چند اور بیماریوں کے باعث نہوں
کہ جن کو وہ جانتے ہیں بخار کے سبب سے ہی بتایا کرتے ہیں
لیکن ہندوستان میں ملیریا کے باعث تعداد اموات کا اندازہ
کم از کم دس لاکھ سالانہ لگایا جائے۔ تو اس کو مبالغہ نہیں کہہ سکتے
تالابوں کے علاوہ ملیریا اور بہت سے دوسرے مقامات
میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً شہر بمبئی کے سامنے کے پانی کے
گھاٹ جو غیر ضروری اور دنیا کے جہاز رانوں کے واسطے مرگ
آفریں جال ہیں۔ ریلوں کے بند ہیں کہ جن میں پانی کے نکاس
کے لئے کافی راستے نہیں بنائے جاتے۔ پنجاب کے وہ علاقے
ہیں۔ جہاں زمین میں سے پانی رستا ہے۔ صوبہ متحدہ کی جدید
زراعت گاہ ہے۔ جو ہمالیہ کے دامن میں شیر اور دیگر درندوں
کے سکونتی جنگل کو صاف کر کے بنائی گئی ہے۔ دونوں قدرتی طور
سے ملیریا کے مستقر ہیں۔ لیکن دونوں میں حکومت کی زراعتی
آبپاشی کی عظیم الشان تجویز کے ماتحت سیراب کرنے کے لئے
نہریں کھود دی گئی ہیں۔ اور پانی کی نکاس کے راستہ بنائے گئے ہیں
بہر حال۔ ملیریا ملک کی بڑی اور اخراجات طلب آفتوں
میں سے ایک ہے۔ اس وجہ سے ہی نہیں کہ اس سے تعداد اموات کا
اوسط زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس سبب سے کہ وہ صحت

اور معاشرت میں ایسی خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ جو دوسرے امراض کی اقسام کو دعوت دیتی ہیں۔

ہندوستان کے دیسی اختیارات اقتدار کی موجودہ حالتوں میں حکومت کی تدابیر جو ملیریا کے انسداد کے متعلق تھیں وہ بھی حفظ صحت کی تمام دیگر تدابیر کے مانند بُری طرح کچل دی گئی ہیں۔ یہ اقتدار عموماً اپنی بات کی پچ کرتا ہے۔ حالانکہ ترقی کی شاہراہ پر یہ اقتدار گامزن نہیں ہوتا۔

بعض بعض مقامات پر رضاکارانہ خدمت کا جوش پیدا ہو رہا ہے۔ جو اس سرزمین میں نیا اور اجنبی ہے۔ اور اس کو دیکھ کر قدرے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس میں بنگال کی انجمن باہمی معاونتِ انسدادِ ملیریا پیش پیش ہے۔ یہ ہندوستانی مجلس ہے۔ جو دیہاتیوں کو تعلیم کے ذریعہ اصولِ حفظِ صحت پہ کاربند اور ملیریا پر غالب آنے کی تدبیریں بتانے میں مشغول ہے۔ رائے بہادر ڈاکٹر جی۔ سی۔ چٹرجی۔ اس کے خاص کارکن ہیں۔ ان کے معاون ڈاکٹر اے این مترا اور بابو کے این بینرجی بہت تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ یہ شرفا جن کو میں نے خود اُن کے مرکز بینما میں جا کر دیکھا صرف انسدادِ ملیریا کی ہی کوشش میں مصروف نہیں ہیں۔ بلکہ سرمایہ بھی فراہم کر رہے ہیں۔ اس غرض سے کہ بنگالی دیہاتی آبادی کو مغربی تعلیم یافتہ ڈاکٹروں کی خدمات سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے اس پیش بہا تالاب کے علاوہ گاؤں میں کنواں بھی ہوتا ہے

کنوؤں کی گہرائی بیس سے چالیس فٹ تک ہوتی ہے۔ ان کا
پانی زیادہ تر سطحی ہوتا ہے۔ دھوپ میں سوکھی ہوئی اینٹوں سے
اس کی من بنائی جاتی ہے۔ اور من پر ایک موٹی لکڑی رکھدی
جاتی ہے۔ دن میں ہر وقت اس لکڑی اور کنوئیں کی من پر دیہاتیوں
کو جھکے ہوئے۔ کپڑے دھوتے نہاتے دانتوں کو مانجتے اور
کلیاں کرتے ہوئے دیکھو گے۔ پانی جو وہ استعمال کرتے ہیں
چھینٹوں کی صورت میں پاؤں پر گر کر پھر وہیں پہنچ جاتا ہے
جہاں سے نکالا گیا تھا +

ہر شخص پانی بھرنے کے لئے ایک نہایت میلی اور ڈاکٹر کی
نظر سے خطرناک لٹیا لاتا ہے۔ اور اس رسی کے ذریعہ سے
جو ہر کام میں لائی جاتی ہے۔ اس لٹیا کو کنوئیں میں پہنچاتا ہے
اور گھر کو جاتے وقت اپنے بال بچوں کے پینے کے واسطے
پانی اُسی لُٹیا میں بھر کر لے جاتا ہے +

برٹش حکومت کے حفظان صحت کے انتظام کے بڑے مقصدوں
میں سے ایک یہ بھی اہم مقصد ہے۔ کہ گاؤں میں اچھے کوئیں
بنائے جائیں اور اُن کے استعمال کرنے کے مناسب قاعدے
لوگوں کو سکھائے جائیں۔ اب گاؤں میں پختہ کنوئیں اکثر دیکھنے
میں آتے ہیں۔ لیکن فلپائن کی طرح ٹھیک ہندوستان میں بھی
لوگ اپنے قدیم آبائی دستور کی طرف زیادہ مائل ہیں اور
جہاں ممکن ہو سکتا ہے وہ جدید اور محفوظ کنوؤں کو چھوڑ کر اپنی
پُرانی بیٹھنے اور گپ شپ کرنے کی جگہ چلے جاتے ہیں۔ جہاں وہ

سب کے سب بے خبری میں ایک دوسرے کو مسموم کرتے ہیں
بعض جگہ پمپ بھی جو کنوئیں کے محفوظ ہونے اور پانی نکالنے میں آسانی کا باعث ہوتے ہیں۔ لگائے گئے ہیں۔ لیکن قاعدہ یہ پڑ گیا ہے۔ کہ پمپ سے عملی کام نہیں لیا جاتا۔ اس وجہ سے کہ ہندوستانی کے نزدیک مشین خرچ کو بڑھانے والی چیز ہے پرداخت اور استعمال کی چیز نہیں۔ جب کوئی ڈھبری یا چھلا گر پڑتا ہے۔ تو کوئی شخص اس کو لگانے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے وہ بیکار ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی چاہات کا مسئلہ کچھ ہندوستان ہی کے لئے اہمیت کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ ہیضہ پانی سے پیدا ہونے والی بیماری ہے۔ رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ برٹش ہندوستان کے بعض صوبے دنیا میں ہیضے کے جراثیم کے مستقل اور بڑے مرکز ہیں[1]۔

یہ بیماری ایسے پانی کے پینے سے پھیلتی ہے۔ جو ہیضے کے مریضوں کے جراثیم یا اور جراثیم کو منتقل کرنے والے ذرائع سے متاثر ہو چکا ہو۔ یا ایسے کچے یا ناکافی پختہ کھانے سے جو متاثر ہو چکا ہو۔ اس کے جراثیم ایسی آبادی میں زیادہ پرورش پاتے ہیں۔ جہاں لوگ عام طور سے کمزور ہوں قوت حیات میں کم مایہ ہوں اور قوت دافعہ نہ رکھنے والے ہوں۔ اس کو

---

[1] مشرق اقصا میں عالمگیر بیماریوں کا پھیلنا۔ مصنفہ ڈاکٹر لیف نارمن واٹ جمعیت اقوام ۱۹۲۳ء صفحہ ۲
۹۲ فلپائن جرنل آف سائنس ۱۹۱۴ء ڈاکٹر وکٹر جی ہیسر۔

روک دینے کے لئے ٹیکہ لگوانے کا محض ایک علاج ہے لیکن بیماری کے بڑھ جانے کے بعد کوئی علاج نہیں۔ اس سے پندرہ فیصدی سے لے کر نوے فیصدی تک اموات ہوتی ہیں۔ مگر عموماً چالیس فیصدی کے قریب ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں نشیبی بنگال اور وادیٔ گنگا کا رقبہ ہیضہ کا خاص مرکز ہے۔ لیکن یہ بیماری کسی حد تک جزیرہ نمائے (ہند) کے بڑے حصے میں عموماً رہتی ہے[51]۔

سنہ ۱۸۱۷ء سے ہیضے کے دس حملے ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں صوبہ متحدہ پر ہوا۔ اور اس حملے میں مشرق سے مغرب کی طرف اس کی رفتار اتنی تیز تھی۔ کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی[52]۔

معمولی حالات میں جہاں پانی کی بہم رسانی کا انتظام عمدہ اور اصول سائنس کے ماتحت ہے وہاں ہیضہ کا کوئی خطرہ نہیں لیکن اس زمانے میں عظیم اور بنیادی تبدیلیاں حالات کو جلد دگرگوں کر دیتی ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۲۰ء میں روس کے لاکھوں مریض پناہ گزینوں کا اچانک مغربی یورپ میں داخل ہو جانا

---

۵۱ ہیضے کے عالمگیر ہونے کے متعلق یادداشت میجر۔ اے جی۔ رسل ڈائرکٹر حفظانِ صحت احاطہ مدراس۔ لیگ اقوام سنہ ۱۹۲۵ء جس کو اس تمام مضمون کے لئے دیکھنا چاہئے۔

۵۲ ہیضے کے اسباب کی جدید تحقیقات ای ڈی ڈبلیو گریگ ایڈنبرگ طبی رسالہ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

دہشت زدگی کے الزام سے بے خوف ہو کر بین الاقوامی صحت عامہ کے افسر آج کل یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ آیا مقامی کوششیں آئندہ اچانک حملوں کی مدافعت میں ہمیشہ کامیاب ہوتی رہیں گی؟ اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ وہ ہندوستان کے ہیضہ کو ایک شدید بین الاقوامی اہمیت کا ضروری مسئلہ سمجھتے ہیں ؎

ممالک متحدہ امریکہ کو متعدی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جراثیم کو منتقل کرنے والے عنصر کی طرف توجہ کرنی چاہئے ہر ایک متعدی مرض ایسے جراثیم پیدا کرتا ہے۔ جن میں بیماری پھیلانے کی طاقت ایک سوا ایک دن سے لے کر ہمیشہ تک رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ تندرستوں کے ذریعہ سے بھی جراثیم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ ہندوستان سے امریکہ کے شہر نیویارک یا سین فرانسکو تک بمشکل ایک مہینے کی راہ ہے۔ پھر امریکہ کیسے بچ سکتا ہے؟

ایک امریکن ماہر حفظانِ صحت نے جواب بین الاقوامی ملازمت میں ہے کہا کہ جس وقت بھی ہندوستانیوں کو اصلی حالت کا علم ہو گیا تو تمام دنیا کے مہذب ممالک جمعیت کے سر ہوں گے اور لیگ سے مطالبہ کریں گے۔ کہ ہندوستان سے ہمیں بچاؤ ؎

بنگال جو ہیضے کا بدترین رقبہ ہے۔ وسعت میں فرانس کے

برابر ہے۔ اس کے چوراسی ہزار نوسو اکیاسی دیہات ہیں چار کروڑ پینتیس لاکھ نفوس رہتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں جو ہیضہ کا ایک معتدل سال تھا۔ ۱۱۰۵۹۲ دیہات میں ہیضہ پھیلنے کی رپورٹ کی گئی جو ۲۶ اضلاع میں واقع تھے۔ تعداد اموات ۷۴۵۰۰ تھی۔ وقت وبا۔ یعنی وقت ضرورت سے پہلے چار کروڑ پینتیس لاکھ آدمیوں کو ٹیکا لگانے کی ترغیب دینے کے کام کا بھی خیال کیجئے۔ جو ایک بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ ہیضہ کے ٹیکہ کے اثرات انسدادی صرف نوے دن تک رہتے ہیں اور ان تمام دیہاتوں میں کنوؤں کے جراثیم کے ہلاک کرنے کے کام کو بھی تصور کیجئے۔ یہ بھی خیال کیجئے کہ پہلے آپ کو ایسے شکی قسمت پرشاکر اور اکثر مخالفانہ رویہ اختیار کرنے والے لوگوں کو بجائے مجبور کرنے کے ترغیب دینی ہے۔

۲۵-۱۹۲۴ء کے موسم سرما میں ریاست کشمیر کے اندر ہیضے کی وارداتیں ہوئیں۔ انگریزوں نے جہاں تک ممکن تھا حکام ریاست کو حفظ ماتقدم کی ترغیب دی۔ لیکن ریاست کے حکام نے ہندوستانی اصول کی بنا پر کوئی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماہ اپریل میں ہیضے کا ایک زبردست

---

۵۱ ہندوستان کے شمار و اعداد کا خلاصہ ۱۵-۱۹۱۴ء سے ۲۴-۱۹۲۳ء تک۔ صفحہ ۱ اور ۳۸۲۔ صاحب ڈائرکٹر محکمہ حفظان صحت بنگال کی چون ویں سالانہ رپورٹ کے ضمیمہ اول کا صفحہ ۲۸۔ دیکھو۔

حملہ ہوا۔ جس سے ایک ہی مہینے کے اندر تمام ریاست کی آبادی کا دو فیصدی حصہ ہلاک ہو گیا۔ برٹش ہند کی قریبی سرحد یعنی پنجاب میں پہلے ہی محکمہ حفظان صحت اس حد تک ہندوستانی بنایا جا چکا تھا۔ کہ تمام محکمہ میں ایک ہی انگریز باقی رہ گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیس برس میں پہلی بار اس مہلک بیماری (ہیضہ) نے کشمیر کی سرحد سے نکل کر پنجاب کے کسانوں کی بڑی تعداد کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

عام طور پر عالمگیر ہیضے کا خاص خطرہ اُن ہنگامی کثیر التعداد اجتماعات سے پیدا ہوتا ہے۔ جو میلوں تہواروں اور تیرتھوں میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ گذشتہ بارہ برس۔ یا ان سے زیادہ عرصہ کے دوران میں برٹش حکام نے تدابیر حفظان صحت لوگوں کی آمد و رفت کی جگہ اور اجتماع کے مواقع پر یہ کیں کہ عارضی پاخانے بنائے گئے۔ پانی کے لئے نل لگائے گئے۔ کنوئیں صاف کئے گئے۔ ڈاکٹر اور محافظ لوگ مقرر کئے گئے۔ ان تدابیر کا یہ نتیجہ نکلا اور وہ ایسی کارگر ہوئیں کہ جن سے بہت بڑی حد تک ہیضہ کا خطرہ کم ہو گیا۔ کشمیر کا حادثہ آیندہ امکانات کی پیشین گوئی کرتا ہے۔

ہک ورم امعاء کی ایک متعدی بیماری ہے جو مریض کی طاقت کو چوس لیتی ہے۔ اور آخر کار اس کے بدن اور دماغ کو ایسا بیکار کر دیتی ہے۔ کہ وہ نہ اپنے کام کا رہتا ہے۔ نہ دوسرے کے مصرف کا۔ یہ ایسی زمین پر ننگے پاؤں چلنے سے پیدا ہوتی

ہے جہاں سے اسی مرض کے اور مریض جراثیم وغیرہ اِدھر گذرتے ہوں۔ اس کے انسداد کی تدبیریں یہ ہیں۔ (الف) عوام کو پاخانوں کے مناسب استعمال کرنے کی سکھلائی کرنا۔

(ب) لوگوں کو جوتے پہننے کی ترغیب دینا۔

جیسا کہ مسٹر گاندھی نے ظاہر کیا ہے کہ ہندو کسی جگہ پاخانوں میں قضائے حاجت کے لئے نہیں جاتے۔ اور نہ ہی وہ کوئی مناسب جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک قصبہ میں صدر بلدیہ نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ افسر حفظانِ صحت کے حکم کی تعمیل میں اس کی مرضی کے مطابق پاخانے بنا دیئے گئے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ پاخانے یونہی خالی پڑے رہتے ہیں اور قدیم رسم و رواج کے مطابق لوگ سڑکوں۔ کوچوں۔ نالیوں اور اپنے گھروں کے صحنوں میں بیٹھنے سے پاخانہ پھرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ کچھ اس وجہ سے بھی تھا۔ کہ اس قصبے میں اچھوت کم تھے۔ اور کوڑا کرکٹ اُٹھانے والا کوئی موجود نہ تھا۔ جس کو کوئی اچھی ذات والا ہندو ہاتھ لگا ہی نہیں سکتا۔ خواہ وہ اپنے ہی پاخانہ کی بدبو سے دم رُک کر مر جائے۔ اور کچھ اس سبب سے بھی کہ اس میں ہندو مذہب کے رسوم کی پابندی بآسانی ممکن ہے[۱]۔ دیہاتی ہر حال میں گاؤں کے آس پاس کے کھیتوں میں پاخانہ پھرنے کے لئے جاتے ہیں۔ جہاں وہ ہر وقت

---

[۱] ہندوؤں کے رسم و رواج اور تہوار صفحہ ۲۳۶ تا ۲۴۰۔

چلتے پھرتے رہتے ہیں*

ڈاکٹر ایڈی سی شان ہندوستان کے محکمہ حفظان صحت کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے الفاظ میں خلاصہ یہ ہے۔ تم ہک ورم بیماری کا انسداد کیونکر کرسکتے ہو۔ جب کہ لوگ قضائے حاجت کے لئے پاخانوں میں نہیں جاتے۔ اور جبکہ کوئی راسخ العقیدہ کٹر ہندو اور یقیناً کوئی عورت جوتا نہیں پہن سکتی*

ان حالات میں یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ ہک ورم کا علاج شرطیہ مقررہ اور سادہ ارزاں ہے۔ لیکن ایسے مریضوں کا علاج کرنا جو فوراً ہی اس متعدی مرض سے پھر متاثر ہو جائیں۔ عوام کے روپیہ کا بیکار خرچ کرنا ہوگا یہ تخمینہ کیا گیا ہے۔ کہ مدراس کے اسی فیصدی۔ اور بنگال کے ساٹھ فی صدی لوگ ہک ورم کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر اینڈریو بالفور ہندوستان میں اس مرض کے متعلق ایک دلچسپ تخمینہ تحریر کرتے ہیں[1]۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

ایک یقینی احتیاط سے بنائے ہوئے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس ملک کے ساڑھے چار کروڑ مزدور ہک ورم کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں محکمہ تحقیق اعداد وشمار نے

---

[1] سلطنت کا مسئلہ حفظان صحت صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۴*

اندازہ کیا تھا کہ بنگال میں ایک تندرست جسم والے کھیتی کا کام کرنے والے مزدور کی اجرت دس روپیہ ماہانہ ہے۔ ساڑھے چار کروڑ مریض مزدوروں کی اجرت سالانہ سو روپیہ فرض کرتے ہوئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اب ساڑھے چار ارب روپیہ سالانہ کماتے ہیں۔ ضلع دارجیلنگ میں باغات چائے کے منتظمین کہتے ہیں۔ کہ راک فیلر کی تدابیر دافع ہک ورم نے مزدوروں کی استعداد کار کو ۲۵ فی صدی سے اب ۵۰ فی صدی تک بڑھا دیا ہے۔ فرض کرو کہ ہندوستان میں عام طور سے دس فی صدی قابلیت کا اضافہ ہو سکتا ہے اس طرح بھی چار ارب پچاس کروڑ بڑھ کر چار ارب پچانوے کروڑ روپیہ ہو جاتے ہیں۔

پہلے پہل ۱۸۹۶ء میں گلٹی والا طاعون چین سے ہندوستان میں آیا۔ آج ہندوستان دنیا کا خاص[1] گہوارہ جراثیم بنا ہوا ہے۔ اور ۱۸۹۶ء سے اب تک ہندوستان کے طاعون سے ایک کروڑ دس لاکھ آدمی ضائع ہو چکے ہیں۔ اس مرض کے ستر فی صدی مریض مر جاتے ہیں۔ نمونیا کا پلیگ جو بعض اوقات دوسری بیماریوں کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اس سے شاذ ہی کوئی جانبر ہوتا ہے۔

طاعون کو اگر منبع سے نہ روکا جاتے تو وہ ہمیشہ بین الاقوامی خطرہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ ایسا خطرہ جس کی طرف سے

---

[1] مشرق اقصیٰ میں امراض متعدی کا پھیلنا۔ ڈاکٹر ایف نارمن وائٹ صفحہ ۲۱

بین الاقوامی افسران صحت ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں۔ چونکہ تازہ ترین مشاہدات سے یہ بات مسلسل ظاہر ہو رہی ہے کہ یہ مرض اُن ملکوں میں ہی پیدا ہوا ہے۔ جہاں پہلے وہ زمانہ گذشتہ میں کبھی بھی پیدا نہیں ہوا۔

طاعون برخلاف ہیضے کے ایک آدمی سے دوسرے کو نہیں لگتا۔ یہ اُن پسوؤں کے ذریعہ سے آدمی تک پہنچتا ہے جو بیمار چوہے کے جسم سے لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ پسو کاٹتے ہیں تو کاٹی ہوئی جگہ کے گرد ایک زہریلا مادہ رہ جاتا ہے آدمی اس کو کھجاتا ہے تو خراش سے وہ زہر جلد میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور یہ گویا کام کامل ہو جاتا ہے۔ جب کسی گاؤں میں طاعون پھوٹ جائے۔ تو سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ جب طاعون شروع ہو تو مریضوں کو گاؤں فوراً خالی کر دینا چاہئے اور دیہاتیوں کو طاعونی ٹیکہ لگانا چاہئے۔

اکثر ممالک میں طاعون پر اصل میں غلبہ پانے کے واسطے چوہے بھی ساتھ ہی ہلاک کرنے شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن چوہوں کا مارنا ہندوؤں کی سرزمین میں ان کے مذہب کی وجہ سے موثر طریق پر نہیں ہو سکتا۔ افسران حفظان صحت کے کام میں ایک مسلسل دشواری اور خاص سدراہ ہندوستانی آدمیوں کی سہل انکاری اور سخت لے پرواہی ہے۔ جو ان کی قسمت پر شاکر رہنے پر مبنی ہے۔ اور کچھ زمانہ حال کا وہ چالاک سیاسی شورش انگیز کارندہ بھی ہے۔ جو ادھر اُدھر گاؤں میں کانا

پھوسی کرتا پھرتا ہے کہ ایک شیطانی حکومت تمہاری نقصان رسانی پر تلی ہوئی ہے۔ اس قسم کے آدمیوں نے وقتاً فوقتاً یہاں تک اپنے پیروؤں کو دیوانہ بنا دیا ہے کہ انہوں نے محکمہ حفظانِ صحت کے ایک ولیسی کارندہ کو جو اُن کو متاثر رقبے سے باہر نکالنے کے لئے بھیجا گیا تھا مار ڈالا۔

بہرحال حکومت کے حکم کی پیروی کرنے کے کئی مفید نتائج پے در پے دیکھنے سے اب ایک حد تک لوگوں کی حالت میں ترقی رونما ہو رہی ہے۔ ملک کے بعض حصوں میں جہاں طاعون کے متواتر حملے ہو چکے ہیں۔ لوگ چوہوں کے مرنے کے ساتھ ہی خود بخود گاؤں کو خالی کر دینا شروع کر دیتے ہیں اور قریب کے شفاخانے میں بکثرت جا کر ٹیکہ کی درخواست کر دیتے ہیں لیکن بالعموم اُن کی ذہنیت تاریکی میں اسقدر گھری ہوئی ہے کہ ایک ایجی ٹیشن برپا کرنیوالا شخص ان لوگوں کو جھوٹے موٹے چند قصے سُنا کر آسانی سے اُن کو مخالفت کرنے اور تشدد پر اُتر آنے کے لئے مشتعل کر سکتا ہے۔

جب ایک ممتاز ہندوستانی عورت اپنے پلنگ کی پٹی کے پاس کھڑی ہوئی لیڈی ڈاکٹر سے یہ کہہ سکتی ہے کہ میں اپنی زبان کیوں آپ کو دکھاؤں تکلیف تو بہت نیچے بدن میں ہے اور علاوہ اس کے اگر میں اپنا منہ کھولوں تو اس میں اور خبیث روحیں گھس کر داخل ہو جائیں گی۔ یا جب کہ ضلع کا ایک بڑا زمیندار اپنے دس دن کے بچے کے بہت قریب ایک بڑے بندر کو باندھ سکتا ہے۔ اور پھر اس بندر کو غصہ دلا

کرنے کے لئے جسمانی تکلیف دے سکتا ہے۔ تاکہ وہ بچے کی طرف جھپٹے اور غرفش کرے۔ اور اسی طرح اُس بھوت کو بھگا دیوے۔ جو کہ بچے کو تشنج میں مبتلا کر رہا ہے۔ تو اُن جاہل لوگوں سے جو نالاب کے کنارے لیٹے رہتے ہیں۔ کیا توقع ہو سکتی ہے؟

۱۹۲۶ء کے جاڑوں میں مجھے ایک انگریز افسر حفظانِ صحت کے ساتھ ایک ایسے ضلع میں دورہ پر جانے کا اتفاق ہوا جہاں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ پہلا گاؤں جو ہم نے دیکھا۔ وہ غلے کے تاجروں۔ دوکانداروں۔ اور ساہوکاروں کی خوشحال بستی تھی۔ اور قرب و نواح کے دیہات کے کسانوں کی منڈی۔ ہر گھر میں مٹکوں اور کوٹھیوں میں اناج بھرا ہوا تھا۔ چوہوں کی کثرت تھی۔ چوہے مرنے لگے تھے اس کے بعد دو آدمی مر گئے۔ اس پر انگریز حاکم ضلع نے گاؤں کو خالی کرنے کا حکم دے دیا۔

اب یہ تمام لوگ ایک چھوٹے سے عارضی جھونپڑیوں کے گاؤں میں جمع ہو گئے۔ جو کہ اُن کے موضع کے دروازہ سے چند سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ تاکہ موسم بہار کے آغاز اور وباء طاعون کے اختتام کا انتظار کریں۔ سکاٹ لینڈ کا ایک ڈاکٹر جو تیس برس سے یہاں طبی خدمات انجام دے رہا تھا۔ سول سرجن کی حیثیت سے وہاں پہنچا۔ تمام آدمی بچے۔ بوڑھے۔ عورتیں۔ اور مرد

اس کو سلام کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ تاکہ اس کا استقبال کریں۔ اور مشورہ لیں ؁

صاحب اگر ہم یہاں اپنا کھانا پکانے کے لئے آگ جلاتے ہیں۔ تو اندیشہ ہے کہ ہوا چل پڑے اور شعلے بلند ہو کر اُن گھاس پھوس کے گھروں کو خاکستر کر دیں۔ پھر ہم کھانا کس طرح پکائیں۔ براہ عنایت اس کا کچھ انتظام کر دیجئے

دیکھو اس ٹیلے کے اُدھر چولھے بناؤ ؁

آہا۔ ہاں صاحب۔ بیشک یہ ٹھیک ہے ؁

صاحب ہم یہاں اپنے گھروں سے باہر بیٹھے ہیں۔ چور آکر ہمارا اناج لے جائیں تو کیا کیا جائے ؁

کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ چور طاعون سے مر جائیں بہ نسبت اس کے کہ آپ لوگ ہلاک ہوں کچھ فاصلہ پر پہرہ دار بٹھا دیجئے ؁

صاحب بہت عقلمند ہیں۔ اور کیوں صاحب یہاں قریب ہی ایک خیمے میں ایک اجنبی مجہول الحال شخص رہتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ہماری جلدوں میں دوا پہنچائے۔ کیا وہ دوا مفید ہے۔ کیا ہم اس کی بات مان لیں اور اس دوا کی واقعی قیمت کیا ہے؟

خیمہ والا آدمی سرکار کا بھیجا ہوا ہے۔ وہ دوا اُن سب کے لئے جو زندہ رہنا چاہتے ہوں ضروری ہے وہ مفت دی جاتی ہے۔ کوئی قیمت نہیں ؁

کچھ وقفہ گذرتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر نگاہیں ڈالتے ہیں۔ اور پھر اُن کا سردار کہتا ہے:

بیشک یہ بہت اچھا ہوا کہ صاحب تشریف لے آئے جون ہی ہم بڑھے ڈاکٹر نے کہا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ٹیکہ لگانے والا ڈاکٹر ٹیکہ لگانے سے پہلے ان لوگوں سے روپیہ وصول کرتا ہے۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور جب لوگ رشوت نہیں دیتے۔ تو وہ رپورٹ کر دیتے ہیں۔ کہ لوگوں نے ٹیکہ لگوانے سے انکار کر دیا۔ پولیس اور فوج کے علاوہ ہم کسی کو جبریہ ٹیکہ نہیں لگا سکتے۔ یہ نہایت خطرناک کام ہے۔ یہ تو لوٹے ہوئے تیروں سے موت کا مقابلہ کرنا ہے:

اس کے بعد ہم نے اس (مجہول الحال اجنبی) کو ایک خیمے میں لیٹا ہوا دیکھا۔ یہ محکمہ حفظان صحت کا گشتی کمپونڈر ہے۔ جو معمولی عملی جراحی کرنے کنوؤں کی صفائی۔ طاعون کا ٹیکہ لگانے۔ معمولی امراض میں معمولی دوائیں تقسیم کرنے حفظ صحت کے اصول کے متعلق تقریر کرنے اور تصویریں دکھانے کے کام کا واقف ہے۔ اور یہی کرنے کے لئے وہ یہاں بھیجا گیا ہے لیکن اس کے اپنے کہنے کے مطابق وہ ایک مہینے تک اسی خیمے میں بیٹھا رہا:

اس نے شکایت کی - کہ میں روز ان لوگوں کو ٹیکہ لگوانے کے لئے بلاتا ہوں - لیکن وہ انکار کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں :-

"چونکہ تم طاعونی ڈاکٹر یہاں موجود ہو تو طاعون بھی ضروری ہی آئے گا"۔

وہ مجھ پر ہنستے ہیں - وہ ناشائستہ اور جاہل لوگ ہیں۔

ڈاکٹر اس کے سامان کا معائنہ کرتا ہے - اس کی طاعونی صندوقچے کے اندرونی ڈھکنے میں دوا کی خوراک کی مقدار لکھی ہوئی ہے - اس میں پچکاریاں سوئیاں ادویات دافع جراثیم غیر مستعمل پڑی ہوئی ہیں اور ساتھ ہی اس کے اور دواؤں کے بکس میں ہاضمے کے سفوف دلیسی ادویہ اور ٹکیوں کی صورت میں سادہ دوائیں ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا - تمہارے آلات دیکھو - سب زنگ آلودہ ہیں - بعض شکستہ اور بیکار ہیں۔

جس وقت یہ ٹوٹے تھے اسی وقت انہیں صدر کو بھیج دینا لازم تھا - تم جانتے ہو کہ فوراً ان کی جگہ دوسرے بھیج دیئے جاتے - اب تمہارے پاس کوئی آلہ کام کرنے کے لئے نہیں ہے۔

ہاں میں بھیجنا تو چاہتا تھا - لیکن بھول گیا۔

اٹھائیسواں باب

ہندوستان کے نیم حکیم

برہمنوں میں ایک مثل مشہور ہے۔ کہ "چلنے پھرنے سے بیٹھا رہنا بہتر ہے۔ بیٹھے رہنے سے لیٹ جانا بہتر ہے جاگتے رہنے سے سو جانا بہتر ہے۔ اور موت ان سب سے بہتر ہے"۔

ان باتوں پر غور کرتے ہوئے جن کا ذکر گذشتہ باب میں کیا گیا ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہندوستانیوں پر حفظ صحت کے متعلق ان کو اپنی عجیب و غریب عادات کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک امریکن سائنسدان کے الفاظ میں جو اس وقت اس ملک کا مطالعہ کر رہا ہے۔ یہ ہے کہ "ایک مدت دراز تک موریوں کا گندہ پانی جو ان کے پینے کے پانی میں رس کر ملا ہوا ہوتا ہے۔ پی پی کر یہ لوگ ایک حد تک متعدی بیماریوں کے اثرات سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ سب کے سب انتڑیوں کے اجرام کا ایک چلتا پھرتا چڑیا گھر بنے ہوئے ہیں۔ جو ان کے وجودوں پر بھاری بوجھ ڈالے رکھتے ہیں۔ اور جس سے یہ نمونیا۔ اور انفلوئنزا جیسی بیماریوں کو لازماً قبول کرنے کی ہمیشہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ مکھیوں کی طرح مرتے ہیں۔ اور ان میں مطلق

مرض کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہوتی ۔

ان حالات کی موجودگی پر اگر نادان عمر کی شادیوں۔ جماع کی بے احتیاطیوں۔ اور آلاتِ تناسل کی بیماریوں کا اضافہ کر دیا جائے۔ تو ان لوگوں کی جسمانی اور دماغی مصیبتوں کا اور بھی پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدمی سوچنے لگتا ہے۔ کہ جو لوگ ایسی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ اور جنکی پرورش ایسے حالات میں ہوتی ہے۔ کس طرح جیتے رہتے ہیں؟

اس کا جواب یورپ کے ایک نہایت قابل بین الاقوامی صحت عامہ کے ماہر نے ان الفاظ میں دیا ہے :۔

کہ "یہ ایک طبیعت کو حالات کے مناسب کر لینے کا سوال ہے۔ اور زندگی کے ایک درجہ کے انکشاف کی ایک صورت ہے۔ جو یہ گذار رہے ہیں۔ برطانیہ کو ساری دنیا کو خطرہ میں ڈالنے کا یہ الزام دیا جاتا ہے۔ اگر برطانیہ ان لوگوں کی حفاظت نہ کرتی تو شمال کی جنگ جو قوموں نے اُن کو کبھی کا نیست و نابود کر دیا ہوتا"۔

شمالی ممالک کی قومیں بشمول سکھوں کے اور خصوصاً پٹھان اور دوسری مسلمان قوموں کے فائق قوت جسمانی زیادہ تر ان کی بہتر خوراک کی وجہ ہے۔ یہ مضبوط اور تنومند گھر سے باہر رہنے والے لوگ سب کے سب بڑے گوشت خور ہوتے ہیں۔ اور بہت سا دودھ اور غلہ کھاتے ہیں۔ ان کے

مقابلہ میں جنوبی ہندؤوں کی غذا میں ان کے اجسام کے ذرات
کی پرورش کے لئے بہت کم غذائیت موجود ہوتی ہے۔ ان
لوگوں کا گذارہ زیادہ تر مٹھائیوں اور کاربوہائیڈریٹ (دالوں
چاولوں) پر ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں اس حد تک استعمال کرتے
ہیں۔ کہ یہ نشست کی زندگی بسر کرنے کے قابل رہتے ہیں۔
اور یہی وجہ ہے کہ اکثر جنوبی ہندوستان کے لیڈروں کی
زندگیوں کا مرض ذیابیطس جلد خاتمہ کر دیتا ہے[^1]۔

لفٹننٹ کرنل کرسٹوفر۔ آئی۔ ایم۔ ایس نے جو گورنمنٹ
ہند کے سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں اپنے ایک مضمون
میں جس کا عنوان تھا "ہندوستانیوں پر بیماری کی وجہ سے
کیا خرچ ہوتا ہے"۔ لکھا تھا[^2]:۔

ہندوستان میں اموات کی سالانہ تعداد قریباً ستر لاکھ ہوتی
ہے۔ اور یہ تعداد دنیا کے سب سے بڑے شہر لندن کبیر کی
آبادی کے قریباً برابر ہے۔ یوں تو ہر انسان کو ایک نہ ایک
دن مرنا ہے۔ مگر جن کے پاس دولت ہے۔ ان کے لئے تو
ضروری ہے کہ اپنی جان بچانے کے لئے اُسے خرچ کریں۔
ایک بچہ کی زندگی کے پہلے سال ہندوستانی کی "غالب امید زیست"

[^1]: اس مضمون کی مفصل تحقیقات کے لئے۔ میجر ڈی میکے۔ آئی۔ ایم ایس۔ کتاب "پروٹائن الیمنٹس ان نیوٹرلیس" مطبوعہ لنڈن۔ ایڈورڈ آرنلڈ ۱۹۱۲ء دیکھو۔

[^2]: ماخوذ ہو انڈین میڈیکل گزٹ مطبوعہ اپریل ۱۹۲۴ء صفحات (۱۹۶۔ تا ۲۰۰)

تیس سال ہوتی ہے ۔ مگر جب یہ پانچ سال کا ہو جاتا ہے ۔ تو یہ اوسط پینتیس سال کی ہو جاتی ہے ۔ اور یہی ان کی ہر عمر کی بڑی سے بڑی غالب امید زلیست ہوتی ہے" ٭

کرنل کرسٹوفر کی یہ بھی رائے ہے کہ اموات کی اسقدر بھاری اوسط کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے ۔ کہ اس کی بنیاد عالمگیر اور مسلسل بیماری ۔ کمتر مقدار پیدائش ۔ حکومت کے بہت بڑھے ہوئے اخراجات اور سرا پائی ہوئی تجارت ہے کہ جس کی وجہ سے ملک کے ذرائع پر بہت سے ایسے ٹیکسوں کا بوجھ پڑتا ہے ۔ کہ جن کا گو حساب لگانا مشکل ہے ۔ مگر یقیناً اتنے بھاری اخلاقی اور اقتصادی بوجھ کا اٹھانا مشکل ہے ۔ جو ملک کی فلاح و بہبود کے لئے سم قاتل ہیں ٭

اس قدر بھاری اخراجات کی بہم رسانی کے لئے قلت وسائل ہمیشہ نمایاں رہتی ہے ۔ بعض صوبجات کے ۱۹۲۵-۲۶ء کے بجٹ (میزانیہ) میں مندرجہ ذیل رقوم دکھائی گئی تھیں:۔[۱]

	تعلیم	صحت عامہ
احاطہ بمبئی	۱۴۵۰۰۰۰ پونڈ	۲۰۰۹۴۰ پونڈ
احاطہ مدراس	۱۲۹۴۰۰۰ پونڈ	۲۱۹۷۰۰ پونڈ
صوبہ جات متحدہ	۱۱۹۰۲۰۰ پونڈ	۱۰۲۸۵۰ پونڈ
بنگال	۹۰۰۴۰۰ پونڈ	۱۸۳۳۵۰ پونڈ

---

[۱] ملاحظہ ہو "انڈین ایئر بک" بابت ۱۹۲۶ء کے صفحات ۸۹ - ۹۷ - ۱۰۷ - اور ۱۱۸ ٭

حالات کو بہتر کرنے کے لئے راستے تو کھلے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کہ ان پر چلنے والا کوئی نہیں۔ ایک راستہ کا نشان یہ بتاتا ہے[۹۱] "کسی اطمینان بخش ترقی کرنے کے لئے ابتدائی ضرورت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں انسانی ہمدردی اور عوام کی اصلاح کرنے کا ولولہ پیدا ہو تاکہ وہ اپنے وقت روپے اور جسمانی طاقت کے خرچ کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے ان ہموطن بھائیوں کی اصلاح میں لگ جائیں۔ جو ان سے کمتر درجہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں ..... ہندوستان کی تباہ کن شرح اموات کی کہ جن کا بہت بڑا سبب وبائی امراض بھی ہیں۔ اس وقت تک کوئی روک تھام نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ اپنی معاشرتی پابندیوں میں منہمک رہیں گے۔ اور جو صحت عامہ کے لئے بھی ایسی ہی مضر ہیں۔ جیسی اقتصادی ترقی کے لئے"۔

مگر انسانی ہمدردی کا مادہ آج کل ہندوستان میں کہیں نام کو موجود نہیں۔

مسٹر گاندھی نے اس پہلو پر عجیب و غریب روشن خیالی کا اظہار کیا ہے۔ ہندو ڈاکٹروں کی نسبت اظہار رائے کرتے ہوئے وہ یوں کہتے ہیں[۹۲]:۔

---

[۹۱] بیانیہ جس سے ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی کا پتہ چلتا ہے جو اس ملک نے ۲۶-۱۹۲۳ء میں کی۔ (سٹیٹمنٹ اگزیبٹنگ دی مارل اینڈ میٹیریل پراگریس آف انڈیا) مطبوعہ لنڈن ۱۹۲۶ء صفحات (۲۱۱-۲۱۲)

[۹۲] مسٹر گاندھی کا بیان جس کا حوالہ اس بات میں دیا گیا ہے۔ انکی کتاب "انڈین ہوم رول" میں ملیں گے۔ جو گنیش اینڈ کمپنی مدراس نے ۱۹۲۲ء میں طبع کرائی ملاحظہ ہو صفحات (۱۶۱-۱۶۲)

"یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہم لوگ طبابت کا پیشہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟ یہ بنی نوعِ انسان کی خدمت گذاری کرنے کی غرض سے تو ہرگز اختیار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہم ڈاکٹر صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ہمیں عزت اور دولت حاصل ہو"

پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

"یوروپین ڈاکٹر سب سے بُرے ہوتے ہیں"۔

اپنے اس الزام کی تفصیل کرتے ہوئے مسٹر گاندھی کہتے ہیں:۔

"یہ (یوروپین) ڈاکٹر ہمارے مذہبی احساسات کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ان کی دواؤں کے بہت سے مرکبات میں حیوانی چربی یا شرابیں ملائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور یہ دونوں ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہب میں ممنوع ہیں"۔

پھر آگے چل کر زیادہ وضاحت سے فرماتے ہیں:۔

"اگر میں اپنی اشتہا سے زیادہ غذا کھا جاؤں گا۔ تو مجھے بد ہضمی ہو جائیگی۔ چنانچہ میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ مجھے دوائی دے گا تو میں اچھا ہو جاؤنگا۔ میں پھر اشتہا سے زیادہ غذا کھا جاؤنگا اور میں پھر اسی ڈاکٹر کی گولیاں استعمال کروں گا۔ اگر میں نے یہ گولیاں پہلی ہی بدہضمی کے وقت استعمال نہ کی ہوتیں۔ تو میں اس سزا کو بھگت لیتا جس کا کہ میں زیادہ غذا کھانے کی وجہ سے مستحق تھا۔ اور پھر میں اشتہا سے بڑھ کر کبھی کھانے کا نام نہ لیتا...... لہذا ثابت ہوا کہ متواتر دواؤں کے استعمال سے انسان کا اپنے دل پر کوئی قابو نہیں رہتا"۔

آخر میں مسٹر گاندھی فرماتے ہیں کہ "ان حالات کی موجودگی میں ہم اپنے ملک کی خدمت کرنے کے ناقابل ہیں لہذا ثابت ہوا کہ یوربین علم الادویات کے پڑھنے سے ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے جائیں گے"۔

مسٹر گاندھی کے اس فیصلہ کی نسبت خواہ کچھ بھی خیال کیا جائے ان کی ایمانداری کی نسبت کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان مغربی طبابت پیشہ لوگوں کی جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں قدر وقیمت اور ان کے طریق ہائے کار کی نسبت ایسی رائے رکھتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ کہ گورنمنٹ اور اس کے سب کاموں کے خلاف کہ جن میں سررشتہ تعلیم بھی شامل ہے عدم تعاون کا پرچار کرانے کے زمانہ میں مسٹر گاندھی طبی اور صحت عامہ کے سکولوں میں تعلیم پانے والے طلبا پر بھی یہ زور نہ دیتے کہ وہ اپنی تعلیم فی الفور چھوڑ دیں اور اپنے سکولوں کو بائیکاٹ کر دیں۔ انہوں نے بچوں کی طرح تھوڑے زمانہ تعلیم چھوڑ دی۔ اور ہندوستان کو کس قدر نقصان پہنچا!

ہندوستانی قومیت پسندی کی اس تصویر کا دوسرا رخ وہ پرزور کوشش اور جدوجہد ہے جو آیورویدک یا ہندوؤں کے قدیم طریق علاج کی نسبت کی جا رہی ہے۔ جس کے مطابق آج بھی بیشمار ہندوستانیوں خصوصاً بنگال کے جنوبی اور وسطی ہندوستان میں علاج کیا جا رہا ہے۔

تسلیم کیا جاتا ہے کہ آیورویدک علاج کے اصول قدیم زمانے کے

دیوتاؤں کے قائم کئے ہوئے ہیں۔ جو روحانی اور برگزیدہ ہیں ویدک طب کی خوبیوں کے نہایت مختصر حالات "سشرتا سمہیتا" کے مندرجہ ذیل خلاصہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔ جو اُن وویں سے ایک فاضلانہ کتاب ہے۔ جس پر اس طب کے اصولوں کی بنیاد قائم ہے[1]۔

"ایک مریض کی صحت یا عدم صحت کی اس انداز سے پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ جو اُس قاصد کی شکل و صورت۔ گفتگو۔ لباس طرزِ کلام سے معلوم ہوتی ہے۔ جو وید صاحب کو بلانے کے لئے بھیجا جائے۔ یا چاند کی ان گردشوں سے پتہ لگ سکتا ہے۔ جو وہ مختلف برجوں میں اس وقت لگا رہا ہو۔ جس وقت کہ یہ قاصد وید صاحب کے پاس پہونچا ہو اکے اس رُخ سے لگایا جا سکتا ہے جس رخ پر یہ قاصد کے پہنچنے کے وقت چل رہی ہو۔ یا اُن شگونوں کی نوعیت سے لگ سکتا ہے جو یہ قاصد راستے میں آتا ہوا دیکھے۔ یا خود وید صاحب کی اس طرز گفتگو سے لگ سکتا ہے۔ جو وہ قاصد کے ساتھ کریں۔ اگر وید صاحب کو بلا کر لیجانیوالا قاصد خود مریض کے ہی مذہب و ملت کا آدمی ہو۔ تو خیال کر لینا چاہئے کہ شگون اچھا ہے۔ اور اگر یہ قاصد مریض کے مذہب و ملت کا نہ ہو۔ تو جان لینا چاہئے کہ مرض مہلک صورت اختیار کرے گا۔ اور مریض کا انجام بخیر نہیں ہوگا"۔

جدید آیورویدک طب کے متعلق بہت سی کتابیں شائع

---

[1] ملاحظہ ہو ترجمہ از کوبراج کنجالال بشاگ رتنا۔ صفحہ (۲۷۰)

ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ سُشرتا کا علم الادویہ اور علم جراحی جو آج سے دو ہزار برس پہلے کا ہے۔ جدید مغربی سائنس سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ چونکہ اُس وقت سے اب تک آیورویدک طریق علاج میں کوئی بہت بڑا انقلاب پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے یہ طریق علاج عملی طور پر ہر طرح سے مکمل ہے۔ سر پیٹرک ہیر لکھتے ہیں[1]:۔

آیورویدک طب کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ بیماریاں ارواح خبیثہ (بھوتنوں) کی کارروائیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو بہت سی نذر نیاز دینے اور منتر جنتر سے رفع ہو سکتی ہیں۔ بچوں کی بیماریوں کی نسبت کہا جاتا ہے[2] کہ یہ بیماریاں ان روحوں کی کارروائیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو موت کے دیوتا کے دربار میں اعلےٰ ترین رتبہ ملنے سے محروم ہو گئے تھے۔ اور جو اپنی طاقت ان والدین کو تکلیف پہنچا کر قائم کرنے پر مجبور ہوئے تھے کہ جنہوں نے اپنے بچوں کی پیدائش کے لئے ہزارہا قسم کے پاپ کئے تھے۔ آیورویدک طب کی کتابوں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی خاص صحت بخش نسخہ جات نہیں ملتے جدید کتابوں میں ایسے نہایت پیچیدہ نسخے درج ہیں۔ جن کی نسبت لکھا ہو

---

[1] کتاب "دی میڈیکل پروفیشن ان انڈیا" مصنفہ میجر جنرل سر پیٹرک ہیر۔ آئی۔ ایم ایس۔ مطبوعہ ہنری فروڈی اینڈ ہوڈر وسٹوٹن لنڈن ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۰۴ ؛

[2] یہ حصہ کویراج نگیندر ناتھ کی کتاب "دی آیورویدک سسٹم آف میڈیسن" سے نقل کیا گیا ہے۔ جو کلکتہ میں تین جلدوں میں ۱۹۰۹ء میں چھپی ہے ؛

ہے۔ کہ یہ نامردی اور سوزاک کے انتہائی درجات میں صحت بخش ثابت ہوئے ہیں۔ اور بعض نسخے ایسے درج ہیں۔ جو عورتوں کی ہر ایک بیماری کے لئے چاہئے وہ کسی سبب سے پیدا ہوئی ہو۔ مفید بتائے گئے ہیں"۔

آیور ویدک طب کے علم جراحی کے متعلق میں نے جو کچھ کر ذاتی تحقیقات کی ہے اس کی نسبت میں صرف دو مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ پہلی مثال تو یہ ہے کہ مدراس پریذیڈنسی کے ایک ہسپتال میں ۱۹۲۵ء کے ایک دن ایک چھوٹا لڑکا داخل ہوا تھا جس کا بازو ایک پارسل کی صورت میں بندھا ہوا تھا۔ اس لڑکے کو ایک بڑے مشہور و معروف آیور ویدک ڈاکٹر نے بھیجا تھا اور ہسپتال کے انچارج انگریز سرجن سے التجا کی تھی۔ کہ وہ اس لڑکے کے بازو کو مناسب جگہ پر بٹھا کر سی دے۔

اس مریض کے مرض کا قصہ یہ تھا کہ بازو میں ایک مرکب زخم آگیا تھا۔ اور اس کی ہڈی ٹوٹ کر زخم میں سے جلد کے باہر نکل آئی تھی۔ آیور ویدک ڈاکٹر صاحب نے پہلے تو اس کھلے زخم پر گائے کا گوبر لگایا تھا۔ اور پھر اس کے اوپر کسی درخت کی تازی چھلی ہوئی چھال سے چوبی پٹیاں نہایت کس کر باندھ دیں۔ چونکہ موسم نہایت گرم اور خشک تھا۔ اس لئے یہ چھلکا بہت جلد ہی خشک ہو کر سکڑ گیا۔ اور اس نے پورے زور کے ساتھ زخمی بازو جکڑ لیا۔ اس سے دوران خون رک گیا۔ گوشت سڑ گیا اور بازو کہنی سے بیکار ہو گیا تھا۔ مریض کے بازو کی یہ حالت دیکھ

آیورویدک طبیب کو عین وقت پر خیال آگیا - کہ وہ اپنے ہم پیشہ (انگریز ڈاکٹر) کی امداد حاصل کریں - اور مغربی سوئی سے اس غریب کا باز وسلوائے ٭

دوسری مثال اسی صوبہ کے ۱۹۲۶ء کی ہے - ایک آیور ویدک ڈاکٹر نے اپنی طب کے اصول کے مطابق ایک ایسے مریض پر جراحی عمل کرنے کی کوشش کی - جس کی ایک گلٹی پھولی ہوئی تھی - اس ڈاکٹر نے اس مریض کو کوئی بیہوش کرنیوالی دوائی سنگھائے بغیر گلٹی کو کھول دیا - ڈاکٹر کی نشتر کا اندر داخل ہونا تھا کہ مریض اچھل پڑا - جس سے ایک خونی شریان کھل گئی اور پیٹ کی آبدار جھلی پھٹ گئی - وید صاحب چونکہ جراحی کے علم سے بالکل لاعلم تھے - لہذا وہ مریض کو اٹھا کر ایک پاس کی سرکاری ڈسپنسری میں لے گئے جہاں ڈسپنسری کا مہتمم ہندوستانی ڈاکٹر تھا - جس نے خوف کے مارے اس مریض پر ہاتھ نہ ڈالا - اور یہ کہہ کر ٹال دیا :-

"میں ایسے مریضوں کا علاج کرنے کے لئے نہیں ہوں میں تو جراحی کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے عملوں کے لئے مقرر ہوں بہتر ہے کہ آپ اس مریض کو بڑے ہسپتال میں لے جائیں"

مگر ہسپتال میں پہونچائے جانے سے پہلے بیچارہ مریض چل بسا ٭

اس پر پولیس نے قتل عمد کا مقدمہ ان وید صاحب کے خلاف دائر کر دیا - جس میں ہندوستانی ڈاکٹروں کی ایک ایسوسی ایشن نے

ن میں بہت سے مغربی سند یافتہ اور سرکاری ملازم بھی تھے۔
نہ صرف ملزم کی طرف سے جواب دعوے پیش کیا بلکہ مقدمہ کا
یفنس کیا اور اخراجات بھی ادا کئے۔ اور کہا۔ کہ ہمارا پرانا اور
مدہ طبی طریقہ بدنام نہ ہو۔ ان کے مقرر کئے ہوئے وکلا نے
پہلے تو ملزم کو ایک اصطلاحی سقم کی وجہ سے ضمانت پر رہا کرا لیا
اور بعد میں اس بچارے ڈسپنسری والے ڈاکٹر پر مجرمانہ دیر کرنے
کے جرم میں مقدمہ چلوا دیا۔

اس پرانے طریق علاج کی خوبی کی نسبت عام دلائل یہ پیش
کی جاتی ہیں۔ کہ یہ عوام کو بہت سستا پڑتا ہے اور یہ کہ ہندوستانیوں
کی طبیعتوں کے لئے خاص طور پر موافق ہے۔ کہ دیوتاؤں کا بنایا
ہوا اور منظور کردہ ہے۔ آخری دلیل کو نظرانداز کر کے اور
اس کی بحث پر قطع نظر کر کے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک آیور
ویدک شفاخانہ قائم کرنے پر اتنا ہی روپیہ خرچ ہوتا ہے۔
جتنا کہ ایک ڈاکٹری علاج کی ڈسپنسری قائم کرنے پر ہوتا ہے۔
اور یہ کہ آج تک کوئی ایسا مادی فرق نہیں نکالا گیا۔ کہ مغربی ادویات کا
اثر گورے آدمیوں پر کچھ اور ہوتا ہو۔ اور کالے آدمیوں پر
اس کے برعکس ہوتا ہو۔

مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات سے تو دیسی ادویات میں پھر سے
جان پڑ گئی ہے۔ چونکہ صوبجاتی وزرا کے عہدوں کے ملنے کا انحصار
محض عام لوگوں کی آرا پر ہوتا ہے۔ لہذا وہ مجبور ہیں کہ سرکاری
روپے سے آیورویدک اور یونانی کالجوں ہسپتالوں۔ اور

ڈسپنسریوں کے قائم کرنے کے لئے خرچ کرنے کے حق میں رہیں انڈین نیشنل کانگریس کے اس دعوے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ آیورویدک ادویات بھی اسی طرح سائنس کے اصولوں پر مبنی ہیں جس طرح کہ مغربی ادویات اور سر رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شاعروں کے یہ پُرجوش الفاظ سُنکر کہ "آیورویدک سائنس کے مقابلہ میں یورپ کوئی سائنس پیش ہی نہیں کرسکتا"۔ اور یہ ملاحظہ کرکے کہ "سواراجی لوگ عام طور پر اس سائنس کو اس لئے ترقی دینا چاہتے ہیں۔ کہ یہ ان کے اپنے وطن کی ایک نعمت ہے"[۱] آپ لوگوں کے سامنے وہ مایوس کن نظارہ آجائے گا۔ جو ہندوستان جیسے بیماریوں سے مارے ہوئے ملک میں ادویات اور صحت عامہ کے متعلق پیش کیا جارہا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہاں اس سائنس کی وہی مٹی پلید کی جارہی ہے جو ویسٹ انڈین جبشیوں نے "ووڈو ڈاکٹرنگ" قائم کرکے پلید کی تھی ؛

اس بارہ میں کہ ہندوستان کے عوام ابھی تک دیسی علاج کے دلدادہ ہیں۔ کوئی کلام نہیں۔ یہاں کے معالجوں کو بھی "ووڈو ڈاکٹروں کی طرح سے چند اچھی جڑی بوٹیوں کا استعمال سکھا دیا جاتا ہے اور انہیں سے یہ لوگ کچھ مریضوں کو اچھا کرکے اپنا رعب وداب قائم رکھتے ہیں ؛

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خود مسٹر گاندھی جو عام طور پر اور بڑے زور شور سے یہ اعلان کیا کرتے تھے۔ کہ "ہسپتال ایسے مقامات ہیں جنہیں گناہ ترقی کرتا ہے"؛

[۱] ملاحظہ ہو کتاب "انڈین ہوم رول" صفحہ (۶۱)

اور یہ کہ "یورپین ڈاکٹر سب سے بڑے ہوتے ہیں" اور یہ کہ :-

ہندوستان کے نیم حکیم ان ڈاکٹروں سے اچھے ہیں جو اپنا رعب قائم رکھنے کے لئے ہر وقت تیوری چڑھائے رہتے ہیں[1]

پہلو کے درد کے عارضہ سے بیمار پڑ گئے "

چونکہ وہ اس زمانہ میں جیل خانہ میں تھے۔ لہٰذا ایک انگریز ڈاکٹر جو ہندوستانی طبی محکمہ کا رکن تھا۔ اور جس نے مسٹر گاندھی کی متذکرہ بالا باتیں سنی ہوئی تھیں۔ سیدھا اُن کے پاس چلا گیا اور کہا "مسٹر گاندھی میں افسوس سے آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ مرض اپنڈے سائٹس (التہاب زائدہ) میں مبتلا ہیں ۔

اگر آپ میرے زیر علاج ہوتے تو میں فوراً آپ پر عمل جراحی کرتا مگر غالباً آپ اپنے کسی آیورویدک ڈاکٹر کو ترجیح دیں گے" ۔

مسٹر گاندھی کا ارادہ اس کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ اس انگریز جراح نے کہا کہ "بہتر یہ ہے کہ میں آپ پر عمل جراحی نہ کروں کیونکہ اگر اس سے خدانخواستہ کوئی اور خرابی پیدا ہو گئی تو آپ کے تمام دوست اس کا الزام ہم انگریزوں پر لگائیں گے۔ جو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ آپ کی خوب حفاظت کریں" ۔

اس کے جواب میں مسٹر گاندھی نے کہا :- کہ اگر آپ عمل جراحی کرنے پر تیار ہیں۔ تو میں ابھی اپنے دوستوں کو بلا بھیجتا ہوں اور ان کو یہ سمجھا دیتا ہوں۔ کہ آپ نے یہ عمل میری درخواست پر کرنا منظور کیا ہے ؟

---

[1] ملاحظہ ہو۔ کتاب "انڈین ہوم رول" کا صفحہ (۶۲)

چنانچہ مسٹر گاندھی اپنی خوشی سے اس ہسپتال میں چلے گئے "جس میں گناہ کرنا سکھلایا جاتا ہے" جہاں ان کا عمل جراحی ہندوستان کے طبی محکمہ کے "سب سے بڑے انگریز ڈاکٹر" نے کیا اور ان کے صحتیاب ہونے تک ایک انگریز نرس ان کے سرہانے بیٹھی رہی۔ جس کی نسبت ان کا خیال بعد میں یہ ہوا کہ یہ بڑی مفید ہستی ثابت ہوئی ہے ؁

انتیسواں باب

اقتصادی آئینہ میں معائنہ نفسیات

ہمیں اسپر ہمیشہ اتفاق رہا ہے کہ کسی ملک کے لوگوں کی فلاح وبہبود کا انحصار ہمیشہ اقتصادی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ گذشتہ صفحوں پر ہندوستان کی اقتصادی حالات کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اب میں ان پر کچھ اور اضافہ کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس اضافہ سے میری مراد یہ نہیں کہ مزید حالات کی جانچ پڑتال کروں۔ اور ان کی نسبت دعوے کروں کہ یہ حاوی ہیں۔ بلکہ یہ محض زندوں کے ملک کے خیالات پریشان ہیں جو اپنی حالت اور مقصد دونوں کے لحاظ سے بالکل غیر سیاسی ہیں ؁

ہندوستانیوں کو ان شکایات کے علاوہ جن کا ذکر پہلے

کیا جا چکا ہے۔ اور شکایات بھی ہیں۔ جن کو وہ ملک کی گری ہوئی حالت سے موسوم کرتے ہیں۔" اقتصادی لوٹ" ذو معنی نام دیتا ہے۔ ان معاملات سے مقابلہ کرنے پر جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ شکایتیں بالکل سطحی معلوم ہوتی ہیں اور ان سے اصلی مطلب خبط کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ اس اقتصادی لوٹ مار کا جو کچھ کہ مقصد مجھے نظر آتا تھا۔ اس کا ذکر میں نے اس کتاب کے متن میں کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندوستانی سیاسی کی فہرست میں ان میں کوئی بھی شامل نہیں۔ مگر وہ ان کی بجائے "کپاس۔ چائے۔ گورنمنٹ کے تمسکات پر کا سود۔ گندم کی برآمد۔ فوج رکھنے کے اخراجات۔ اور ہندوستانی سول سروس کے انگریز افسروں کی تنخواہ" کے عنوان قائم کرتا ہے۔

ان معاملات یا کسی اور معاملہ کی ہندوستانیوں کے نقطۂ نگاہ سے اپنے خیالات کا مقابلہ کر کے جانچ پڑتال کرنے کا انجام سوائے مایوسی اور گورکھ دھندے کو بگاڑ کر رکھ دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہندوستانیوں کا قاعدہ ہے کہ اگر معاملہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ تو وہ اسے چھوڑ کر اور ایسی باتوں کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ جن میں ان کا ہاتھ پڑتا ہو۔ چنانچہ ان مدات کا جنکے عنوان اوپر قائم کئے گئے ہیں۔ مختصر ذکر کرنے سے ایک ہندوستانی کی اس عادت کا انکشاف ہو جائیگا ؛

کپاس کی نسبت ایک ہندوستانی بڑے زور و شور سے یہ کہتا رہتا ہے کہ ملک کی کچی پیداوار خود غرضی سے (داکٹمی) کر کے

انگلستان کو اس غرض سے لیجائی جاتی ہے کہ لنکا شائر کے باشندے کام میں لگے رہیں۔ اور اُسے کپڑے کی صورت میں تبدیل کر کے ہندوستان بھیج دیا جاتا ہے۔ اور یہاں کے لوگوں کو اس کی خریداری پر مجبور کیا جاتا ہے ؛

درحقیقت امور واقعہ یہ ہیں ۔ (الف) انگلستان کی منڈی ہندوستانی کپاس کے خریداروں میں چھٹے نمبر پر ہے۔[۵۱] (ب) ہندوستانی کپاس ادنےٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ اسکی کاشت بے قاعدہ طور پر کی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کم ہوتی ہے اس کا وزن بڑھانے کی خاطر اس میں بہت سی ملاوٹیں ملائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس سے انگریزی کپڑا بننے والوں کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں ۔ (ج) لنکا شائر کی کھڈیوں کے لئے کپاس امریکہ اور سوڈان سے آتی ہے۔ اور (د) اس تھوڑی سی ہندوستانی کپاس سے جو سلطنت متحدہ میں جاتی ہے۔ لیمپوں کی بتیاں چیزیں صاف کرنے کے جھاڑن اور دوسرے نہایت ادنےٰ قسم کے کپڑے بنے جاتے ہیں ؛

اس اثر کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ہندوستانی کپاس کی درآمد کی تجارت پر پڑ رہا ہے ؛

ان دو اثرات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جن سے انگلستان اور ہندوستان یکساں طور پر موثر ہو رہے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو گورنمنٹ نے اس سوتی اسباب کا جو ہندوستانی کارخانہ میں تیار ہوتا ہے۔ محصول اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور یا سیر

---

[۵۱] ملاحظہ ہو۔ ضمیمہ سوئم الف کتاب ہذا۔

کسی برطانوی نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ اس محصول کے اڑ جانے سے انگلستان میں مال کی درآمد کم ہو جائے گی۔ اور ہندوستان میں مال زیادہ بننے لگے گا۔ دوسری طرف واقعات یہ ہو گئے ہیں۔ کہ ہندوستان کے لوگوں کو سال بہ سال خرچ کرنے کے لئے زیادہ روپیہ ملتا جا رہا ہے اور ان کی خرچ کرنے کی عادت بڑھ رہی ہے۔ اور یہ کہ ہندوستانی نفیس کپڑے کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستانی کپڑا زیادہ تر گاڑھا اور کھُردرا ہوتا ہے۔

باوجود اس کے کہ منڈیاں کھلی ہیں۔ کہ نفیس کپڑا بنانے میں جاپان مقابلہ کر رہا ہے۔ کہ مہاتما گاندھی کے گھر کے کتے ہوئے سوت کا گاڑھا کپڑا موجود ہے۔ مگر ہندوستان پھر بھی اس بات پر تلا ہوا ہے کہ لنکا شائر کا بنا ہوا نفیس کپڑا خریدے۔

اندریں اثنا گورنمنٹ نے کپاس کی کاشت کو ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس نے اس کوشش سے کہ کپاس کی کاشت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ان رقبہ جات میں جہاں کپاس کی کاشت زیادہ ہوتی ہے۔ تجرباتی[1] بیت قائم کر دیئے ہیں۔ اور اچھے نمونہ کی کپاس پیدا کرنے کے مقامات مخصوص کر دئے ہیں۔ کپاس کے کھیتوں کو معائنہ کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اور اصلاح یافتہ آلات کشاورزی[2] اور اچھا

---

[2] ان آلات کی پہلے امریکہ سے درآمد کی جاتی تھی اور اب یہ ہندوستانی محنت مزدوری سے سرکاری زراعتی سٹیشنوں میں بننے لگے ہیں۔

بیج مہیا کیا جاتا ہے[۱]۔ اور اسباب کی پوری کوشش کی جا رہی ہے
کہ کپاس کی قیمت فروخت میں اضافہ ہوتا رہے ۔

ایک امریکن ماہر کا قول ہے کہ "درحقیقت ہندوستان کپاس
کی کاشت کے لئے ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کی نسبت بہترین
ملک ہے مگر یہاں کے لوگ یہ کام پوری تن دہی سے نہیں کرتے
اور سواراجی سیاست داں اس کام کو ترقی دینے میں بدیں وجہ
مزاحم ہیں کہ ان کی مرضی نہیں کہ ہندوستان والے ایسی روئی
کی کاشت کریں جو لنکا شائر والے استعمال کریں اور اس طرح
انگلستان کو مدد ملے" ۔

ہندوستان کے چوٹی کے سیاست داں اس صورت
حالات سے یا تو لاعلم ہیں۔ یا ان کی پروا نہیں کرتے کیونکہ انہوں
نے کئی دفعہ مجھے بڑے زور سے کہا ہے ۔ کہ "انگلستان ہماری
کپاس اس لئے لے جاتا ہے کہ وہاں کے بیکار مزدور کام میں
لگے رہیں ۔ اور پھر اسی کا کپڑا بن کر ہمارے ملک میں واپس
لے آتا ہے ۔ اور ہمیں اس کے خریدنے پر مجبور کرتا ہے ۔ لہذا
ہماری کپاس کا تمام منافع اسی کی جیب میں چلا جاتا ہے ۔ اور
ہندوستان مفت میں لوٹا جا رہا ہے ۔ کوئی بھی ملک ایسی لوٹ کو
برداشت نہیں کر سکتا" ۔

اس کے جواب میں میں نے کہا :- کہ کپاس امریکہ میں بھی
پیدا ہوتی ہے جس میں سے کچھ انگلستان خرید کر اور اس کا کپڑا

---

[۱] یہ بیج امریکہ کے ذخائر سے منگوایا جاتا ہے ۔

بُن کر پھر امریکہ ہی کے ہاتھ بیچتا ہے۔ ہم لوگ (امریکہ والے) اپنے ملک کا بنایا ہوا مال اس شخص کے ہاتھ بخوشی تمام بیچ دیتے ہیں۔ جو ہمیں زیادہ قیمت دیتا ہے۔ اور ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ چیز کسی ملک سے بھی ملے خرید لیتے ہیں۔ اور ہم اپنی روئی کا کچھ کپڑا خود بھی بن لیتے ہیں۔ ان صورتوں میں یہ فرمائیے کہ آپ کے ملک میں اور امریکہ میں کیا فرق ہے"؟

یہ سنکر ہندوستانی سیاست داں نے جھٹ کہدیا:-

"مگر چائے کے سوال پر تو ذرا غور کیجئے۔ ہمارے ہاں چائے کی بڑی بڑی فصلیں ہوتی ہیں۔ اور اس تمام چائے کو ہندوستان کے باہر کھینچ لیجایا جاتا ہے اور اس طرح ہمارے ملک کو تباہ کرنے والی ایک اور لوٹ کی جارہی ہے"۔

اسپر میں نے سوال کیا:- کہ "کیا آپ اپنے ملک کی چائے بیچ دیتے ہیں یا مفت میں دیدیتے ہیں"؟

مجھے جواب ملا کہ "یہ سچ ہے کہ ہم بیچ دیتے ہیں۔ مگر کوئی بھی صورت ہو۔ آخر چائے تو یہاں سے نکل جاتی ہے"۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں تیسری لوٹ یہ بچائی جا رہی ہے۔ کہ گورنمنٹ کے مفاد عامہ کے واسطے لئے ہوئے روپے کے تمسکات کا سود وصول کر کے لنڈن بھیجدیا جاتا ہے۔ اس شکایت کی مقبولیت مختصر طور پر ریلوے کی واحد مثال دینے سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلی ریلوے لائن کی تکمیل ۱۸۵۳ء

میں ہوئی تھی اور اخیر مارچ ۱۹۲۴ء تک اس ملک میں (۳۸۰۳۹) میل پر ریلیں چل رہی تھیں[1]۔ جنیر ۱۹۲۵ء میں فی میل کے حساب سے اتنے مسافروں نے سفر کیا۔ جن کی تعداد اس عرصہ کے ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کی ریلوں کے سفر کرنے والے مسافروں سے ساڑھے چار گنا زیادہ تھی۔

اس معاملہ کے متعلق جس کا ذکر ہو رہا ہے اگر ہم امریکہ والوں اور ہندوستانیوں کے علیحدہ علیحدہ خیالات پر غور کریں۔ تو ہندوستان کی اقتصادیات پر مزید روشنی پڑتی ہے جب امریکہ والوں نے اپنے ملک میں ریلیں چلانی چاہیئں۔ تو ان کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا۔ کہ یہ قرضہ لئے بغیر اس کام کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس روپے کا نصف یورپ سے (جس میں بہت زیادہ قرضہ کی رقم برطانیہ عظمیٰ کی تھی) قرض لیا۔ جس سے ریلیں تیار کی گئیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو پوری امید تھی۔ کہ وہ یہ قرضہ اس کثیر منافع سے اتار لیں گے جس کے ملک میں ذرائع آمد و رفت کے بڑھ جانے سے ہونے کی توقع تھی۔ امریکہ کی ان ریلوں پر ۱۹۱۴ء تک قریباً خرچ ہی خرچ ہوتا رہا۔ اب ہندوستان کی سنئیے کہ جب یہاں ریلیں چلائی جانے لگیں تو یہاں بھی روپے کے نہ ہونے کی دقت پیش آئی۔ مگر یہاں یہ صورت نہ تھی۔ کہ روپے کی کمی ہو۔ بلکہ یہ دقت تھی کہ ہندوستانی سرمایہ دار بہت زیادہ شرح سود کے بغیر روپیہ

---

[1] ملاحظہ ہو سٹیٹیکل ایبسٹرکٹ کا صفحہ ۶۱۴۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب ہذا کا ضمیمہ سوئم (م ب)

دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ لہذا ہندوستان نے (اپنے مفاد کی خاطر) اپنی ریلوں کی لاگت کا عملی طور پر سارا روپیہ سب سے کم سود لینے والی منڈی یعنی لنڈن سے قرضہ لیا اور اس کا سود ۲۰۵ سے ۵ فیصدی تک (جس کی اوسط ۳۰۵ فیصدی ہوتی ہے) دینا کیا۔ یعنی یہ روپیہ اتنی کم شرح سود پر لیا گیا۔ جس پر دنیا کی کوئی قوم روپیہ نہیں دے سکتی۔

انہی قرضہ جات پر اب سالانہ سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس کو ہندوستانی نکتہ چیں ہمیشہ ناقابل تلافی نقصان بلکہ ملک کے ذرائع پر "چھاپہ یا لوٹ" کے نام سے نامزد کرتے رہتے ہیں۔
سنہ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ہند کو ان ریلوں سے سود کی آمدنی سے نقصانات کی رقوم اور سالانہ اخراجات کی منہائی کے بعد (۲۰۰، ۴۳۷، ۱۲) پونڈ خالص منافع ہوا۔[1]

ریلوں کے متعلق مسٹر گاندھی کے مندرجہ ذیل خیالات جو ان کے برطانیہ کی مخالفت کے پراپاگنڈا میں خاص اہمیت رکھتی ہیں:-

اچھا سفر وہی ہے جو آہستہ رفتار سے کیا جائے۔ لہذا اس سفر کو ریلوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ ان لوگوں میں جو بھلائی کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔۔ عجلت نہیں ہوتی ۔۔۔۔ برائی کرنیوالے کے پر لگے ہوئے ہوتے ہیں ۔۔۔۔ لہذا ریلیں صرف برائیوں کے ہی پھیلانے کا ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ یہ معاملہ قابل بحث ہے

---

[1] ملاحظہ ہو سٹیٹسمین ایئر بک مطبوعہ سنہ ۱۹۲۲ء کا صفحہ (۱۳۹)

کہ آیا ریلیں قحط کو پھیلانے کا ذریعہ ہیں یا نہیں۔ مگر اس میں کوئی
کلام نہیں کہ وہ برائیوں کی اشاعت کرتی ہیں..... خدا نے
انسانوں کے اجسام میں ان کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی
خواہش کی ایک حد رکھی ہے۔ اور انسان اس حد سے تجاوز
کر جانے کے ذرائع کے تلاش کی فوری کوشش میں لگا یا
گیا....... ریلیں بہت خطرناک چیز ہیں"۔

باوجود اس کے مسٹر گاندھی نے خود اپنے سیاسی دوروں
کے اوقات میں تمام ملک کا سفر انہی ریلوں میں کرکے خطرے
کے بہادرانہ طور پر مقابلہ کرنے کی مثال قائم کر دی اور باوجود
ان کے شبہات کے جوان کو ریلوے کے قحط ڈالنے کی نسبت
پیدا ہو گئے تھے۔ ریلوں نے بخلاف اس کے فی الواقع ہندوستان
سے قحط کا نام و نشان مٹا دیا۔ حالانکہ پرانے زمانے میں قحط کا
ڈر ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اور اگر ایک بھی موسم میں بارش نہ ہوتی تھی
تو قحط کا بھوت نازل ہو کر لوگوں کو کھا جاتا تھا۔ اب قحط کی وجہ
سے موت کا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آتا کیونکہ جہاں کہیں یہ نمودار
ہو تو گورنمنٹ انہی ریلوں کے ذریعہ (الف) ان علاقہ جات
سے قحط زدہ لوگوں کو اس جگہ لے جاتی ہے جہاں مزدوری بہت
ملتی ہے اور (ب) انسانوں کی خوراک اور حیوانوں کا چارہ
ایسے مقامات سے جہاں ان کی زیادتی ہو ایسے مقامات میں پہنچاتی
ہے۔ جہاں ان کے بغیر لوگ مر رہے ہوں۔

علاوہ ریلوں کے ملک میں چاروں طرف انگریزوں کی بنائی

ہوئی سڑکوں اور شاہراہوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جن پر بیل گاڑیوں کی جگہ (جن میں بیل رینگتے اور ٹھوکریں کھاتے نظر آتے تھے) بذریعہ موٹر آمدورفت ہو رہی ہے۔

ایک پرانے ڈپٹی ڈسٹرکٹ کمشنر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "جب کبھی مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب یہاں قحط سے تمام ملک ویران اور تمام آدمی ہلاک ہو جاتے تھے۔ تو میں کہہ اٹھتا ہوں کہ خدا ہنری فورڈ پر برکات نازل کرے؟"

میرے خیال میں اب ضرورت نہیں رہی کہ یہاں ریلوں کے مزید عملی فوائد کا ذکر کیا جائے جو خواہ اشیاء کے فرقوں کے یکساں کرنے یا منڈیوں کے کھل جانے یا تجارت میں ترقی ہو جانے سے نہ صرف فرداً فرداً لوگوں کو پہنچے ہیں بلکہ گورنمنٹ کو بھی مالیات میں اضافہ ہو جانے سے حاصل ہوئے ہیں۔

اب ہم چوتھی مد یعنی گندم کی برآمد کا ذکر کرتے ہیں۔ مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندوستانی نکتہ چیں یہ کہتے ہیں کہ گندم کا ایسے ملک سے برآمد کرنا جہاں بہت سے علاقہ جات میں وقتاً فوقتاً خوراک کی کمی ہو جاتی ہے۔ ایک ناقابل برداشت "لوٹ" ہے اور یہ کہ گندم گورنمنٹ کی بدنیتی یا لالچ یا اس کے انتظام کے ناقص ہونے کی وجہ سے ملک سے باہر لیجائی جاتی ہے۔

آج کوئی ایسا آدمی گندم فروخت نہیں کرے گا جسے آج اس کے اپنے منہ میں ڈالنے کی ضرورت ہو۔ اگر کوئی شخص گندم فروخت کرتا ہے تو ایسی چیز کے حاصل کرنے کے لئے فروخت

کرتا ہے کہ جس کی اسے ضرورت یا خواہش ہے۔ گذشتہ تیس سال میں گورنمنٹ نے اس ملک کے بہت سے غلہ کے رقبوں کو جو پہلے محض بنجر پڑے ہوئے تھے۔ گندم کی کاشت کے قابل بنا دیا ہے۔ لاکھوں ہندوستانی ان رقبوں میں سے اسقدر گندم برداشت کر رہے ہیں۔ جو ان کی اپنی اور ان علاقہ جات کی ضروریات سے جن میں وہ رہتے ہیں۔ بہت زیادہ ہوتی ہے سڑکوں۔ ریلوں اور جہازوں نے دنیا بھر کی منڈیوں کو ان کے دروازوں کے سامنے لاکر ڈال دیا ہے۔ اور وہ اپنی گندم اس شخص کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ جو ان کو اس کی قیمت اوروں سے بڑھ کر دیتا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ گورنمنٹ برآمد ہونیوالے گندم پر اس غرض سے محصول لگا دے۔ کہ ہندوستان کی پیداوار اسی ملک میں رہے تو گندم فروخت کرنے والے کسقدر شور اور واویلا مچائیں گے۔ اور اپنی محنت اور مشقت کا معاوضہ نہ حاصل کر کے کتنا دانت پیسیں گے۔ گندم کو ہندوستان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ہندوستان کے باہر تجارت کی لہر بہائے لئے پھرتی ہے ؛

ہماری پانچویں مد یعنی ہندوستانی فوجوں کے اخراجات کی نسبت ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک کے مالیہ کے تناسب کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ کئے جا رہے ہیں۔ ہندوستانی سیاست داں کہتا ہے کہ سرکار نے فوج بہت زیادہ رکھی ہوئی ہے"۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ کیا یہ سچ مچ اس ضرورت

سے بہت زیادہ ہے۔ جو تمہاری حفاظت اور امن وامان
قائم رکھنے کے لئے لاحق ہے"۔

ہندوستانی سیاست داں کے پاس اس کا گھڑا گھڑایا
جواب یہ ہے کہ "مجھے علم نہیں اور نہ ہی کبھی میں نے یہ معلوم کرنیکی
کوشش کی ہے۔ مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسپر ہندوستان
کے مالیہ کا ۵۰ فیصدی کا بہت بڑا حصہ خرچ کیا جارہا ہے"۔

لوگوں میں رسم پڑ گئی ہے۔ کہ اس مضمون کے متعلق اظہار
خیالات کرتے ہوئے وہ صرف ہندوستانی مرکزی میزانیہ کا
ہی حوالہ دیا کرتے ہیں۔ جس میں کہ ملکی محافظت کے خرچ کی
رقم کل مالیہ کی قریبًا ۵۰ فیصدی دکھائی ہوئی ہوتی ہے۔ صحیح
نتیجہ پر پہونچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ صوبجاتی بجٹوں پر بھی
نظر ڈالی جائے۔ جن میں حفاظت ملک کے اخراجات کی کوئی
رقم نہیں دکھائی جاتی۔ ان بجٹوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا
کہ محافظتی اخراجات کی مد میں کل سرکاری مالیات سے قریبًا
تیس فیصدی دیا جاتا ہے[۱]۔

ہر ہندوستانی کو قریبًا دو شلنگ پانچ پنیس کے حساب
سے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ٹیکس دینا پڑتا ہے[۲]۔

برطانیہ عظمےٰ کے باشندوں کو اسی حساب سے فی کس قریبًا
۲ شلنگ ۴ اپنیس دینا پڑتا ہے۔ امریکہ کے باشندوں کو

---

[۱] ملاحظہ ہو "دی فنانس آف انڈیا" مصنفہ ارتھر وائیکونٹ ہمفری ملفورڈ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۲ء صفحہ (۹۲)
[۲] ملاحظہ ہو "انڈیا ان ۲۵-۱۹۲۴ء" صفحہ (۲۲۱)

قریباً ایک شلنگ ایک پینس اور جاپان والوں کو ہندوستانیوں سے چھ گنا زیادہ یعنی فی کس ۱۴ شلنگ ۷ پینس ٹیکس دینا پڑتا ہے[1]

ہندوستان کے شمال میں چودہ سو میل لمبا وہ سرحدی علاقہ ہے۔ جس میں ہمیشہ خطرہ لگا رہتا ہے ۔

جہاں کے باشندے ہتھیار اٹھانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں اور جس میں گذشتہ صدی میں تیس دفعہ جنگ کی آگ مشتعل ہو چکی ہے۔ ہندوستان کے ساتھ بڑے لمبے چوڑے قابل نفوذ آبی سواحل بھی موجود ہیں۔ جن کی حفاظت اسپر مزید مالی بوجھ ڈالے بغیر برطانیہ کا جنگی بیڑہ کرتا رہتا ہے۔ اور یا آخر ہندوستان میں ایسی آبادی موجود ہے جو وقتاً فوقتاً اسقدر جوش و خروش دکھاتی رہتی ہے کہ جس کی آپس میں ایک دوسرے کے خلاف حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اس ملک کے ٹیکس ہلکے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ غریب ہیں۔ مالیہ اس لئے کم لیا جاتا ہے کہ ٹیکس ہلکے لئے جاتے ہیں۔ یہاں کی قومی محافظت کے اخراجات زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں سے مالیہ تھوڑا لیا جاتا ہے۔ ملک میں امن واماں قائم رکھنا گورنمنٹ کا اولیں فرض ہے اور اس فرض کی ادائگی پر کوئی بھی گورنمنٹ ہو جو چاہے خرچ کر سکتی ہے۔ اگر ملک کے مالیہ کی مقدار کل کم ہو تو دوسرے کاموں کے لئے بہت تھوڑا بچتا ہے اور اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مالیہ بڑھایا جائے[2] ۔

---

[1] سٹیٹسمین ایر بک مطبوعہ ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۹ ۔ [2] ملاحظہ ہو ضمیمہ سویم ۔ ج

مگر ہندوستانیوں کی اس دلیل کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہندوستانی فوج کے اخراجات کی مد میں ہندوستان کے روپیہ پر ہندوستان سے باہر کے لوگ چھاپہ مار رہے ہیں۔ حالانکہ بات دراصل یہ ہے کہ تمام ہندوستان کی فوج کی تنخواہ عملی طور پر ملک کے اندر ہی رہ جاتی ہے۔ فوج کی بہت بڑی تعداد تو ہندوستانیوں پر ہی مشتمل ہے۔ لہذا ان کی تنخواہ یہیں کی یہیں رہنے میں تو کسی کو کلام نہیں اور ہندوستان کا وہ روپیہ جو گورے سپاہیوں کی تنخواہ میں برطانیہ کو چلا جاتا ہے۔ اتنا کم ہے کہ اسکا خیال کرنا ہی تضیع اوقات ہے اور ہندوستان میں جو برطانوی افواج کے افسر ہیں۔ وہ اکثر صورتوں میں اپنی تنخواہ کے علاوہ اپنے گھروں سے منگوا کر اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ ہتھیار اور دیگر ذخائر بھی حکماً ہندوستان ہی سے خریدے جاتے ہیں۔ بشرطیکہ یہاں کے کارخانے اچھا مال مقابلتاً مناسب قیمت پر دے سکیں اور اگر یہاں کے کارخانے نہ دے سکیں تو پھر سامان باہر سے صاحب ہائی کمشنر خریدتے ہیں۔ جو ہندوستان کی خاطر لنڈن میں مقیم ہیں اور جو خود ہندوستانی ہیں۔ گورنمنٹ کے ذخائر کی خرید کے معاملہ میں چاہیے یہ کسی محکمہ کے لئے ہی خریدے جائیں۔ ہندوستانی سیاست والوں کے بیانات اور انکی خرید کے اصلی کاغذات کی تحریریں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اور میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے بیانات کی کاغذات سے ... مطابقت کرنے میں اصلیت کو

سمجھنے کی نسبت اپنے آرام کا زیادہ خیال رکھتے ہیں *

ہندوستانی سیاست دانوں کے خیال کے مطابق ہندوستان کے ذرائع پر چھٹا چھاپہ ہندوستانی سول سروس کے انگریز افسروں کی تنخواہوں کا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ شروع شروع میں یہ ضروری تھا کہ یہاں کے عہدوں کو اچھے قابل آدمیوں سے پُر کرنے کے لئے معقول تنخواہ دی جائیں۔ اور گو گذشتہ چوتھائی صدی میں اشیا کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ مگر ان کے مقابلہ میں ان تنخواہوں میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں کیا گیا۔ آج کل ہندوستان میں سکونت رکھنے سے جیسا کہ ہر اس شخص کو معلوم ہو جاتا ہے جو تھوڑے عرصہ کے لئے یہاں رہے بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اور یہ ملک اِن معنوں میں گورے آدمیوں کی سکونت کے لایق نہیں۔ گو یہ ان کی جان تو نہیں لیتا مگر اُن سے صحت کی دولت چھین لیتا ہے۔ ایک انگریز جو یہاں نوکری کر لیتا ہے۔ ایک بڑے لمبے عرصہ کے لئے اپنے گھر کی تمام صحبتوں آرام و آسائش سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شادی کر لیتا ہے تو اُسے جلدی ہی اپنے بچوں سے جُدا ہونا پڑتا ہے۔ اور ان کی ایسے ملک میں اپنے آپ سے الگ رکھ کر پرورش کرنی پڑتی ہے۔ جو یہاں سے تین ہفتے کی مسافت پر ہے۔ جب وہ پچیس سال سے پینتیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد علیحدہ ہوتا ہے۔ تو اس کی ایک ہزار پونڈ سالانہ پنشن میں سے اسے پچیس فیصدی وہاں کے ٹیکسوں پر

دیدینا پڑتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان تمام افسروں کی تنخواہیں صرف ہندوستانیوں کے نقطۂ نگاہ سے ہی بہت زیادہ ہیں کیونکہ ان لوگوں کی طرز زندگی مختلف ہے۔ اور اسقدر نرالی ہے کہ کوئی انگریز کبھی ہندوستانیوں کی سی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی سول سروس کے ایک شادی شدہ انگریز کے اگر تعلیم پانے والے بچے ہوں۔ اور تنخواہ کے علاوہ اسے کوئی اور آمدنی کی صورت نہ ہو تو اُسے اپنے اخراجات کے پورا کرنے کے لئے نہایت کفایت شعاری سے گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ حاجت کی ضرورت کے لئے بھی وہ کچھ بچا نہیں سکتا۔

باوجود اس کے سر[1] ایم وسواس وارایا بھی دوسرے بڑے بڑے ہندوستانیوں کی طرح فرماتے ہیں کہ "بدقسمت ہندوستانی نہ صرف اپنے کپڑوں اور خوراک کا خرچ پورا کرنے کے لئے کماتے ہیں بلکہ ان کو ایک ایسی گورنمنٹ کی پرورش کرنی پڑتی ہے جو تمام دنیا میں سب سے زیادہ مہنگی ہے"۔

ٹیکسوں کے نقشہ پر صرف ایک نظر ڈال کر اس بیان کی تردید کرنا محض وقت کا ضائع کرنا ہے۔ اس نقشہ کو دیکھنے سے اس بیان کی ہرگز تائید نہیں ہوتی کہ "ہندوستانیوں کو ایک ایسی گورنمنٹ کی پرورش کرنی پڑتی ہے۔ جو تمام دنیا میں سب سے زیادہ مہنگی ہے"۔ بشمول مالیہ زمین کے (جس کو صحیح طور پر ٹیکسوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا) برطانوی ہندوستان کے

[1] کتاب ایلنشری کننگ انڈیا صفحہ (۷)

باشندوں نے ۲۴-۱۹۲۳ء میں فی کس صرف ساڑھے پانچ روپے[1] (یعنی ۷ شلنگ ۵ پنس) بطور ٹیکس ادا کیا تھا۔ جو موجودہ شرح تبادلہ کے حساب سے ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کے ۸۲ء اسینٹ کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں فلپائین کے باشندوں نے ۱۹۲۳ء میں۔ جیسا کہ النسولس آڈیٹر صاحب کی سالانہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ساڑھے تین ڈالر یا ۱۴ شلنگ ۷ پنس فی کس ادا کیا۔

ہندوستانیوں کی عام غربت کا لحاظ کرکے ٹیکس کی یہ قلیل رقم بھی زیادہ معلوم ہوگی۔ مگر اس کے مقابلہ میں اگر گورنمنٹ کے اخراجات کو اسقدر بھی گھٹا دیا جائے کہ ان میں اس سے زیادہ کمی ہی نہ کی جا سکتی ہو تو بھی یہ ایک مفلس قوم کی نظر میں بہت زیادہ معلوم ہوں گے۔ مگر ایسا خیال کرنے والے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ جن کو یہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ہندوستان کی مفلسی کا ایک سبب ٹیکسوں کی کمی بھی ہے۔ کہ جس کی وجہ سے حکومت کو اس ملک کی بہتری کے کام کرنے کے ذرائع ہی میسر نہیں ہو سکتے۔

اب اس بحث کو چھوڑ کر آؤ ہم یہ دیکھیں کہ ہندوستان کا روپیہ کون سی اور مدات میں ضائع کیا جا رہا ہے۔ بڑی بڑی مدات کا تو پہلے صفحوں میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ مگر ان میں بعض دیگر مدات شامل کی جاتی ہیں جو دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی

[1] "سٹیٹیکل ایسٹریکٹ" بابت ۱۳-۱۹۱۲ء لغایت ۲۴-۱۹۲۳ء صفحہ (۱۹)

ہیں۔ مثلاً اعلےٰ ذاتوں کی شادیوں کے اخراجات۔ بھاری شرح سود کے قرضے۔ روپیہ دبا چھوڑنا۔ جس سے اس کی کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔ گداگروں کو معقول رقوم دینا۔

ہندوؤں کی بعض ذاتوں کے افراد کی شادیاں ایک محدود حلقہ کے اندر ہی ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایک شخص صرف نصف درجن کنبوں کے اندر شادی کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اس شخص کو باوجود اس کے کہ اسے لاولد رہ جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ مگر انہیں نصف درجن کے قریب کنبوں کے اندر کسی لڑکی کے پیدا ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے[1]۔ اور جب یہ لڑکی پیدا ہو جائے تو اسے اس کے بیاہنے کے لئے اتنی رقم دینی پڑتی ہے کہ جس کی ادائگی سے وہ تباہ ہو جائے۔ بعض لوگوں میں یہ دستور ہے کہ لڑکی کی شادی اسی شوہر سے کیجاتی ہے۔ جو خالص ذات کا ہو۔ اس میں چاہئے لڑکی کے باپ کا ضمیر اپنی لڑکی کو ساری عمر بن بیاہی رکھنے کے لئے مردہ ہو جائے اس کے لئے یہ ضروری ہوگا۔ کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اس وقت تک نہ کرے جب تک کہ اس کے لئے سچی ذات کا شوہر نہ مل جائے ؏

گذشتہ سالوں میں بنگال میں کئی واردا تیں ایسی ہوئی ہیں۔ کہ لڑکیوں نے سن بلوغ کو پہنچتے ہی بدیں وجہ خود کشی کر لی کہ ان کے باپ ان کو اتنا جہیز دینے سے بچ جائیں۔ جتنا

---

[1] ملاحظہ ہو "ایکسٹر کٹنگ انڈیا" مصنفہ وسوسواریا۔ صفحہ (۲۴۱)

وہ دے نہیں سکتے تھے۔ یا جس کے دینے سے ان کے تباہ ہو جانے کا خطرہ تھا۔[1] چونکہ بنگالی نوجوان نے اتنے بھاری جہیز کی اس ادائگی کی رسم کی مذمت کرنے کی بجائے اس کی تعریفوں کے پل باندھ دئے۔ جس سے اس کو اور بھی تقویت ہوئی۔ اور لڑکیوں کے باپوں کی آمدنیوں کا بوجھ اور بھاری ہو گیا۔ اگر کوئی شخص خوشحال ہوا اور کافی روپیہ بھی کماتا ہو اسکو بھی شادیوں کے اس جہیز کی ادائگی تباہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ رسم و رواج اور خاندانی غیرت اسے مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ اپنے ذرائع آمدنی سے بڑھ چڑھ کر جہیز دے۔

شادیوں اور تجہیز و تکفین کے اخراجات۔ مقدمہ بازی کی لت۔ فضول خرچی اور فصلوں کی تباہی بڑے بڑے اسباب ہیں۔ جو ہندوستانیوں کو مقروض کر دیتی ہیں۔ ہندوستان کا ساہوکار یا بنیا اور فلپائین کے سود خوار ایک ہی قماش کے آدمی ہوتے ہیں اور بالکل اسی طرح جسطرح کہ فلپائین میں ہو رہا ہے ایک اوسط درجہ کا ہندوستانی بھی جو کچھ روپیہ پس انداز کر لیتا ہے۔ خواہ اس کی ذات اور پیشہ بنیا کا ہو یا نہ ہو۔ اس کا ارادہ اس روپیہ کو قرض پر دینے کا ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے ہمسایوں کو یہ روپیہ کم سے کم ۳۳ فی صدی سود پر بطور قرضہ دیدیتا ہے۔ ان حالات میں یہ کب ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کو جو اس کے لئے ریلیں چلانے کے لئے قرضہ مانگتی ہے وہ (۵ ، ۳) فیصدی

---

[1] لیجسلیٹو اسمبلی ڈیبیٹس ۱۹۲۲ء جلد دویم۔ حصہ سویم۔ صفحہ (۱۸۱۱)

کی ذلیل شرح پر روپیہ دے یہ کام تو لنڈن کے سادہ لوح لوگوں کا ہی ہے ؛

یہ بنیا لوگ اپنی چالاکی سے پہلے ہی تاڑ جاتے ہیں کہ فصل کم ہوگی ۔ اس لئے وہ اپنے علاقہ کی ساری گندم سمیٹ لیتے ہیں اور فصل بونے کے موقع پر اسے دو سو روپیہ فی صدی منافع کے حساب سے اپنے ہمسایوں کے ہاتھ بیچ لیتے ہیں اور ان غریبوں کی آیندہ ہونے والی فصل ضمانت میں لکھوا لیتے ہیں ؛

بنیوں کا ایک دفعہ قرضدار ہو کر پھر کوئی ہی خلاصی پا سکتا ہے ۔ نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ ایک قرضدار کو پہننے کے کپڑے ۔ بیل اور تمام ضروریات زندگی اسی بڈھے مکڑ سے خریدنی پڑتی ہیں ۔ اور سود در سود اسی طرح بڑھنا شروع ہو جاتا ہے ۔ جسطرح کہ پرانے زمانے میں بڑھا کرتا تھا ۔ اور قرضدار کی تیسری یا چوتھی پشت تک ہی اس کا سارا گھرانا تباہ و برباد ہو کر مفلس اور قلاش محض رہ جاتا ہے ؛

مسٹر کیلورٹ لکھتے ہیں کہ " یہ خیال غلط ہے کہ قرضہ ناداری کی وجہ سے چڑھ جاتا ہے ۔ قرضہ کا انحصار ہمیشہ اعتبار پر ہوتا ہے ۔ اور اعتبار ہمیشہ خوشحال لوگوں پر ہوتا ہے نہ کہ مفلسوں پر " ۔ ہندوستانیوں پر اعتبار محض سلطنت برطانیہ کی مہربانی سے پیدا ہوا ہے ۔ کیونکہ اس نے یہاں امن وامان قایم کیا اور ہندوستانیوں کی جائدادیں اور

مال و دولت محفوظ کر دیں اور نہریں نکال کر زمین کی پیداوار میں ترقی اور اس کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔ بنیا لوگوں کی یہ شان و شوکت بھی سلطنت برطانیہ ہی نے بنائی ہے۔ پنجاب میں جو ہندوستان کے سب صوبوں سے خوشحال صوبہ ہے یہاں تو ہم بنیوں کو بہشت میں پاتے ہیں۔ چالیس ہزار بنئے لوگوں سے سالانہ سود کی اتنی رقم جمع کر لیتے ہیں۔ جو اس رقم سے کم از کم تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جو وہ خود گورنمنٹ کو ادا کرتے ہیں[1]۔

ہر جگہ کھلم کھلا یا خفیہ طور پر یہ سود خور عوام کو تعلیم دینے کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص کبھی اس قسم کے کاغذ پر دستخط نہیں کرے گا۔ جس کی تحریر سے بنئے ایک ان پڑھ کو عمر بھر اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں اور ایک شخص جو تھوڑا سا بھی حساب جانتا ہوگا۔ یہ دیکھتا رہے گا کہ کب اس کا حساب بے باک ہوتا ہے۔ کونسلوں کے دو ہندوستانی ممبروں نے جو خود ساہوکارہ کرتے تھے۔ مجھ سے پر جوش الفاظ میں کہا۔ کہ بنئے اس دخل در معقولات دینے والی اور ہمدردی نہ رکھنے والی گورنمنٹ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس نے جا بجا انجمن ہائے امداد باہمی قائم کر دی ہیں۔ جو اس کا اشارہ پاتے ہی بنیوں کا پرانا نہایت فائدہ بخش کام بگاڑ دیتی ہیں۔ مزید برآں گورنمنٹ نے بنیوں کو بھی نقصان

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ سویم۔ و۔

پہونچانے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے شبینہ سکول کھول دئے ہیں۔ اور نوجوانوں کو تعلیم دینی شروع کر دی ہے۔ جس سے بنیوں کے دل دہل گئے ہیں"۔

یہ بنئے لوگ چونکہ تمام ملک میں زبردست ہو گئے ہیں۔ اور لوگوں پر ان کا رعب وداب رہتا ہے۔ لہذا یہ سوا راج پارٹی کو بھی اندر ہی اندر بڑی تقویت پہونچاتے رہتے ہیں اور اسے مزدوری ہمیشہ لوگوں کے حقوق اور رائج الوقت اصلاحات کا مخالف بناتے رہتے ہیں۔

ایک تیسرا اچھا چھاپہ بھی ہے جو ہندوستان کی خوشحالی پر مارا جا رہا ہے۔ گو اس کا بہت کم پرچار ہوا ہے۔ مگر درحقیقت اس کا اثر نہ صرف ہندوستان پر پڑ رہا ہے۔ بلکہ باقی دنیا بھی اس سے موثر ہو رہی ہے اور وہ ہندوستانیوں کی سونا چاندی لینے کی رغبت ہے۔ سلطنت روما کے اوائل زمانہ سے لے کر آج تک اقتصادیات کے مغربی ماہر اس بات کا رونا روتے رہے ہیں کہ ہندوستانی اپنی پیداوار کے معاوضہ میں غیر ملکی اشیا لینے کی بجائے قیمتی دھاتیں (سونا چاندی) لے لیتا ہے۔ اور یہ قیمتی دھاتیں وہ ایسی طرح پر نگل جاتا ہے کہ پھر ان کا پتہ ہی نہیں چلتا[۱]۔

۱۹۰۸ء میں یہ تخمینہ لگایا گیا تھا۔ کہ ہندوستان سونے کی اینٹوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہضم کر چکا ہے کہ وہ اپنے تجارتی کاموں کے لئے

---

[۱] ملاحظہ ہو ضمیمہ سویم۔ ح۔

بے کار ہو گیا ہے۔ اس سونا سے ہندوستان کو قریباً تئیس لاکھ پونڈ سالانہ (جو ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر سکہ امریکہ کے مساوی ہے) کا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ سونا قریباً ستائیس کروڑ پونڈ یا ایک ارب اکتیس کروڑ بیس لاکھ امریکن ڈالر کی مالیت کا ہے[۱]۔ سونے کا یہ لازوال ذخیرہ ہر ایک حیثیت کے ہندوستانی یعنی غریب سے غریب مزدور سے لے کر بڑے بڑے والیان ریاست تک کے پاس موجود ہے۔

۱۹۲۷ء میں مسٹر ڈی۔ سی۔ بلس نے جو بمبئی میں امریکن ٹریڈ کمشنر ہیں اس خزانے کی بابت جو ہندوستان میں ہے یہ لکھا تھا[۲]:-

کہ "سونے کا ایک لازوال خزانہ جمع کر لیا گیا ہے۔ جس کی قیمت کا تخمینہ پانچ بلین ڈالر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ تمام خزانہ غیر منافع بخش قیمتی دھات کی صورت میں پڑا ہوا ہے۔ اسی کو اگر منافع پر لگایا جائے۔ یا دنیا کی نقدی کی منڈیوں میں قرضہ پر دیا جائے۔ تو اس سے ہندوستان دنیا کی طاقتور قوموں میں سے ایک قوم بن سکتا ہے۔" ہندوستان کا روائتی خزانہ

---

[۱] کتاب "انڈسٹریل کو ہیبی ٹیشن آف ایشیا"۔ جو مشرق میں سلطنت کی تجارت پر سکے کے چلت کے اثر کی تحقیقات کی بابت ہے۔ مطبوعہ کلارمونٹ جان ڈانیال کیگن پال ٹرنچ ٹربنر اینڈ کمپنی لمیٹڈ لنڈن سنہ ۱۹۱۰ء۔ صفحہ (۲۴۹)۔

[۲] ملاحظہ ہو کتاب "بمبئی بلین مارکیٹ" مصنفہ ڈون بین بلس جو نزد صوبجات متحدہ امریکہ کا بیورو آف فارن اینڈ ڈومسٹک کامرس ٹریڈ انفارمیشن بلین نمبر (۴۵۷) صفحہ (۵-۶)

واقعی موجود تو ہے۔ مگر یہ اس صورت میں رکھا ہوا ہے کہ یہ اپنے مالکان کو کوئی منافع نہیں دیتا۔"

ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے یہ بالکل نامناسب سمجھا جاتا رہا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا وارث اپنے باپ کے جمع کئے ہوئے خزانہ پر دست اندازی کرے یا خود اپنا خزانہ بنائے۔ مرحوم نظام حیدرآباد نے اپنے خزانوں میں بیش بہا جواہرات جمع کئے تھے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ موجودہ نظام سونے کی اینٹوں کے انبار لگا رہے ہیں اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اتنا سونا جمع کر لیا ہے کہ جس کی قیمت ڈیڑھ سو اور دو سو ملین ڈالر کے درمیان ہوگی اسی طرح ہندوستان کا ہر ایک دہقان اپنی چاندی زمین میں دفن نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس کی حفاظت اس طرح کرتا ہے۔ کہ اس کے زیورات بنا کر اپنی عورتوں کی گردنوں۔ کلائیوں اور ٹخنوں پر لادیتا ہے۔ اس طرح دنیا بھر کے سونے کی پیداوار میں سے چالیس فیصدی سونا اور دنیا بھر کی چاندی

سلہ ہم حضور نظام کے خزانہ کی وسعت اور سونے کی اینٹوں کے متعلق کچھ رائے نہیں دیتے کیونکہ وہ ایک عالیشان سلطنت کا مالک اور قدیم مغلئی مشرقی طریقہ کے سلطان ہیں لیکن ہندوستان کے عام دہقانوں کی نسبت جو گپ اڑائی جاتی ہے کہ انکی عورتوں کے پاس اسقدر چاندی اور سونا ہے۔ اس سے تو سارا ہی معاملہ گپ معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ہم خود اہل ملک سے ہیں ممکن ہے کہ ساہوکاروں اور بڑے بڑے زمینداروں اور راجوں مہاراجوں کے پاس سونے اور چاندی کے خزانے جمع ہوں۔ مگر عام ہندوستانی تو نہایت مفلس و محتاج اور قوت لایموت کے غم میں اکثر مبتلا رہتے ہیں۔ (مترجم)

کی پیداوار میں سے تیس فی صدی چاندی کی سالانہ کھپت ہندوستان میں ہو جاتی ہے۔ اس سونے کے نہ تو سکے بنائے جاتے ہیں اور نہ ہی یہ چلت میں آتا ہے۔ مسٹر بلس چاندی کی نسبت کہتے ہیں کہ "ہندوستان چاندی کے ڈلے اور اینٹیں نہ صرف زیورات بنانے کے لئے مانگتا ہے بلکہ بلا شبہ اینٹیں سے بے شمار ڈلے اور اینٹیں زمین میں گاڑ کر فراموش کر دئے جاتے ہیں"۔

بعض ہندوستانیوں میں یہ رسم ہے کہ وہ اپنے بے شمار سکے تو زمین میں دفن کر رکھتے ہیں۔ اور خود بنئے کے بے حد قرضدار رہتے ہیں اور مزید قرضہ لیتے جاتے ہیں۔ یہ رسم اس وجہ سے پڑ گئی ہے کہ ایک تو لوگوں کو یہاں کے بنکوں پر اعتبار نہیں دوسرے یہ دفینہ اس غرض سے ہیں کہ مصیبت کے دن ان کے کام آئے گا۔

ہندوستان میں سونا اور چاندی کھنچے چلے آتے ہیں اور یہاں پہونچتے ہی بے کار طور پر دفن ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہاں کے لوگ جو پہلے ہی غریب ہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اپنے ان دفینوں میں پڑے سوتے ہیں۔ اور اپنے ملک کو خوشحال نہیں ہونے دیتے۔

اب ہم اس لوٹ کی طرف پھر رجوع کرتے ہیں۔ جو زمین کی پیداوار کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان خصوصاً ایک بھاری زراعتی ملک ہو مگر یہاں کے

زراعت پیشہ لوگوں نے اپنی زراعتی زمین کو کبھی زرخیز بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ہمیشہ اس میں سے پیداوار حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر کبھی اس کو طاقتور بنانے کی کوشش نہیں کرتے اور پھر ناقص فصل ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس جلانے کا ایندھن بھی کافی نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ گائے کا گوبر جلاتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے دماغوں میں مذہب کا سودا موجود ہوتا ہے۔ لہذا یہ اپنے مرے ہوئے مویشیوں کی ہڈیاں (جن کی ان کے پاس ہمیشہ بہتات رہتی ہے) بطور کھاد کے استعمال کرنے کی بجائے غیر ملکوں کو بھیجنے کے لئے بیچ دیتے ہیں اور یہ اپنی زمینوں پر قلبہ رانی ایسے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ہلوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہ جو بمشکل تمام زمین کی سطح کو چھیل سکتے ہیں۔

فرض کر لیا جائے کہ مذہبی پابندیوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کے باوجود یہ لوگ اس بیکار طور پر دفن کئے ہوئے روپے میں سے تھوڑا سا نکال کر یا اس دفینہ کو کسی منافع بخش کام پر لگا کر اسکی آمدنی سے زمین کو زرخیز کرنے والے آلات اور مشینیں خرید لیں تو اس معمولی سی کوشش سے انہیں کس قدر فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی جبلی عادت ہوگئی ہے۔ کہ یہ بلا کسی کوشش کے خوشحال ہونا چاہتے ہیں وراثت کے قدیم قوانین کے بموجب ان کی جائداد کی تقسیم ایسی بری ہوتی ہے کہ جب تک ایک شخص کی جائداد کو ٹکڑے

ٹکڑے ہو کر بالکل بے کار نہ ہو جائے۔ کسی وارث کے ہاتھ میں نہیں پڑتی اور یہ سبب بھی لوگوں کی خوشحالی کی راہ میں ایک بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ جن لوگوں کو اس مضمون کے ساتھ دلچسپی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ مسٹر کیلورٹ کی کتاب "ویلتھ اینڈ ویل بیئنگ آف دی پنجاب" کا مطالعہ کریں۔ جس میں اس بارہ میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح عورتوں کے کام نہ کرنے کی وجہ سے ذاتی مفاد میں رکاوٹیں حائل ہو رہی ہیں[1]۔

گو اعادہ ہو جانے کا خوف ہے۔ مگر میں یہاں اس بھاری نقصان کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتی جو ملک کو سات ملین بے کار مویشیوں کو مذہب کی آڑ میں بے فائدہ رکھنے سے پہنچ رہا ہے۔ کاش ان مویشیوں سے کام لے کر ملک کو چمڑے اور ہڈی کے مہیا کرنے سے ہی فائدہ پہنچایا جائے۔

ہندوستانی دولت پر چھاپوں کی فہرست کی آخری مد گدا گری ہے۔

برہمنوں کو دھرم کے مطابق دنیا کا کام دھندا چھوڑ بیٹھنا اور خدا کی یاد میں لگا رہنا اور بھیک مانگ کر گذارہ کرنا انسانی زندگی کے آخر نصف حصہ کا بہترین مقصد ہے۔ یہ شریعت بھی تلقین کرتی ہے کہ وہ شخص جو کسی فقیر کو خیرات دیتا ہے۔ درحقیقت فقیر کا قرض دار بن جاتا ہے۔ یعنی بھیک مانگنے والا بھیک دینے والے کے لئے یہ سنہری موقع پیدا کر دیتا ہے

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ سوم۔ ط۔

کہ موخرالذکر یہ قرضہ اگلے جنم میں وصول کرلے گا۔ لہذا ایک فقیر کو نہ تو بھیک مانگنے میں شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی وہ دینے والے کا کوئی احسان محسوس کرتا ہے[۵۱]۔

انڈین لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس مورخہ ۲ر فروری ۱۹۲۶ء میں سر ہری سنگھ گوڑ نے کہا تھا[۵۲]:-

"گذشتہ مردم شماری کی رپورٹ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔۔۔ کہ ہندوستان میں گداگروں۔ آوارہ جوگیوں اور (جوتشیوں) کی تعداد اٹھاون لاکھ ہے۔۔۔۔ مگر درحقیقت ان لوگوں کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ ان میں وہ سادھو اور فقیر بھی شامل ہونے چاہئیں جو بھیک پر گذارہ کرتے ہیں"۔

گورنمنٹ نے ۱۹۲۱ء میں ان سادھوؤں اور فقیروں کا جو اندنوں بھیک مانگ کر گذارہ کر رہے تھے تخمینہ (۱۴۵۲۱۷۴) کا لگایا تھا۔

ان برگزیدہ سادھوؤں کے سیکڑوں اور ہزاروں کے ٹڈی دل ملک میں پھرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں کہیں جاتے ہیں۔ سب کچھ چٹ کر جاتے ہیں۔ ہر ایک مقدس سادھو کے پیچھے ایک ایک چیلا اپنے گورو کا کچکول تھامے پھرتا ہے انکو بھیک دینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص ملک میں پھرے تو اسے ان کی چھاؤنی کی چھاؤنیاں پڑی ہوئی دکھائی

---

۵۱ ملاحظہ ہو ضمیمہ سویم۔ ی۔

۵۲ ملاحظہ ہو لیجسلیٹو اسمبلی ڈبیٹس جلد ہفتم نمبر ۔ صفحات (۶۳۵ - ۶۳۶)

دیں گی - اور یہ اسے سڑکوں پر ملیں گے - یہ قریبًا بالکل ننگے
ہوتے ہیں - بدن پر راکھ کی تہ چڑھائی ہوئی ہوتی ہے - انکی لمبی
لمبے بالوں کی لٹیں - جوگیا رنگ میں رنگی ہوئی اور ناکستر سے
لتھڑی ہوتی ہیں - اور ان کی آنکھیں چرس اور دیگر منشیات
کے استعمال سے سُرخ بنی رہتی ہیں - بڑے بڑے میلوں پر
تو ان کا ایک ہجوم لگ جاتا ہے - ایک بڑے ہوشیار ملاحظہ
کنندہ نے مجھے بتلایا کہ مدراس کے آخری بارہ سالہ میلہ کے موقع پر
اڑھائی میل لمبی سڑک کے جو شہر سے اشنان کرنے کی جگہ کو جاتی
ہے - دونوں طرف یہ مذہبی فقیر ہی فقیر نظر آ رہے تھے - یہ
کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے - اور ان کے آگے
ہر ایک کا ایک ایک چیلہ تھا - جو گذرنے والوں سے اپنے گورو
کے لئے بھیک مانگ رہا تھا۔

اب ہم اس فراموش شدہ سوال کو لیتے ہیں کہ ہندوستانیوں
کی پرانی اور جدید اقتصادی زندگی میں کیا فرق ہو گیا ہے - مسٹر
گاندھی اور ان کے چیلے یہ کہتے ہیں کہ انگریزی راج ہونے کی
وجہ سے ہندوستانی آہستہ آہستہ مگر مکمل طور پر غریب تر ہوتے
جاتے ہیں - اور ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے
اس کی اصلیت معلوم کرنا واقعی مشکل کام ہے - مگر یہ صاف
عیاں ہے - کہ ہندوستان کے عوام اپنی اصلی طرز زندگی
کے حالات کی اصلاح کرنے یا انہیں کوئی انقلاب پیدا کرنے کی
خواہش یا آرزو نہیں رکھتے - دراصل ان کی طبیعتیں ہی

نہیں چاہتیں کہ حالات پلٹا کھائیں۔ یہ اپنی گارے کی جھونپڑیوں کی زندگی پر قانع ہیں۔ اگر ان کے گھروں میں کھڑکیاں رکھدی جائیں یا انگیٹھیاں بنادی جائیں تو غالباً یہ ان کو بند کردیں گے یہ اپنے گھروں کی مرمت نہیں کریں گے اور انہیں بارش سے بہ جانے دیں گے۔ البتہ جب یہ گھر بہ چکے گا۔ تو اس کی جگہ نیا بنالیں گے۔ گو ان کے رہنے کو کھلی جگہیں ہیں۔ مگر یہ اکٹھے مل کر ایک کوٹھڑی میں گھسٹ کر رہنا پسند کریں گے۔ زیادہ خوراک کی فراہمی کے لئے یہ زیادہ مشقت نہیں کریں گے۔ بلکہ لکیر کے فقیر بن کر خالی بیٹھے گپیں ہانکتے رہیں گے اور دن کی روزی مل جانے پر مطمئن ہو جائیں گے[۵۱]

مگر ان کے سلامت رہنے کے وسائل بلاشبہ زیادہ ہیں ان میں مصیبت کا مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھی ہوئی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ لوگ اس کے خلاف کہتے ہیں۔ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے ذرائع آجکل ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک کے دل میں ایسے ذرائع[۵۲] کے حاصل کرنے کی خواہش تو موجود ہے کہ جن سے مادی ترقی ہو سکتی ہو مگر اس سوال کا جواب کہ آیا یہ خواہش اچھی ہے یا بری اس تفریق کے پردۂ اخفا میں ہے جو مشرقی اور مغربی اقوام میں حائل ہے۔ اور اس کا انحصار اس کارروائی کے طریق پر ہے

---

[۵۱] ملاحظہ ہو ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کی جلد اول۔ حصہ اول۔ صفحہ ۵۴

[۵۲] ملاحظہ ہو ضمیمہ سوئم۔ م۔

جو یہ دونوں اقوام اس خواہش کے حصول کے لئے کرتی ہیں۔

ان باتوں کو اہمیت دیتے ہوئے یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ ہندوستان کی سرزمین اس سے پانچ کروڑ چالیس لاکھ زیادہ آدمیوں کی پرورش کرتی ہے کہ جن کی یہ پچاس سال پہلے کیا کرتی تھی۔ یعنی اس کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد سات یا آٹھ فی صدی کا اضافہ ہو جاتا ہے[1]۔

آبادی کے اس اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ اب اس ملک کو نہ تو کسی جنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور نہ یہاں کوئی خانہ جنگی یا تباہ کن قحط رہے ہیں۔ وبائی بیماریوں کی روک تھام ہو گئی ہے اور خوراک با افراط پیدا ہونے لگی ہے۔ اور یہ سب نعمتیں ایک قائم شدہ گورنمنٹ کی طفیل ہیں کہ جس کی موجودگی سے جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ہمیشہ بڑے اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

گو گورنمنٹ نے دختر کشی۔ ستی اور دوسرے ہندوستانی ظالمانہ اور جابرانہ افعال کا قلع قمع کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک اس ملک میں اوائل عمر کی شادی اور غیر محدود نسل پیدا کرنے کا دستور جاری ہے۔

ہندوستان آج اپنے ارتقا کے اس نقطہ پر کھڑا ہوا ہے کہ جہاں آبادی کا انتظام صرف بیماری اور بیماری ہی کر سکتی ہے[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہوں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری ہند کی رپورٹ کے صفحات۔ ۷ و ۴۸

[2] مردم شماری ہند کی رپورٹ کی جلد اول۔ حصہ اول کا صفحہ ۲۹۔

تیسواں باب

خاتمہ

اس کتاب کے گذشتہ ابواب میں زمانہ موجودہ کے ہندوستان کے زندہ حقائق درج ہیں۔ اس حقیقت حال سے بآسانی انکار کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی نہ تو تردید کی جا سکتی ہے اور نہ ہی انہیں متزلزل کیا جا سکتا ہے۔ میں یاد دلانے کے لئے تیار ہوں کہ اور بھی کئی واقعات اعداد و شمار اور زاویہ ہائے نگاہ ایسے موجود ہیں جن کا میں نے اس کتاب میں تذکرہ نہیں کیا۔

نہ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بعض نہایت ناگوار چیزیں جو میں نے یہاں ہندوستان کی بابت بیان کی ہیں۔ اُن کی نظیر ہماری مغربی زندگی کے بعض حصوں کے میلان اور چلن میں نہیں مل سکتیں درحقیقت ہندوستانیوں نے انانیت اور مادیت کے اصولوں کے جسے یہ روحانیت کہتے ہیں۔ اتنے وسیع اور دور کے معنی لئے ہیں۔ کہ جتنے مغرب نے نہیں لئے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ان پر کیا بلحاظ فرد یا قبیلہ زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ کیونکہ وہ اس سڑک کے اخیر تک روشنی ڈالتے ہیں۔

چند ہندوستانی تو اس صاف بیانی کو ایک دوست کی وفاداری سمجھیں گے۔ اور جن کے دل پر زیادہ سخت صدمہ ہوگا۔ وہ دل آزار ہوں گے۔

کاش یہ صاف گوئی ایسی معجزنما ثابت ہو کہ جوش اور غصے کے تمام جذبات اسی میں جذب ہو جائیں - اور آیندہ وقت کا عزیز حصہ دعوتِ مقابلہ یا کسی اعلان پر برباد یا ضایع نہ کیا جائے -

ضمیمۂ اوّل

طبی شہادت

سنہ ۱۹۲۲ء کی انڈین لیجسلیٹو اسمبلی میں مندرجہ ذیل شہادت پر جو حالات حاضرہ کی تشریح کے متعلق پیش کی گئی تھی - موجود الوقت ہندوستانی ممبروں کی طرف سے نہ تو کوئی سوال ہوا - اور نہ ہی اس کی کوئی مخالفت کی گئی - گو یہ شہادت اکتیس سال پہلے کی قلمبند کی ہوئی تھی - مگر پھر بھی اسپر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا - اور یہی وجہ ہے کہ یہ ایک خاص اہمیت رکھتی تھی یہ شہادت جو پیش کی گئی - ایسی مریضہ عورتوں کی فہرست پر مشتمل تھی - جو سنہ ۱۸۹۱ء میں ان مغربی لیڈی ڈاکٹروں نے تیار کی تھی جو اس وقت ہندوستان میں طبابت کر رہی تھیں - اور انہوں نے ہی اسے ایک عرضداشت کے ساتھ وائسرائے کی خدمت میں بدیں غرض پیش کیا تھا کہ وہ ہندوستانی بچوں کی خاطر اس معاملہ میں دخل دیں - یہ لیڈی ڈاکٹر صاحبان مانتی ہیں

کہ انہوں نے یہ فہرست ان مریض عورتوں کے ڈاکٹری معائنہ سے مرتب کی تھی۔ جو ان میں سے کسی نہ کسی کے سامنے وقتاً فوقتاً علاج کے لئے لائی گئیں اور یہ کہ ایسی مریضوں کی اور بھی کئی مثالیں ان کی معمولی طبابت کے زمانہ میں ان کے سامنے پیش آئی ہیں مریضوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

الف۔ مریضہ کی عمر نو سال تھی۔ شادی کے ایک دن بعد علاج کے لئے لائی گئی۔ اس کی ران کا جوڑ نکلا ہوا تھا۔ پیڑو اسقدر کچلا ہوا تھا۔ کہ اس کی صورت بگڑ گئی تھی۔ گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لٹک رہا تھا۔

ب۔ مریضہ کی عمر دس سال تھی۔ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ خون بہ افراط بہ رہا تھا۔ گوشت بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

ج۔ مریضہ کی عمر نو سال تھی۔ ایسی مکمل طور پر اسقدر جبر کیا ہوا تھا۔ کہ اس کا عمل جراحی سے اچھا ہونا قریباً ناممکن تھا۔ اس کے شوہر کی دو اور بھی زندہ بیویاں تھیں اور یہ نہایت فصیح انگریزی بولتا تھا۔

د۔ مریضہ کی عمر دس سال تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ تھی جس کے جسم کا ابھی بالکل نشو و نما نہ ہوا تھا۔ اس کے امعائے مستقیم سے اسقدر خون بہ رہا تھا۔ کہ اس کے مرجانے کا خطرہ تھا۔ اس کے شوہر کی عمر قریباً چالیس سال اور وزن گیارہ سٹون (۱۵۴ پونڈ) سے کم نہ تھا۔ اس نے اپنی حیوانی خواہش کو خلاف وضع فطری کے طور پر پورا کیا ہوا تھا۔

ہ - مریضہ کی عمر قریباً نو سال تھی - زیریں اعضا بالکل مفلوج ہو چکے تھے ۔

و - مریضہ کی عمر قریباً بارہ سال تھی - نہ صرف مقعد پھٹی ہوئی تھی بلکہ سیون کے پٹھے چھلے ہوئے تھے - اور دہانِ زہدان پر زخم پڑا ہوا تھا ۔

ز - مریضہ کی عمر قریباً دس سال تھی - خون نکل جانے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھی - بیان کرتی تھی کہ خلاف وضع فطری کے طور پر اس کے ساتھ بہت زبردستی کی گئی ۔

ح - مریضہ کی عمر قریباً بارہ سال - حاملہ تھی بچے کا سر توڑ پھوڑ کر نہایت مشکل سے بچہ نکالا گیا تھا - جس کی وجہ یہ تھی - کہ جوف اور بچے پیدا ہونے کے راستے کو قبل از وقت استعمال کیا گیا تھا (یعنے سن بلوغ سے پہلے ہی عورت سے مقاربت کی گئی تھی)

ط - مریضہ کی عمر قریباً سات سال - اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی تھی تین یوم کے بعد اس نے نہایت تکلیف کے ساتھ جان دیدی ۔

ک - مریضہ کی عمر قریباً دس سال تھی - اس کی حالت نہایت قابل رحم تھی - ہسپتال میں ایک دن رہی - اس کے بعد اس کے شوہر نے اسے "جائز" استعمال کے لئے واپس مانگا ۔

ل - مریضہ کی عمر گیارہ سال تھی - چونکہ اس کے ساتھ بہت زبردستی کا برتاؤ کیا گیا تھا - اس لئے اپنی تمام عمر لولی رہے گی - اس کی ٹانگیں اور پاؤں مفلوج ہو چکے تھے -

م - مریضہ کی عمر قریباً دس سال تھی - یہ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور گھٹنوں پر رینگتی ہوئی ہسپتال میں آئی - اپنی شادی کے بعد

کبھی بھی پڑھی کھڑی ہونے کے قابل نہ رہی تھی۔

ن۔ مینہ کی عمر نو سال تھی۔ اس کا مرا اپنی جگہ پر قائم نہ رہا ہوا تھا جس کی وجہ سے نہ وہ چل ہی سکتی تھی اور نہ ہی ایک پاؤں دوسرے پاؤں سے آگے نکال سکتی تھی۔

مندرجہ بالا فہرست لیجسلیٹو اسمبلی ڈیبیٹس بابت ۱۹۲۲ء جلد سوم حصہ اول کے ضمیمہ میں ملے گی جو صفحہ ۹۱۹ پر درج ہے۔ نیز مباحثات کا صفحہ (۸۸۲) ملاحظہ ہو۔

ضمیمہ دوم

عورتوں کا حق انتخاب

۱۹۱۹ء کا ریفارم بل (مسودہ اصلاحات) تیار کرنے کے وقت برطانوی پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ عورتوں کے حق انتخاب کے مسئلہ پر صرف ہندوستانی لوگ خود ہی مناسب غور و خوض کر سکتے ہیں۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے پرانی جنسی ناقابلیت کو اس مسودہ میں رہنے دیا۔ مگر ساتھ ہی قواعد انتخابات کو ایسے سانچے میں ڈھالا۔ کہ ہر ایک صوبجاتی کونسل واضع آئین و قوانین کو اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اس مضمون کا ایک ریزولیوشن پاس کر کے صوبجاتی رجسٹر انتخاب کنندگان میں عورتوں کا نام درج کر لیا کریں۔

ان اختیارات کی رو سے صوبجات مدراس۔ بمبئی۔ بنگال متحدہ پنجاب اور آسام نے اپنے اپنے صوبہ کی جنسی ناقابلیت کو نظرانداز کرکے عورتوں کو انہیں شرائط پر حق انتخاب دیدیا۔ جن شرائط پر کہ مرد رائے دہندگان کو یہ حق حاصل ہے۔ مزید برآں مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی نے بھی اسی قسم کا ایک ریزولیوشن پاس کردیا ہے۔ چنانچہ اب عورتیں نہ صرف اپنے اپنے صوبجات کی کونسلوں کے ممبروں کے لئے بلکہ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبروں کے انتخاب کے لئے بھی رائے دینے کی مجاز ہیں۔ موجودہ عام قابلیت کے لحاظ سے اس وقت ہندوستان بھر میں صرف دس لاکھ یا تمام رائے دہندگان کی ۷ فیصدی عورتیں ایسی ہیں۔ جنہیں حق انتخاب حاصل ہے۔

۱۹۲۴ء کی سر الگزنڈر موڈی مین کی تحقیقات اصلاحات کی کمیٹی کو یہ غور کرتے ہوئے کہ عورتوں کے اس حق کے متعلق کچھ اور کیا جائے (یعنی عورتوں کو نیابت کے عہدے کا امیدوار ہونے کا حق دیا جائے) یہ ماننا پڑا تھا[۱] کہ عورتوں کے حق انتخاب کے سوال نے ہندوستانیوں کے تمدن اور احساسات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور یہ کہ اس کا فیصلہ پارلیمنٹ کے خیال کے مطابق صرف ہندوستانی ہی کرسکتے ہیں[۲]۔

چنانچہ موڈی مین کمیٹی کی سفارش پر صوبجاتی کونسلوں کی امیدواری کے

---

۱۵ ملاحظہ ہو ۱۹۲۴ء کی ریفارم انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کا صفحہ ۵۔

۵۲ ملاحظہ ہو انڈین ییر بک بابت ۱۹۲۸ء صفحہ ۵۱۱

قواعد ترمیم کئے گئے تھے - جن میں صوبجاتی کونسلوں کے ووٹ کے ذریعہ صنفی ناقابلیت کو نظر انداز کر دینے کے اختیارات بحال رکھے گئے تھے - اور ان اختیارات پر مدراس اور بمبئی کی کونسلیں عملدرآمد بھی کر چکی ہیں ؎

موڈی مین کمیٹی نے یہ تجویز سفارش کی تھی کہ ہندوستان کے محکمہ قانون کی دونوں کونسلیں (یعنی کونسل آف سٹیٹ اور اسمبلی) اپنے قواعد رائے دہندگان کی ترمیم جنسی ناقابلیت کے سوال کو نظر انداز کر کے کریں تاکہ ان صوبجات کے حلقہائے انتخاب کنندگان جنہیں کہ عورتیں حق انتخاب کے قابل ہیں - دونوں کونسلوں کے لئے عورتوں کا انتخاب کرائیں - چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۲۶ء کو ہندوستانی سررشتہ قانون میں ایسے ووٹ دئے گئے ؎

ابتک جو کارروائی ہو چکی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس استحقاق کا فائدہ ہندوستانی رائے دہندگان کی بجائے صوبجات کے انگریز گورنروں ہی نے اٹھایا ہے - ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک بائیس عورتیں میونسپل کونسل یا مقامی گورنمنٹ بورڈوں کی ممبر ہو چکی ہیں جن میں صرف چار بذریعہ انتخاب گئی تھیں اور باقی تمام کو گورنمنٹ نے نامزد کیا ؎

مندرجہ ذیل بیان ایک ایسے انگریز کا ہے جو ہندوستانی حالات سے خوب واقف ہے - جس کا ہندوستان میں بہت کچھ

سلہ ملاحظہ ہو انڈین ییر بک بابت ۱۹۲۶ء صفحہ ۵۱۱

اخلاقی اثر ہے اور جو اس اثر سے مندرجہ بالا انقلابات کی حمایت میں بہت کچھ کام لیتا رہا ہے۔ اس انگریز نے ان حالات سے اپنا تعلق اور ان کی صورت کی نسبت اپنی موجودہ رائے میرے کہنے پر ظاہر کی تھی۔ اور اس کی تائید بعد میں بڑے بڑے ہندوستانیوں نے کر دی تھی۔ اس انگریز کا بیان حسب ذیل ہے:-

"اس کے متعلق کہ کیوں ہندوستانی عورتوں کو حق انتخاب کے لئے تیار کیا جائے میں تمہارے سامنے اپنے دلائل پیش کرتا ہوں جو دہلی میں میں نے اس پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے پیش کئے تھے جس نے یہ ایکٹ وضع کیا تھا۔ بات یہ ہے بعض مقامات خاص کر بمبئی میں ایک عرصہ سے عورتوں نے میونسپل حق انتخاب حاصل کر لیا ہے۔ بمبئی میں بیشمار عورتیں ایسی تھیں جنہوں نے ہمارے تمدنی کام میں بڑا مفید حصہ لیا تھا۔ لہذا میں نے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے اور اس غرض سے کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسری عورتیں بھی میدان میں نکلیں عورتوں کے حق انتخاب کے لئے زور دیا تھا۔ پردے کی رسم کا جتنی جلدی ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہئے کیونکہ اس کا اثر ہندوستانی عورتوں کی صحت پر تباہ کن پڑتا ہے اور میں نے یہ خیال کیا تھا کہ عورتوں کو حق انتخاب دینے سے پردے کی رسم کو دور کرنے میں تقویت پہنچے گی"۔

جہانتک مجھے معلوم ہے بمبئی میں عورتوں کو حق انتخاب دینے کا اثر بہت تھوڑا ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں پبلک لائف میں

وہی عورتیں ہیں جو حقِ انتخاب سے پہلے تھیں۔ اور یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں یہ اثر اور بھی بہت کم ہوا ہے۔ جب تک تمدنی حالات کی اصلاح نہ ہو۔ ہندوستانی عورتوں کے لئے حقِ انتخاب کوئی معنے نہیں رکھتے گا۔ کیونکہ وہ اس حق سے فائدہ اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتیں"۔

بمبئی کی عورتوں کے حالات کا خیال کرتے ہوئے۔ جو ہندوستان بھر میں بہترین ہیں۔ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بمبئی کا شہر پارسیوں کا بڑا بھاری مرکز ہے۔ کیونکہ تمام ہندوستان کے پارسیوں کی مجموعی تعداد یعنی (۱۰۱۷۷۸) میں سے قریباً (۹۲۰۰۰) بمبئی پریزیڈنسی میں مقیم ہیں[1]۔ پرانے ایرانیوں کی نسل سے ہونے کی وجہ سے یہاں تمام پارسی عملی طور پر سوداگر یا ساہوکار ہیں۔ فی ہزار ایک سو پندرہ تعلیم یافتہ ہندو مردوں کے مقابلہ میں فی ہزار آٹھ سو پارسی مرد تعلیم یافتہ ہیں۔ پارسی اپنی عورتوں کو نہ تو زیر نگرانی رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی زیادہ اُن پر زور ڈالتے ہیں۔ لہذا فی ہزار چودہ تعلیم یافتہ ہندو عورتوں کے مقابلہ میں فی ہزار[2] (۷۲۲) پارسی عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔

پس اس قدر تعلیم یافتہ عورتوں کی اعلےٰ رتبہ کی جماعت تمام اعلےٰ رتبہ کے لوگوں کی عورتوں پر اثر ڈال سکتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہندوستان کی ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی جلد اول کا صفحہ ۱۱۸۔

[2] ملاحظہ ہو " " " " " (۱۸۰)

ضمیمہ سوئم

الف ہندوستانی کپاس

۲۵-۱۹۲۴ء میں جتنی کپاس ہندوستان سے برآمد کی گئی[1] اسکی تفصیل ذیل میں درج ہے۔ یونٹ (اکائی) ۴۰۰ پونڈ کے گٹھوں کی ہے۔

جاپان	۱۶۷۱۰۰۰
اٹلی	۴۸۵۰۰۰
چین (جس میں ہانگ کانگ شامل ہیں)	۲۸۴۰۰۰
بلجیم	۲۰۱۰۰۰
جرمنی	۱۷۴۰۰۰
سلطنت متحدہ (برطانیہ)	۱۶۲۰۰۰

ہندوستان سے جو کپاس انگلستان کو لیجاتے ہیں۔ لنکاشائر کی کھڈیوں میں بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ کپاس ادنےٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ لہذا لنکاشائر والے کپاس زیادہ مصر اور امریکہ سے خرید کرتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو "ریویو آف ٹریڈ آف انڈیا" بابت سال ۲۵-۱۹۲۴ء مطبوعہ کلکتہ گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل پبلیکیشن برانچ ۱۹۲۶ء۔ صفحہ ۳۰

سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں کل (۳۳۲۲۴۰۰) گٹھے[1] ہندوستانی کپاس کی انگلستان کی درآمد کی گئی - اور یہاں کے کارخانوں میں (۲۰۵۰۸۹۱) گٹھے خرچ ہوئے ؂

جاپان نے نہایت ادنےٰ درجہ کی ہندوستانی کپاس خریدی کیونکہ یہاں اس سے وہی کپڑے بنے جاتے ہیں - جن کا مقابلہ چین میں ہندوستان کے کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑوں سے کیا جاتا ہے - سنہ ۱۹۲۴ء میں برٹش ہندوستان میں (۳۳۰) روئی کے کارخانے تھے - قریباً ان تمام کارخانوں کے مالک ہندوستانی ہیں - جنہوں نے قاعدہ کے مطابق انگریز سپرنٹنڈنٹ اور فورمین ملازم رکھے ہوئے ہیں - اور باقی تمام محنت مزدوری ہندوستانی کرتے ہیں - مندرجہ ذیل اعداد[2] کے ملاحظہ سے معاملہ اور زیادہ صاف ہو جائے گا ؂

	سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء ملین (دس لاکھ گز)	سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء ملین گز	سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء ملین گز	سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء ملین گز
سوتی کپڑا جو ہندوستانی کارخانوں میں بنا گیا -	۱۱۶۴۶۳	۱۷۲۵۶۲	۱۷۰۱۶۹	۱۹۷۰۶۵
وہ کپڑا جو ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہو کر ہندوستان سے باہر گیا -	۸۹۶۲	۱۵۰۳۰	۱۷۵۰۳	۱۸۱۶۵
غیر ممالک (یعنی تمام ممالک جن میں سلطنت متحدہ - جاپان - اٹلی - نیدرلینڈز اور ریاستہائے متحدہ شامل ہیں) کا تیار شدہ سوتی کپڑا جو ہندوستان میں باہر سے آیا -	۳۱۶۷۰۱	۱۵۹۳۶۳	۱۴۰۵۶۸	۱۸۲۳۶۲

[1] ملاحظہ ہو "ریویو آف ٹریڈ آف انڈیا" بابت سال سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء مطبوعہ کلکتہ گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل پبلیکیشن برانچ سنہ ۱۹۲۶ء - صفحات ۲۱ - ۲۲

[2] ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ صفحہ ۲۳

اس طرح سے معلوم ہوگا کہ جہاں ہندوستان کی اپنی ساخت میں اور یہاں کے مال کے باہر جانے میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں باہر کا مال اس سے نصف آتا ہے جتنا کہ ۱۹۱۳ء سے پہلے آیا کرتا تھا۔

ب۔ ریلوے شمار و اعداد

مندرجہ ذیل اعداد ۱۹۲۶ء کے ہیں اور یہ ان شمار و اعداد سے لئے گئے ہیں جو سٹیٹسمین ئیر بک بابت ۱۹۲۶ء میں دے ہوئے ہیں

	ہندوستان میں	جمہوریہ ارجن ٹائن میں	ریاستہائے متحدہ میں	کنیڈا میں
وہ میل جنمیں علاقہ کے ۱۰۰ مربع میل کے حساب سے ریل چل رہی ہے۔	۲۱	۱۹	۸۸	۱۵
ان مسافروں کی تعداد جنہوں نے چلتی ہوئی ریلوں پر فی میل کے حساب سے سفر کیا۔	۱۵۰۳۴	۵۹۰۶	۳۵۵۰	۸۱۴
اسباب جو ٹنوں کے حساب سے چلتی ہوئی ریلوں پر فی میل کے حساب سے لیجایا گیا۔	۲۷۸۵	۲۰۴۳	۸۲۷۷	۱۰۱۹
اس درآمد شدہ اور برآمد شدہ اسباب کی قیمت کی میزان جو چلتی ہوئی ریلوں پر فی میل کے حساب سے لیجایا گیا۔	۱۱۸۶۰ پونڈ	۱۵۰۲۶ پونڈ	۶۸۹۹ پونڈ	۲۲۴۷ پونڈ

ج۔ فوجی اخراجات

اس کے متعلق ایک مانے ہوئے ماہر کی یہ رائے ہے[۵]:-

کسی ملک کے فوجی اخراجات کا اندازہ بغیر کسی غلطی کے ڈر کے ان ضروریات کو مدنظر رکھ کر لگایا جاتا ہے جو اس ملک کو لاحق ہوں

[۵] "ڈیفنس آف انڈیا" مصنفہ آرتھر ونسنٹ۔ صفحات (۹۳-۹۴)

اور جن کا پورا کرنا اس ملک کی اپنی طاقت سے قریباً بالکل باہر ہو مثلاً اس کی جغرافیائی اور نسلی آبادی کے حدود کو قائم رکھنے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس ضرورت کو مدنظر رکھ کر کہ اس ملک کی ہمسایہ ملکوں کی طاقت کتنی ہے اور ان کا برتاؤ کیسا ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کہ اس ملک کے باشندے آدمی اور سامان مہیا کرنے کا کس قدر بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ اس ضرورت کو دیکھ کر کہ اس ملک کی اپنی قوموں میں صلح ہے۔ یا شکر رنجی۔ ہندوستان کے فوجی اخراجات کی نسبت صرف اسبات کی تحقیقات ضروری ہے کہ آیا اس کے کل بجٹ کی میزان اس کے وسیع علاقہ جات کو سنبھالنے اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے کافی ہے اگر اس میزان میں اضافہ کر دیا جائے تو اس کے محافظت کے اخراجات وہی رہیں گے جواب ہیں اور یہ بجٹ اس حد تک غیر مناسب نہیں رہے گا کہ ہندوستان محافظتی اخراجات میں دنیا کے بہترین ممالک میں سے شمار ہونے لگے گا۔"

(۲) سود خور

پنجاب کے بنئے کی نسبت مسٹر کیلورٹ لکھتے ہیں[1]:-

"بنیا سب سے زیادہ دولتمند لوگوں کی واحد جماعت کا رکن ہے۔ اس کے منافع جات غالباً تمام کاشتکاروں کے منافعوں کی یکجا جمع کی ہوئی رقم سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے پیشہ ور جماعت کی کوئی ہستی نہیں ہوتی۔ اس کے

[1] ملاحظہ ہو کتاب "ویلتھ اینڈ ویلفیئر آف دی پنجاب" مصنفہ ایچ کالورٹ ... [illegible]

سامنے دستکار لوگ ہیچ ہوتے ہیں اور تجارتی اور کاروباری لوگ بھی اس سے دوسرے درجہ پر ہوتے ہیں"۔

مگر یہ سود خور لوگ پنجاب ہی میں خاص نہیں ہوتے۔ برٹش ہندوستان کے دیہاتی رقبہ جات کے لوگوں کے قرضہ کا تخمینہ تقریباً چالیس کروڑ پونڈ ہے۔ جو سارے کا سارا غیر منافع بخش ہے اور قرضہ کی اسقدر تعداد زیادہ تر سود کی زیادہ شرح اور سود در سود کی وجہ سے ہوگئی ہے۔ اور ان قرضوں میں زمین کی ترقی کرنے کے لئے لی ہوئی رقوم کی ایک نہایت قلیل۔ فیصدی ہے۔ باقی تمام کے تمام فرضی شادیوں میں فضول خرچیوں کیلئے لئے گئے ہیں۔

۵۔ سونے چاندی کی اینٹیں

۱۹۲۴-۲۵ء میں ہندوستان سے سوداگری کے مال کی برآمد اس کی درآمد سے بقدر[1] دس کروڑ پونڈ زیادہ ہوئی۔ اسی سال میں سونے چاندی کی درآمد بقدر چھ کروڑ[2] ساٹھ لاکھ پونڈ کے ہوئی۔

۱۹۲۴-۲۵ء میں دو کروڑ چالیس لاکھ پونڈ[3] کا ہندوستانی مال امریکہ میں گیا۔ جس کے مقابلہ میں امریکہ نے ہندوستان کے پاس صرف چورانوے لاکھ پونڈ کا اسباب بیچا اور قریباً اتنی مالیت کی چاندی کی

سلہ ملاحظہ ہو۔ "ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا" صفحہ (۴۷)

سلہ ۲ " " " " صفحہ (۴۸)

سلہ ۳ " " " " صفحات (۴۹-۶۰-۶۱-۶۲)

سلامتیں اور ایک کروڑ چونتیس لاکھ پونڈ کا سونا اس ملک میں بھیجا۔ یہ درآمد و برآمد ہر سال بڑھ رہی ہے۔ جس کے ساتھ ہی دنیا بھر میں سونے کی اینٹوں کی قیمت بڑھ رہی ہے

۶۔ زنانہ مزدوروں کی عدم موجودگی

مسٹر کیلورٹ اپنی کتاب "ویلتھ اینڈ ویل فیر آف دی پنجاب" کے صفحہ (۲۰۷) پر لکھتے ہیں:۔

"اگر مغربی ممالک میں کوئی ایسی تحریک پیش کی جاتی کہ محض گھروں کے کام کاج کے سوائے باقی تمام کاموں کے لئے عورتوں کی خدمات نہ حاصل کی جائیں تو یہ تحریک تمام اقتصادی حلقہ جات میں ہل چل ڈالدیتی اور اگر یہ تحریک پاس ہو جاتی۔ تو وہ تمام ممالک تباہ و برباد ہو جاتے .... یہ امر واقعہ ہے کہ بعض (ہندوستانی) قومیں ایسی ہیں۔ جن کے افراد اپنی عورتوں کو کھیتوں میں بھی کام نہیں کرنے دیتے۔ یہی امر انکی مفلسی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کافی ہے"۔

اسی کے متعلق ایک ہندو مصنف مسٹر وسوسوارایا اپنی کتاب "ایکنسٹرکٹنگ انڈیا" کے صفحہ ۲۴۶ پر لکھتے ہیں:۔

"وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی اس معاملہ پر غور کریں۔ کہ ان کی عورتوں کی بیکاری کی زندگی (جس کے بسر کرنے پر وہ اپنی عورتوں کو اس خیال سے مجبور کر رہے ہیں کہ ان کی غیرت اور حمیت گوارا نہیں کرتی) کیا اس دل ہلا دینے والی قیمت کے مقابلہ میں جو اس وقت ہندوستان ادا کرنے کے لئے

مجبور کیا جا رہا ہے ہندوستان کی نصف آبادی کام کرنے کی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے بیکار بیٹھی ہے"۔

ز۔ گداگری

۲ فروری ۱۹۲۶ء کو مسٹر عبد الحی نے جو مشرقی پنجاب کی طرف سے ایک مسلمان ممبر ہے انڈین لیجسلیٹو اسمبلی میں ہندوستان میں گداگری اور آوارہ گردی کی روک تھام کی غرض سے ایک ریزولیوشن پیش کیا۔ جس کے پہلے حصہ میں اُس نے کہا۔

"دیکھنے والا حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ہے۔ کہ آسمان پر ستاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ یا ہندوستان میں گداگروں کی...... ہندوستان میں زراعت کے سوا کوئی بھی ایسا پیشہ نہیں جو یہ دعوائے کر سکے۔ کہ اس کے کرنے والوں کی تعداد گداگروں سے زیادہ ہے۔ میں بڑے زور کے ساتھ اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر بیسواں آدمی ضرور گداگر ہوگا"۔

انہیں گداگروں کی نسبت لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب "نیشنل ایجوکیشن ان انڈیا" میں صفحہ ۳۷ پر لکھا ہے:۔

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم کے بہت بڑے حصہ نے (جس کا تخمینہ بعض اوقات ایک چوتھائی لگایا جاتا ہے) فائدہ بخش اقتصادی کام چھوڑ کر لوگوں کو یہ پرچار کرنا شروع کیا ہے کہ نجات حاصل کرنے کے لئے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ یا تو خود سادھو (گداگر تارک الدنیا) بن جائے۔ یا اگر

یہ نہ کر سکے تو سادھوؤں کو خوب کھلائے پلائے اور ان کی پرورش کرتا رہے"۔

ح۔ عوام کی اقتصادی حالت

آمدنیوں کے بڑھ جانے کی ایک عام عینی شہادت یہ ہی کہ اب دیہاتی لوگ بھی ان غیر ضروری چیزوں کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ جن کا ان کو کبھی خواب وخیال بھی نہ آیا تھا۔ چنانچہ فوری ۱۹۲۶ء کو علی گڈھ کے ایک میلے پر الگ ہفتہ کے اندر ایک ہزار پونڈ کے سستے بوٹ بک گئے۔ جن کی فروخت سے سوداگروں کو بیس فیصدی خالص منافع ہوا۔ دیہاتیوں کے لئے یہی بوٹ (جن کو وہ اپنے پاؤں میں پہن کر چٹخاتے پھرتے تھے) بیس سال ہوئے ایک ان سنی نعمت تھی۔ اسی میلے پر چھپر لو لیمپوں اور نہایت چمکدار روغن والے ٹرنکوں کے (جن پر وہیں بار بار روغن پر روغن ہو رہے تھے) ڈھیروں کے ڈھیر بک رہے تھے اور ان کے خریدار معمولی دیہاتیوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ چائے سگرٹ۔ دیاسلائیاں۔ لالٹین۔ بٹن۔ جیبی چاقو۔ منہ دیکھنے کے آئینے اور گراموفون اب وہ لوگ خرید رہے ہیں۔ جو پندرہ سال ہوے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ ریل کے تیسرے درجہ کی سواریوں کی بھرمار۔ ایک اور مثال اس کی ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں آج کل پیسہ ہے۔ ہندوستانی دہقان اب ریل کا سفر اس طرح سے کرتے ہیں۔ جس طرح امریکہ کے وہ لوگ جو ایک جگہ سے

دوسری جگہ جاکر کام کرتے ہیں۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں بارہ لاکھ چھیالیس ہزار اول درجہ کے مسافروں کے مقابلہ میں اٹھاون کروڑ اٹھارہ لاکھ چار ہزار مسافروں نے تیسرے درجہ کی گاڑیوں میں سفر کرکے یہ ثابت کردیا کہ دہقانوں کے پاس خرچ کرنے کے لئے کافی روپیہ موجود ہے؂

میں نے ان مسافروں کو تیسرے درجہ کی گاڑیوں میں ٹھونستے ہوئے دیکھ کر کئی دفعہ یہ سوال کیا:-

"آخر یہ لوگ جا کہاں رہے ہیں؟"

مجھے ہمیشہ یہی جواب ملا:- "یہ جا رہے ہیں۔ کہیں ملاقات کے لئے۔ زیارت یا جاترا کے لئے۔ شادی بیاہ میں شامل ہونے کے لئے۔ اپنا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کے لئے اور بعض صرف یہ کہنے کے لئے کہ "بس میں گیا اور واپس آیا۔"

عمدہ حافظہ کا راز - ہر شخص اس کے ذریعہ اپنا حافظہ بڑھا سکتا ہے - طالب علموں کے لئے عجیب و غریب تحفہ ہے ۔ قیمت ۸ر

آہنی ارادہ - اس کتاب میں نہایت عمدہ پیرایہ میں عزم اور استقلال پیدا کرنے پر بحث کی گئی ہے ۔ قیمت ۸ر

مطالعہ باطن - رسالہ مائینڈ ریڈنگ کا اردو ترجمہ ۔ قیمت ۸ر

دم فرصت یا عین موقعہ پر - جو لوگ حال اور موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیں مطالعہ کریں (۸ر)

طریق دولت - جس میں ہر روش کے دنیا داروں کے مفید مطلب رائیں - دنیا میں ہر پیشے سے دولت کمانے اور دولتمند ہونے کے متعلق لکھی گئی ہیں - اور کئی کروڑ پتی لوگوں کے تجربات درج ہیں ۔ ۱۲ر

شاہراہ دولت - امریکہ کے مشہور مسٹر بارنم کی کتاب ڈالر اور سنس کا ترجمہ جس میں دولت کمانے کے کئی طریقے قلمبند کئے ہیں - کہ جن کی پیروی کر کے وہ خود امیر بن گیا - اور انہی قواعد کی پیروی کرنے سے آپ بھی دولتمند بن سکتے ہیں - باتصویر ۔ قیمت ایک روپیہ - عہ ر

امریکہ کے کامیاب لوگ باتصویر - آجکل دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب اور دولتمند اہل امریکہ ہیں - اس کتاب میں امریکہ کی تمام چوٹی کے کامیاب لوگوں کے حالات اور انکی کامیابی کے وسائل درج کئے گئے ہیں ۔ قیمت عہ ر

تحریک - ڈاکٹر سیموئل سمائیلز کی مشہور کتاب "سلف ہلپ" کا اردو ترجمہ جس میں ہزاروں مثالیں دیکر ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنی مدد خود کرنی چاہئے ۔ قیمت ۱۲ر

مطالعہ نفس - انسان کا بہترین مطالعہ نفس ہے ۔ قیمت ۳ر

توجہ کی یکسوئی - دنیا کی تمام کامیابیوں کا مدار یکسوئی پر ہے جو قابل دید ہے ۔ ۳ر

قوت الحیات - زندگی مردانگی کے لئے پیدا کی گئی ہے - اس میں سیکڑوں مثالیں درج ہیں ۔ قیمت (۸ر)

ملنے کا پتہ:- منیجر پیسہ اخبار لاہور

فارسی بول چال - جس میں زمانہ حال کی فارسی زبان کے سیکھنے اور بولنے کا طریقہ بہت سی جدید لغات
محاورات کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے - جو فارسی آج کل ایران میں بولی جاتی ہے - اس میں ترکی - روسی
اور اجنبی زبانوں کے لفظ اور غیر مانوس محاورات ہیں - ایسے قریباً پونے دو ہزار الفاظ اور کئی محاورات
- بالمقابل اردو معانی درج ہیں - قیمت ۸/

ترکی بول چال - ترکی سکھلانے کی اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب جو منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر
اخبار نے قریباً پونے دو سو صفحہ پر لکھی ہے اور جس کے ذریعہ سے ایک ہوشیار آدمی جو فارسی اور عربی زبان سے
قدر واقف ہو - تین ماہ کے اندر محنت کر کے ترکی زبان سیکھ سکتا ہے - قیمت ۱/

انگلش ٹیچر - بغیر استاد کی مدد کے انگریزی سکھانے والی کتاب - اس میں گرامر - ٹرانسلیشن - ایڈیمز اور لیٹر رائٹر
شامل ہے - جو انگریزی زبان کا ایک لفظ نہیں جانتے - تھوڑے عرصہ میں انگریزی سیکھ سکتے ہیں - قیمت ۱۲/

ہندو کلاسیکل ڈکشنری - ہندو دیوتاؤں اور اوتاروں کے وید اور پوران کے حالات اور راکھشوں
ہیروں اور راجاؤں کی سوانح عمری بطور لغات - قیمت ۶/

عوالطا گر ناگری - جس کے مطالعہ سے ہر اردو دان ہندی بغیر مدد استاد کے آسانی سیکھ سکتا ہے - مصنفہ سید وزیر احمد صاحب قادری بلوی ۴/

ایشیا و یورپ کی ضرب الامثال - سولہ ایشیائی زبانوں اور آٹھ یورپین زبانوں کی چیدہ ضرب المثلوں کا اردو ترجمہ (۸/)
اردو زبان - قیمت ۴/ **عربی بول چال** - جس میں ہندیوں کو زمانہ حال کی عربی زبان سیکھنے اور
بولنے کا طریق بتایا گیا ہے - ابتدا میں دو ہزار الفاظ عربی مع معانی اردو ہر قسم کی گفتگو کے لئے درج کئے گئے ہیں پھر چار ہزار فقرات
محاورات آجکل کے مصر اور شام و عرب کے روزمرہ کے مع اردو مضمون کے گفتگو کے مختلف ابواب پر منقسم کئے گئے ہیں -
آخر میں پرائیویٹ اور دفاتر کی خط و کتابت و رقعات کے نمونے درج ہیں - قیمت ۱۲/

انگریزی بول چال - کل کتاب کے ۱۳۰ صفحہ ہیں جن میں بارہ سو سے زیادہ فقرے اور محاورے انگریزی ٹائپ میں چھپے ہوئے ہیں
اور انکے بالمقابل اردو ترجمہ درج ہے کل کتاب کو چھ حصوں و مختلف بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ کسی قسم کا طریق گفتگو باقی نہ رہ جائے - قیمت ۱۲/

آرتھر برانڈرتھ صاحب کی عربی گرامر - اردو زبان میں اس سے بہتر اور مفصل عربی گرامر نہیں چھپی ہوگی جس میں
ہزارہا عربی فقرے مع اردو ترجمہ برائے مشق درج ہیں - قیمت (۱۲/)

قواعد ترکی - ترکی زبان سیکھنے کے لئے ترکی صرف و نحو کے علم ضروری قواعد اردو میں - قیمت ۴/

مفتاح البلاغت - اردو میں فن بلاغت کی بہترین کتاب مصنفہ حکیم مولوی محمد نجم الغنی صاحب رامپوری فن معانی و بلاغت میں اس سے بہتر کتاب موجود نہ ہوگی۔ قیمت مجلد (۳ہ)

جنگ یورپ کے ٹکنیکل حالات - موجودہ جنگ یورپ کے دلفریب حالات جن کو پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے قیمت ۴ر

دنیا کی گوری قومیں - دنیا کی آئندہ سرداری کن اقوام کے ہاتھ میں ہوگی رنگدار قوموں کی بیداری امریکن مصنف کی قلم سے - ۸

تحفۃ الطیر - خلاصہ دیوان حافظ الشیخ نظم پنجابی قابل دید پنجابی اشعار۔ قیمت ۳ر

تذکرات و سوانح عمریاں

ذکر شہنشاہ جارج پنجم - با تصویر قیمت (۸) **نپولین بوناپارٹ** - فرانس کے عظیم الشان بہادر جو سپاہی بادشاہ کی زندگی کے حالات۔

حیات زیب النساء - شہرہ آفاق ملکہ شاعرہ زیب النساء کی زندگی کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ قیمت ۳ر

خالد بن ولید - حضرت خالد بن ولید سیف اللہ اسلام کے مشہور سپہ سالار کے حالات تاریخ اسلام کا اس نہایت پُرجوش اور خالص ہیبت کو زمانہ کی کیفیت مختلف مہمات اور میدانہائے کارزار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قیمت (۱۲) **حالات سعدی** - شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مفصل حالات

مسٹر اینڈریو کارنیگی - اس کتاب میں امریکہ کے اس مشہور کروڑپتی کی زندگی کے حالات درج ہیں جو بچپن میں ایک غریب جولاہے کا بیٹا تھا اور اپنی قوت بازو اور عقل خداداد سے وہ کروڑپتی بن گیا۔ قیمت (۸)

ابراہیم لنکن - اضلاع متحدہ امریکہ کا نامور پریزیڈنٹ جو نہایت غربت کی حالت سے اس عظیم الشان رتبہ تک صرف اپنے قوت بازو سے پہنچ گیا۔ قیمت ۸ر **حیات النعیم** - فی ذکر نبی کریم سید المرسلین کی زندگی کے حالات اقوال و اخلاق۔ قیمت ۸

پیغمبر اسلام - مشہور روسی فلاسفر ٹالسٹائی کے خیالات۔ حضرت خیر البشر کی تعریف میں۔ قیمت ۸ر

الفاروق - مصنفہ علامہ شبلی نعمانی۔ قیمت (عہ)۔ **سلطان صاحبقران** - قیمت چار آنہ ۴ر

حضرت ابوبکر صدیق کی شاندار زندگی کے حالات ترجمہ عربی سے اردو میں۔ قیمت ۱۰ر

حضرت علی ابن ابی طالب - حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی کے مفصل حالات۔ قیمت ۱۲ر

جنرل گارفیلڈ - اس محنتی اور مزدور لڑکے کی زندگی کے حالات۔ جو بعد میں اضلاع متحدہ کا پریزیڈنٹ بن گیا۔ قیمت ۸ر

حیات مشتاق - نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب بہادر آنریری سکریٹری ٹرسٹیان علی گڑھ کالج کی کامیاب زندگی کے حالات مصنفہ منشی سکندر علی صاحب لفافہ تر دانی باتصویر قیمت ۸ر **مہادیو گوبند رانا ڈے** - قیمت چار آنہ۔

یہ جواہرات — ہر قسم کے جواہرات کی شناخت خواص و حالات اور تحقیقات تجارتی کی مفصل کیفیت درج ہو۔ ۱۲ر

بتی بنانا — مشینری کے ذریعہ موم بتی بنانا اور تجارتی نقطۂ نگاہ سے کامیاب ہونا۔ قیمت ۱۲ر

دکی حقیقت — خراد کی پرزوں کا استعمال اور ہر قسم کی چھوٹی بنانا وغیرہ نہایت مفصل پیرایہ میں بیان کیا ہو۔ عہ

مٹھائی کا کارخانہ — بسکٹ۔ کیک۔ انگریزی مٹھائیاں بنانے کی کتنی ترکیبیں درج ہیں۔ ۱۴ر

ل مرغیخانہ — اگر مرغیوں کی تجارت اور پرورش سے ہر روز روپیہ کا ادا حاصل کرنیکا آپ کو بھی شوق ہے

ں مرغیوں۔ ٹرکیوں۔ بطخوں اور دیگر انگریزی پالتو جانوروں کی پیدائش بذریعہ مشین اور ان کی پرورش اور

نشت اور امراض کا علاج۔ اور مرغیوں کی تجارت سے روپیہ کمانے کے مفصل حالات درج ہیں۔ ۱۲ر

شنائی — تین سو مختلف قسم کی روشنائیوں اور سیاہیوں کے حالات۔ قیمت ۸ر

نگائی چھپائی — سوتی۔ ریشمی اور اونی کپڑوں پر چھینٹ چھاپنا۔ اور اس کی مفصل تشریح۔ ۸ر

شبازی — یورپین اور ہندوستانی آتشبازی کے ۵۲۵ نسخے۔ قیمت ۱۲ر

لاو آبداری — لکڑی۔ پتھر۔ لوہے کو جلا دینے اور صیقل کرنے کے مجرب نسخے۔ قیمت ۸ر

ارنش اور پالش — لکڑی۔ لوہے۔ پتھر وغیرہ پر پالش اور وارنش کرنے کے

یہ طریقے جو ابھی تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ قیمت ۱۲ر

مصنوعی دھاتیں اور ٹانکا لگانا — جرمن سلور اور دیگر مصنوعی دھاتیں بنانے کی

ترکیبیں مفصل تشریح کے ساتھ درج ہیں۔ قیمت (۸ر)

بید صنعت حصہ اول — سٹیم انجن کے کل پرزوں کی شناخت و حالات ان سے کام لینا۔

ہر انجنیر کو ضروری ہے۔ نہایت قابل دید کتاب ہے۔ قیمت (عہ)

ل دنداں سازی — مصنوعی دانت لگانے۔ دانتوں کو پالش کرنے۔ سونا چڑھانے۔ ربڑ کا جبڑا

نے۔ دانت اکھاڑنے وغیرہ کے طریقے درج ہیں۔ قیمت عہ ر

ارخانہ دھلائی — یعنی لانڈری یا پارچہ شوئی۔ سرد و گرم کپڑے دھونے۔ داغ دھبے چھڑانے۔ دھولا

نے سے روپیہ کمانے کے طریقے درج ہیں۔ قیمت (عہ) **گائیڈ مکینکل انجنیری** — مکینکل انجنیروں کے

امتحان مشینوں۔ اور سٹیم انجنوں کے بنانے اور ان کے پرزوں کی شناخت اور سمجھانے کی مکمل رہنما ہے۔ ۱۸ر

آئینۂ جواہرات ۔ اس میں ہر قسم کے جواہرات کی شناخت ۔ حالات و خواص و اصول ۔ ماہرین و دانشمندانہ زمانہ قدیم مع خواص ماہیت ۔ کیمیائی ترکیب ۔ مقامات پیدائش ۔ حالات برآمد و کان کی کاٹ اور جلا و سنگکاری ۔ کھرے کھوٹے کی پہچان ۔ غرض جواہرات کے متعلق ہر بات درج ہے ۔ جو پنڈت امرناتھ صاحب تحصیلدار نے مدت ۔۔۔ کی جدوجہد سے یادگار رہری حضور مہاراجہ رنبیر سنگھ والئی جموں تیار کی گورنمنٹ پنجاب نے انعام اس کے صلہ میں دیا ۔ ہفت رنگ جواہرات کی اصلی تصاویر ہیں ۔ ۱۵

رسالہ فوٹوگرافی ۔ فن فوٹوگرافی سیکھنے کی مکمل رہنما ۔ قیمت ۸

گھر کا درزی ۔ کپڑے سینے ۔ کترنے اور ڈریس تیار کرنے کی آسان ترکیبیں درج ہیں ۔

مکمل گھڑی سازی ۔ گھڑیاں ۔ کلاک ۔ ٹائم پیس وغیرہ مرمت کرنے اور گھڑیوں کے پرزے بنانے مرمت و صاف کرنے کے طریقے ۔ باتصویر (عکہ)

دباغت ۔ پشم ۔ نرمی ۔ بال دار ۔ کھال رنگنے اور اس کے تیار کرنے اور نرم و ملائم کرنے کے کیمیائی طریقے درج ہیں ۔ قیمت ۱۲

چینی مٹی اور اس کے مصنوعات ۔ ہر قسم کی مٹیوں کے حالات اور شناخت ۔ جن سے چینی مٹی کا خمیر بنتا ہے ۔ اور برتن وغیرہ بنانے اور ان کے فروخت کرنے کے حالات ۔ قیمت

لوہا ڈھالنا ۔ سٹیل و کاسٹ آئرن کی ڈھلائی ۔ فونڈری قائم کرنا ۔ پن ۔ نب ۔ سوئیاں بنانیکی باتصویر طریقہ

علاج اسپاں ۔ گھوڑا اور اس کی تربیت اور ان امراض کا علاج جو عموماً گھوڑوں کو ہوتے ہیں ۔ نہایت کارآمد ۔ قیمت ۱۲ **معالجات الکلب** ۔ کتوں کی ہر قسم کی بیماریاں اور ان کا علاج اور پرورش کے طریقے وغیرہ ۔ قیمت ۱۲

محب المویشی ۔ اس میں ۔ ہاتھی ۔ شیر ۔ گھوڑا ۔ خچر ۔ گدھا ۔ بھینس ۔ گائے ۔ بکری ۔ بھیڑ تمام پالتو جانوروں کے امراض اور ان کا علاج اور ان کی نگہداشت کے نہایت آسان طریقے درج ہیں ۔ قیمت

خوانِ یغما ۔ مسلمانوں کے انواع و اقسام کے صد با لذیذ کھانے پلاؤ ۔ زردہ ۔ قورمہ ۔ گوشت کوفتے وغیرہ بنانے کے دوران میں مصالحے ڈالنے اور پکانے کی پوری ترکیب اس میں درج ہیں ۔

گلٹ سازی ۔ بجلی کے ذریعہ ۔۔۔ گلٹ کرنا اس کتاب کی مدد سے کام شروع کرنے پر ایک آدمی کافی روپیہ کما سکتا ہے

جناب منیجر صاحب
انتخاب لاجواب لاہور میرے نام
ایک سال کے لئے رسالہ وی پی کریں
انتخاب لاجواب
قیمت سالانہ چھ روپے
ہزار روپے کی کتابیں ہر
خریدار کو مفت ملتی ہیں